ادبِ اُردو کا باتصویر ماہوار رسالہ

مرتبہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

جلد چہارم

جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۱ء

جس میں

اسّی نامور اہل قلم کے ایک سو سے زائد مضامین

دو سو چورانوے صفحات میں درج ہیں

اور

اکسٹھ رنگین و سادہ تصاویر شامل ہیں

مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد

فہرست مضامین

حصۂ نثر

نمبر	مضمون	صفحہ
۱	امومیت شمس العلماء ڈاکٹر سید علی صاحب بلگرامی ایم اے مرحوم	۱
۲	ایشیائی شعراء کا کمال - مجدد الوقت مولانا احمد حسن صاحب شوکت	۹-۲۳۲
۳	انگلستان سے ہم کیا سیکھ سکتے ہیں؟ ایک اینگلو انڈین ...	۲۷
۴	اسیر مرحوم - خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی ...	۴۲
۵	ازیا درفتہ سلطنت - (مع نقشہ) حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ...	۷۱
۶	اقوام ہند کی اصل اور انکی تقسیم شمس العلماء ڈاکٹر سید علی صاحب بلگرامی	۱۶۱-۲۴۷
۷	انقلاب زمانہ -	۲۲۵
۸	ایڈیٹوریل -	۵۴-۱۰۱-۱۵۵-۲۰۲-۲۹۳
۹	بڑی بہن - و-ر	۳۱
۱۰	برٹش حکومت کی برکتیں -	۹۱
۱۱	تقسیم علم ادب - ایم نظام الدین حسن اسکوبری - اے بی ایل	۱۰۵
۱۲	تمدن - ابو العلاء حکیم سید احمد صاحب ناطق لکھنوی	۱۱۳
۱۳	تزکیۂ اخلاق - جناب "آنند"	۱۱۹
۱۴	تعلیم نسواں - مس آر - ظہور الدین صاحبہ ...	۲۲۸
۱۵	جشن تاجپوشی - مولوی سید محمد فاروق صاحب	۸۰
۱۶	جاپان میں تعلیم نسواں - جنابہ زبیدہ خاتون صاحبہ	۲۵۶
۱۷	چپ کی داد - منشی تیرتھ رام صاحب فیروز پوری ...	۲۶۸
۱۸	خوف رسوائی - د-ر	۱۲۹
۱۹	خواجہ آتش لکھنوی - خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی	۲۶۶
۲۰	دربار تاجپوشی - مولوی شعیب احمد صاحب ندرت میرٹھی	۲۵۲
۲۱	دربار دہلی - ابو العلاء حکیم سید احمد صاحب ناطق لکھنوی	۲۴۲
۲۲	سیف و قلم - خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں صاحب	۱۶۶
۲۳	سسٹر نویدیتا - جناب "آنند"	۲۷۳
۲۴	سری رامچندر جی - منشی محمد حسین صاحب امجد ...	۲۸۳
۲۵	شہید وفا کی تربت - جناب ج - د عالی ...	۳۸
۲۶	شیخ ابو الفیض فیضی فیاضی - مجدد الوقت مولانا احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی	۶۵
۲۷	شاہنامہ فردوسی طوسی - مولوی محمد شفیع الدین خاں مراد آبادی ایم آر اے ایس	۲۱۷
۲۸	شعرم را بمدرسہ کہ برد - مولوی محمد صدیق صاحب اعجاز میرٹھی	۲۳۸
۲۹	علامہ شبلی نعمانی - پادری جان ملکم صاحب ...	۱۴
۳۰	عالم و ما فی العالم - پروفیسر جے - آر - رائے صاحب	۷۶-۱۲۳-۱۶۹
۳۱	عالم خیال - سید شبیر حسن صاحب، مجسٹریٹ، بھوپال ...	۲۱۹
۳۲	فلسفۂ سیاست - مسٹر ظفر عمر صاحب بی اے (علیگ)	۶۰-۲۰۷
۳۳	فرانس کے اخبارات - مجدد الوقت مولانا احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی	۱۲۷
۳۴	قدیم ہندوستان میں فن ہوابازی - منشی تیرتھ رام صاحب فیروز پوری	۸
۳۵	گہنے کا رواج - مولوی سید احمد صاحب دہلوی، مؤلف فرہنگ آصفیہ	۵۷
۳۶	لازوال خوشی - بابو ڈپٹی لال صاحب نگم بی اے دہلوی	۲۱۴
۳۷	مسٹر تھیوبرون کیمرن - پنڈت برجناتھ صاحب ترنبہ ایم اے	۸۵
۳۸	مولوی سید احمد صاحب دہلوی - مولوی اعلان صفی صاحب شہیر (منشی عالم)	۱۳۶
۳۹	مندر سری رنگ ناتک - جناب ہ-م-ر	۱۴۰
۴۰	مالک الدولہ صولت - مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی	۱۴-۱۷-۲۵۶
۴۱	مولوی نظام الدین حسن - پادری جان ملکم صاحب	۲۳۴
۴۲	نوجوان بیوہ کی شب تنہائی - سید علی متقی خاں صاحب رئیس امروہہ	۱۴۲
۴۳	نواب میر محبوب علیخاں غفران مکان - از سید خورشید علی صاحب	۱۸۱
۴۴	ہندوؤں کے مذہب پر ایک عام فلسفانہ نظر - رائے پربھو لال صاحب بی اے	۱۷
۴۵	ہکسلے کے خیالات - پروفیسر جے - آر - رائے صاحب	۲۱۰

حصۂ نظم

صفحہ

۱ آج - منشی تلوک چند صاحب محروم ۵۰
۲ آمدِ تاجورِ مبارک ہو - منشی عبد الخالق صاحب خلیق دہلوی ۲۸۹
۳ اخلاقی غزل - منشی برج بھوکن لال صاحب دریاآبادی ... ۴۹
۴ انجامِ گل - منشی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی ... ۹۸
۵ ادیب - مولوی اعلان صفی صاحب شہیر (منشی عالم) ... "
۶ انتظارِ دوست - منشی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ... ۱۵۰
۷ اسپ - مولوی حفظ الکریم صاحب حفیظ ۱۹۴
۸ بیکار رہنے والو - مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی ۲۴۵
۹ تہنیت تاجپوشی - مولوی سید محمد فاروق صاحب شاہپوری ۴۹
۱۰ تختِ طاؤس - ۲۹۲
۱۱ جانِ جہاں - از مسٹر ولی الحق صاحب ایم - آر - اے - ایس ۹۸
۱۲ جلوۂ جاناں - پنڈت جواہر ناتھ صاحب کول المتخلص بہ ساقی دہلوی ۱۴۸
۱۳ جلوۂ قدرت - منشی جگل کشور صاحب ضبط ۲۴۶
۱۴ جاڑا - سیّد محمد مرتضیٰ صاحب بیان ویزدانی میرٹھی (مرحوم) ۲۸۵
۱۵ جلوسِ دربار - حافظ محمد یعقوب صاحب اوج گیاوی ... ۲۹۸
۱۶ چشمِ جاناں - مولوی محمد سیف الدین صاحب شباب ... ۵۰
۱۷ چاندنی - حافظ محمد یعقوب صاحب اوج گیاوی ... ۲۴۵
۱۸ حبِّ وطن - منشی لال چند صاحب فلک ۹۷
۱۹ خیر مقدم - مولوی محمد عبد الحمید صاحب حمید میرٹھی ... ۲۸۶
۲۰ دوست کو پیام - منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی ... ۵۱
۲۱ دیارِ یار - مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب ... ۱۵۰
۲۲ دیہاتی اور شہری - منشی کندن لال صاحب شرر سہارنپوری ۱۹۲
۲۳ دُنیا - ماسٹر سید تصوّف حسین صاحب واصف اکبرآبادی ... ۱۹۳

صفحہ

۲۴ دلّی دربار - منشی نادر علی خاں صاحب نادر کاکوروی ۲۸۶
۲۵ رباعیات - (۱) شاکر میرٹھی ۴۸
(۲) مولوی محمد عبد الحمید صاحب حمید میرٹھی ۵۲
(۳) سید محمد مصطفےٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید لکھنوی ۱۴۷
(۴) مجدد الوقت مولانا احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی ۲۴۲
۲۶ - زمزمہ - پنڈت جواہر ناتھ صاحب کول، المتخلّص بہ ساقی دہلوی ۲۹۱
۲۷ سینس اینڈ لجن - مولانا احمد علی صاحب شوق لکھنوی - ۱۴۴
۲۸ سچی بیوی - جناب نصیر حسین آبادی ۱۵۱
۲۹ سانجھی - منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی ... ۱۹۶
۳۰ سرکشی و احتضار - سید علی رضا صاحب ماہر کنتوری ... ۲۴۲
۳۱ سالِ تخت نشینی - مولوی فضل ستار صاحب لاُابالی ... ۲۹۲
۳۲ شمع و پروانہ - میر امجد حسین صاحب ماہ عظیم آبادی ... ۹۶
۳۳ شمع - منشی خورشید علی صاحب مہر دہلوی ۱۴۹
۳۴ عالمِ خیال کا چوتھا رُخ - مولانا احمد علی صاحب شوق لکھنوی ۴۶
۳۵ عالمِ رویا - مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی ... ۴۸
۳۶ عظمتِ ہند - پنڈت بشن نراین صاحب در، المتخلّص بہ ابر لکھنوی ۹۳
۳۷ عندلیب - میر امجد حسین صاحب ماہ عظیم آبادی ... ۱۹۳
۳۸ عہدِ قیصری - سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہین ۲۹۱
۳۹ غزلیات: - نظم لکھنوی - ماہر کنتوری - ندرت میرٹھی ... ۵۳
شوکت میرٹھی - ماہر کنتوری - آباد عظیم آبادی ... ۹۹
عزیز لکھنوی - حسن بانکی پوری - جناب محروم - سرور جہان آبادی ۱۰۰
حضرت ریاض - توفیق مہدوی - آباد عظیم آبادی حمید میرٹھی ۱۵۳
عشرت لکھنوی جناب بسمل - جناب محروم - بیدل جھنجھانوی ۱۵۴

		صفحہ
	علامہ شبلی[19] نعمانی۔ جناب لطیف[20]۔ حضرت ریاض[21]	۲۰۱
	ابوالاعجاز عرشی[22]۔ عشرت[23] لکھنوی ...	۲۴۶
۴۰	غمِ فرقت۔ منشی کندن لال صاحب ثمر سہارنپوری	۹۳
۴۱	فراق۔ پنڈت بشن نرائن صاحب در المتخلص بہ ابر لکھنوی	۲۴۱
۴۲	فسانہ و تہنیت شکنتلا۔ منشی اقبال ورما صاحب سحر ...	۲۴۳
۴۳	قطعہ تاریخ تاجپوشی۔ پنڈت سکھدیو پرشاد صاحب مہر ...	۴۸
۴۴	قطعہ عبرت آمیز۔ ماسٹر سید تصوف حسین صاحب واصف اکبرآبادی	۵۲
۴۵	قطعہ تہنیت۔ جناب صفدر مرزاپوری	۲۹۰
۴۶	قطعات تاریخ وفات نظام	۱۹۹
۴۷	〃 〃 جلوس	〃
۴۸	〃 〃 وفات حضرت تسلیم و ظہیر بہ منشی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی	۲۴۶ و ۲۴۱
۴۹	〃 〃 تاجپوشی۔ قاضی محمد کریم الدین صاحب زعیم	۲۹۲
۵۰	قصیدہ۔ منشی اقبال ورما صاحب سحر	۲۸۷
۵۱	گلِ نیلوفر۔	۹۵
۵۲	مسلکِ گوتم۔ رائے صاحب پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم	۹۵
۵۳	مذاقِ عشق۔ مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی	۱۴۷
۵۴	مصوری و شاعری۔ مولانا سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عمادپوری	۱۹۲
۵۵	مرجھائی ہوئی کلیاں۔ حکیم رگھبیر سہائے صاحب بریاں جہان آبادی	۱۹۵
۵۶	موسمِ برشگال۔ مسٹر محمد یوسف صاحب قیصر ایڈیٹر الحجاب	۱۹۷
۵۷	نغمۂ روح۔ مولانا سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عمادپوری	۹۴
۵۸	نوحۂ سرور۔ منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی	۹۶
۵۹	نوحۂ وفات مہاراجہ ناہن۔ بابو چندولال صاحب ناظر	۱۵۲
۶۰	نوحۂ انتقال نظام۔ (۱) خواجہ معین الدین صاحب سلام	۱۹۸
	(۲) منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی	〃
۶۱	نسیم برشگال۔ سید عاشق حسین صاحب سیماب اکبرآبادی	۱۹۷
۶۲	نغمۂ تہنیت۔ مولوی محمد سیف الدین صاحب شباب	۲۸۹
۶۳	یادِ محبوب (رباعیات) مولوی محمد عبدالکریم صاحب صبر دہلوی	۱۹۹

فہرست تصاویر

جولائی۔ [1] فرقت زدہ یکشن (رنگین)، [2] دو ہزار برس قبل کی ایک ہندوستانی عورت۔ [3] علامہ شبلی نعمانی۔ [4] اجنٹا کے غار کی ایک تصویر۔ [5] سوامی شنکر اچاریہ۔ [6] حبقوق نبی کا مزار۔ [7] شاہزادہ جہانگیر و نورجہاں۔ [8] جھبو اجی۔ [9] حضرت اسیر مرحوم۔ **اگست**۔ [10] ہجراں نصیب یکشن (رنگین)۔ [11] دولہن کی سہیلیاں۔ [12] آخری شاہ مغلیہ کی تحریر کا نمونہ۔ [13] خواجہ میر علی تبریزی کی تحریر کا نمونہ۔ [14] رادھا اور کرشن۔ [15] زحل اور اسکے چھلے۔ [16] مشتری۔ حلقہ ہائے زحل۔ [17] اعلیٰ حضرت شہنشاہ جارج پنجم دام ملکہ و علیا حضرت ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا۔ [18] سامان تاجپوشی۔ [20] مسٹر میتھیو برون کیمرن۔ [21] رقص۔ **ستمبر**۔ [22] اُتر اور برہمن ملا (رنگین)، [23] سلطان عبدالحمید خان۔ [24] پرنس بسمارک۔ [25] عام نظارہ قلعہ و مندر سری رنگ نائک۔ [26] نظارہ مندر سری رنگ نائک۔ [27] مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی۔ [28] راجہ سر اندر بکرم پرکاش بہادر مرحوم۔ [29] سری کرشن کا بچپن۔ [30] مجمع آل انڈیا اردو کانفرنس۔ [31] مولوی سید احمد صاحب دہلوی۔ [32] جملہ ہفت کوٹ مندر سری رنگ نائک۔ [33] اندرونی حصہ مندر سری رنگ نائک۔ **اکتوبر**۔ [34] دمینتی اور ہنس (رنگین)۔ [35] نمونہ خوشخطی۔ [36] ساوتری اور فرشتۂ موت۔ [37] جوانِ ترک۔ [38] دربار نورتن اکبری۔ [39] گنگا اور جمنا۔ [40] نواب میر محبوب علیخاں آصف جاہ مرحوم۔ [41] سانچی کا ایک نظارہ۔ [42] نواب میر عثمان علیخاں فتح جنگ بہادر نظام دکن۔ **نومبر**۔ [43] میگھ ناد کا یگیہ (رنگین)۔ [44] مرحوم و مبرور مہاراجہ کوچ بہار۔ [45] مہارانی صاحبہ کوچ بہار۔ [46] جھبولنا محل گورداسپور۔ [47] پنڈت نارائن ناتھ۔ [48] مولوی نظام الدین حسن۔ [49] دیوار چین۔ [50] مہاراجہ راجیندر نرائن بھوپ بہادر والی ریاست کوچ بہار۔ [51] روضۂ شاہ عبدالجلیل الہ آباد۔ [52] روضۂ بیگم الہ آباد۔ [53] ولادتِ شکنتلا۔ **دسمبر**۔ [54] مہاراجہ یدھشٹر (رنگین)، [55] دمینتی سویمبر۔ [56] لیلیٰ مجنون۔ [57] ششر نیویدتا۔ [58] ناوکِ جگر دوز۔ [59] خانۂ کعبہ۔ [60] سری رام چندر جی مہاراج۔ [61] عطائے دیوتا۔

عزلت زدہ یکش

انڈین پریس الہ آباد

جولائی سنہ ۱۹۱۱ء

جلد ۴ — نمبر ۱

امومیت

تمدّن کے ابتدائی مدارج

اقتباس از کتاب تمدّنِ ہند (زیرِطبع) - کتاب دوم فصل چہارم

سواحلِ ملابار کے باشندے نائر وغیرہ

تمدّن کے ابتدائی مدارج ہند کی مختلف اقوام میں اس وقت وہ نظامات اور تمدّنی مدارج موجود ہیں، جن کو متمدّن اقوام مدت سے قطع کر کے اپنی موجودہ حالت پر پہنچی ہیں۔ اس برّ اعظم کی اقوام پر نظر ڈالنے سے ہمیں وہ کُل مدارج ملتے ہیں، جو ہمارے آباؤ اجداد طے کر چکے ہیں۔

نائر ملابار کے نائروں میں بعض ایسی رسمیں موجود ہیں جو یورپ سے بالکل مفقود ہو گئیں، اور جن کا پتہ صرف ہماری کتابوں میں رہ گیا ہے۔ مثلاً ان میں خاندان کا دار و مدار ماں پر ہی جو یورپ میں بھی ابتدائی زمانہ تاریخی میں تھا۔

امیت تاریخی تحقیقات نے، جن کا ذکر ہم نے اپنی دوسری تصنیف میں کیا ہے، اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ جب انسان اپنی وحشی حالت سے نکل کر تمدّن کے میدان میں آیا، تو اس ابتدائی حالتِ معاشرت میں کسی ایک قوم کی کُل عورتیں، کُل مردوں کی مِلک ہوا کرتی تھیں، اور بچے جو اِن سے پیدا ہوتے، وہ بھی کُل قوم کی مِلک تھے۔ اس کے بعد اُمیت یعنی مادری خاندان کی بنا پڑی۔ جس کے رو سے بچّے ماں کی ملک ٹھہرائے گئے، اور ماں کی جائداد کے وارث قرار دئے گئے۔ یہ اُس عام ملکیت کے مقابل میں ایک بہت بڑی ترقی تھی، کیونکہ شخصی ملکیت عمومی ملکیت سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

نائروں کی ہمگوشا ایک فرانسیسی فرانسوا پیرار ستّرھویں صدی عیسوی کی

ابتدا میں ملابار آیا تھا، اور اس نے جو کچھ بیان نائروں کا لکھا ہے، وہ کم و بیش اس وقت تک اُن کی حالت سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ نائر ایک بہادر اور جنگ جو قوم ہے، اور ان میں اُسی قسم کا مردانہ اخلاق ہے، جیسا یورپ میں ازمنۂ متوسطہ میں تھا۔ یہ بالکل نڈر اور غیرت مند قوم ہے۔ انھیں اپنی عزت کا بے انتہا خیال ہے، اور ان میں عورتوں کی حرمت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں نائروں کی ایک بڑی حکومت تھی اور یہ متموّل قوم تھی۔ پیرار لکھتا ہے کہ کیا لیکٹ کا زامورن ہندوستان کے بڑے حکمرانوں میں ہے، اور اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ نائروں کی فوج ہے۔

نائروں کے اوصاف | جسمانی لحاظ سے نائر ایک حسین قوم ہیں۔ ان کا قد بلند، جسم سڈول، ہاتھ پیر خوبصورت، اور رنگ صاف ہے۔ نائر کے لفظ کے معنی مالک کے ہیں، اور یہ فی الواقع ساحل ملابار کے امرا اور حاکم قوم ہیں۔ برہمنوں نے صرف تھوڑے دنوں ان پر حکومت کی، اور انھوں نے بہت جلد اپنے کو آزاد کر لیا۔ اس وقت برہمنوں کی مذہبی حکومت بھی نائروں پر بہت کم ہے۔ یہ ملابار کے برہمن آریہ نہیں ہیں، اور نہ شمال کے آریہ برہمنوں کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ خود نائر جو اپنے کو کھتری کہتے ہیں، ہندوؤں کے نزدیک شودر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی نائر اپنی ہمسایہ اقوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمسایہ تیر کی قوم ہے، جو اصل میں نائروں سے زیادہ خالص ہیں، اور ان کا رنگ بھی زیادہ صاف ہے۔ علاوہ ان کے موپلوں (موپلا) کی قوم ہے، جو عرب ملاحوں کی اولاد اور مسلمان ہیں۔ یہ نہایت بہادر ہیں اور اکثر نائروں سے لڑتے رہتے ہیں۔

خاندان | خاندان کی بنیاد کا اُمیت پر ہونا ایک ایسی رسم ہے، جو اعلیٰ متمدن اقوام سے بالکل مفقود ہو گئی ہے، اور اب بہت ہی کم اقوام میں باقی ہے۔ ہند میں یہ رسم آسام کے کھاسیاں، جن کا ذکر ہو چکا اور ملابار کے نائروں میں پائی جاتی ہے۔ وحشی اقوام میں شادی کوئی چیز نہیں بلکہ قوم کی کل عورتیں کُل مردوں کی مِلک ہیں۔ اُمیت کی رسم اس سے ایک درجہ اوپر ہے اور اس میں ایک عورت کے متعدد شوہر ہوتے ہیں، اور خاندان کی مالک عورت ہوتی ہے۔

شادی | نائروں میں شادی کثرت البعول کے قسم کی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی کی رسمیں اُس وقت قرار دی گئیں، جب برہمن ان پر غالب ہو چکے تھے۔ شروع میں تو ایک عورت کا ایک ہی شوہر ہوتا ہے، لیکن شادی کی مدت محدود ہوتی ہے۔ شوہر اپنی بی بی کے گلے میں ایک ہار ڈال دیتا ہے، اور جب تک عورت اُس ہار کو پہنے رہے، شادی قائم رہتی ہے، تھوڑے دنوں کے بعد پہلا شوہر کچھ دیکر رخصت کر دیا جاتا ہے، اور دوسرے اشخاص اس کی جگہہ لیتے ہیں۔ یعنی عورت تمام قوم کی مِلک نہیں ہوتی، بلکہ صرف چند اشخاص کی: لیکن اس شرط سے کہ وہ خود اُن کو انتخاب کرے، اور اُن سے بچے لے، اور اُن کی تعداد دس بارہ اشخاص سے زیادہ نہ ہو۔ نائر عورت، جو اپنے بھائیوں کے ہمراہ رہتی ہے، پہلی شادی ہونے کے بعد ہی اپنے مختلف شوہروں کو یکے بعد دیگرے بُلا کر گھر میں رکھتی ہے، اور جو شوہر برسرِ کار ہوتا ہے، وہ اپنا چھرا بطور علامت کے دروازہ پر گاڑ دیتا ہے۔ ایسی شادی سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی ماں کے نام سے کہلاتے ہیں، کیونکہ باپ ان کا نا معلوم ہوتا ہے۔

خاندان کی حکومت | نائروں میں خاندان کی حکومت پوری طرح عورت کے ہاتھ میں ہی، اور وہ اس کام میں اپنی بڑی بیٹی سے مدد لیتی ہی - جو مرد ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتے ہیں، اُس کے بھائی اور بیٹے ہیں - بچوں کو جو اپنی ماں اور اُس کے بھائیوں میں پلتے ہیں، ماموں کے ساتھ ویسی ہی محبت ہو جاتی ہی، جیسے دوسری اقوام میں اولاد کو باپ کے ساتھ ہوتی ہی - بھائی بہنوں میں بھی ہمیشہ ساتھ رہنے کی وجہ سے بڑی محبت ہو جاتی ہی، جو ہرگز زن و شو میں نہیں ہو سکتی، کیونکہ شوہر اپنی بی بی کے ساتھ کبھی زیادہ دنوں نہیں رہ سکتا - آسانی سے سمجھ میں آئے گا کہ اس انتظام کے رو سے خاندان میں اوّل درجہ عورت کا ہی، اور اُس کے بعد اُس کے بھائیوں کا - شوہر کا درجہ نہایت کم ہی، کیونکہ اُس کا تعلق عارضی اور چندروزہ ہوتا ہی - عورت ہمیشہ اُسی مرد کو انتخاب کرتی ہی جو مضبوط اور حسین ہو - اُس کو پورا حق اس بات کا ہی کہ جس کو چاہے اپنا شوہر بنائے، بشرطیکہ وہ شخص نیچی ذات کا نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں اُس کی عزت میں فرق آتا ہی - یہ ہنگامی شوہر زیادہ تر برہمن ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کی ذات اعلیٰ ہی - یہ گھر گھر پھرتے ہیں اور اپنی قیمتی نسل کو نذر کر کے قوم کا درجہ بلند کر دیتے ہیں -

مردوں کی آزادی | نائروں میں مردوں کو ویسی ہی آزادی ہی جیسی عورتوں کو، یعنی جس طرح عورتیں کثیرۃ البعول ہیں ویسے ہی مرد کثیر الازواج ہوتے ہیں - البتہ جو اشخاص مفلس ہیں، وہ زیادہ بی بیاں نہیں رکھ سکتے، بلکہ کئی بھائی یا کئی اشخاص ملکر ایک عورت کے شوہر بن جاتے ہیں -

کثرت البعول کی رسم | کثرت البعول کی رسم ہندوستان کے دوسرے خطوں میں پائی جاتی ہی - اقصائے شمال کی طرف تبت میں اور اقصائے جنوب کی طرف مدورا میں یہ رسم موجود ہی - کثرت البعول کی رسم جو ہمیں اس قدر نفرت انگیز معلوم ہوتی ہی، فی الواقع نہایت قدیم رسم ہی، اور مہابھارت میں پانچوں پانڈو جو آپس میں بھائی ہیں ایک ہی عورت سے، جس کا نام دروپدی ہی، اور جس کی آنکھیں کنول کی سی ہیں، شادی کرتے ہیں -

ارث | جب کوئی نائر مرتا ہی، تو اُس کی اولاد وارث نہیں ہوتی، بلکہ اُس کی بہن کی اولاد - مادری جائداد لڑکی اور اُس کی لڑکی کو پہنچتی ہی، جیسا کہ پہلے ٹراونکور کے راج میں ہوا کرتا تھا - بھائی اپنی ماں کی نگرانی میں جائداد کا انتظام کر سکتے ہیں، لیکن قانوناً اُنہیں اُس میں کوئی ملکیت کا حق نہیں ہوتا - ایسا معلوم ہوتا ہی کہ یہ اُمّیتی خاندان نائروں کی طبائع اور حالت سے خاص مناسبت رکھتا ہی کیونکہ اُس ملک میں قدیم سے جاری ہی - اگرچہ مسلمان اور عیسائی اس ساحل پر سالہائے دراز سے بسے ہوئے ہیں، ان کا کوئی اثر اس رسم پر نہیں پڑا ہی -

سیّد علی بلگرامی

قدیم ہندوستان میں فنِ ہوابازی

آجکل جب کہ انگریزی اور اُردو رسالوں اور اخباروں میں سب سے زیادہ دلچسپی کے مضامین وہ سمجھے جاتے ہیں جو ہوابازی، ہوائی پرواز، آلات پرواز، یا ہوائی جہازوں کے متعلق ہوں، یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی قدیم روایات میں جو بوانوں اور اُڑن کھٹولوں کا ذکر آیا ہی وہ کہاں تک درست اور قرینِ قیاس ہو سکتا ہی۔ پُرانے قصّے کہانیاں سُننے اور بعض مذہبی کتب پڑھنے سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہی کہ گو اہلِ مغرب ہوائی پرواز کو ایک جدید انکشاف قرار دیکر اسے سائینس کی ایک عظیم الشان فتح ظاہر کر رہے ہیں، تاہم اہلِ ہند کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی جہالت یا لاعلمی کے باعث ہم آجتک ہوائی پرواز کے ان قدیم قصّوں سے یا تو بالکل بے خبر تھے یا انھیں ناممکن سمجھ کر نظرانداز کر دیا کرتے تھے، لیکن اب جب کہ ہم نمائش الہ آباد کے موقع پر اپنی آنکھوں سے آلات پرواز دیکھ چکے اور کلکتہ، حیدرآباد وغیرہ بعض مقامات میں مشہور ہوابازوں کے کارنامے سُن چکے ہیں، تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہی کہ ہندوؤں کی عظیم الشان تہذیب سے یہ بات کچھ بعید نہ تھی کہ اس میں بوان اور اُڑن کھٹولے تیار کر لئے گئے ہوں۔

فی الحقیقت یہ بات عام طور پر بیان کی جاتی ہی کہ ہندوؤں کے علم الاصنام (Mythology) میں جن دیوتاؤں کا ذکر آتا ہی وہ ضرور کسی نہ کسی قسم کے آلات پرواز (Aeroplanes) استعمال کیا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ مشہور پشپک بوان تھا جسے کُبیر جو دولت کا دیوتا ہی، استعمال کیا کرتا تھا۔ پُرانوں میں ایک خاص صنعت کے ذریعہ جسے انگریزی میں Metonomy کہا جاتا ہی جا بجا اس دیوتا کا ذکر بطور "پشپک" کے آیا ہی۔ بالمیک نے اپنی تصنیف میں اسکا جو ذکر کیا ہی اس کا حوالہ آگے چل کر دیا جائے گا۔ یہاں پر صرف اسیقدر بیان کر دینا کافی معلوم ہوتا ہی کہ اس کا ایک خود بخود حرکت کرنے والی ہوائی گاڑی ہونا ایک یقینی امر ہی۔ اس بات کی کہیں توضیح نہیں کی گئی کہ اس کا نام "پشپک" کیوں تھا گو اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہی کہ یہ لفظ "پُشپ" पुष्प سے مشتق ہی جس کے معنی "پھول" کے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہی کہ کُبیر چونکہ تمام دیوتاؤں میں زیادہ دولت مند تھا، اس لئے اس کی ہوائی گاڑی پھول کی طرح ہلکی اور اس کی خوشبو کی طرح تیز رفتار ہوگی۔ اس عجیب و غریب گاڑی کی نسبت رامائن کے ایک پرب میں جن میں ۵۰۰۰ قبل مسیح سے ۲۰۰۰ قبل مسیح تک کے واقعات کا ذکر ہی، یہ بات مذکور ہی کہ اسے راون نے کسی طریق پر اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اور جب کبھی وہ برہمنوں کو جپ تپ میں مصروف دیکھتا تو اس میں بیٹھ کر اُن کے کاموں میں حارج ہوا کرتا تھا۔ جب رامائن کی مشہور و معروف لڑائی میں راون رام چندر جی کے ہاتھوں قتل ہوا تو یہ ہوائی گاڑی حقوقِ فتح کے مطابق رام چندر جی کے ہاتھ آئی اور وہ اس میں مع سیتا جی اور لکشمن جی و بعض دیگر خدام

دو ہزار برس قبل کی ایک ہندوستانی عورت

انڈین پریس ۔ الہ آباد

سوار ہوکر اجودھیا پہنچے۔

سنسکرت زبان کے مشہور و معروف ناٹک شکنتلا کا مصنف کالیداس اسی واقعہ کو اپنی نظم "رگھوبنس" میں دوہراتا ہی۔ اس نظم کے ۱۹ کانڈوں میں رام چندر جی، ان کے اباو اجداد اور جانشینوں کا تذکرہ ہی۔ ایک اور سنسکرت شاعر بھاروی جو چھٹی صدی عیسوی میں ہو گذرا ہی، اسی قسم کی ہوائی گاڑی کا ذکر اپنی نظم "کراتار جونیہ" میں کرتا ہی جن میں شو اور ارجن کی لڑائی کا ذکر ۱۸ کانڈوں میں کیا گیا ہی۔

انگریزی زبان میں ہوا میں اُڑنے کی کل کے لئے ایک جامع لفظ ایروپلین (Aeroplane) موجود ہی لیکن اُردو میں ابھی تک اس کا مرادف کوئی خاص لفظ قائم نہیں کیا گیا۔ اخبارات میں عام طور پر اس کے لئے آلۂ پرواز، ہوائی گاڑی، ہوا میں اُڑنے کی کل، یا ہوائی جہاز وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے "ہوائی جہاز" غلط اور "ہوا میں اُڑنے کی کل" غیر موزوں ہی۔ کوئی لفظ اگر موزوں کہلا سکتا ہی تو وہ "آلۂ پرواز" ہی ہی۔ لیکن سنسکرت زبان میں اس کے لئے ایک نہایت مناسب لفظ "وِمان" विमान ہی جو ایک سنسکرت ماخذ سے نکلا ہی جس کے معنی "ناپنا" "پھیلنا" اور "مختلف طریقوں پر بنانا" کے ہیں۔ قدیم ترین روایات سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ ایک قسم کی خود بخود حرکت کرنے والی گاڑی ہوتی تھی جس میں بیٹھ کر لوگ ہوا میں سیر کرسکتے تھے۔ پرانوں میں اس قسم کی ایک گاڑی کا ذکر آتا ہی جس کی سات منزلیں تھیں لیکن معلوم ہوتا ہی کہ بعد میں یہ لفظ عام طور پر ایوانِ شاہی کے لئے استعمال ہونے لگ گیا تھا۔ روایات سے پایا جاتا ہی کہ قدیم زمانے میں وِمان مختلف شکلوں کے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ بعض کی شکل محل کی سی ہوتی تھی، بعض کی مکان کی طرح اور بعض ان میں سے گاڑیوں کی وضع کے ہوا کرتے تھے۔ ایک پران میں دھنیشور کا جو ہندوؤں کے چھوٹے درجہ کے دیوتاؤں میں سے ہی، اس طرح پر ذکر آتا ہی کہ وہ اپنے وِمان میں سوار ہوکر آسمان کی سیر کرتا پھر رہا ہی۔ چنانچہ ایک خاص باب میں جس کی سرخی "گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرنا" ہی، اس دیوتا کی سیر و سیاحت کا حال مذکور ہی۔ سنسکرت زبان میں ہوابازی کے متعلق بہت سی اصطلاحات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہی کہ ہوائی پرواز کا فن اس زمانے کے بھارت ورش میں ایک اعلیٰ تکمیل کے درجہ تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض اصطلاحات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) وِمان یاتو विमान यातु ہوائی گاڑی کو چلانا یا اُس میں بیٹھ کر سفر کرنا۔

(۲) وِمان جیریا विमान चरया ہوائی گاڑی میں سیر کرنا۔

(۳) وِمان پربھوت विमान प्रभूत ہوائی گاڑیوں کا جلوس۔

(۴) وِمان ارج विमान चरज ہوائی گاڑی کو چلانے والا۔

وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

لیکن ان اصطلاحات سے اس بات کا پتہ نہیں چل سکتا کہ ہوائی گاڑیوں کی پرواز کس قسم کی ہوا کرتی تھی۔ اس مطلب کے لئے ہمیں بالمیکی رامائن کا مطالعہ کرنا چاہئے جس کے یدہ اور اترکانڈ میں رام چندر جی کی ایسی متعدد پروانوں کا

ذکر آتا ہے، ان سب میں غالباً بہترین کیفیت "پشپک" وِمان کی ہے جس میں رامچندر جی مع اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور ہمراہیوں کے سوار ہو کر اجودھیا پہنچے تھے۔ چنانچہ جب رامچندر جی بھیشن سے جو راون کا بھائی اور جانشین تھا اس بات کا بندوبست کرنے کو کہتے ہیں کہ وہ اجودھیا میں جہاں کا راستہ نہایت بکھیڑا اور دشوار ہے جلد پہنچ جائیں تو بھیشن انھیں "پشپک" وِمان کی یاد دہانی کرواتا ہوا کہتا ہے:۔

"مہاراج میں بہت جلد آپ کو اس شہر میں پہنچا دوں گا۔ پشپک" نامی سورج کی شکل کی گاڑی میرے بھائی کُبیر سے راون نے چھین لی تھی۔ مہاراج وہ عمدہ گاڑی جو ہر جگہ لے جائی جا سکتی ہے، راون کے مرنے کے بعد آپ کی ہو چکی ہے۔ وہ گاڑی لنکا کے آکاش میں بادلوں کے مانند ہے جس میں تمام تفکرات سے بری ہو کر آپ اجودھیا کو پدھار سکتے ہیں۔"

اس کے بعد بھیشن نے رام چندر جی کی پوجا کی اور گاڑی ان کے سامنے لے آیا۔ بالمیکی نے اس موقع کا ذکر حسبِ ذیل الفاظ میں کیا ہے:۔

"اس پر وہ گاڑی وہاں پہنچی۔ اس پر سنہرے نقش و نگار تھے اور جا بجا قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے بالائی کمروں پر سر بسر چاندی چڑھی ہوئی تھی اور اسے سفید جھنڈوں اور جھنڈیوں سے سجایا ہوا تھا۔ اس پر گلٹ کئے ہوئے کنول کے پھول لگے ہوئے تھے اور موتیوں اور جواہرات کی مالائیں لٹک رہی تھیں۔ اس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے نہایت سریلی آوازیں نکلتی تھیں۔ اس میں بڑے بڑے کمرے تھے جنھیں چاندی اور موتیوں سے سجایا ہوا تھا۔ یہ گاڑی ایسی مضبوط بنی ہوئی تھی کہ اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ تھا اور اسے مرضی کے مطابق چلایا جا سکتا تھا۔"

اس قدر تفصیل کے بعد لکھا ہے:۔

"اس پھول کی ایسی خوبصورت گاڑی کو دیکھ کر جو ایک بہت بڑے پربت سے مشابہ تھی، رام چندر جی حیرت میں آ گئے......

اس کے تھوڑے عرصے بعد وہ مع سیتا جی اور لچھمن کے اس خوشنما گاڑی پر سوار ہوئے اور ہنومان اور ان کی سپہ کے بعض جوان جو اجودھیا پہنچنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے وہ بھی اس میں سوار ہو گئے۔"

آگے چل کر بالمیک لکھتا ہے:۔

"اس طرح پر جب سب سوار ہو چکے تو راگھو کا حکم پا کر کُبیر کی وہ خوشنما گاڑی بہت بڑے شور کے ساتھ اوپر کی طرف اُٹھی نہایت خوشنما راج ہنس اس گاڑی کو اُڑا رہے تھے۔ رام چندر جی اس میں سوار ہو کر ایسے خوش ہوئے کہ وہ کُبیر ہی کا سروپ معلوم ہوتے تھے۔"

راستے میں یہ گاڑی مقام کشکندہ پر رُکی۔ معلوم ہوتا ہے یہ شہر زمانۂ حال کے موضع ہمپی کی جگہ جو بیجا نگر کے مشہور کھنڈرات کے قریب واقع ہے آباد ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر سیتا جی کی درخواست پر ہنومان کی فوج کے بعض اور افسر اس گاڑی میں سوار کئے گئے۔ آخر کار یہ گاڑی رام چندر جی کے بھائی بھرت جی کے محل میں جا رُکی جہاں رام چندر جی اور ان کے ہمراہی اس میں سے اُترے۔ اس کے بعد رام چندر جی نے گاڑی سے مخاطب ہو کر کہا "اب تو کُبیر کے پاس چلی جا میں تجھے جانے کی آگیا دیتا ہوں"

اس پر وہ خوشنما گاڑی شمال کی طرف اُڑ کر دولت کے دیوتا کے پاس پہنچی۔ اس گاڑی کو راون کُبیر سے چھین کر لے گیا تھا مگر اب رام چندر جی کی بدولت وہ اسے واپس مل گئی۔

لیکن راماٰئن میں پشپک کا ذکر یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ آگے چل کر ایک موقع پر لکھا ہے:۔

"بعض اوقات دولت کا نیکدل دیوتا (کُبیر) غریبوں کا بھیس بدل کر اپنے والدین کے پاس جایا کرتا تھا۔ اس وقت دیوتا اور گندھرو حمد گاتے اور اپسرائیں اس کی گاڑی کے آگے آگے ناچتی جایا کرتی تھیں اور جس طرح سورج اپنی کرنوں پر تیرتا ہے اس طرح دولت کا دیوتا اس گاڑی میں بیٹھ کر اپنے والدین کے پاس چلا کرتا تھا۔"

معلوم ہوتا ہے یہاں پر اس وقت کا حوالہ دیا گیا ہے جبکہ پشپک گاڑی رام چندر کی بدولت کُبیر کو واپس مل گئی تھی۔

رام چندر جی کو اس کے واپس ملنے کی کسی قدر دلچسپ کیفیت راماٰئن میں دی ہوئی ہے جس میں سے ذیل کے فقرات کا اقتباس کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب رام چندر جی مع اپنے بھائیوں کے بڑے سُکھ چین کے ساتھ اجودھیا میں رہتے تھے انہیں ہوا میں سے ذیل کے شیریں الفاظ سُنائی دیئے۔

"ہے عالی نسب رام آپ خوش ہو کر میری طرف دیکھئے۔ مَیں وہی پشپک ہوں جو اس وقت کُبیر کی جائے رہائش سے آرہی ہوں۔ مہاراج آپ کے حکم کے بموجب مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی مگر انہوں نے مجھے کہا کہ راون کو لڑائی میں قتل کر کے مہاراج رام چندر جی نے تجھ پر قبضہ پا لیا ہے، میں اس بدخلق راون کی موت پر بہت خوش ہوں۔ ہے پشپک رام نے تجھے لنکا سمیت فتح کر لیا ہے۔ پس مَیں تجھے اگیا دیتا ہوں کہ تو واپس انہیں کے پاس چلی جا۔ تمام مقامات پر سیر کرنے کے لئے تو ہی مناسب گاڑی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ رگھو کل رام ہی تجھ پر سوار ہوں۔ پس تو بغیر افسوس کئے اُن کے پاس چلی جا' مہاراج کُبیر کا یہ حکم پاکر میں اب تمہاری خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ آپ بلاخوف وخطر مجھے منظور کیجئے۔ میں تمام دُنیا کی فتوحات سے بالاتر ہوں کُبیر کے حکم کے بموجب میں آپ کی خواہش کے مطابق تمام علاقوں پر سے سفر کر سکوں گی۔"

پشپک کے ان الفاظ کو سُنکر رام نے اسے ان الفاظ میں مخاطب کیا:۔

"اے پشپک تو جو سب گاڑیوں کی سردار ہو اگر صورت حال یہ ہے تو خیر تو آجا۔ چونکہ دولت کے دیوتا نے مجھے اس قسم کا حکم دیا ہے اس لئے مَیں اس سے انحراف نہ کروں گا۔"

یہ کہہ کر رام چندر جی نے خشک دھان، پھولوں اور عنبر سے پشپک کی آرتی اُتاری اور پھر یوں کہنے لگے:۔

"اب تو جا اور جس وقت میں تجھے یاد کروں یہاں آجانا۔ اس وقت ہے پشپک تو ہماری جُدائی سے افسردہ خاطر نہ ہونا۔ اور نہ کہیں جاتے ہوئے راستے میں رُکنا۔"

اس حکم کو پا کر پشپک نے کہا "جو آگیا مہاراج" اور وہ واپس اپنے مقام پر چلی گئی۔

بالمیکی راماٰئن سے اخذ کر کے جو فقرات سطور بالا میں درج کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں اس قسم کی ہوائی گاڑیاں موجود تھیں جنہیں بنانے میں ابتک یورپ والے کامیاب نہیں ہوسکے۔ بالمیک نے جابجا اس گاڑی کو "طلائی پشپک" کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتر کانڈ میں رام چندر جی کے گِدھ اور اُلو کے جھگڑے کو فیصل کرنے کے جس واقعہ کا ذکر ہے اس موقع پر اُنھوں نے اسی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ یہ آخری موقع ہے جہاں اس رزمیہ نظم میں اس گاڑی کا ذکر آتا ہے سوا راماٰئن کے ایک ابتدائی حصے میں مذکور ہے کہ

"اس گاڑی کو برہما کے من سے تیار کیا تھا" اور سطور بالا میں کیفیت قلم بند کی گئی ہے، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ "اسے بڑے خوشنما راج ہنس کھینچا کرتے تھے" مخفی نہ رہے کہ یہی فقرہ کم از کم ایک بار پھر اس گاڑی کے تذکرے کے متعلق رامائن میں آتا ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس گاڑی کو درحقیقت پرندے کھینچتے ہوں، البتہ اس کے یہ معنی لئے جا سکتے ہیں کہ گاڑی کی رفتار اور خوبصورتی راج ہنسوں کے برابر تھی۔ رامچندر جی کی اس گاڑی کے ساتھ گفتگو کا بھی جو ذکر کیا گیا ہے وہ شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

رام کے لنکا سے اجودھیا میں اُڑ کر آنے کا ذکر کالیداس نے بھی اپنی نظم رگھو بنس کے تیرھویں کانڈ میں کیا ہے اور بھاؤ بھوتی اپنے ناٹک "اترام چرتر" میں اس کا ایک موقع پر حوالتاً ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ ایکٹ نمبر ۳ میں ہم رام چندر جی کو یہ کہتے ہوئے پاتے ہیں:۔ ہے گاڑیبان اس جگہ گاڑی کو روکو" مہابھارت میں جابجا آسمانی گاڑیوں کا ذکر آتا ہے جن میں سے ایک وہ بھی تھی جو ورن نے ارجن کو بطور تحفہ کے پیش کی تھی۔ اس گاڑی کی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسمانی ہتھیاروں سے مسلح تھی اور اسے دیوتا یا راکشش مغلوب نہ کر سکتے تھے۔ اس گاڑی کی چکاچوندی کی کوئی شخص تاب نہ لا سکتا تھا اور اسی میں بیٹھ کر سوم نے دیوتاؤں کو مغلوب کیا تھا۔ اس گاڑی میں ایک نہایت خوشنما طلائی جھنڈا لگا ہوا تھا جس پر کئی قسم کے جانوروں کی تصاویر تھیں، لیکن اس کے متعلق چونکہ لکھا ہے کہ کاندھرو دنیا میں سے اسے گھوڑے اُڑا کر لے گئے تھے اس لئے یہ امر مشتبہ ہے آیا وہ پشپک کی طرح ہوائی گاڑی تھی یا نہیں۔ ایک اور ہوائی گاڑی اندر کے قبضہ میں تھی جس پر سوار ہو کر ارجن آکاش پر پہنچا تھا لیکن اس کے متعلق اس جگہ مفصل ذکر کرنے کی گنجائش نہیں۔

سطور بالا میں ہندوستان کی دو مشہور قدیم رزمیہ نظم کی کتابوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ قدیم کے ہندوستان میں فنِ ہوابازی ایک اعلیٰ تکمیل کے درجے تک پہنچ چکا تھا۔ یہ بات کہ جو حوالے اوپر دئے گئے ہیں وہ شاعرانہ مبالغہ سے کہاں تک ملوث ہیں، سوائے عالم الغیب کے اور کسی کو معلوم نہیں۔

تیرتھ رام

ایشیائی شعراء کا کمال

(۱)

ردیف و قافیہ شعر کے دو رکن اعظم ہیں اور انھیں سے نظم شعر کہلانے کا مستحق ہوا ہی اور شاعر کے لئے انھیں کا التزام اہم ہی - عرب - فارس - بھاشا - کے شعرا نے دونوں کے پورا پورا لحاظ رکھنے پر بڑا زور دیا ہی اور کیا طاقت ہی کہ اُن کا قلم ردیف و قافیہ کے مرعی رکھنے میں ڈگمگا جاے - مگر از دو شعراء اس کا لحاظ بہت کم رکھتے ہیں - کیا معنی کہ ردیف جس پر مضمون کا دار و مدار ہی اور جو مضمون کی حرکت کروی کی قطب یا کلی ہی وہی شعر میں اکثر بیکار نظر آتی ہی گویا مضمون کو اُس سے واسطہ ہی نہیں رہتا - یہ عیب نہ صرف نو آموز یا معمولی شعراء کے کلام میں ہی بلکہ بعض نامی گرامی شعراء بھی اس سے بری نہیں - اساتذہ کے ایسے اشعار کسی وقت ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے اور بات یہ ہی کہ جو لوگ حشو کو معیوب نہیں سمجھتے وہ ردیف کو بیکار رکھنے کے زیادہ مرتکب ہوتے ہیں - انھیں لوگوں نے حشو کی دو قسمیں گھڑ لیں ایک حشو قبیح - دوسرا حشو حسن جیسے گناہ کی کوئی شخص دو قسمیں ٹھیرائے ایک گناہ اچھا دوسرا گناہ بُرا - شعر میں حشو و زوائد کا ہونا بدترین عیوب ہی - شعر کی صفت یہ ہی کہ مضبوط اور مربوط ہو - ورنہ نام کو نہ ہو - گھٹا ہوا ہو - ٹھوس ہو - اگر ایک لفظ اُٹھا دیا جاے تو سلسلہ تار و پو و بکھر جاے - تصرف کرنے سے نکتہ چیں کو عاجز کر دے - اسی کا نام سحر حلال - سہل ممتنع ہی - اسی کا نام اعجاز ہی - یہ کمال حضرت نظامی گنجوی میں ہی - خاقانی میں ہی - مولانا عبدالقادر بیدل میں ہی - اور شعراء اُردو میں حضرت غالب دہلوی میں ہی - رحمۃ اللہ علیہ اجمعین اور بھاشا کے شعراء میں تلسی داس جی کا کلام بہت مضبوط ہی، حشو نام کو نہیں، اور شعراء عرب میں متنبی کا کلام بہت چُست ہی - اور کیوں نہ ہو - متنبی کے لغوی معنی ہی شعر میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے کے ہیں - ہم سب کے کلام کا نمونہ مع حل و تنقید پیش کریں گے -

مولانا نظامی گنجوی معراجِ رسول میں فرماتے ہیں -

شبے کاسماں مجلس افروز کرد   شب از روشنی دعوے روز کرد

اس شعر میں لفظ شب دو جگہ آیا ہی مگر حشو نہیں - آسماں کو مجلس افروز کرنے یعنی انجمن انجم کو زینت دینے اور اپنی روشنی سے دن کا دعویٰ کرنے کی فاعل دونوں مصرعوں میں شب ہی ہی - بیشک فن بلاغت و بیان میں مضمر کی جگہ اظہار مظہر فعل فصاحت ہی یعنی مصرع اولیٰ میں لفظ شب ظاہر تھا تو مصرع دوم میں ضمیر لانا مناسب اور کافی تھا جو "کرد" میں ہی - مگر لفظ شب کو مکرر لانے کے سوا چارہ نہ تھا، کیونکہ پہلی شب عام ہی اور دوسری خاص - بلاغت یہ ہی کہ شب تو ہمیشہ آسمان کی مجلس روشن کرتی ہی مگر معراج کی شب میں یہ تخصیص ہی - کہ اس نے اپنی روشنی سے دن بن جانے کا دعویٰ کیا - یہاں اعتراض پڑتا ہی کہ دن کو تو ستارے اور ثوابت چھپ جاتے ہیں پھر آسمان کی مجلس کا روشن کرنا کہاں رہا - جواب یہ ہی کہ شب نے ایسا دعویٰ کیا ہی نہ کہ حقیقتاً وہ دن بن گئی ہی - مراد انتہا درجہ کی روشنی ہی اور بس - اور اگر شب کو مفعول اور آسمان کو فاعل قرار دیا جاے تو مضمر و مظہر کا جھگڑا ہی نہیں رہتا - کیا معنی کہ مصرع اولیٰ میں شب مفعول ہی اور مصرعِ ثانیہ میں فاعل - یعنی آسمان نے جس شب کو اپنا مجلس افروز

بنایا اور اگر افروز کو مخفف افروزی مانا جائے اور شب کو محض ظرف نہ کہ فاعل، تو شب کا دوسرے مصرع میں مکرر لانا ضروری ہو جاتا ہی۔ یعنی جس شب آسمان نے مجلس افروزی کی تو شب نے دن ہو جانے کا دعویٰ کیا۔ ورنہ مولانا نظامی یوں فرما سکتے تھے ؎

زروشنگری دعویٔ روز کرد

آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

زمعراج او در شبِ ترکتاز　　معرّج گران فلک طراز

معراج و معرّج میں تجنیس ہی۔ معراج آلۂ عروج (چڑھنے کا زینہ) تعریج کپڑے کو مع بیل بوٹے کے بُننا۔ معرّج گرا گرچہ موٹا لفظ ہی مگر قوام میں ٹھکا ہوا ہی۔ مراد سیارے ہیں جو آسمان پر اپنی گردش سے بوٹے بُن رہے ہیں۔ رسول صلعم کی معراج سے اُن کو زینت دے دی بہت بلند اور بلیغ مضمون ہی۔

خاقانی ایک مدحیہ قصیدے کی تشبیب میں ساقی کو مخاطب کر کے کہتا ہی ؎

برق توئی و بید من سوختۂ توام کنوں　　سوختہ بید خواہ اگر راوق عید پروری

حل اے ساقی تو برق ہی اور میں تیرا بید سوختہ ہوں یعنی تو نے مجھے بید کی لکڑی کی طرح جلا کر کوئلا کر دیا ہی اور یہ قاعدہ ہی کہ بید کے کوئلے سے شراب صاف کرتے ہیں پس تو اگر عید کے لئے راوق (شراب مصفّٰی) تیار کرنا چاہتا ہی تو مجھے کام میں لا ؎

بر عنب و دُم خورہ تیز رکاب بادہ دہ　　چوں دُمش از مطوقی چوں عنبش ز احمری

لغت عنب۔ پختہ انگور۔ خورہ مخفف خروس مراد صراحی ہی جو اکثر خروس کی شکل ہوتی ہی۔ مطوقی۔ خمدار ہونا۔ دُمش میں ضمیر شین خورہ کی جانب ہی اور عنبش میں بادہ کی جانب۔ رکاب بڑی طشتری جسے رکابی کہتے ہیں۔

حل اے ساقی انگور اور دُم خروس کے انداز پر اُٹھ اور شراب کی قاب دے جیسی خروس کی دُم جُھکی ہوئی ہوتی ہی اور جیسا انگور سُرخ ہوتا ہی یعنی رندوں کو جھک جُھک کر شراب دے۔ سُرخ انگور کی طرح تیرا حُسن بھی لعلگوں ہی اس قدر سنجیدہ ہی جسے مجدد کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک لفظ بھی حشو نہیں ٹھوس کلام ہی۔

پھر خورہ (صراحی) اور عنب (شراب) کے انداز کی توضیح کرتا ہی ؎

رقص کناں نگر خورہ لعل عنب چو روے تو　　طوق کشاں سر دُمش چوں خطت از معنبری

حل صراحی رقص کر رہی ہی۔ سُرخ شراب تیرے چہرے کے مانند ہی۔ صراحی کی دُم خمدار ہی جیسا تیرا خط سیاہ۔ محفل میں اکثر حسین امرد لڑکے رقص کرتے ہیں اور وہی ساقی بنکر شراب پلاتے ہیں کیونکہ سبزۂ خط تو امردوں ہی کے چہرے پر ہوتا ہی نہ کہ رقاصہ عورتوں کے چہرے پر ؎

منتظری کہ از فلک خوانچۂ زر برآیدت　　خوانچہ کن چغانہ کش خوانچۂ زر چہ می بری

حل۔ اے ساقی تو شاید منتظر ہی کہ آسمان سے تیرے لئے خوانچۂ زر (آفتاب) نکلے اُس وقت تو رندوں کو صبوحی پلائے۔ خوانچہ بنا۔ پیالہ نکال۔ خوانچۂ زر کا کیا انتظار کرتا ہی۔ یعنی طلوع آفتاب سے پہلے صبوحی دے۔ ذیل کے شعر میں تجنیس ملاحظہ ہو ؎

کردہ چرخ جو بجو دیدہ و آزمودۂ　　کردہ بجور جوز پشت ہم بجوال اُو دری

لغت جوال۔ باگ ڈور یا رسّی جو گھوڑے اور بیل وغیرہ کے لگی ہو جس سے وہ مطیع رہے۔ جوز پشت۔ زخمی۔ اب ملاحظہ ہو کہ اس شعر میں لفظ (جو) پانچ جگہ جُدا جُدا معنی میں آیا ہی۔

حل آسمان کا کیا ہوا تمام و کمال تو نے دیکھا اور آزمایا ہی اُس نے ظلم سے تیرے پشت کو جوز (اخروٹ) کی طرح زخمی یا دوپارہ کر دیا ہی۔ کیونکہ جوز کی پشت ایسی ہی ہوتی ہی۔ ہموار نہیں ہوتی۔ کھُردری ہوتی ہی اور دو پارہ۔ پھر بھی تو آسمان کی رسّی میں

بندھا ہوا۔ طرح طرح کی تکلیفیں سہہ رہا ہے اس سے کل۔ مولانا عبدالقادر بیدل فرماتے ہیں۔ ؎

چمنے است عالمِ بے بری طرب شکاری عافیت ۔۔۔ چو چنار دوز کفِ تہی ہمہ بہلہ بر کمر آفریں

بھلا ہندوستان بلکہ خود ملک فارس میں کوئی ہمہ داں عالم و فاضل اس شعر کے صحیح معنی سمجھ سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ اگر کسی کو دعویٰ ہو تو سامنے آئے اور بیدل کے دوسرے اشعار کے معنی بتائے۔

لغت بہلہ۔ چمڑے کا دستانہ جس کو ہاتھوں میں چڑھا کر شکاری لوگ جانور پکڑتے ہیں۔ تاکہ وہ چونچوں اور پنجوں سے ہاتھوں کو زخمی نہ کردیں۔

حل۔ عالم بے بری (دُنیا) ایک چمن ہے یہاں طرب حقیقی جو آسائش سے حاصل ہو شکار ہوتی ہے۔ اے مخاطب اگر تجھے شکار کی ہوس ہے تو چنار کی طرح اس چمن میں جا اور دستانہ جس کو تو ہاتھ میں پہنتا، اب اس کو کمر پہ پیدا کر۔ یعنی اس کا پہننا فضول ہے۔ کیونکہ شکار تو رہا ہی نہیں اور یہ چمن بے بری کا عالم ہے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ قاعدہ ہے کہ پنجہ چنار بالکل خالی ہوتا ہے اُسے پھول پھل نہیں لگتے۔ چنار سے مراد کٹھل کا درخت ہے جو چنار ہی کی قسم سے ہے۔ اُس کی جڑ یا تنے میں دس دس اور بیس بیس سیر اور بسا اوقات من من بھر کے کٹھل لگتے ہیں مشکیں جیسی لٹکتی ہوئی ہم نے خود دیکھی ہیں پس کٹھل اُس کی کمر پر گویا بہلہ ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ تو کیسی ہی کوشش کرے مگر دُنیا میں عافیت حقیقی (شانتی یا قوت مطمئنہ) نہیں مل سکتی یہ ذرا سی بات حضرت بیدل نے اس تفنن سے ادا کی ہے کہ سمجھانے سے بھی ذہین و فطین نازک فہم ناظرین ہی سمجھیں گے۔ معمولی فہم والوں کے لئے سمجھنا مشکل ہے، اب تو صاف اور سریع الفہم کلام کی تعریف ہے، گویا شعرائے متقدمین کی جگر کاویاں اور نزاکت آفرینیاں فضول ہیں۔ ایک شعر اور ملاحظہ ہو۔ ؎

سرو برگِ راحت ایں چمن بخیال ما نکند وطن ۔۔۔ چو غبار نزدہ گو فلک سر ما بزیر پر آفریں

حل۔ اس چمن (دنیا کی) راحت کا سامان ہمارے خیال میں بھی جاگزیں نہیں ہوتا۔ اگرچہ آسمان کو طاقت ہے کہ ہماری نیچرل ساخت اور جسمانی قطع وضع کو اس اسلوب سے پیدا کرے کہ ہمارا سر پروں کے نیچے ہو اور ہم بھیگے ہوئے غبار کی طرح آرام سے پڑے رہیں مگر ہم تو آسائش کے طالب ہی نہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ جانور آرام یا بسیرا لیتے وقت سروں کو پروں کے نیچے دے لیتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ اب حضرت غالب مرحوم کا کلام لیجئے۔ آپ کا فارسی کلام بالکل صاف ہے، مگر اُردو میں حضرت بیدل کا تتبع کیا ہے۔ اور اشعار میں اکثر بیدل ہی کے رنگ کی جھلک ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہجومِ نالہ حسرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے ۔۔۔ خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

حل۔ نالے ہجوم کرکے آرہے ہیں مگر ایک چیخ بھی پیش نہیں کرسکتے اُن کی حسرت عاجز ہے۔ اُدھر خموشی جب دیکھتی ہے کہ نالے کرنے کو بانسلیوں کے سوپر اُگے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی خس بدنداں (عاجز) ہے کہ میں کیونکر خاموش رہ سکوں گی۔ یعنی نالے اور خاموشی، دونوں کشمکش میں ہیں۔ نہ چیخنے بن پڑتی ہے نہ خاموش رہتے۔ ریشہ نیستاں کے ساتھ خس بدنداں کیا خوب ہے ایک مطلع ملاحظہ ہو۔ ؎

شب جو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا ۔۔۔ رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

حل۔ شب وہ معشوق جو ناموس عشق کی خلوت کا مجلس افروز تھا (خلوت بھی اور مجلس یعنی جلوت بھی۔ ناظرین یہ نزاکت سمجھیں) تو شمع کا ہر رشتہ (وہ دھاگے جن سے شمع کی بتی بنتی ہے) لباس فانوس کے لئے کانٹا ہو رہا تھا یعنی باوصف اس کے کہ خلوت ناموس تھی کوئی غیر موجود نہ تھا پھر بھی فانوس کے لباس کے لئے ہر شمع کا رشتہ کانٹا بنا ہوا تھا۔ یعنی فانوس رشک کر رہا تھا کہ یہ شمع

(باوصف خلوت میں ہونے کے) عُریاں کیوں ہی۔ میرا لباس پھٹ جائے تاکہ میں اُسے چھپالوں۔ اللہ اکبر کتنی نزاکت ہی۔ حضرت غالبؔ نے (رشتۂ ہر شمع) فرمایا ہی، حالانکہ فانوس ایک تھا اور شمع بھی ایک پس یقیناً یہ مراد ہی۔ ؎

شمع کا ہر رشتہ خارِ کسوتِ فانوس تھا

اب عرب کے نامی گرامی شاعر متنبی کا بلیغ کلام لیجئے اپنے ممدوح سیف الدولہ کی سخاوت کی مدح میں ایک قطعہ لکھتا ہی۔ ؎

یا ایہا المھدے علیہ روحہ — اذ لیس یاتیہ لہا استجداءُ

احمد عفاتک لا فجعت بفقدہم — فلترک مالم یاخذوا اعطاءُ

حل۔ اے وہ شخص (ممدوح) جس کی روح بھی ہدیہ دی گئی ہی یعنی جس نے اپنی جان بھی سائلین کو ہدیتہً دے دی ہی (ہبہ کردی ہی) اس لئے کہ سوال کی طلب نہیں آتی یعنی تیری روح کے لئے کوئی سائل نہیں آتا ورنہ تو ضرور دے دیتا۔ تو اپنے سائلین کا شکریہ ادا کر کہ وہ زندہ رہیں اور تو اُن کے گُم ہو جانے پر خُدا کرے دردناک نہ ہو کیونکہ تیری روح اُن کے پاس ہی اور وہ زندہ رہیں گے تو تو بھی زندہ رہے گا۔ تیری جان جو اُن کی ملکیت ہو گئی ہی اُنھوں نے تیرے پاس چھوڑ رکھی ہی اور یہ قاعدہ ہی کہ جو شخص کوئی شی کسی کے پاس چھوڑ دے اور نہ لے وہ بمنزلہ عطا کے ہی۔ پس سائلین کا شکریہ ادا کر کہ وہ تیرے معطی اور منعم ہیں۔ صرف اتنی بات کہ تو مال، جان کے دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا کس خوبی سے ادا کیا ہی۔ اسی قصیدے میں لکھتا ہی۔ ؎

واذا مطرت فلا لانک مجدبٌ — تُسقی الخصیب و تمطر الدأماءَ

لغت مجدب جدب سے ماخوذ ہی قحط یا خشک سالی پیدا کرنے والا خصیب سبزہ زار والی زمین دأماء دریا۔

حل۔ تیرے ملک کو بارش کی ضرورت نہیں اور اگر تو کبھی بارش دیا جاتا ہی یعنی تیرے ملک میں مینہ برستا ہی تو اس لئے نہیں کہ تو خشک سالی پیدا کرتا ہی، آخر بارش جب ہوتی ہی سبزہ زار اور دریا دونوں ہی پر یکساں ہو جاتی ہی مگر دریا کو بارش کی کیا ضرورت ہی۔ ؎

واذا مُدحت فلا لتکسب رفعۃً — للشاکرین علے الالٰہ ثناءُ

حل اور جب تو مدح کیا جاتا ہی تو اس لئے نہیں کہ اُس سے تو بلندی حاصل کرے آخر شاکر لوگ رات دن خدا کی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ خدا کو کسی کی تعریف کی پروا نہیں نہ اُس کو تعریف سے کوئی رفعت ملتی ہی، بلکہ شاکر کا کام ہی شکر کرنا ہی۔ کیا کیا پاکیزہ توجیہات ہیں۔ سبحان اللہ۔

بھاشا میں مہاراج تلسی داس جی کی کتاب رامائن عجیب و غریب نظم ہی جو بے بہا جواہرات سے مرصع ہی بالکل نیچرل اور سوشیل ہی، ایک شعر بھی ایسا نہیں جس سے اخلاقی نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ پھر رنگ آمیزی ایسی دلکش اور شیریں ہی کہ غلو اور خلاف فطرت مبالغہ بالکل نہیں۔ الفاظ قلیل اور معانی کثیر۔ سچی روی اور سچا قافیہ۔ ٹھکا ہوا کلام۔ حشو و زوائد سے پاک۔

جب شری رام چندر جی بالی کو مار کر اور سگریو کو راج دیکر پرورشن پہاڑ پر رونق افروز ہوئے تو آپ کے چرنوں کے پرتاب سے وہاں بہار آگئی۔ بارش ہونے لگی تلسی داس جی اُس کا نیچرل سین کس دلکش اسلوب سے حسب ذیل دکھاتے ہیں۔ ؎

سُندر بن کُسومت ترو شوبھا — گنجت چنچریک مدھ لوبھا

حل۔ خوبصورت بن۔ خوشبو دینے والا۔ رونق دار۔ بھونرے شہد کے لالچ سے چار طرف گونج رہے ہیں۔ شوبھا اور لوبھا کتنے سچے قافئے ہیں۔

دیکھ منوہر شیل انوپا — رہے تہاں اُنج سہت سُر بھوپا

حل پرورشن پہاڑ کو عمدہ اور لاثانی دیکھکر رام چندر جی

اپنے بھائی رام لچھمن سمیت وہاں براج مان ہوئے۔

کندمول پھل پتر سُہائے بھے بہت جب تین پربھو آئے

حل۔ جب سے رام چندر جی براجے کندمول (وہ پھل جو زمین کے اندر اندر پیدا ہوتے ہیں) اور پھل اور پتے بافراط ہو گئے۔

مدھوکر کھگ مرگ تن دھر دیوا کریں سدھ مُن پربھو کی سیوا

حل۔ تمام دیوتا رشی اور مُنی، بھونروں اور ہرنوں وغیرہ کے روپ میں آکر بھگوان کی سیوا کرنے لگے۔" دیوتاؤں نے اپنے شریر اس خوف سے بدلے کہ کہیں راوں کو خبر نہ ہو جائے۔

منگل روپ بھئے بن تب تیں کینہ نواس رما پت جب تیں

حل۔ جب سے رامچندر جی نے وہاں قیام کیا پہاڑ کا بن منگل کا داتا بن گیا۔

برکھا کال میگھ نبھ چھائے گرجت لاگت پرم سُہائے

حل۔ برسات کے دن آگئے۔ بادل گرجتے ہوئے کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ رامچندر جی اپنے بھائی لچھمن جی سے کتھا کہتے ہوئے فرماتے ہیں۔ دوہا

لچھمن دیکھو مورگن ناچت بارو پیکھ گرہی برت رت ہرکھ جس بشن بھگت کنہ دیکھ

لچھمن دیکھو توموروں کے جھنڈ بادلوں کو دیکھ کر کیسے آنند ہو کر ناچتے ہیں جیسے کوئی گرہست جو بھگت کو پسند کرتا ہو رام بھگتوں (عارفوں) کو دیکھکر خوش ہوتا ہو۔

گھن گھمنڈ نبھ گرجت گھورا پریا ہین ڈرپت من مورا

حل۔ بادل آسمان میں اُمنڈ اُمنڈ کر گرج رہے ہیں اور میرا جی پریا (جانکی جی) کی جُدائی میں تڑپتا ہی۔ یہاں رامچندر جی نے اپنی عصمت کی دیوی بی بی کی محبت کا اظہار کیا ہی۔

دامن دمک رہی گھن ماہیں کھل کی پریت یتھا تھر ناہیں

حل۔ بجلی بادلوں میں چمک چمک کر رہ جاتی ہی جیسے دشمنوں کی محبت کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا۔

برکھیں جلد بھوم نیرائی یتھا نویں بدھ ودیا پائی

حل۔ بادل زمین کے گرد آ آکر ایسے برستے ہیں (فروتنی کرتے ہیں) جیسے عاقل لوگ علم حاصل کرکے اور بھی منکسر المزاج ہو جاتے ہیں۔

چھدر ندی بھری چلی اُترائی جس تھوڑے دھن کھل بورائی

حل۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں بھر بھر اور آپے سے باہر ہو کر یوں اُچھل اُچھل کر چل رہی ہیں جیسے کوئی بیوقوف اچھا آدمی تھوڑا روپیہ پاکر اُچھلنے کودنے لگتا ہی۔ کیونکہ ندیوں کا پانی ادھر اُدھر سے آیا ہوا ہی ان کا اپنا ذاتی نہیں۔

دیکھئے کوئی تشبیہ ایسی نہیں جو سوشیل رزلٹ سے خالی ہو۔ سچی شاعری اسے کہتے ہیں۔

احمد حسن شوکت

علامۂ شبلی نعمانی

علامۂ شبلی دَورِ جدید کے بہترین و زندہ حکماءِ اسلام میں سے ہیں۔ اس پُرآشوب و قحط الرجال زمانہ میں اب یہی ایک ذات ہندوستان میں باقی رہ گئی ہی جو باقیات الصالحات اور سارے ہند کے لئے باعث افتخار ہی۔ خُدا ان کو عمر صد سالہ بخشے اور ان کے فیوضِ علمی سے ہند کو روشن و منوّر کرے، اور جن تجاویز عالیہ کی تکمیل میں وہ منہمک ہیں اُن کے پھلوں کو دیکھنا انھیں اپنی زندگی میں نصیب ہو! آمین!

سالِ گذشتہ مَیں جب شملہ پر میں ایک نہایت ہی تجربہ کار و وسیع المعلومات جرمن مستشرق کے ساتھ جو ہندوستان میں قریباً چالیس سال سے علمی کاروبار میں مشغول ہیں ملا، اور ہندوستان کے علما و مصنّفین کا ذکر آیا تو صاحب موصوف نے فرمایا کہ

"علما و مصنفینِ ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہی، اوّل مادۂ تحقیق و تدقیق دوم جانچ پڑتال۔ سوم جدّت۔ چہارم مضبوطیِ رایے و استدلال۔ علماء و مصنفین ہند کا متخیلہ تو بیشک زیادہ قوی ہی لیکن ان میں مبالغہ کی عادت ہی۔ ان کے تاریخی حکایات اور جنگی افسانے مبالغہ و متضاد خیالوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بخلاف اسکے اہل مغرب کے دماغ منطقی استدلال اور درست الفاظ استعمال کرنے کی عادی ہیں۔ اہل مغرب کے محققانہ و عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی دیسی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔ گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوتی ہیں"۔

واقعی یہ رایے نہایت منصفانہ و باوقعت ہی جن صاحبوں نے علامۂ ممدوح کی بیش بہا تصانیف مثل تاریخ علم کلام۔ الفاروق۔ الغزالی۔ شعر العجم۔ موازنۂ انیس و دبیر و مجموعہ رسائل شبلی وغیرہ کا مطالعہ کیا ہی وہ جانتے ہیں کہ اُردو زبان میں یہ تصانیف بلحاظ عالمانہ و محققانہ و فلسفیانہ استدلال و انداز کے کسی مستند یوروپی تصنیف سے کم نہیں ہیں۔ علامۂ ممدوح کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق و مضبوطی رایے و منطقیانہ استدلال ہی۔ ان میں ایک قسم کی اُرجنالٹی، یعنی جدّت بھی ہی، اور طرز ادا میں دل آویزی و عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہی۔ عالمانہ تحقیق و جانچ پڑتال و جدّت متقدمین ائمہ و مجتہدین کی تصانیف کے بعد اب بہت کم نظر آتی ہی۔ قریباً سات سو سال سے مسلمانوں میں سے جدّت و اختراع کا مادّہ زائل ہو گیا ہی۔ اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک کورانہ تقلید کے کنوئیں کے مینڈک یا لکیر کے فقیر ہو رہے ہیں۔ کس قدر افسوس ہی کہ اصولِ ارتقاء عقل کے یہ لوگ منکر ہو رہے ہیں اور ذرا سی بھی جدّت و جودت کو بدعت و کفر سمجھتے ہیں۔ وہ تھوڑا سا زمانہ جس میں صرف قرآن اور عقل کا دور دورہ رہا اب تک اسلام میں طلائی دَور سمجھا جاتا ہی۔ اسی آزادی کے دَور میں ایسے ایسے علما و ائمہ و مجتہدین پیدا ہوئے جن کا اجتہاد آج بطور قطعی کے مانا جاتا ہی۔ حالانکہ آج بھی ویسے ہی، اور شاید ان سے افضل علما و مجتہدین پیدا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ قانون ارتقاء عقل کو مان لیا جائے اور اسپر عملدرآمد ہو۔ یورپ میں جہاں اس اصول کو مان لیا ہی، اور عقولِ انسانی کے نشو و نما میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں، آج بھی

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے مصداق علما وفضلا پیدا ہو رہے ہیں۔ اسلام کی سب سے بڑی پولٹیکل مصیبت تو اس روز پیدا ہوئی جب کہ جمہوری حکومت کی جگہ شخصی حکومت نے غصب کر لی اور اسلام کے پولٹیکل نظام کو بدل ڈالا۔ اس کے بعد جیوں جیوں بادشاہانِ اسلام قوی و خود مختار ہوتے گئے، انھوں نے اور بھی عقولِ انسانی کے ارتقا میں مزاحمتیں محض اپنی ذاتی اغراض کے لئے پیدا کرنی شروع کیں۔ علما کو بھی دولت و جاہ و حشم کی تزویر میں پھنسا کر اپنا طرفدار بنایا، اور علما نے عوام کو اپنی گرفت میں لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں حرّیت کا مادّہ رفتہ رفتہ سلب ہو گیا۔ عقلی ضعف بھی آ گیا۔ قوت ارادی پست ہو گئی۔ تقلید کے پھندوں میں جکڑ گئے۔ لکیر کے فقیر بن گئے۔ ظالم سے ظالم و فاسق سے فاسق بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ عوام کی نظر میں وہی بادشاہ و خلیفہ سب سے زیادہ مقبول ٹھہرا جو تمام حرّیت کا دبانے والا، اور شخصی و نوعی آزادی میں خلل انداز ہو۔ گو ظاہر میں مذہبی جامہ پہنے ہو۔ آج دنیائے اسلام تقلید و لفظی جھگڑوں میں ایسی جکڑی ہوئی ہے کہ نجات مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جابجا معدودے چند نفوس قدسی ایسے پیدا ہو چلے ہیں جو اس غلامی و ذلت اور اس کے اسباب کو محسوس کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو روحانی و عقلی نجات دلائیں جو پولٹیکل آزادی کے ابتدائی زینے ہیں۔ علامۂ مفتی عبدہ مصر میں اسی خیال کے تھے اور علامۂ شبلی ہند میں ایک ایسا بڑا کام کر رہے ہیں جس کی اہمیت کا اندازہ مسلمانانِ ہند کو ۲۵ سال کے بعد معلوم ہو گا۔ کوئی شک نہیں کہ اگر علامۂ شبلی اوائل اسلام کے زمانہ میں ہوتے تو آج وہ امام و مجتہدِ وقت مانے جاتے۔ کیونکہ ان میں اکثر ان خصوصیتوں کی جھلک پائی جاتی ہے، جو اوائلِ اسلام کے ائمّہ و مجتہدین میں پائی جاتی تھی۔ عالمانہ عبور۔ غور و خوض کی قوت۔ تحقیق و تدقیق و علمی جانچ پرتال کی عادت۔ اپنی طبیعت سے کسی بات کا پیدا کرنا۔ پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں و خارستانوں سے نکال کر و سلجھا کر تقسیم و تحلیل کرنا اور پھر اُسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔ یہ وہ صفتیں ہیں جو علامۂ ممدوح کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔ اسی کے ساتھ علامۂ ممدوح میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ فہمی و دُور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔ ایسے علما تو آجکل بہت ملتے ہیں جن کی شان میں سورۂ جمعہ کی یہ آیت بالکل صادق آتی ہے کہ وہ گدھے ہیں جن پر کتابوں کا بوجھ لدا ہے۔ "چارپائے بر و کتابے چند"۔ یعنی علم کے ساتھ نہ عقل ہے نہ تحقیق و معاملہ فہمی و دُور اندیشی۔

علامۂ شبلی کی زندگی اس قابل ہے کہ دیگر علماء ہند اُس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کی تعلیم و تربیت بھی مثل دیگر علما کے اُسی قدیم اصول و طرز پر ہوئی تھی جو ہندوستان کے پرانے عربی مدرسوں میں آج تک رائج ہے۔ لیکن آپ نے اپنی محققانہ طبیعت و جودت سے برابر کام لیا اور لکیر کے فقیر نہ بن بیٹھے کہ صرف 'قَالَ قَالَ' کا درس دیتے اور 'اَقُول' کے لفظ پر فی الفور کفر و الحاد کے فتوے صادر فرماتے 'هذا وهابیٌّ وهذا بدعتیٌّ'، پر اخوت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کرتے۔ علامۂ شبلی نے علوم اسلامی سے فراغت پا کے یونانی خیالات و جدید یوروپی علمی تحقیقات و انکشافات پر بھی نظر ڈالی۔ ان کا موازنہ کیا۔ آپ نے لفظی سطح سے مغز قرآن پر غور و خوض کیا۔

اصول ارتقاء عقل پر ایمان لائے - جوہر عقل کی فضیلت کو تسلیم کیا، اور اسی کے ساتھ اُس کو بر امن الخطا بھی نہیں سمجھا، کیونکہ اگر ایسا سمجھتے تو ایک طرف تو مقلد ہونا پڑتا اور دوسری طرف انانیت پیدا ہو جاتی - علامۂ ممدوح نے اس معاملہ میں وہی طریقۂ اعتدال اختیار کیا جو ائمہ سلف کا خاصہ تھا -

علامۂ ممدوح کے اشغال علمی و بیش بہا تصانیف پر اگر سرسری ریویو بھی کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ ایک بڑا دفتر بن جائے - ہم اپنے ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ علامۂ ممدوح کی کل عالمانہ تصانیف و رسائل و مضامین و غزلیات کا مطالعہ کریں - ان کے مطالعہ سے دنیاء اسلام کی وسعت و عظمت و خوبیوں و ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے - طلبا اگر انہیں پڑھیں تو اعلےٰ درجہ کے ادیب بن جائیں - علما پڑھیں تو ان میں محققانہ مذاق پیدا ہو جائے - غیر اقوام پر ان کے مطالعہ سے اسلام کی حقیقی عظمت و خوبیاں منکشف ہوں - یہ کتابیں سہل پسندی - عام فہمی و دلآویزی و ارزانی میں بھی اپنی آپ نظیر ہیں -

جن لوگوں کو علامۂ ممدوح سے نیاز حاصل ہے وہ ان کی اسلامی سادگی و خلوص سے نہایت متاثر ہوتے ہیں تبحّر علمی پر - یہ سادگی و اخلاص سونے پر سُہاگا ہے - اور علم و سادگی و خلوص و اسلام کا ورد آپ کے کل خاندان کا شرف ہے - چنانچہ آپ کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب عربک پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی میں بھی یہی اوصاف پائے جاتے ہیں، اور اسلام کا گہرا عشق اس پر مستزاد ہے -

علامۂ شبلی کا مذاق مختلف پہلو رکھتا ہے - ایک طرف تو آپ کا مذاق سخت فلسفیانہ و محققانہ پہلو لئے ہوئے ہے اور واقعات تاریخی میں کسی قسم کی رنگ آمیزی آپ کو پسند نہیں - دوسری طرف آپ بے حد نیچر پرست واقع ہوئے ہیں - آپ کی فارسی غزلیات سے جذبات لطیفہ درد و عشق و حُسن و جمال کا پتہ چلتا ہے - یہ عجیب بات ہے کہ دُنیا میں جتنے انبیا و مشاہیر و حُکما گذرے ہیں اُن میں نیچر پرستی بے حد رہی ہے - کائنات کے حُسن و خوبیوں میں اُنھیں سب سے زیادہ مزہ ملتا ہے - اس وقت ہم کو ان کی ایک غزل کے چند مصرعے اتفاق سے یاد آگئے جو نقل کئے جاتے ہیں -

ہر جا کہ روے روشن تو جلوہ ساز بود ہر ذرّہ را نظر بہ جمال تو باز بود
ہر جا حدیثِ فتنۂ ایام کردہ ایم روے سخن بآں نگہہ فتنہ ساز بود
جانا! زبان و لب نشود ترجمانِ دل مارا امید ہا زنگہ ہاے راز بود
ان شوخ را بہ صومعہ ہا چوں گذر فتاد یکبارہ عشق ہائے حقیقی مجاز بود
تا چرخ سفلہ صحبتِ آں شوخ در گرفت کو فتنہ دوست بودہ و ایں فتنہ ساز بود

غگیں مباش گر سخن از مدعا رفت
شبلی ہنوز اوّلِ راز و نیاز بود

اشغال علمی و تصانیف کے ساتھ ساتھ علامۂ ممدوح نے مختلف قومی خدمات انجام دی ہیں - مثلاً آپ انجمن ترقی اُردو کے اوّلین مربیوں میں سے ہیں - زبان اُردو کو آپ سے بہت کچھ مالامال کیا ہے - جب آپ حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون تھے تو ایک نیا علمی دور حیدر آباد میں چمک اُٹھا تھا - آپ ایک مشرقی یونیورسٹی کا نظام بھی بنا چکے تھے - صرف حضور نظام کی منظوری کی دیر تھی -

اب علامۂ ممدوح ایک ایسے بڑے کام میں مشغول ہیں کہ اگر وہ مکمل ہو گیا تو سمجھ لینا چاہئے کہ مشرق میں ایک نیا دور

مسلمانوں پر طلوع ہوگا۔ اگر الندوہ فی الحقیقت کامیاب ہوگیا یعنی ہندوستان کے شیعہ و سُنّی و وہابی و حنفی وغیرہ علما درحقیقت اسلام کی عمارت بنانے میں متفق ہوگئے اور ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائی تو ہندوستان و مشرق میں مسلمان قوم کا ایک زندہ تاج محل بن جانا کچھ مشکل نہیں۔

دارالعلوم ندوہ ہی ایک ایسا انسٹی ٹیوشن مسلمانوں کا ہے۔ جس پر ٹھیٹھ اسلامی ہونے کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ ہند کا الأزہر بن جائے اور اس سے ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو ایک طرف تو اندر سے مسلمانوں کی کایا پلٹ کردے اور دوسری طرف ہندوستان و مشرق میں یدخلون فی دین اللہ افواجا، کے جھنڈے گاڑے! خدا علامۂ ممدوح کو کم از کم ۲۵ سال اور زندہ رکھے اور چشم حاسداں سے بچائے!

جان ملکم

ہندوؤں کے مذہب پر ایک عام فلسفیانہ نظر

توحید پر اسی رسالہ میں جو مضمون اس سے پہلے شائع ہوا ہے اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندو دراصل کسی نہ کسی شکل میں وحدانیت کے قائل ہیں۔ اس پر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندوؤں کے عقیدے میں ایک ہی خدا سچ ہے اور ذات ہے تو سوائے اس کے کوئی دوسری ذات نہیں ہے تو پھر یہ کیسے ہے کہ ہندوؤں کا مذہب اس قدر بوقلموں اور رنگ برنگ نظر آرہا ہے۔ کوئی شاکت ہے کوئی وشنو वैष्णव اور کوئی شیو शैव اور کوئی کچھ اور۔ کوئی کھڑا تلک لگاتا ہے اور کوئی آڑا اور کوئی اپنا سارا ماتھا رنگ لیتا ہے۔ غرض جہاں دیکھو وہاں جدا رنگ نظر آتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر مانیر ولیمس (Monier Williams) نے بھی اپنی ایک کتاب میں اس مذہب کی نسبت حسب ذیل لکھا ہے :-

" ہندوؤں کا مذہب ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد ایک اصلی اور سادہ مسئلہ وحدت الوجود پر قائم ہے مگر جس میں سے انواع و اقسام کے بے شمار توہمات اور عقائد کی شاخیں پھوٹیں ہیں جس طرح بڑ کے درخت کے ایک ہی تنے سے بے شمار شاخیں پھوٹتی ہیں اور پھر ان شاخوں سے جٹائیں نکل کر زمین تک پہنچتی ہیں اور ان جٹاؤں کے زمین میں جم جانے سے ایک بے شمار تعداد میں نئے تنے پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اصلی تنا خود اپنی شاخوں کے گھنے جنگل میں ناپید ہو جاتا ہے، اسی طرح اس ہمہ اوست کے مسئلہ نے ہندوؤں کے دلوں میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ لی ہے اور اس سے بے شمار شاخیں نکلی ہیں۔ یہانتک کہ وہ جو سیدھا سادا اور اصلی مسئلہ تھا ان توہمات اور بیہودہ عقائد کے جنگل میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس مسئلۂ وحدت الوجود کے مطابق وجود حقیقی ایک ہے اور دوسرا کوئی نہیں۔ یہی وید کی صحیح تلقین ہے اور یہی صحیح علم ہے جو ویدوں سے حاصل ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے عوام الناس کے مذہب میں گو مسئلہ مذکور الصدر ہی نجات کا ایک سچا راستہ مانا گیا ہے، مگر اس میں علاوہ اُس کے دیگر اسفل طریقے بھی رکھے گئے

ہیں مثلاً ایک کرم مارگ ہو جس میں افعال اور کفاروں وغیرہ کا
پھل مانا گیا ہو اور دوسرا بھکتی مارگ جس میں شخصی خدا کی پرستش اور
اُس کے عشق کا چرچا ہو۔ اگرچہ اس مذہب کی بنیاد وید پر ہو مگر اس
میں تمام مذاہب سے کچھ نہ کچھ لے لیا گیا ہو اور کچھ ایسے اشکال
اُس نے اپنے روبرو رکھے ہیں جو تمام اقسام کے خیال کے لوگوں
کے لئے موزوں ہیں۔ وہ آل ٹالرنٹ یعنی
سب کچھ گوارا کرنے والا ہو یا یہ کہ سب باتوں کا متحمل ہو۔ سب کو اپنے
میں شامل کرنے والا اور سب باتوں کو قبول کرنے والا ہو۔ اس
کا ایک رُخ اگر روحانی ہو تو دوسرا مادّی، اگر ایک قرین عقل ہو
تو دوسرا بعید از عقل۔ ایک اگر پاک و خالص ہو تو دوسرا ناپاک
و غلیظ۔ اس کی تشبیہ ہم ایک کثیر الاضلاع شکل سے دے سکتے
ہیں جس کا ایک بازو اگر عملی طور پر کام کرنے والوں کے لئے ہو تو
ایک سخت اخلاق پسند آدمیوں کے لئے ہو۔ ایک اور پُر جوش طبیعت
کے لوگوں کے لئے اور ایک اور شہوانی طبائع کے آدمیوں کے
لئے اور ایک اور فلسفائی خیال اور غور پسند طبیعت کے لوگوں کے
لئے ہو۔ جن کو پابندیِ رسم پسند ہو اُن کی اس میں کامل تشفی
ہوتی ہو جو افعال کے پھلوں کے منکر ہیں اور بھکتی یعنی عشق خدا
کو اپنا اصل مقصود سمجھتے ہیں اُن کو بھی ان کے احاطے سے باہر
جانے کی ضرورت نہیں جن کی طبیعت شہوت پسند ہو وہ بھی اپنی
خواہشات کو اس میں پورا کر سکتے ہیں اور جن کی طبیعت اس قسم
کی واقع ہوئی ہو کہ ان کو "خدا کیا ہو؟ آدمی کیا ہو؟ روح اور مادہ
میں کیا تعلق ہو؟" ایسی باتوں پر غور کرنا پسند ہو وہ بھی یہاں اپنی
طبیعت کے موافق خیالات کی بلند پروازیوں میں مستغرق رہ
سکتے ہیں۔ غرض کہ ہر قسم کی طبیعت کے لوگوں کے لئے اس
میں کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہو اور اسی وجہ سے اس مذہب میں
بے شمار تفرقے ہو گئے ہیں"۔

ایک اور جگہ پر وہی پروفیسر صاحب یہ لکھتے ہیں:۔

"قدیم ویدوں اور بودھوں کے مذہب اور اصلی باشندگانِ ہند
کی غیر آرین قوموں کے عقائد کے باہمی خلط ملط سے ہندوؤں کا وہ
مذہب پیدا ہوا ہو جو حال میں رائج ہو۔ چونکہ ہندوؤں کے مذہب
کا بہت بڑا اصول یونیورسل ٹالریشن (Universal toleration)
ہو جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ سب باتوں کو گوارا کرنے والا ہو اور تعصب
سے بالکل مبرا ہو اس لئے اُس نے کل اقسام کے عقائد کو اپنے
میں داخل کر لیا ہو حتیٰ کہ ہندوستان کے جنگلی اور پہاڑی اقوام
کے عقائد بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس نے سبھوں کے
لئے دروازہ کھول دیا ہو اور سب اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ
برہمنوں کی عظمت اور کھانے پینے و شادی بیاہ کے متعلق چند
قواعد کی پابندی کی جائے"۔

پھر اور ایک جگہ پروفیسر مانیر ولیمس لکھتے ہیں:۔

"اور حق تو یہ ہو کہ ہندوؤں کے مذہب کا کوئی تذکرہ کامل
نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس میں ہر مذہب اور ہر فلسفائی خیال
کا ذکر نہ کیا جائے جو دنیا میں اب تک کبھی پھیلا ہو"۔

پروفیسر مانیر ولیمس نے جو تعریف ہندو مذہب کی کی ہو وہ
ایک حد تک صحیح ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہند کے اصلی غیر آرین
و نیز اُن بیرونی اقوام کے عقائد اس میں شریک ہو گئے ہیں جو
زمانۂ متوسط میں ملکِ ہند میں داخل ہوئے تھے اور یہی وجہ
ہو کہ یہ مذہب اس قدر بوقلموں نظر آ رہا ہو مگر یہاں یہ ضرور کہہ
دینا چاہئے کہ یہ بوقلمونی محض اسی ایک وجہ سے نہیں ہو۔ قدیم
رشی جنھوں نے اس مذہب کی بنا ڈالی تھی بخوبی سمجھتے تھے کہ
انسان کے طبائع مختلف ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہو کہ کسی خاص عقیدہ

کو سب لوگ تسلیم کریں۔ طبائع کے اختلاف کے لحاظ سے طریقوں کا اختلاف عمداً جائز رکھا گیا ہو اور یہ تلقین کی گئی ہو کہ چاہے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے سالک اُس طریقہ پر چل کر منزلِ مقصود کو ضرور پہنچے گا دیر سے یا جلد تر البتہ کوئی طریقہ سیدھا ہو اور کوئی ٹیڑھا۔ اسی طرح جیسے کوئی سڑک سیدھی جاتی ہو اور کوئی چکر کھا کر مگر دونوں ایک ہی منزل کو پہنچاتی ہیں۔ طبائع انسانی تین اقسام کے دیکھے جاتے ہیں، ساتوک सात्विक راجسک राजसिक تامسک तामसिक ساتوک طبائع کے وہ صالح لوگ ہیں جو قطعاً تمام گندگیوں سے پاک ہوا و ہوس دُنیاوی سے آزاد، نیک خیال، نیک باطن، نیک رویہ، راجسک طبیعت کے آدمی تیز اور طرّار کاموں کے کرنے میں مشّاق ہوتے ہیں اور مغلوب الغضب اور مغلوب الشہوت، اور تامسک طبیعت کے وہ لوگ ہیں جو کامل جہالت اور کاہلی میں مبتلا رہ کر تاریکی پسند ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان تینوں خالص صفات کے آدمی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ دُنیا میں زیادہ تر ان تینوں اقسام کے طبائع میں سے مخلوط طبائع کے آدمی ہوتے ہیں کسی میں ساتوکی جو راجسک و تامسک طبائع پر غالب ہوتی ہو کسی میں راجسک باقی دونوں پر اور کسی میں تامسک غالب رہتی ہو۔ پس ان مختلف طبائع کے لحاظ سے رشیوں نے مذہبی تفرقے رکھے ہیں، اور ہر ایک کے لئے راستے کھول دئے ہیں جن کو اختیار کر کے آدمی منزلِ مقصود کو پہنچ سکتا ہو۔ مثلاً دو بڑے مارگ یعنی طریقے یہ ہیں (۱) پرورتی प्रवृत्ति مارگ۔ (۲) نورتی निवृत्ति مارگ۔ طریقہ اوّل میں تمام جائز دُنیوی لذائذ سے محظوظ ہونے کی اجازت ہو، تاکہ اُن لذائذ سے سیر ہونے کے بعد حظ اُٹھانے والا شخص ان سے متنفر ہو کر جانبِ خُدا رجوع ہو جائے اور چونکہ ہندوؤں میں تناسخ کا ایک مسلّم عقیدہ ہو اس لئے اگر اس جنم میں نہیں تو آیندہ کسی نہ کسی جنم میں وہ ضرور اس طرح لذائذ سے سیر ہونے کے بعد متنفر ہو کر جانبِ خدا رجوع ہو جائے گا۔ طریقۂ دوم کو جو اختیار کرتا ہو وہ ان سب لذائذ سے دُور رہنا چاہتا ہو وہ سخت نفس کشی اور ریاضت کو اپنے اوپر گوارا کرتا ہو اور اس طرح وہ اپنے کو دریائے ہستی میں ملا دینا چا[illegible]ہو، یہ طریقہ شیووں शैव کا ہو جن میں جوگیوں کا ایک مشہور فرقہ ہو۔ چونکہ یہ لوگ عالم کی حقیقی ہستی کے قائل نہیں بلکہ ایک معنی میں یعنی حالتِ عرفاں میں وہ نابود ہی ہو جس کے یہ معنی ہیں کہ گویا وہ کشار क्षार یعنی راکھ ہو اس لئے یہ لوگ اپنے ماتھے پر بالعموم اور سارے بدن میں بالخصوص بھسم भस्म یعنی راکھ لپیٹے ہیں۔ غرض کہ یہ دو بڑی تقسیم ہیں اور پھر اول الذکر تقسیم یعنی پرورتی مارگ کی اور بیشمار شاخیں پھوٹی ہیں، کیونکہ لذائذ سے محظوظ ہونے کا طریقہ گو وہ جائز ہی کیوں نہ ہو ایک طرح کا نہیں ہو۔ کوئی ان لذائذ کو ہی مدعا سمجھ کر اُس نیچر کی ہی جس سے ان کو یہ لذائذ حاصل ہوتے ہیں پرستش کرتے ہیں اور ایسے لوگ شاکت یعنی نیچر پرست کہلاتے ہیں اور کوئی ایسے ہیں جو لذائذ کو بھوگنا اپنا عین مدعا نہیں سمجھتے بلکہ وہ ان کو اس لئے بھوگتے ہیں کہ آخر وہ ان سے سیر ہو کر اُن سے متنفر ہوں اور جانبِ خُدا رجوع ہوں۔ یہ لوگ ویشنو वैष्णव کہلاتے ہیں۔ مگر ویشنوؤں میں بھی دو طریقے ہیں ایک وہ جواب بیان ہوا اور دوسرا وہ جس میں ترکِ لذائذ کی تلقین ہو۔ جن میں ترکِ لذائذ کی تلقین ہو وہ یہ کہتے ہیں کہ لذائذ سے انسان کی کبھی سیری نہیں ہوتی بقول گوسائیں تلسی داس۔

बुझै न काम अग्नि तुलसी कबहु विषय भोग बहु घी ते

بجھے نہ کام اگنی تلسی کبہوں وشے بھوگ بہو گھی تین

یعنی یہ کہ خواہشات کی آگ حظائظ نفسانی کے گھی سے کبھی نہیں بجھتی۔ آگ پر جتنا گھی زیادہ ڈالا جائے گا وہ اُتنا ہی زیادہ بھڑکے گی۔ اُس طریقہ کو جس میں ترک لذائذ کی تلقین ہے۔ بیراگ वैराग کہتے ہیں، اور جس میں حصول لذائذ کی تلقین ہے اس کو انوراگ अनुराग یعنی پسٹھی [illegible] مارگ کہتے ہیں مگر عشق حقیقی دونوں کا اصل اصول ہے۔ البتہ طالب لذائذ مجازی سے حقیقی کو پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کے لوگ خصوص وہ لوگ جو طالب لذائذ ہیں خوشبودار چیزوں مثل صندل وگوپی چندن وغیرہ سے اپنی پیشانی کو رنگتے ہیں جس سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔

مثنوی معنوی میں یہ قصہ بیان ہوا ہے کہ کوئی چرواہا تھا جو بکریوں کا ایک بہت بڑا گلہ رکھتا تھا۔ ایک دن وہ جذبۂ عشق میں آکر خدا سے مخاطب ہو کر بہ آواز بلند یہ کہہ رہا تھا کہ اے میرے پیارے اگر میں تجھے پاؤں تو میں تیرا سنگار کروں، تجھے اچھے اچھے کپڑے پہناؤں اور اپنی بکریوں کا عمدہ سے عمدہ دودھ پلاؤں۔ یہ آواز کہیں حضرت موسیٰ کے کان میں پڑ گئی جو اُدھر سے گذر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ خدا کے جلال کے قائل جس کا جلوہ وہ خود کوہِ طور پر دیکھ چکے تھے فوراً اس چرواہے کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے چرواہے تو کیا بے ادبی کرتا ہے، خدا کی شان میں ایسے کلمات زبان پر لاتا ہے۔ ایسے کلمات سے تو باز آ اور خبردار پھر ایسا نہ کہنا۔ وہ بیچارہ موسیٰ کے کہنے سے ڈر کر خاموش ہو گیا مگر اسی وقت موسیٰ کو یہ الہام ہوا کہ اے موسیٰ۔ ع

تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی

یہ قصہ ہندو بھگتوں کا ٹھیک فوٹو ہے۔ ویشنوؤں میں جو پشٹی مارگ والے ہیں یعنی جو طالب لذائذ ہیں وہ کچھ اس کا انتظار نہیں کرتے کہ خدا اُن کے سامنے آئے بلکہ وہ اس کی ایک تصویر یا مورت کو اپنے سامنے رکھ کر دن میں کئی بار اُس کا سنگار کرتے ہیں، اچھے اچھے کپڑے و زیور پہناتے ہیں اور لذیذ کھانے اُس کے روبرو رکھتے ہیں اور اپنا تن من دھن سب اس پر قربان کرتے ہیں۔ وہ کوئی چیز اپنے لئے گوارا نہیں کرتے تاوقتیکہ وہ اُس کو بطور نذر اپنے محبوب حقیقی کے سامنے نہ رکھدیں۔ اس کو کون نہیں جانتا کہ وہ مورت کچھ کھاتی نہیں، پہنتی نہیں، سونگھتی نہیں، تاہم جذبۂ عشق ان کو ایسے حرکات کی طرف مائل کرتا ہے۔ جب عاشق کو اپنے معشوق حقیقی کے ساتھ پریم یعنی عشق کی زیادتی ہوتی ہے تو وہ جو جو باتیں اپنے لئے خوشگوار سمجھتا ہے اس کے لئے پہلے ضروری سمجھتا ہے۔ صرف یہی نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ کھاتا ہے اس کو وہ اپنے معشوق حقیقی کا جھوٹا سمجھ کر کھاتا ہے اور جو کچھ وہ پہنتا ہے اُس کی اُترن سمجھتا ہے۔ مگر یہ سب باتیں اسی وقت تک زیبا دیتی ہیں جب کہ عشق میں پوری پوری محویت ہو گئی ہے ورنہ یہ سب کھیل ہی ہیں۔ اور نہایت ذلیل حرکات میں داخل ہیں۔ ایسے لوگوں میں وہ لوگ جو اصل حقیقت کو پہچان گئے ہیں اس طرح کی پوجا کرکے بھی یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جس کی وہ پوجا کر رہے ہیں اس کو ایسے چڑھاوے وغیرہ کی ضرورت نہیں وہ ان سب باتوں سے مبرا ہے جیسا کہ کسی سنسکرت شاعر نے چند اشلوکوں میں ظاہر کیا ہے جن کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اجنتا کے غار کی ایک تصویر

انڈین پریس الہ آباد

"کون سی جگہ ہے جہاں وہ موجود نہیں پھر اُس کا آواہن ہم کہاں
کریں، جو سب کا آدھار بن رہا ہے اس کو کیا آسن دیں، وہ جو بالکل
پاک و صاف ہے اُس کے پاؤں کیا دھوئیں، اور اس کو کیا ارگھ دیں
جس میں کوئی میل نہیں اس کو اشنان کیا کرائیں، اور جو ایک
عالم کو اپنے میں ڈھانپے ہوئے ہے اُس کو کپڑے کیا پہنائیں،
جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں، اُس کو جنیؤ کیا پہنائیں، جو کسی سے
چھوا نہیں جا سکتا اس کو گندھ یعنی خوشبو کیا سنگھائیں، وہ جو
خود حُسن مجسم ہے اُس کے لئے زیور کی کیا ضرورت ہے، نیوید
नैवेद्य یعنی کھانے وغیرہ اس کے سامنے رکھنے کی کیا ضرورت
ہے جو ہمیشہ ترپت तृप्त یعنی سیر ہے۔ جو غیر محدود ہے اس کا طواف
کیا معنی رکھتا ہے، اور جو ذات لاشریک ہے اس کی ڈنڈوت کیا
ہو سکتی ہے، اس کی تعریف میں کیا مناجات کی جا سکتی ہے جس
کی تعریف کرنے میں وید بھی عاری ہے۔ جو ہر جا حاضر و ناظر ہو اُس
کی آرتی کیا کی جا سکتی ہے، غرض اس طرح خداوند حقیقی کی سب
سے اعلیٰ پرستش برہم کے جاننے والوں کو کرنا چاہیئے۔"

ہندوؤں کے مذہب کی نسبت ایک بڑا اعتراض یہ
کیا جاتا ہے کہ وہ متضاد باتوں سے بھرا ہوا ہے یعنی یہ کہ کہیں تو
ایک چیز کی تعریف کی گئی ہے اور پھر دوسری جگہ اُسی چیز کی مذمت
کی گئی ہے مگر واضح رہے کہ جو باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں وہ
فی الحقیقت متضاد نہیں ہیں اس کے حل کی دو کنجیاں ہیں
ایک یہ کہ ودھی विधि و نشیدھ निषेध یعنی اجازت و ممانعت
ہے اور پرشنسا प्रशंसा و نندا निन्दा یعنی تعریف و مذمت دو
علٰحدہ علٰحدہ باتیں ہیں جن باتوں کی اجازت وید یا شاستر میں ہے
وہ ہمیشہ جائز ہی سمجھی جاتی ہیں اور جن باتوں کی ممانعت ہے
وہ ہمیشہ ممنوع ہی سمجھی جاتی ہیں یعنی جو اوامر ہیں وہ اوامر
رہیں گے اور جو منہیات ہیں وہ منہیات۔ زنا کاری ممنوع ہے یہ
کبھی جائز نہیں ہو سکتی۔ پھر چند باتیں ایسی ہیں جن کی کہیں
تعریف کی گئی ہے اور کہیں مذمت مثلاً شادی کرنا اور بچّے
پیدا کرنا ایک جائز فعل ہے اس کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اکثر جگہ
اس کی تعریف کی گئی ہے اور زور دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شادی
کرکے بیٹا پیدا نہ کرے گا تو وہ اور اس کے اجداد بہشت
سے گر جائیں گے۔ دوسری جگہ جہاں معرفت کا ذکر ہے اور
جہاں اس بات پر زور دیا دیا گیا ہے کہ تمام دنیاوی علائق
سے کنارہ کشی کرنا چاہیئے، وہاں عورت کے ساتھ تعلق
رکھنے کی مذمت بدرجۂ غایت کی گئی ہے، چاہے وہ جائز ہو
یا ناجائز۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ شادی کرنا اور بچّے پیدا کرنا
ممنوع ہے، مگر اُس کے نزدیک جس کو معرفت مطلوب ہے یہ
ایک مذموم بات ہے۔ جہاں معرفت کا ذکر ہے وہاں بُت پرستی
ایک مذموم بات سمجھی جاتی ہے، مگر جن کی روحانی حالت ابھی
گھٹی ہوئی ہے اُن کے لئے صرف اس کی اجازت ہی نہیں
ہے بلکہ تقید ہے۔ دوسری کنجی ادھکار अधिकार اور نہ
اندھکار अनधिकार کی ہے یعنی یہ کہ قبل اس کے کہ کوئی تلقین
کسی کو کی جائے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اس تلقین کے
لئے استحقاق پیدا کیا ہے یا نہیں یا یہ کہ وہ ظرف کیسا ہے جس
میں فلاں علم جائے گا۔ ظرف کے لحاظ سے اپدیش کرنا
چاہیئے، اگر اس کا لحاظ نہیں کیا گیا تو وہ اپدیش یعنی تلقین
بیکار جاتی ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا مُضر اثر
پڑتا ہے۔ ظرف ہی کے لحاظ سے صفائی یا غیر صفائی خدا کے
متعلق تلقین کرنے کی ہدایت شاستروں میں ہے ظرف ہی
کے لحاظ سے برت یعنی روزہ رکھنے کی ہدایت ہے یعنی یہ کہ

کس کو برت بغیر کھانے یا پینے کے رکھنا چاہیئے اور کس کو پھل وغیرہ کھالینا چاہیئے۔

پروفیسر مانیر ولیمس کا یہ کہنا پورا پورا صحیح نہیں ہے کہ اصل اصول ہندو مذہب کا مسئلہ وحدت الوجود کی تلقین ہے۔ مخفی نہ رہے کہ جیسا سابق کے مضامین میں بتایا گیا ہے، زمانۂ قدیم سے اس ملک میں مختلف عقائد رہے ہیں اور ان مختلف عقائد کی فلاسفی میں بھی فرق ہے۔ کوئی صفات کے قائل تھے اور کوئی ذات اور صفات دونوں کے اور کوئی صرف ذات کے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ عقائد کیا ہیں۔

(۱) ایک وہ لوگ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ ہمکو صرف صفات کا علم ہوتا ہے جس کو ذات کہتے ہیں۔ اس کا ہمکو کوئی علم نہیں ہے اور اس لئے اس کے وجود کو ماننا فضول ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمکو صرف تغیرات کا علم ہے کسی غیر متغیر شے کا ہم کو علم نہیں اور اس لئے ہم اس کے وجود کے قائل نہیں۔ ان لوگوں میں بودھ مذہب کے لوگ شریک ہیں چونکہ یہ لوگ صرف صفات کے قائل ہیں اس لئے وہ صرف ظاہری چیزوں کو سچا جانتے ہیں اور اس وجہ سے وہ نہ خدا کے قائل ہیں اور نہ روح کے۔ یہ لوگ قطعاً اہل ظاہر کہے جا سکتے ہیں، صرف لفظ ہی کے قائل ہیں معنی کے نہیں۔

(۲) وہ لوگ ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ ہر چیز کی ذات بھی ہے اور اس کے صفات بھی ہیں یعنی یہ کہ وہ ہر چیز کی ذات اور صفات دونوں کے علٰحدہ علٰحدہ وجود کو تسلیم کرتے ہیں یہ ذات و صفات آپس میں ایسے ملے ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر خیال نہیں ہو سکتا ذات کا خیال بغیر صفات کے نہیں ہو گا اور صفات کا خیال بغیر ذات کے نہیں ہوگا۔ یہ عقیدہ اُن لوگوں کا ہے جو روح کو الگ اور خدا کو الگ سمجھتے ہیں اور دونوں کو موصوف با صفات جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی چیز کا بغیر صفات کے رہنا نا ممکن ہے۔ چونکہ یہ لفظ اور معنی اور ذات اور صفات دونوں کے قائل ہیں اس لئے یہ نیم اہل ظاہر اور نیم اہل باطن ہیں۔

(۳) وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صرف ذات ہی سچ ہے، اس کے اگر کوئی صفات ہیں تو وہ ظاہری ہیں فی الواقع ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ذات اور صفات کوئی دو جدا جدا شے نہیں ہیں۔ ہم کو ایک وقت میں ایک ہی چیز کا علم ہے، اگر ہم کو ذات کا علم ہے تو صفات غائب ہو جاتے ہیں اور اگر صفات کو ہم دیکھتے ہیں تو ذات کا خیال جاتا رہتا ہے۔ یہ عقیدہ فرقہ وحدت الوجود کا ہے ان لوگوں کے نزدیک صرف ایک ہی ذات ہے اور صورتیں بہت ہیں اور ایک ہی ذات صفات میں ظاہر ہو کر مختلف صورتیں دکھاتی ہے۔ یہ قطعاً اہل باطن ہیں اور معنی کے قائل ہیں لفظ کے قائل نہیں بقول شخصے لفظ بگزاری سوے معنی رَوی۔

غرض کہ ان تین مختلف عقائد پر سیکڑوں مذہبی فرقے ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے چلے آرہے ہیں جس وقت شری شنکر اچارج کا ظہور ہوا ایک طرف تو بودھوں کا زور تھا اور دوسری طرف جو ہندو باقی رہے تھے وہ بھی مختلف فرقوں میں منقسم تھے اور یہ بھی آپس میں جھگڑتے تھے کہ ہمارا معبود تمہارے معبود سے زیادہ مقتدر ہے گویا ہر ایک کے معبود ایک دوسرے سے علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ شری شنکر اچارج نے جو ہندوؤں میں سب سے بڑے فلاسفر مانے گئے ہیں مسئلہ وحدت الوجود کو سامنے رکھ کر ان مختلف فرقوں کو

ملانے کی غرض سے ہر کسی کو یہ ہدایت کی کہ لفظ یا صورت پرست جھگڑو، اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ لفظ کے پرے جو معنی ہیں یا صورت کے پرے جو ذات ہے، وہی ایک حقیقت ہے جس کا اصلی وجود ہے، وہی ایک حقیقت ان مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے، جن کو تم مختلف ناموں سے پوج رہے ہو۔ پس تم سب مل جاؤ اور بے فائدہ لفظ یا صورت کے پیچھے مت جھگڑو۔ اگر تم کو پوجنے ہی کی خواہش ہے تو جس صورت میں چاہو اس کو پوجو لیکن اگر کوئی اور کسی دوسری صورت میں اس کو پوجتا ہے تو اس کو یہ سمجھکر بُرا مت کہو کہ وہ بھی وہی ذات ہے جس کو تم اپنی قبول کی ہوئی خاص صورت میں پوج رہے ہو۔ غرض اس طرح پر اُنھوں نے اسمارت स्मार्त مذہب کو قائم کیا جو اب تک چلا جاتا ہے اور یہی ایک مذہب ہے جو ویدوں کی اصل تلقین کے مطابق ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ آیا ہندوؤں کا مذہب ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہا ہے یا اُس میں کچھ تغیرات بھی ہوئے ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ ہندو مذہب کی دو اوستھا یعنی حالتیں ہیں ایک گیان اوستھا یعنی حالت عرفان جس کو پرمارتھک اوستھا یعنی حقیقت بھی کہتے ہیں اور دوسری اگیان اوستھا یعنی حالت عدم عرفان جس کو ویوہارک اوستھا یا تعینات بھی کہتے ہیں۔ گیان اوستھا کا اصل اصول توحید مطلق ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل نصف اشلوک سے ظاہر ہے:

ब्रह्म सत्यं जगन्मिथ्या जीवो ब्रह्मैव नापरः

کے یہ معنی ہیں کہ برہم ब्रह्म یعنی ذات مطلق ہی سچ ہے اور عالم جھوٹا ہے اور جس کو جیو یعنی روح کہتے ہیں وہ درحقیقت برہم یعنی ذات مطلق ہی ہے۔ یہ ذات مطلق نرگن اور نراکار ہے یعنی صفات اور جسم کے خیالات سے وہ بالکل مبرا ہے۔ جس وقت گیان یا اعلیٰ درجہ کی بھگتی سے کسی کو یہ علم ہو کہ میں ذات مطلق ہوں، اس سے الگ نہیں ہوں تو اس وقت اس کو تمام قیود سے رہائی ہو کر مکتی یعنی نجات حاصل ہو جاتی ہے، اس کی تلقین شُرتیوں श्रुतियों میں کی گئی ہے جو اٹل ہیں اور جن میں کوئی تغیر واقع نہیں ہو سکتا۔

اب رہی اگیان اوستھا جس کو ویوہارک व्यावहारिक اوستھا یعنی تعینات بھی کہتے ہیں۔ اس کے اصل اصول یہ ہیں۔

(۱) وحدانیت خدا یعنی معبودیت و عبودیت کے امتیاز کے ساتھ خدا الگ ہے اور روح الگ ہے، خدا ایک ہے اور روحیں بے شمار۔ وہ جو درحقیقت نرگن و نراکار ہے ایشور یعنی شخصی خدا ہو کر ظاہر ہوتا ہے جو سگن و ساکار ہے یعنی موصوف بہ صفات ہے اور جسم کے خیال سے بھی مبرا نہیں۔ یہی ایشور بہ لحاظ اپنے صفات کے تین روپوں میں ظاہر ہوتا ہے جن کو شیو۔ وشنو اور برہما کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

(۲) عقیدہ اوتار بخلاف دیگر مذاہب کے جن میں یہ مانا گیا ہے کہ جب ضرورت ہوتی ہے انسان کی ہدایت کے لئے انبیا وغیرہ خدا کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں یہ مانا گیا ہے کہ خود خدا ہی نیکوں کی حفاظت اور بدوں کے قلع و قمع کے لئے یا یوں کہو کہ جو جمال کے قائل ہیں اُن کو اپنے جمال اور جو اُس کا جلال دیکھنا چاہتے ہیں اُن کو اپنے جلال کا درشن دینے کے لئے اور نیز انسان کی ہدایت کے لئے جامۂ انسانی میں ظاہر ہوتا ہے جس کو اوتار کے نام سے ملقب کیا گیا ہے۔

(۳) عقیدہ تناسخ یعنی یہ کہ روح بہ نتیجۂ عذاب و ثواب مختلف قالبوں میں چکر کھاتی رہتی ہے۔

(۴) ویدک کرموں کا کرنا مثلاً سندھیا کرنا، جگ کرنا، شرادھ کرنا، اگنی ہوتر کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام باتوں کی تلقین وید اور شاستر دونوں میں کی گئی ہی اور یہی اٹل ہیں ان میں بھی کوئی تغیر نہیں ہوا ہی۔ البتہ یہ باعث بندھن یعنی قیودات ضرور ہیں اور ان عقائد کے رکھنے یا ان کاموں کے کرنے سے مکتی نہیں مل سکتی۔

غرض یہ اصل اصول مذہب ہردو اوستھاؤں کے ہیں اور ان پر کُل فرقے متفق ہیں، سوائے اس کے کہ مکتی یعنی نجات کے متعلق باہم اختلاف ہی جس کا ذکر صراحت کے ساتھ سابق کے مضامین میں کیا گیا ہی۔ یہ وہ عقائد ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہی، اب رہے فروعات مذہب جن کا ذکر اسمرتیوں اور پُرانوں میں ہوا ہی، ان میں ہر زمانہ میں تغیر ہوتا رہا ہی اور زمانہ کے لحاظ سے ہی اسمرتیاں بنی ہیں۔ ان فروعات میں یہ چند باتیں زیادہ تر قابل لحاظ ہیں۔

(۱) چونکہ ہر شخص کے طبائع جُدا جُدا ہیں اس لئے ہر شخص کو اپنی طبیعت کے لحاظ سے پرستش کے کسی ایک طریقہ کو اختیار کرنا چاہیئے اور ایشور کے مختلف روپوں میں سے اُس کے کسی ایک روپ کی پرستش یا عبادت کرنا چاہیئے یعنی یہ کہ پہلے یہ تصفیہ کرنا چاہیئے کہ ہمارا اشٹ इष्ट کیا ہونا چاہیئے۔

(۲) ایشور کو چھوڑ کر پرتیک اوپاسنا प्रतीक उपासना کہاں تک جائز سمجھی جا سکتی ہی۔

(۳) پرتما پوجن یعنی بُت پرستی کہاں تک جائز ہی۔

اس میں شک نہیں کہ بہ لحاظ اختلاف طبائع جو ایک کا اشٹ ہی اور دوسرے کا اِشٹ نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا کی نسبت جس کسی نے اپنا کوئی خاص آئیڈیل Ideal قرار دیدیا ہی، ممکن ہی کہ وہ دوسرے کا نہ ہو۔ مثلاً جو شخص خدا کے جلال کا قائل ہی اس کا آئیڈیل ضرور اس کے آئیڈیل سے جُدا ہوگا جو اس کے جمال کا قائل ہی۔ لیکن افسوس ہی کہ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہی۔ کوئی اپنے آئیڈیل کو دوسرے کے آئیڈیل پر ترجیح دیتا ہی اور لڑنے جھگڑنے کے لئے مستعد ہو جاتا ہی۔ مثلاً کسی کے اشٹ دیو بھگوان وشنو विष्णु ہیں۔ وہ اس بات کو بھول کر کہ بھگوان وشنو اور بھگوان شیو शिव دونوں ایک ہی ذاتِ مطلق یا ایشور کے دو علیحدہ علیحدہ روپ یا مظہر ہیں اُس شخص سے جھگڑتا ہی جس کے اشٹ دیو بھگوان شیو ہیں اور یہ کہتا ہی کہ میرے اشٹ دیو تمہارے اشٹ دیو سے بڑھ کر ہیں تمہارے اشٹ دیو یعنی شیو میرے اشٹ دیو یعنی بھگوان وشنو کے داس یعنی غلام بلکہ جیو یعنی روح ہی ہیں۔ البتہ ان کو بھگوان وشنو کی عبادت سے وہ مرتبہ ملا ہی جو ان کو حاصل ہی۔ اسٹ اشٹہ کے اس جھگڑے نے ہندوؤں کے مذہب میں وہ خرابیاں پیدا کر دی ہیں جو آپ دیکھی جا رہی ہیں۔ اور یہ محض اس لئے کہ بھگوان وشنو بھگوان شیو سے بڑے ہیں یا بھگوان شیو کو بھگوان وشنو پر ترجیح حاصل ہی۔ نئے نئے پوران بنا دئے گئے ہیں اور قدیم پورانوں میں بھی تحریفات کی گئی ہیں جن کا تفصیل سے ذکر کرنا اس لئے مناسب نہیں سمجھا جاتا کہ ناحق کوئی بحث نہ چھڑ جائے۔ چونکہ برہما کے اوپاسک یعنی پوجنے والے کوئی نہیں ہیں، اس لئے بیچارہ برہما باقی دونوں کا داس یا فرمانبردار ہی مانا گیا ہی۔

پُرانوں میں جو ایک کی بڑائی اور دوسرے کی مذمت جائز رکھی گئی ہی اس کے متعلق مصنف وچارساگر کا یہ کہنا ہی چونکہ کُل پورانوں کے بنانے والے

سوامی شنکراچارج

"معلوم ہوا، کہ کچھ نہ معلوم ہوا"

انڈین پریس الہ آباد

بیاس جی ہیں اس لئے ان کا مقصد کسی ایک پوران میں وشنو اور دوسرے میں شو کی نندا کرنے سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وشنو یا شو کی پرستش ترک کردی جائے۔ اگر یہی مراد ہوتی تو وشنو و شو دونوں کی پرستش ترک ہوجاتی۔ ایک کی بڑائی اور دوسرے کی مذمت کرنے سے ان کا اصل مقصد یہی ہوسکتا ہی کہ جو کوئی اِشٹ इष्ट اختیار کیا جائے اس میں پوری پوری مصروفیت اور محویت ہوجائے ممکن ہی کہ یہ صحیح ہو۔

شُدّھ برہم ब्रह्म ہم اس سے پہلے یہ تعریف کر آئے ہیں کہ وہ نرگن و نراکار ہی یعنی نام و روپ اور جسم وغیرہ کے تمام خیالات سے بالکل پاک و صاف ہی اور جس کو جیو کہتے ہیں وہ فی الحقیقت برہم ہی ہی، اُس سے الگ نہیں، لیکن جب جیو اوستھا میں جیو کو یہ پرتیت یعنی محسوس ہوا کہ میں برہم سے الگ ہوں تو پھر دو علٰحدہ علٰحدہ وجودوں کی ہستی کو ماننا پڑا۔ ایک ویشٹی व्यष्टि یعنی بحیثیت افراد جیوؤں کی ہستی جس کی کوئی تعداد مقرر نہیں کی جاسکتی اور دوسری سمشٹی समष्टि یعنی بحیثیت کل ایشور کی ہستی جو صرف ایک ہی ہوسکتا ہی۔ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ بلحاظ طبائع تین گنوں کی ہستی مانی گئی ہی، ستوگن، رجوگن، تموگن جب ستوگن باقی دو گنوں پر غالب رہتا ہی تو اس کو شُدّھ ستوگن کہتے ہیں اور جب یہی ستوگن باقی دونوں سے دبا ہوا رہتا ہی تو اس کو مَلِن मलिन ستوگن کہتے ہیں۔ یہ تینوں گن مایا[1] کے ہیں شُدّھ ستوگن کے ساتھ مایا میں جو عکس شُدّھ برہم یعنی چیتن चेतन کا ہی وہ عکس مع مایا اور اس کے ادھشٹھان अधिष्ठान چیتن کے ایشور نام سے موسوم ہوا اور مَلِن ستوگن کے ساتھ ویشٹی اگیان کے انس میں اُسی چیتن کا عکس مع اگیان اور اگیان کے ادھشٹھان

چیتن کے جیو کہلایا۔ مخفی نہ رہے کہ سمشٹی समष्टि کے معنی کُل اور ویشٹی व्यष्टि کے معنی جزو یا افراد کے ہیں، سمشٹی میں جس کا نام مایا माया ہی ویشٹی میں اسی کا نام اگیان ہی۔ لیکن فرق یہ ہی کہ مایا میں شُدّھ ستوگن پردھان یعنی غالب رہتا ہی اور اگیان میں مَلِن ستوگن۔ مایا میں شُدّھ ستوگن کے غالب رہنے کی وجہ سے ایشور سروگیہ सर्वज्ञ ہی یعنی عالم الغیب، کیونکہ شُدّھ ستوگن کی خاصیت پرکاش یعنی نور کی ہی اور اسی لئے ایشور ہمیشہ مُکت ہی یعنی جینے اور مرنے سے پاک ہی۔ برخلاف اس کے اگیان میں مَلِن ستوگن کے پردھان رہنے سے جیو الپگیہ अल्पज्ञ ہی یعنی اس کا علم محدود ہی اور وہ جینے اور مرنے کے بھی تابع ہی شُدّھ ستوگن کے ساتھ یہ مایا جس میں چیتن کا عکس پڑکر اُس چیتن चेतन کا نام ایشور ہوا اس ایشور کا کارن شریر ہی اور مَلِن ستوگن کے ساتھ اگیان جیو کا کارن شریر ہی۔ اور پانچ عناصر لطیفہ من، بدھی، چت، اہنکار، پانچ کرم اندریہ اور پانچ گیان اندریہ اور پانچ پران یہ سب مل کر جیو کا سوکشم सूक्ष्म یعنی جسم لطیف ہی اور کُل جیوں کے سوکشم شریر مل کر ایشور کا سوکشم شریر ہی اور کُل استھول स्थूल برہمانڈ یعنی تمام کائنات ایشور کا استھول شریر ہی۔ ایشور کے کارن شریر کے ابھمانی अभिमानी کا نام ایشور یعنی شو ہی اور اس کے سوکشم شریر کے ابھمانی کا نام جس میں کارن شریر بھی انترگت ہی ہرنیہ گربھ हिरण्यगर्भ یعنی برہما اور اُس کے استھول شریر کے ابھمانی کا نام جس میں کارن و سوکشم شریر دونوں انترگت ہیں وراٹ विराट یعنی وشنو ہی۔ یہ بموجب سدھانت مت کے ہی لیکن ویشنو لوگ اس ترتیب کو اُلٹا کردیتے ہیں اور ان کے

[1] لفظ مایا اس تمام مضمون میں انگریزی لفظ فنومنیا Phenomena کے معنی میں مستعمل ہوا ہی مایا کیا ہو اگیان کیا ہی اس کے متعلق انشاء اللہ ایک بسیط مضمون کبھی لکھا جائے گا۔

نزدیک وشنو ایشور ہی جو کارن شریر کا ابھانی ہی۔ غرض کہ ذات تو ایک ہی ہی لیکن اجسام کے لحاظ سے روپ اور نام علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ پیدائش عالم کے وقت ایشور یعنی شیو سے ہی تمام شرشٹی نکلتی ہی اور پہلے سوکشم اور پھر استھول ہو کر ظاہر ہوتی ہی اور پرلے प्रलय کے زمانے میں استھول سے سوکشم ہو کر بالآخر اسی شیو یعنی ایشور میں لے लय یا فنا ہو جاتی ہی۔ غرض کہ ان تینوں شریروں کا ابھانی ایک ہی ہی، البتہ بہ لحاظ اختلاف مدارج[ل] اور نہ کہ بہ لحاظ اختلاف نوعیت اسی ایک کے تین غلاف یعنی اجسام ہیں لیکن اس پر بھی پہلا جسم دوسرے کے انتر گت ہی۔ اور پہلا اور دوسرا تیسرے کے انترگت ہی۔ شرشٹی کے ہو جانے کے بعد ان کارن وسوکشم و استھول شریروں یعنی تمام برہمانڈ یا عالم کا مالک وہی ایک وشنو نام سے موسوم ہوا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کُل عالم کو تھامے ہوئے ہیں اور اسی سے سنسکرت میں انکا ایک نام استھتی स्थिति بھی ہی، جس کے معنی قیوم کے ہیں اور پرلے प्रलय کے وقت جب تمام شرشٹی شیو یعنی ایشور میں لے یعنی فنا ہو جاتی ہی، وہی ایک کارن شریر کا مالک ایشور یا شیو نام سے باقی رہتا ہی اب اُن لوگوں سے جو ہندوؤں کو تثلیث پرست کہتے ہیں ہمارا یہ سوال ہی کہ ہندو در حقیقت موحد ہیں یا تثلیث پرست۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ ہندوؤں کے مذہب میں جو خرابیاں اب پائی جا رہی ہیں اُن کے اسباب کیا ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا سبب تو وہی دشٹ نشٹ کا جھگڑا ہی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہی لیکن اس کے علاوہ دو اور بڑے اسباب ہیں جن کا ذکر مختصراً ذیل میں کیا جاتا ہی۔

(۱) پرتیک اُپاسنا प्रतीक उपासना اور پرتما پوجن کا زیادہ تر رواج ہوتا۔ لفظ پرتیک کے معنی کسی کو کسی کے نزدیک پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں پرتیک اوپاسنا سے مراد ان اشخاص کی پرستش ہی جن کے فیضان برکت سے قربِ خدا حاصل ہو سکتا ہی یعنی دیوتاؤں سادھو سنتوں، اولیا وغیرہ کی پرستش۔ البتہ حالت ابتدائی میں اس قسم کی پرستش یا مورتی پوجا بُری نہیں، ہی لیکن اگر عمر بھر یہی رہی تو البتہ اس شخص کی حالت پر افسوس کرنا چاہیئے جو اس میں مصروف ہی۔ زمانۂ حال میں زیادہ تر اسی پرتیک اپاسنا اور مورتی پوجا کا رواج ہی اور اس سے روحانی حالت کو جیسی کچھ ترقی ہو سکتی ہی ظاہر ہی۔

(۲) ہندوؤں کے مذہب کی خرابی کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہی کہ ایک طرف تو برہمنوں میں قناعت کی صفت باقی نہ رہی اور دوسری طرف اُن کے ججمانوں نے اُن کی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا۔ زمانۂ قدیم میں برہمنوں کے لئے یہی شغل رکھا گیا تھا کہ وہ وید پڑھیں اور پڑھائیں، جگ کریں اور کرائیں اور علم و فضل کو ترقی دیں۔ ان کی پرورش ان کے ججمانوں یعنی چھتریوں اور ویشیوں سے متعلق تھی۔ اس زمانہ میں ان کو بھکشا کی کمی نہ تھی اور نہ اس کا لوبھ تھا کہ وہ بھکشا سے زیادہ جو اُن کی پرورش کے لئے ضروری ہو دھن دولت جمع کریں۔ اب ججمانوں کا یہ حال ہی کہ مفت بھکشا دینا تو جُدا رہا اگر کوئی کرم بھی برہمنوں سے کرایا جاتا ہی تو اس کی پوری دکشنا بھی اُن کو نہیں ملتی ہی مثلاً اگر کوئی ججمان سرادھ کرانا چاہتا ہی یا کوئی کتھا کہلانا چاہتا ہی تو سرادھ کرانے والے یا کتھا کہنے والے برہمن کو دکشنا صرف دو یا چار آنے دی جاتی ہی یا کتھا میں آٹھ آنہ یا روپیہ زیادہ سے زیادہ چڑھا دیا جاتا ہی جو اس کے عیال و

[ل] ۔ لفظ مدارج یہاں انگریزی لفظ Stages کے معنی میں مستعمل ہوا ہی۔

اطفال کی پرورش کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ برہمن اپنے آبائی پیشے کو چھوڑ کر دوسرے دھندھوں کا آسرا لیتے ہیں جس کی وجہ سے علم و فضل اُن سے رُخصت ہو جاتا ہے یا یہ کہ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ججمان ان کی طرف سے ہاتھ کھینچ رہے ہیں تو وہ کمائی کی دوسری ترکیبیں اختیار کرتے ہیں، چنانچہ اُنھوں نے اپنے ججمانوں سے روپیہ اینٹھنے کے طرح طرح کے ایسے اختراعات کئے ہیں جن میں اُنھوں نے اُن ججمانوں کو پہلے سے بھی زیادہ جکڑ بند کر دیا۔ آج ججمان کے گرہ اچھے نہیں ہیں، یا اُس کے بچے کے لئے فلاں گرہ بھاری ہے اُس کا جاپ کرا دیا جائے نہیں تو موت کا خوف ہے۔ بیچارہ برہمن اس طرح کچھ تو لے ہی مرتا ہے جو اس کو دوسری حالت میں کبھی نہیں ملتا۔ کتھا میں ستونس ماتر کاؤں اور نوگرہ کی اسی لئے پوجا کرائی جاتی ہے کہ اس طرح کچھ پیسے تو اور چڑھوائے جائیں گے۔ سرادھ میں ویدی پر چھپن رتوؤں کی پوجا جو بالکل غیر متعلق معلوم ہوتی ہے، صرف اسی لئے کرائی جاتی ہے کہ کم سے کم چھپن پیسے تو اور چڑھوا لئے جائیں۔ تیرتھوں میں جہاں لوگوں کے اجتماع کا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے کہ علم و فضل کے متعلق خیالات کا باہمی تبادلہ ہو، پنڈے لوگ بے طرح اپنے ججمانوں کو لوٹتے ہیں جس کی کیفیت اظہر من الشمس ہے۔ دوسری طرف ججمانوں کا یہ حال ہے کہ ناچ وغیرہ میں سیکڑوں روپیہ خرچ کر دیں گے لیکن کفایت کریں گے تو پروہت کی دکشنا میں اگر ججمان پہلے کی طرح برہمنوں کی پرورش کا خیال رکھتے اور برہمن بھی برہمن بنے رہتے تو شاید یہ نوبت نہ پہنچتی۔ غرض برہمنوں اور ان کے ججمانوں دونوں کے قصور سے ہندو مذہب کی وہ خستہ و خراب حالت ہو رہی ہے جو ناگفتنی ہے اور جس کی اصلاح کی ظاہرا کوئی امید نہیں ہے۔ گیان بھکتی اور کرم کانڈ ان تینوں طریقوں میں کیسی اعلیٰ فلاسفی ہے اس کے متعلق میرے بسیط مضامین اسی رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں اس لئے اور زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

پربھو لال

انگلستان سے ہم کیا سیکھ سکتے ہیں؟

پروفیسر مکس ملر نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں کمال فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہ بتایا تھا، کہ یورپ کی مسیحی اقوام، ہندوستان سے کیا کچھ سیکھ سکتی ہیں؟ مگر آج تک کسی نے یہ نہ بتایا کہ ضرورت زمانہ کو مدِ نظر رکھ کر، ہم ہندوستان والے انگلستان سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

سنیئے! سب سے اوّل اور سب سے اعلیٰ درجہ کا سبق جو ہم اہلِ انگلستان سے سیکھ سکتے ہیں، وہ ایک ایسی خود غرضی ہے، جو سارے نیشن کے ساتھ مجموعی طور پر علاقہ رکھتی ہے۔ انگریز ہیں تو بہت ہی خود غرض، مگر ان کی یہ خود غرضی کسی شخصِ واحد کی ذات کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی، بلکہ وہ قومی خود غرضی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا نام "مہذب خود غرضی" زیادہ موزوں ہے۔ اور یہ ہمیں صرف انگلستان ہی

کے مسیحی باشندگان سے حاصل ہو سکتی ہی۔ کسی نے بھی آج تک دعویٰ نہیں کیا کہ انگریز خودغرض نہیں ہیں؛ وہ خود بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ برعکس اس کے، ہندوستان میں یہ بات کہیں نظر نہیں آتی، یعنی وہ مجموعی صورت میں "خودغرض" نہیں ہیں۔ مانا کہ ان میں کوئی اکّادُکّا متفرّدانہ صورت میں خودغرض ہو، مگر مجموعی طور پر دیکھوگے، تو اہلِ ہند کے طریقِ معاش و معاد کی لغت میں اس کا کہیں نام نہ پاؤ گے۔ ان کو تو ابتدا ہی سے یہ سکھایا گیا ہی، کہ "یہ دُنیا گذشتنی و گذاشتنی ہی، یہاں کے دھندوں میں اپنے آپ کو نہ پھنساؤ۔ جہاں تک ممکن ہو، اُس عالم سے دل لگاؤ، جہاں ابدالآباد تک بے خوف و خطر رہنا ہوگا۔" دوسری طرف انگلستان والے اپنی ساری لیاقت، سارا زور، ساری قوت، سارے خیال، اسی میں صرف کرتے ہیں، کہ جہاں تک ہو سکے اس دُنیا میں اپنی حالت کی ترقی کریں۔ کیا ہی اچھی بات ہو، اگر برادرانِ ملک اہلِ انگلستان کی زندگیوں کا مطالعہ کریں۔ اگر مغرب کے تقدس مآب قبیسانِ اعظم کے رنگ میں ہمارے ہاں کی گہری اخلاقی فطرت رنگی جائے، تو ممکن ہی کہ ہم بھی اپنی حیثیت کو قائم رکھ سکیں

انگریزوں کی مجموعی یا قومی خودغرضی اور دنیاداری سے بالکل ملتی جلتی ان کی حبّ الوطنی ہی۔ قدیم سنسکرت زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو Patriotism کا ہم معنی قرار دیا جا سکے، یا کھینچ تان کر اس کے مفہوم کو اس کے قریب قریب کہا جا سکے، اور نہ ہی اب تک کوئی ایسی بڑی ضرورت محسوس ہوئی، جس کے دفعیہ کے لئے کوئی نیا لفظ تراشا جاتا۔ اس Patriotism (پیٹریٹ ازم) کے مفہوم کی کچھ کچھ جھلک یہاں کے دیہاتیوں میں ضرور پائی جاتی ہی، مگر وہ بھی عام طور پر نہیں۔ کیونکہ زمانۂ قدیم میں ہندوستانیوں کو کسی ایسی مشکل کا سامنا نہیں ہوا تھا، جس کے مقابل میں انھیں خیال ہوتا کہ حُبّ الوطنی بھی کوئی شے ہی۔ یہ اپنی ہی بساط کے مطابق بازی بدکے، اور اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے۔ پروفیسر شلر Schiller نے کیا خوب کہا ہی۔

دُنیا کے جملہ امور کا دار و مدار صرف بھوک اور محبت پر ہی

قدیم زمانہ میں اگر کہیں حُبّ الوطنی کی ضرورت ہوئی ہوگی، تو صرف بھوک کے لئے اور بس۔ برعکس اس کے محبت کا یہ عالم تھا، کہ مہاتما بدھ کی تعلیم میں نہ صرف بنی نوع انسان تک ہی محبت کو محدود کیا گیا، بلکہ کھلے طور پر بتایا گیا، کہ باغِ آفرینش کا کوئی گل بوٹا اس جوہر سے خالی نہیں۔ گلستانِ ہستی کے جس پھول پتّے کو چاہو گے، وہی تمہارے دل کو بھائے گا۔ چنانچہ ان کا یہ خیال ہمارے دانایانِ فرنگ کی راے میں ان کی حُبّ الوطنی یا روز افزوں ترقّی کی راہ میں سدِّ سکندری سے کم نہیں۔ کیونکہ یہ بھی خودغرضی کی ایک قسم ہی، جس کا تعلق کسی فردِ واحد کی ذات سے نہیں بلکہ سارے نیشن کے ساتھ ہی۔ انھیں جب اپنے قومی مفاد کا خیال آتا ہی، تو وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے کسی کے گلے پہ چھُری تو نہیں پھرتی، کوئی مرے یا جیے، مگر وہ اپنے قومی مفاد کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ انگریزی حُبّ الوطنی کے اصول پر کلائیو، وارن، ہسٹنگز، ڈلہوزی سب کے سب "محبّانِ وطن" تھے، کیونکہ اُنھوں نے اپنے وطن و اہلِ وطن کو متموّل بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ چونکہ اب وہ نہ پہلے کی ایسی رسمیں ہیں، نہ وہ باتیں ہیں، اس لئے یہ سمجھو کہ اب وہ زمانہ آگیا ہی جس میں اہلِ ہند کو مغرب کی مسیحی اقوام سے حُبّ الوطنی کا سبق سیکھنا چاہئے۔

حبقوق نبی کا مزار

انڈین پریس الہ آباد

نہ صرف یہی، بلکہ دُنیا کی ہوا دیکھ کر اگر ہندوستانی اپنے دلوں میں اس حُبّ الوطنی کا خیال پیدا کریں، تو انھیں کافر، مرتد، اور ملحد قرار دے کر نہ صرف برادری سے خارج کیا جائے بلکہ اُن کا خون مباح قرار دیا جائے اور اُنھیں کشتنی و گردن زدنی سمجھا جائے۔ اُس صورت میں کچھ بنے تو بنے، ورنہ کوئی اور صورت نظر نہیں آتی۔

ڈین رمزے Dean Ramsay کہتے ہیں:۔

"حُبّ الوطنی کی بدولت آدمی کے دل میں اچھے اچھے خیال پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ یہ اُسے اپنے دیس کی بھلائی اور ترقی پر آمادہ کرتی ہے۔ واجب التکریم بزرگوں کے زانو بہ زانو بیٹھنے والوں کو چاہیئے، کہ اپنے میں اچھی اچھی خصلتیں پیدا کریں۔ یہی وہ بات ہے، جس سے آج کل کی دُنیا والوں میں ایک خاص جوش پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ یہاں قدم قدم پر ہزاروں قسم کی گتھیاں ہیں جن کے سُلجھانے کے لئے بہت کچھ دل و دماغ چاہئے..... حُبّ الوطنی، ایک ایسا اصول ہے، جس کا فائدہ کسی شخص واحد کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا۔ خواہ لوگ طرح طرح کی باتیں سُنائیں، بُرا بھلا کہیں، نکو بنائیں، "خود غرض قوم" نام رکھیں، غرض کچھ ہی ہو، کسی سے ڈرنا نہ چاہئے۔"

الغرض ضرورت کے وقت ہندوستانیوں کو بھی اس قسم کی حُبّ الوطنی کے جوش کی ضرورت ہے، جس میں گویا عقل مفقود ہو۔ یہ ایک بڑا بھاری سبق ہے، جو ہم انگلستان سے سیکھ سکتے ہیں۔

ایک اور بات جو انگلستان کی بدولت ہمیں حاصل ہو سکتی ہے، وہ ہیرو ورشپ یا مشاہیر پرستی ہے۔ انگریزوں کی قوم اپنے ہاں کے اولوالعزم بہادروں کی عزّت کرنے والی قوم ہے۔ وہ اپنے ہاں کے نبرد آزماؤں، بہادروں اور نامور لوگوں کی اُن کی زندگی ہی میں اُن کی عزّت کرتے ہیں، اور مرنے کے بعد ان کی یادگار قائم کرتے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں، جو اس بات سے واقف ہی نہیں، کہ اپنے بزرگوں کی کیسی عزّت کریں۔

مسٹر کارلائل Carlyle اپنی کتاب "ماضی و حال" میں کہتے ہیں:۔

"ہیرو ورشپ کیا ہے؟ بہادروں کی سچّی عظمت و عزّت کا، اور نیز ان کے کارناموں کا خاصّہ اعتراف۔ دُنیا کے ہر زمانہ میں بنی نوع انسان کی معاشرت ایک ایسی چیز ہے جس سے ذرا سی غور کے بعد انسان کی زندگی کے لئے بہت کچھ عمدہ سبق مل سکتے ہیں۔

دُنیا میں جس قدر بڑے آدمی ہو چکے ہیں، وہی قوم کے لیڈر کہلاتے ہیں، اُنکے اوضاع و اطوار اور نشست و برخاست کا لوگوں پر خاص اثر پڑتا ہے۔ یہی بزرگ اُس خاص خیال کے پیدا کرنے والے ہوتے ہیں، جن پر عوام الناس کے لئے چلنا لابدی ہے...... لہذا چاہیے بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں کیسی ہی کیوں نہ ہوں، اُن سے کچھ نہ کچھ خاص سبق ضرور ملتا ہے۔"

دیکھئے انگلستان کی طرف۔ اس ملک کے جن بزرگوں نے کوئی نہ کوئی کام کیا ہے، لوگ اُن کے حسنِ خدمات کے صلہ میں اُن کی یادگاریں اور مجسّمے قائم کرتے ہیں، یا ایک ہم ہیں جو اپنے بزرگوں کے کارناموں کا کچھ خیال نہیں کرتے!

انگلستان دُنیا میں سب سے زیادہ متموّل ملک ہے۔ اُس کی مادّی ترقی کا مدار، اس کی اپنی صنعت و حرفت ہی پر محدود نہیں بلکہ یہ کہ اس کا اسبابِ تجارت ممالک غیر میں

جاسکے یکتا ہے۔ برعکس اس کے ہندوستان دُنیا میں افلاس کے باعث شہرت ازبام ہے۔ اگرچہ یہاں معدنی اور نباتاتی اشیاء کا ذخیرہ بکثرت ہے، مگر روپے کی کمی کچھ کرنے نہیں دیتی۔ ملک دولت مند ہو تو اہلِ ملک کو بھی کچھ فائدہ پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ فلاکت و غربت کا باعث کارخانہ دارانِ انگلستان ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ بالکل سچ ہے۔ یہاں کی قدیم دستکاریوں کو جس طرح خاک میں ملانے کی کوشش کی گئی، وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

علاوہ ازیں ہندوستان کے متموّل کچھ ایسے عقل کے دھنی ہیں، کہ اپنا روپیہ کارخانوں میں لگانا نہیں چاہتے، مگر اس کی وجہ صاف ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مینچسٹر اور ڈنڈی کے محبانِ وطن ہندوستان کی سن اور روئی کی دستکاریوں کو بھی ضرور تباہ کریں گے، اور اپنے عندیوں میں اُسی طرح کامیاب ہوں گے جیسا کہ اگلے زمانہ میں ہوچکے ہیں۔ لارڈ لارنس فرماتے ہیں:۔

"اگر سرکار اہلِ ہند کے فائدہ کی کوئی بات کرتی ہے یا کرنا چاہتی ہے تو عجب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک عام شور برپا ہوتا ہے، جس کی آواز پر انگلستان والے اور بھی زیادہ چلّاتے ہیں۔"

نپولین اعظم کی رائے میں انگریزی قوم ایک مہاجنی فرقہ ہے۔ ان سے یہ امید رکھنا کہ یہ ہندوستانیوں کو اپنے لباس اور دیگر ضروریات مہیا کرنے کی توقع دلائیں گے، بالکل غلط ہے۔ وہ کس طرح آپ اپنا گلا کاٹ سکتے ہیں۔ اُن مشنریوں اور انگلو انڈین اصحاب کو، جو ہندوستانیوں کی نسبت یہ کہا کرتے ہیں، کہ ان میں کوئی خاص جوہر نہیں ہے، کم از کم یہ کوشش تو کرنی چاہیئے کہ غریب ہندوستانیوں کو اپنے ہاں کے کارخانوں اور دستکاریوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملے۔ مگر ان سے ایسی امید رکھنا فضول ہے۔ تاہم ہمیں بیدل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر حب الوطنی کے کچھ معنی ہیں، تو ہمیں چاہیئے کہ اپنے ملک کی مصنوعات کی قدر کریں۔ یہی وہ گر ہے جس سے ہندوستان پھر ایک دفعہ تجارتی ملک ہوسکتا ہے۔

انگریزی قوم سے ہر شخص ویسا ہی دانائی کا سبق حاصل کرسکتا ہے، جیسا بنین کے مشہور ہیرو ورلڈلی وائز مین (ابن الوقت) سے۔ انگلستان والے غیر ملکی باشندوں کے ساتھ خواہ کیسے ہی ہل مل کر رہیں اور ارتباط دکھائیں، مگر جب کبھی اپنے ہموطنوں کے ساتھ مقابلہ ہوتا ہے تو دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ آؤ! ہم بھی اُن سے یہی سبق حاصل کریں اور اپنے اہلِ ملک کے ساتھ مل کر قومی ترقی کے ساعی ہوں، اور ایک دوسرے کا گلا نہ کاٹیں۔

یہ وہ باتیں ہیں جو ہم اہلِ انگلستان سے سیکھ سکتے ہیں، اور آج کل انھیں کی ہم کو ضرورت ہے۔

انشائے اُردو۔ اس نام کی ایک دلچسپ کتاب منشی سید محمود علی صاحب نے اُن خطوط سے مرتب کی ہے جو مسٹر قیصر ایڈیٹر رسالہ الحجاب کو اُن کے دوست احباب نے کسی زمانہ میں لکھے تھے ان میں بعض ہندوستان کے قابل اہل الرائے اور مشہور شاعر ہیں۔ یہ خطوط گھریلو طور پر لکھے گئے تھے جو اب بازار میں لائے گئے ہیں بعض بیگمات کے خط نہایت دلچسپ ہیں خطوط کیا ہیں اُردو علم ادب کی جان ہیں، ان میں جو دل کے سچے جذبات، بے تکلف گفتگو۔ انتہائے سلاست کے ساتھ ہے وہ کسی عمدہ سے عمدہ مضمون میں نہیں پیدا ہوسکتی۔ قیمت فی جلد ۸ر دفتر رسالہ الحجاب موتیا پارک۔ ریاست بھوپال سے مل سکتی ہے۔

بڑی بہن

(۱)

ایک دن موضع شیو گنج میں شام کے وقت کئی عورتیں ایک نیم کے نیچے باتیں کر رہی تھیں - تارا نے ایک ایسے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے جس نے اپنی بیوی کو محض اس لئے ڈنڈوں سے مارا تھا کہ وہ بلا اُس کی اجازت کے گنگا نہانے چلی گئی تھی غصہ کے ساتھ کہا "ایسے آدمی کے مُنہ میں آگ لگ جائے"!

یہ سُنکر عورتیں سناٹے میں آگئیں - کسی نے ہاتھ سینہ پر رکھ لیا - کسی نے دانتوں سے زبان دبائی - تارا کو یہ کہنا مناسب نہیں تھا - کندن نے تیوری بدل کر کہا "تارا بہن! تم زبان سنبھال کر بات نہیں کرتیں - اپنا شوہر تھا - مار ہی بیٹھا تو کیا ہوا!"

کندن جے گوپال چودھری کی بیوی تھی - بابو جے گوپال دُنیا کے اُن چند خوش قسمت آدمیوں میں تھے جنھیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے دونوں وقت لقمۂ تر کھانے کو مل جاتا ہے - وہ سال بھر میں ایک بار لگان وصول کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلتے تھے - باقی سال بھر وہ اپنے دالان میں بیٹھے گپ شپ کیا کرتے - مگر یہ گانوں اُن کی موروثی ملکیت نہیں تھی - موروثی جائداد تو بابو مدن گوپال مرحوم کے زمانہ ہی میں خورد بُرد ہو چکی تھی - جے گوپال کے خسر نے انھیں تکلیف میں دیکھکر یہ گانوں گذارہ کے لئے دیدیا تھا - وہ اس کے علاوہ ہر مہینہ میں اپنے داماد کی امداد کرتا رہتا تھا - جے گوپال کی خوب آرام سے کٹتی تھی - اور آیندہ کے لئے اُنھیں کوئی اندیشہ نہیں تھا - بوڑھا سسر لاولد تھا - اُس کے آنکھ موندتے ہی بیس ہزار سالانہ نفع کی جائداد ہاتھ لگے گی - ایسے خوش نصیب آدمی دُنیا میں کتنے ہوتے ہیں - یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جے گوپال اپنے سسر کی مبارک موت کے خواستگار تھے - مگر سال میں دو تین بار وہ اس روزِ سعید کی آرزو میں ستیہ نارائن کا پاٹ ضرور کرواتے تھے -

خیر! جے گوپال کے دس سال بڑے آرام سے گذرے - تین بچے ہوئے - پیٹ نے گنبد نما صورت اختیار کی - چاندی کے بال جھڑنے لگے - خوش قسمتی کے آنے کا راستہ صاف ہونے لگا - مگر آنا کسے تھا - اور آئی کون! جو بات نہ ہونی چاہئے تھی وہ ہوگئی - اور اُس نے جے گوپال کا مستقبل سیاہ کر دیا - ساٹھ برس کے سن میں بوڑھے خسر کے ایک بچہ پیدا ہوگیا - جے گوپال نے سُنا اور سر پیٹ کر رہ گئے - کندن نے بوڑھے باپ کو خوب جی بھر کر کوسا - اور اس طفلِ نوزائیدہ کی لاش دیکھنے کی تمنا ظاہر کی - کہنے لگی بوڑھا ساٹھ برس کا ہوا - مگر ابھی ہوس نہیں گئی - اب اُسے گلے سے باندھیں - یہ سعادتمند بیٹی تھی! خود غرضی! وائے خود غرضی!

اس بچے نے جے گوپال کی بے فکریوں اور عیش پرستیوں کا خاتمہ کر دیا - اپنی ننھی سی مٹھی سے اس نے جے گوپال کی ساری اُمیدیں اور آرزوئیں - حوصلے اور ارمان مسل ڈالے - سسرال سے نوید آیا - مگر وہ شریک نہ ہو سکے - اُنھیں اب اپنی روزی کی فکر دامنگیر ہوئی - آسام چلے گئے - اور ایک چائے کے کارخانے میں ملازمت کرلی - زندگی میں پہلی بار اتنا دور دراز سفر کرنا پڑا - وہ اب تک کبھی تنہا نہیں رہے تھے - بیوی اور بچے اُن کی زندگی

کا جزو بن گئے تھے۔ کئی ماہ تک اُن کی طبیعت نہ جمی۔ مگر جوں
جوں دن گذرتے گئے توں توں گھر کا خیال کمزور ہوتا گیا۔
سال بھر مشکل سے گذرا ہوگا کہ جگوپال کے دل میں ایک نیا
جوش پیدا ہوا۔ اور وہ یہ تھا کہ اب گھر کی حالت سُدھارنی
چاہئے۔ محبت کی جگہہ ارادوں نے چھین لی۔ پہلے ہفتہ وار
خطوط جاتے تھے۔ پھر پندرھویں دن جانے لگے۔ یہاں تک
کہ دوسرا سال گذرتے گذرتے یہ نوبت ہوگئی کہ مہینے میں ایک
خط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

مگر کندن کی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ جگوپال
سے اُسے وہی محبت تھی جو عام طور پر بیویوں کو ہوتی ہے۔
یعنی شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ وہ محبت جو
دل کو بیچین کرتی ہے۔ جو آنکھوں کو رُلاتی اور جگر کو تڑپاتی ہے۔
وہ پُرجوش جذبہ جو دل کے کل احساسات پر حاوی ہوجاتا
ہے کندن کو نہیں تھا۔ وہ کبھی اپنے شوہر سے الگ نہیں ہوئی
تھی۔ اور اس لئے اُن احساسات سے، اُن حسرتوں سے
جو کچھ فراق ہی میں اپنا زور دکھاتے ہیں وہ مانوس نہیں تھی۔
رشتہ محبت میں گانٹھ تھی۔ مگر ڈھیلی۔ لیکن جدائی کے اس
جھٹکے نے اس گانٹھ کو مضبوط کر دیا۔ محبت کی آگ جو دبی ہوئی
پڑی تھی جدائی کی ہوا پاکر بھڑک اُٹھی۔ کندن کے دل میں
ایک نئے اور پُرجوش محبت نے عود کیا۔ وہ اکثر خاموش اور
اُداس رہنے لگی۔ تنہائی سے اُس کی طبیعت مانوس ہونے
لگی۔ کبھی کبھی اکیلے میں رویا کرتی۔ خطوط زیادہ پُرشوق ہونے
لگے۔ وہ سوچتی بلا سے مجھے موٹے کپڑے پہننے پڑیں گے۔
میں گاڑھا پہنوں گی۔ بلا سے مجھے تکلیف ہوگی۔ میں تکلیف سہوں گی
کندن اگرچہ کئی بچوں کی ماں تھی۔ مگر اس وقت اُس کے دل میں ایک
نشۂ شباب کی متوالی نازنین کا جوشِ محبت اُمڈنے لگا۔ اُس کو
کتنی ہی ایسی باتیں یاد آتی تھیں جو اُس نے جگوپال کا دل
دکھانے کے لئے کہی تھیں۔ کتنی بار وہ اُن سے روٹھی تھی۔
کتنی بار اُن سے لڑی تھی۔ ان باتوں کو یاد کرکے وہ روتی تھی۔
اُس نے سچے معصومانہ جوش کے ساتھ اپنے دل میں عہد کیا
کہ اب میں اُنھیں کچھ نہ کہوں گی۔ وہ جیسے رکھیں گے ویسے
ہی رہوں گی!

(۲)

بڑھاپے کی اولاد بہت پیاری ہوتی ہے۔ اس نوزائیدہ
بچّہ نے جس کا نام نونی چندر رکھا گیا تھا اپنے بوڑھے ماں باپ
کی قسمت جگا دی۔ اُن کی محبّت چاروں طرف سے سمٹ کر
اُس پر جم گئی۔ وہ لڑکا نہیں تھا۔ اُن کی مدت العمر کی دعاؤں
اور آرزوؤں نے انسانی شکل اختیار کر لی تھی۔

مگر بوڑھے ماں باپ کی تقدیر میں بچے کا سُکھ دیکھنا
نہیں بدا تھا۔ تیسرے سال اُس کی ماں بیمار پڑی۔ اُسے معلوم
ہوا کہ اب میں نہ بچوں گی۔ تب اُس نے کندن کو بلوایا۔ کندن
جانے سے ضرور انکار کر دیتی۔ کیونکہ اُسے اب اپنے ماں باپ
سے نفرت ہوگئی تھی۔ مگر اُن دنوں شیو گنج میں پلیگ پھیلا
ہوا تھا۔ کندن کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔

کندن کی ماں اُسے دیکھکر بہت خوش ہوئی اور خوب
روئی۔ باپ نے ہزاروں دعائیں دیں۔ مگر مکان کی مہریاں
اور لونڈیاں اس مہمان کو دیکھکر جل گئیں اور اُس کی طرف طنز آمیز
نگاہوں سے دیکھتیں۔ اکثر اُس سے بے ادبی کر بیٹھتیں۔
مہری کہتی اب کوئی کہاں تک پانی بھرے۔ دن بھر پانی ڈھوتے
ڈھوتے کولھا رہ جاتا ہے۔ مہراجن کہتیں یہ لڑکے جانے کہاں کے

جشودھا جی

انڈین پریس الہ آباد

مربھوکے ہیں۔ چولھا جلا نہیں کہ سب آکے گھیر لیتے ہیں۔ کُندن یہ سب سُنتی اور پی جاتی۔ اپنی ماں کی تکلیف دیکھ کر اُس کا دل کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔ آخر ایک روز بوڑھی عورت کی حالت بہت نازک ہوگئی۔ اُس نے نونی چندر کا ہاتھ پکڑ کر کندن کے ہاتھ میں دیا۔ اور روتی ہوئی دُنیا سے سدھار گئی۔

ماں کے مرتے ہی کندن کے مزاج میں ایک خوش آیند تبدیلی واقع ہوئی۔ نونی چندر سے جو اُسے نفرت تھی وہ جاتی رہی۔ اُس مرجھائے ہوئے یتیم بچہ کو دیکھ کر اُسے اُس پر ترس آتا۔ جب اُس کے اپنے لڑکے نونی کو مارتے۔ اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے آتا۔ اور "جی جی" کا آنچل پکڑ کر فریاد کرتا تو کُندن کا کلیجہ مسوس اُٹھتا تھا وہ نونی کو مادرانہ جوش کے ساتھ گود میں اُٹھا لیتی۔ اور کلیجہ سے چمٹا کر پیار کرتی۔ کندن کے مزاج میں یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی۔ شائد اس لئے کہ بوڑھی ماں نے بچے کو اس کے سپرد کیا تھا۔ یا ممکن ہے کیسی کے خیال نے نفرت پر فتح پائی ہو۔ بہرحال کُندن اب اپنے بھائی کو اپنے بچے سے زیادہ چاہنے لگی۔ نونی کی فریادیں اب اکارتھ نہ جاتیں۔ اگر کبھی طفلانہ مناقشات میں نونی ہی جسارت کرتا تو بھی کُندن اسے سزا نہ دیتی۔ نونی کو روتے دیکھ کر اُس کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا۔ اور بچہ بھی اُس سے کچھ ایسا ہلا کہ اپنی ماں کو بھول گیا۔

تین مہینے کے بعد کُندن کا باپ بھی مرا۔ اُس نے اپنی وصیّت میں جگو پال کو نونی کا سرپرست قرار دیا۔ اور گذارہ کے لئے اُسے ایک گانوں بھی دیا۔ کُندن اب اُس گھر کی مالک ہوئی۔ اور نونی اُس کے دل کا۔

جگوپال خبر پاتے ہی آسام سے چلے آئے۔ اور زمینداری کا انتظام کرنے لگے۔

(۳)

جگوپال اب پہلے کا سا بے فکر۔ آزاد منش آدمی نہ تھا۔ اب وہ شاطر۔ معلہ فہم۔ دُنیادار بابو بن گیا تھا۔ اُسے روپیہ کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ اور ہر دم اسی دُھن میں رہتا۔ پردیس میں اُس نے خوب کمایا۔ اور خوب خرچ کیا۔ چاے کے باغوں میں ناجائز نفس پرستیوں کے بے شمار موقعے ہیں۔ ان سے اُس نے خوب دل کھول کر فائدہ اُٹھایا۔ خلاصہ یہ کہ اُس کے مزاج میں اب چھچھورا پن آگیا تھا۔ اور کندن جیسی سیدھی۔ بھولی عورت جس کی نگاہوں نے سامنے تاکنا نہیں سیکھا تھا اب اُس کے دل کو قابو میں نہ رکھ سکتی تھی۔ اُس نے ایک عرصہ دراز کے بعد اپنے شوہر کو پھر پایا تھا۔ اور اُس کی دلجوئی وخاطرداری میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم ہوگئی تھی۔ مگر جوں جوں وہ نزدیک آنے کی کوشش کرتی۔ توں توں جگوپال اُس سے دُور بھاگتا تھا۔

جگوپال نے پہلے ہی دن سے نونی چندر کے ساتھ مغائرت کا برتاو کرنا شروع کیا۔ اُس کی طرف دیکھتا تو نفرت کے ساتھ۔ بات کرتا تو ترش لہجہ میں۔ کُندن بھائی کی محبت میں شوہر کو اپنا شریک بنانا چاہتی۔ لیکن اگر وہ کبھی اُسے گود میں لے کر جگوپال کے پاس چلی جاتی تو وہ نفرت سے مُنہ پھیر لیتا۔ کچھ دنوں تک غریب کندن نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح جگوپال کے دل میں صفائی ہوجائے۔ مگر آخرکار اُسے معلوم ہوگیا کہ اُس نے نونی کا قصور اب تک نہیں معاف کیا۔ اور نہ اب اس کی توقع تھی۔ اور وہ قصور کیا تھا؟ پیدا ہونا!۔

پہلے جب کبھی نونی اور اُس کے بھائیوں میں جنگ ہوتی تو کندن ہمیشہ اپنے یتیم بھائی کی طرف رہا کرتی۔ اس لئے ان کو نونی کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر اب عدالت کا رُخ پلٹ گیا تھا۔ نئے منصف نے آکر نیا قانون جاری کیا تھا۔ جو فریاد کرتا تھا اُسی کی سزا ہوتی تھی۔ جب کبھی جگوپال نونی کو مارتے۔ اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے آہستہ آہستہ کندن کے پاس آتا تو وہ اُسے گود میں اُٹھا لیتی۔ اور مکان کے کسی گوشہ میں جاکر خوب روتی۔ اور جب تک نونی اُسے چپ نہ کراتا رویا کرتی۔ جوں جوں جگوپال نونی کے ساتھ زیادہ بے رحمی کرتے توں توں کندن کے دل میں اُس کی محبت زیادہ ہوتی۔

جگوپال کو نونی کا رونا اور بولنا سنکر بخار سا چڑھ آتا تھا۔ اور جس وقت وہ نیند میں ہوتے اس وقت تو نونی کی زبان کا کھُلنا گویا شامت کا آنا تھا۔ جب وہ سوتے تو کُندن بھائی کو گود میں لے کر سب سے اونچی منڈیر پر لے جاتی۔ اور اُسے تھپک تھپک کر لوریاں سُناتی اور سُلاتی۔ اسی بنا پر کبھی کبھی جگوپال کُندن کو بھی سخت سُست کہہ بیٹھتا تھا۔ دُرگاپوجا میں اُسنے اپنے لڑکوں کے لئے ریشمی کپڑے بنوائے۔ مگر نونی کے لئے معمولی کپڑے بھی نہ بنوا سکا۔ کندن اپنے بیکس بھائی پر یہ ظلم دیکھتی اور دل ہی دل میں پیچ کھا کر رہ جاتی۔ نونی اُس سے اس قدر ہل گیا تھا کہ دونوں وجودوں میں اب کوئی فرق نہ باقی رہا تھا۔ کُندن کے دل میں اب جگوپال کی عزت روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ وہ اُسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی۔ وہ کبھی نونی کو اُس کے پاس تنہا نہ رہنے دیتی۔ اس قدر بدگمان ہوگئی تھی! وہ اس معاملہ میں باوجود لی کوشش کے جگوپال کے ساتھ وفاداری کا برتاؤ نہیں کر سکتی تھی۔

جگوپال بھی کُندن کی جانب سے حد درجہ بدظن ہوگیا تھا۔ پہلے وہ نونی کو اپنی خواب زندگی کا پریشان کرنے والا سمجھتا تھا۔ اب کُندن کو۔ کُندن ہی اُس راستہ میں ایک کانٹا تھی جو اُسے دولت و ثروت کی طرف لے جا رہا تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے اب مطلق ہمدردی نہ تھی۔ کُندن کے دل میں یہی ایک معما تھا جو اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

(۴)

بھیادوج کی تقریب آئی۔ کُندن نے آج برت رکھا۔ آج کے لئے اُسنے پہلے ہی سے تیاریاں کر رکھیں تھیں۔ نونی کے لئے اس نے گلابی رنگ کا ریشمی کوٹ۔ نیلے کنارے کی دھوتی۔ سنہرا ریشمی دوپٹہ منگا رکھا تھا۔ صبح اُس نے نونی کو اُبٹن سے مَلا۔ نہلایا۔ کپڑے پہنائے۔ اور دستور کے موافق اُس کے ماتھے پر دہی اور چاول کا ٹیکہ لگا دیا۔ نونی خوش رنگ کپڑے پہنے گانوں میں کھیلتا پھرتا تھا۔ صاف گو تارا بھی کسی کام سے اس گانوں میں آگئی تھی۔ یہاں طرح طرح کے چرچے ہو رہے تھے۔ تارا نے سُنا اور غصہ میں بھری ہوئی کُندن کے پاس آکر بولی "بہن! یہ کیا سوانگ رچتی ہو۔ دکھانے کے لئے تو نونی کا ایسا لاڈ پیار ہے۔ مگر گھر بھر اُس کی جان کا گاہک ہو رہا ہے۔ سونے کے کور میں زہر ملا کر دے رہی ہو"

کُندن نے غصہ سے کہا۔ "تارا۔ برس برس کے دن ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو"۔

تارا نے جواب دیا۔ "میں کوئی بات اپنے من سے بنا کر تھوڑے ہی کہتی ہوں۔ گانوں میں جو کچھ سُنا ہے وہ تم سے آکے کہہ دیا۔ جس کی بدولت تمہیں ساری دُنیا کا سُکھ

مل رہا ہو اسی کے لئے اب کانٹے بوئے جا رہے ہیں۔ شیخوپورہ
میں ۸ ریہ تمہارے بھانجے کھرو گوپال کا نام چڑھا دیا گیا ہے۔
اور کئی علاقوں میں ایسی ہی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ مگر یاد رکھو
ایسی دولت کبھی ہضم نہیں ہوتی۔ ایشور سب دیکھتا ہے۔"

کندن رونے لگی۔ جب جگوپال گھر میں آئے تو اُس
نے یہ ذکر چھیڑا۔ جگوپال بولے۔ "میں تو چاہتا تھا کہ یہ بات تمہارے
کان تک نہ پہنچے۔ مجھے خود بڑا دھوکہ ہوا۔ بات یوں ہوئی کہ میں نے
شیخوپورہ کا انتظام کھرو کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر کھرو نے
سرکاری لگان باقی ڈال دی۔ اور جب وہ گاؤں نیلام
پر چڑھا تو اُسے اپنے نام سے خرید لیا۔ مجھے بھی تو کل معلوم
ہوا ہے۔"

کندن۔ "تو تم عذرداری کیوں نہیں کرتے؟"

جگوپال۔ "عذرداری سے اب کوئی کام نہ چلے گا۔ علاوہ اسکے
اپنے بھانجے سے مقدمہ بازی کرنا بدنامی کی بات ہے۔
لوگ ہنسی اُڑائیں گے۔"

کندن کو اطمینان نہیں ہوا، وہ سمجھ گئی کہ یہ سب چالیں نونی
کے تباہ کرنے کے لئے چلی جا رہی ہیں اس کی عقل اب کچھ کام
نہ کرتی تھی۔ عورت ان معاملات کو کیا سمجھے۔ میں کیسے نونی
کو بچاؤں۔ کیا بیکسوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ کیا دنیا میں کوئی
انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی مجھے کلکٹر صاحب کے پاس
لے چلتا تو میں اُن سے سب حال کہہ سناتی۔ مجھے خود جانا
چاہیئے۔ میں بڑے لاٹ تک فریاد لے جاؤں گی۔ مگر
نونی پر ظلم نہ ہونے دوں گی۔

۵

اس کے کچھ دنوں بعد نونی بیمار پڑا۔ برسات کے
دن تھے۔ چاروں طرف ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ نونی بھی اُس کا
شکار ہوا۔ تین دن بخار نہ اُترا۔ اور نہ بچے نے آنکھیں کھولیں۔
گاؤں میں ایک بیدجی تھے۔ وہ دونوں وقت آتے اور
دوا دیتے۔ مگر اُن کی دواؤں سے مطلق افاقہ نہ ہوا۔ چوتھے
دن کندن نے جگوپال سے کہا "جاکر شہر سے ساردا بابو
کو لے آتے تو اچھا ہوتا۔ نونی کا بخار اب تک نہیں اُترا۔"

جگوپال نے لاپروائی سے کہا۔ "ساردا بابو
جانے شہر میں ہیں یا نہیں۔ ابھی دو چار روز اور بیدجی کی دوا
کھلاؤ۔"

کندن۔ "بیدجی کی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور اُس
کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔"

جگوپال۔ "ابھی کُل تین ہی دن تو بخار آیا ہے۔"

کندن۔ "تم ذرا چل کے اُسے دیکھو تو۔ کیسا پیلا ہو گیا ہے۔"

جگوپال۔ "اچھا کل میں ڈاکٹر بابو کے پاس جاؤں گا۔"

جگوپال سویرے اُٹھے۔ اور دن بھر غائب رہنے
کے بعد شام کو خبر لائے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔
کہیں مفصل میں گئے ہیں۔ کندن کو شوہر کی باتوں پر یقین
نہ آیا۔ رات کو جب سب سو گئے تو اُس نے نونی کو گود میں
لیا۔ گاؤں سے ملی ہوئی سارد ندی بہتی تھی۔ گھاٹ پر آکر
ایک کشتی کرایہ کی۔ اور بارہ بجے وہ ڈاکٹر صاحب کے مکان
پر پہنچی۔ ساردا بابو اس کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ دیکھتے ہی پہچان
گئے۔ کندن کو اس حالت میں دیکھ کر اُنھیں بہت رنج ہوا۔
صورتِ حال سمجھ گئے۔ کندن کے لئے دو کمرے خالی کر دئے
ایک مہری کا انتظام کیا۔ اور نونی کے معالجہ میں مصروف ہوئے۔
رات گذری۔ علی الصباح جگوپال جامہ سے باہر۔

غصہ سے کانپتے ہوئے پہنچے اور کندن سے کہا "خیریت چاہتی ہو
تو اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔"
کندن نے جواب دیا۔ "تم اس وقت میرا گلا بھی کاٹ
ڈالو تو میں نہ جاؤں گی۔"
جگ گوپال۔ "اچھا تو اب میرے گھر مت آنا سمجھیں!"
کندن نے اب کی تن کر جواب دیا۔ "تمہارا گھر! وہ گھر
تو میرے بھائی کا ہے۔"
جگ گوپال گھونسا تانکر رہ گیا۔ اسی وقت وہاں سے
آکر رہنے کا مکان اور باغ اپنے بڑے لڑکے کے نام لکھوا
لیا۔ اور دوسرے دن اس کی رجسٹری بھی ہوگئی۔
کندن ہفتہ بھر ڈاکٹر صاحب کے یہاں رہی۔ لونی
کو صحت ہو چلی تھی۔ اس کا ارادہ ابھی اور ایک ہفتہ بھر رہنے
کا تھا۔ مگر گھر اور باغ کے بیع ہونے کی خبر نے اسے وہاں
نہ ٹھہرنے دیا۔ ڈیڑھ دو ہزار کی جائداد ہاتھ سے نکلی جاتی ہو!
اپنے بیٹے کو کندن اس وقت غیر سمجھ رہی تھی۔ بھائی بیٹے
سے بھی پیارا ہو گیا تھا۔

(۶)

کلکٹر صاحب موسم سرما کا دورہ کر رہے تھے شیخوپورہ
میں قیام کیا۔ صبح کے وقت وہ اپنے خیمہ کے سامنے بیٹھے
ہوئے تھے۔ آس پاس کے مواضعات سے زمیندار اور
رؤسا سلام کرنے کو حاضر ہوئے تھے۔ بابو جگ گوپال بھی سیاہ
الپاکے کی چپکن پہنے، سفید پگڑی باندھے سلام کو حاضر ہوئے۔
صاحب بہادر نے ان کی غیر معمولی طور پر عزت کی۔ اور ان
کے لئے کرسی منگائی۔ جگ گوپال کو ہفت اقلیم کی دولت
مل گئی۔ ایسا خوش نصیب کون ہوگا۔ گیان پور کے چکرورتی
اور شاہ گنج کے چودھری یہی ارمان لئے بیکنٹھ سدھار گئے۔
جگ گوپال نے چاروں طرف تفاخرانہ انداز سے دیکھا۔ گاؤں
کے بنئے اور مزدور انکی یہ عزت دیکھکر سکتے میں آگئے۔ افسوس
سام گنج کے ستر بابو یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ دیکھتے کہ میری کیسی
عزت ہے!
یکایک ایک عورت سر سے پیر تک چادر اوڑھے
ایک پنج سالہ لڑکے کی انگلی پکڑے آئی اور کھڑی ہوگئی۔ صاحب
نے پوچھا تم کون ہو۔ کندن بولی "حضور میں اسی گاؤں
کی ایک دکھیاری عورت ہوں۔ آپ کے پاس فریاد لیکر
آئی ہوں۔"
صاحب۔ "اچھا۔ اجلاس کے کمرے میں چلو۔ ہم ابھی آتا ہے۔"
کندن۔ "نہیں حضور۔ میری عرض یہیں سن لی جائے۔"
جگ گوپال کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک
رنگ جاتا تھا۔ کھسیائے ہوئے بندر کی طرح کندن کی طرف
گھور رہا تھا۔ اگر صاحب کا خوف نہ ہوتا تو وہ ضرور اس پر
حملہ کر بیٹھتا۔
کندن کہنے لگی "حضور۔ یہ لڑکا میرا بھائی ہے میں
بابو مادھو سودن کی لڑکی ہوں۔ جن کا دو سال ہوئے
انتقال ہو گیا۔ یہ بابو صاحب جو آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے
ہیں میرے شوہر ہیں۔ میرے باپ کا جب انتقال ہوا تو
انھوں نے ان بابو صاحب کو اپنے نابالغ بچے کا ولی
قرار دیا۔ اور اپنی زمینداری کا ہر ان کے گذارے کے
لئے وصیت میں لکھ گئے۔ مگر ان بابو صاحب کی اب نیت
بدلی ہوئی ہے۔ یہ میرے غریب بھائی کی ساری جائداد
اپنے اور اپنے لڑکوں کے نام کرتے جاتے ہیں۔ کوئی ان کا

ہاتھ روکنے والا نہیں۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ ان کے قابو میں ہوں۔ کچھ بول نہیں سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضور کے راج میں ایک یتیم پر قہر ٹوٹ جائے گا۔ اور اُس کی جائداد دوسروں کے تصرف میں آجائے گی۔ اسی لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں کہ یہ لڑکا آپ کو سونپ دوں۔ اب اس کے ساتھ انصاف کرنا آپ کا دھرم ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیں کیا کریں۔"

یہ کہہ کر کُندن خاموش ہوگئی۔ جگوپال نے غیظ و غضب سے بیچ میں کئی بار چھیڑنے کی جرأت کی۔ مگر صاحب کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ آخر صاحب نے اُن سے پوچھا "یہ سب سچ ہے؟"

جگوپال بولے "حضور، میں حضور کیا عرض کروں۔ بابو مادھوسُدن قرض چھوڑ گئے تھے۔ سو حضور کچھ زمین مکفول کر کے قرض ادا کیا گیا۔"

صاحب "اچھا آج کُل کاغذات ہمارے سامنے پیش کرو۔"

جگوپال "بہت اچھا حضور۔"

صاحب نے تب کُندن سے کہا "اچھا اب تم جاؤ۔ ہم اس معاملہ میں خوب کوشش کریں گے۔ تمہارے بھائی کی جائداد کوئی نہیں لے سکتا۔ تمہاری نیکی اور مستقل مزاجی سے ہم بہت خوش ہوا۔"

کُندن نے جھک کر زمین چومی۔ اور نونی کو گود سے اتار کر صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ نونی رونے لگا۔ مگر صاحب نے اُسے پُچکارا۔ اور ایک ٹینس کا گیند دیکر اُسے بہلایا۔ جب کُندن چلنے لگی تو صاحب نے پوچھا "اس لڑکے کو اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔ کیا کوئی خوف ہے؟"

کُندن۔ حضور "اب میں اُسے آپ کے سپرد کر چکی ہوں میرے ساتھ وہ نہیں رہ سکتا۔"

صاحب "اور تم کہاں جاؤ گی؟"

کُندن "میں اپنے شوہر کے ساتھ جاؤں گی۔"

کُندن نے نونی کو گلے لگا کر پیار کیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے رخصت ہوگئی۔

ایک ہفتہ میں علاقہ کورٹ آف وارڈس کے زیر تحت آگیا۔ اور نونی کو پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر رکھ دیا گیا۔ جگوپال آسام چلے گئے۔ مگر کُندن کو پھر کسی نے نہ دیکھا۔ وہ جس دن صاحب کے یہاں سے لوٹی اُسی دن اُسے ہیضہ ہوگیا مگر گاؤں والے اب بھی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اور صاف گو تارا اب بھی کہتی ہے کہ کُندن کو ہیضہ نہیں ہوا تھا۔

د۔ ر

دہلی سے ایک نیا با تصویر ماہوار رسالہ جاری ہوا ہے جس کا نام "تمدن" ہے۔ اس کے ایڈیٹر شیخ محمد اکرام اور مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری ہیں شیخ محمد اکرام عرصہ تک مخزن کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکے ہیں، اس لئے اُردو خواں پبلک اُن کے نام سے اچھی طرح آشنا ہے۔ رہے مولوی محمد عبد الراشد، سو وہ زبانِ اردو کے مستند انشا پرداز ہیں، اور بیگماتی زبان و محاورات لکھنے میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایسے دو قابل حضرات کی ایڈیٹری میں جو رسالہ شائع ہوگا، وہ کیسا ہوگا۔ "تمدن" کے مقاصد میں زبانِ اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوقِ نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہنچانا ہے، پالٹیکس سے یہ بالکل الگ ہے۔ اب تک دو نمبر (اپریل و مئی) شائع ہوئے ہیں، اور دونوں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہیں، جو اس وقت ملک و قوم کے واسطے مایہ ناز ہیں۔ حجم ۴۸ صفحہ قیمت سالانہ مع محصول ۲ روپے۔ ہم نہایت تپاک کے ساتھ اپنے اس نئے ہمعصر کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور ہماری دلی دعا ہے کہ خدا اس کو اس کے مقاصد میں کامیاب کرے۔

شہیدِ وفا کی تربت

اور رسم وداع دو پھول

سوادِ منظرِ شہرِ خموشاں کیا ہی دلکش ہی
ٹھہر جانا ذرا اک قبر پر جب تم اُدھر جانا

قلم فسانہ طرازِ جذباتِ عشق و محبت شیریں ادا کا یوں زمزمہ پیرا ہی، کہ ایک آپ بیتی سنانے والا سوگوارِ غم شہید وفا یوں کہتا ہی کہ:-

۲۶- مارچ سنہ ہفتہ کا روز بقول بعض احباب کے میری بازگشتِ وطن کا طرب افزا دن تھا، لیکن دلی تعلقات کے حسرتناک نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے اُس شہر مینو سواد (حیدرآباد) سے کوچ کا دن تھا، جس کی آغوشِ بہار رو کا مراتی میں مری محبت نصیب جانِ شیریں اور رشکِ نور جہاں .... نے بھولے بھالے شباب کے ۱۷ سال گذارے تھے، اور اب سلسلۂ حیات منقطع ہو جانے سے وہ پری جمال وہیں ایک پُر فضا مقام پر ایک شفاف اور جاری چشمہ کے کنارے خوابِ نوشینِ عدم کا لطف لیتے لیتے ہمیشہ کے لئے سوگئی تھی۔

تیاری سفر سے شبِ گذشتہ ہی کو فراغت حاصل کی جا چکی تھی، اور مخصوص آج کے لئے جو کام اُٹھ رہا تھا، وہ دوستوں سے الوداعی ملاقات، اور رخصتی معانقہ تھا۔

قاعدہ ہی کہ جب کوئی غیر معمولی سفر یا حالت پیش آنے والی ہوتی ہی، تو خیالات میں پہلے ہی سے مد و جزر شروع ہو جاتا ہی، اور اسی حال میں کہیں آنکھ لگ گئی، تو عالمِ رؤیا کی نیرنگی اور بوقلمونی کا پھر کیا کہنا، الغرض اسی طبعی اصول نے یہاں بھی رات بھر عجیب عجیب گل کھلائے، مناظرِ عبرت دکھا کر کبھی دل کو خدا ترسی کے پاک جذبہ سے منور کیا، اور کبھی چشمِ باطن پر پٹی باندھ کر ایسا لبریز جامِ عیش پلایا، کہ دل نے جوشِ مسرت و شادمانی کی لہریں لیں، کبھی میدانِ فنا کے گم گشتہ یاروں سے دوچار کیا، بالآخر صبح سویرے، منہ اندھیرے، رات بھر کے بھولے بھٹکے کو اُٹھا کر بٹھا دیا۔

خوابگاہ سے اُٹھ کر چوکی پر گیا، حمام کیا، اور وضو کر کے نمازِ صبح ادا کی، اب جھٹپٹا اور صبح کا سہانا وقت تھا، وقت کی دلچسپی نے دل میں گدگدا دیا، جھٹ کپڑے پہنے، اور باہر نکل آیا۔

"جاؤں تو کدھر؟"

یہ خیال آیا ہی تھا کہ جذبِ محبت نے (اُس غزالِ رعنا اور رشکِ زلیخا کے جذبِ محبت نے جو محبت کی سچی، اور بات کی پکی تھی، جس نے نہایت استقلال سے راہِ وفا میں اپنی جان دی تھی، پر دل کے بھید سے زبان تک کو آشنا نہ کیا تھا، اُس کی جذبِ محبت نے جو میرے حریمِ دل کی شمع کافوری تھی، اور جس نے دستِ قضا سے مرگِ شباب کا چھلکتا جام ابھی ابھی چڑھایا تھا) بازو تھاما، اور گورِ غریباں کی طرف لے چلا۔

نکلا تو اس طمع سے تھا، کہ اس سہانے وقت میں کسی سرسبز و شاداب مرغزار یا پھلے پھولے چمن کی ہوا کھاؤں گا جس سے فرحت حاصل ہوگی، اور عطر فرشِ بحری کے مشکبو

جھونکوں سے مشامِ جان معطر ہوگا، اور جا رہا ہوں کدھر؟
اس خیال کی کامیابی میرا رُخ بدلنے کے لئے یقینی تھی، اگر وہ لطیف اور غیر فانی جذبۂ محبت (وہ جذبہ جس میں ذوق و شوق کی بیتابیاں اور گرمیِ عشق اس روحِ آزاد اور نورِ مجسم کے ساتھ اس کی حالت تقیید سے زیادہ بڑھ گئی تھی، وہ جذبہ جو اکثر استغراقی حالتوں میں ایک زبردست قوت کے ساتھ مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا، وہ جذبہ جس کا افسوں مجھ پر میرے اگلے اور ناقص خیال کے مطابق اس کی دُنیا میں رہنے ہی تک چلا تھا، اور اس حور شمائل کے جنت سدھار جانے کے بعد خود اس سے زندگی کا دور دسر جانے اور خمار بادۂ ہستی اتر جانے کی طرح میرے سر سے بھی اس کا سودا نکل جانا چاہئے مگر سوزِ محبت کی جلن دل سے نہ گئی تھی، بلکہ اور دو نی ہو گئی تھی،) میری رہبری نہ کرتا، الغرض اسی کشش نے مجھے اس بالینِ مزار تک پہنچایا، جس میں وہ ملکۂ حسن فنا کی دارو بیہوشی پئے ہوئے خوابِ شیریں کے مزے لے رہی تھی، بغرض فاتحہ اس ۴۳ روز کے عرصہ میں اس شہرِ خموشاں اور گنجِ شہیداں میں بارہا آنے کا اتفاق ہوا تھا، لیکن آج کا آنا وہ روز کا آنا نہ تھا، کسی بڑے سفر کے موقعہ پر پیارے اور عزیز دوستوں سے آخری ملاقات کا سماں عموماً موثر اور رقت خیز ہوا کرتا ہے، لیکن اس وقت اس برزخ بسانے والے دوست کی روحانی ملاقات کا سین جیسا کچھ پُر تاثیر تھا، اس کے دکھانے کے لئے نہ میری زبان میں یارائے بیاں ہے، نہ قلم میں طاقتِ اظہار۔

دردِ دل کے ذوق چشیدہ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ زندگی دھڑاکے جس نے ایک سچا غمخوار، اور دردمند پایا ہو، اور صبر کی سل سینے پر رکھکر اپنی یہ قسمت بھی قسامِ ازل کے سپرد کر دینے پر مجبور ہوا ہو، اور صبح و شام محض اس قتیلِ تمنا اور شہیدِ وفا کی تربت دیکھکر اپنے حسرت نصیب دل کی آرزوئے دید اور شوقِ لقا بر لاتا ہو، یا دو چار اشک آنکھوں سے بہا کر گرمیِ شوق کم کرتا ہو، لیکن یہ سودائے سنگین میں کھویا ہوا شخص اپنی اس طرفہ آرزو سے بھی محروم کیا جا رہا ہو، اور وہ بلبلِ شیدا صیدِ دامِ حوادث ہونے سے پہلے اس پھول کی آخری بو سونگھنے کے لئے چمن میں آ نکلے،

الغرض ان کیفیاتِ درد و غم کی برچھیاں کھایا ہوا دل مرے سینے میں تھا، تربتِ جاناں پیشِ نظر تھی، اور اور کچھ کم دو سال کی بامزہ صحبتوں کا نقشہ خزانۂ خیال میں، پردۂ کثافت ہٹا، چشمِ وجدان کھلی، مادی زبان زیادہ مضغۂ گوشت جو منہ کے اندر زبان کے نام سے نامزد ہے بند ہوئی، لسان القلب میں اشراقی قوتِ گویائی آئی، پھر جن لطیف اور پاکیزہ جذبات سے صدقِ صافی یا بیت السوز معمور ہوا، ان کی تعبیر الفاظ میں یہ ہو گی۔

"اے فنا ہراہِ فنا کے بھولے بھالے مسافر! اور اے بسترِ خاکی پر آرام کرنے والے گل پیرہن! تو بوئے گل کی طرح چمن زارِ ہستی سے صحرائے عدم کو سدھاری، لیکن اپنے دلدادۂ حسن اور شیفتۂ جمال کو، جس کے دل کو تابِ مفارقت ہرگز نہ تھی، سسکتا چھوڑا۔ بھلا! اس مہجور کو جینے میں کیا خاک لطف آئے گا، جس کا کوئی غمخوار رہو نہ ہمدم،

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ہائے! تیرا وہ رنگ تھا، جسے دیکھا نہ سنا، حسنِ صورت

میں تجھے اگر ملائک فریب کہا جائے۔ تو حُسنِ سیرت میں تو آپ
اپنی نظیر تھی، تیرا مذاق اور رنگ طبیعت بھی صورت کی طرح شگفتہ
اور سیرت کی طرح پاکیزہ تھا، تیری خوبی صرف یہی نہ تھی، کہ دستِ
قدرت نے چند نمائشی زیوراتِ آفرینش سے تجھے آراستہ کردیا تھا،
بلکہ تیری فطرت کو وہ جوہر بھی ودیعت کر رکھا تھا، جس سے
تیری طبعِ نازک نے تحصیل و اکتساب کی خوبیوں سے مُعرّیٰ رہنا
بھی گوارا نہ کیا، اور دستِ طلب نے معارف کے موتی بال بال
پرو دیے۔

آہ! تو فنونِ لطیفہ کی شائق تھی، تیری زبان میں وہ شیرینی
کہ جسے سُننے والے اعجاز کہیں اور بُلبُل چہکے۔ تیرے دستِ نگارش
میں وہ رنگینی کہ نقطہ نقطہ سے فصاحت ٹپکے۔ تیری وہ گاہے
ماہے تنہائی میں محبت اور فلسفۂ محبت پر شیوا بیانیاں جس سے
حُسنِ تعلقات اور لگاوٹ کے پنہاں اسرار عیاں ہوں، بلبلِ شیدا
بھی سُنے تو وجد میں آئے، تیری وہ شاعرانہ گونج، عاشقانہ دھن
میں غزل سرائی، طوطیِ چمناں بھی سُنے تو ہم آواز ہو جائے۔
اور ان سب خوبیوں سے بالاتر تیرا شیوۂ دردمندی۔

جس طرح تیری صورت میں جاں بخشی، تیری آواز میں سامعہ
نوازی کی شان تھی، تیری سیرت میں دل نوازی، اور نگاہِ دست
میں کیمیا سازی کی ادائے خاص بھی تھی، تیرا غنچۂ خاطر نسیم ہمدردی
کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے سدا شگفتہ رہتا تھا، مہک ایسی
کہ دلوں کے کنول دیکھ کر کھلیں، مگر ذرا کلمۂ دردکسی ہمنشیں کی
زبان سے سُنا، اور پھول سے زیادہ نازک دل کی پنکھڑیاں
پژمردہ ہونے لگیں، پھر اُس دردمند کو نہال کرنا بھی تیری شگفتہ
مزاجی کا ایک دل پسند انداز تھا۔

آہ! یہ ساری خوبیاں ایک طرف، اور تیری نوبادۂ عنفوان
سے بھرپور جوانی ایک طرف، اسے وہ! کہ سینہ تیرا گنجینۂ آرزو،
اور خزینۂ اسرارِ رازِ دُنیا نہ تھا، اور اسے تا یوم القرار داغِ مفارقت
دینے والے!! خاطرِ احباب پر میل نہ آنے دینا جب تیری
نیک نہادی و پاکیزہ خوئی کا حصّہ تھا، تو چشم زدن میں اتنا
بڑا کوہِ الم توڑنا اُن پر تو نے کیسے گوارا کیا، ہم سمجھتے ہیں کہ
ہمارا دردِ مفارقت تیرے لئے ہم سے زیادہ روح فرسا تھا،
پھر تو نے ہمیں کیوں ایسا زخم کھلایا، جس کا مرہم اندمال اگر
ہو سکتا ہو تو تیرے حُسنِ دل آرا کی دید، ہمارے دلِ بیتاب کو
ایسا داغ کیوں دیا، جسکا ذریعۂ تسکین اگر تھا، تو وہ تیرا
نغمۂ جاں بخش۔

اے میرے نازشِ آرزو! کیا یہ میری آخری آرزو بھی کسی
لطفِ دیرینہ کے ساتھ بر آئے گی۔

یا مرا ناصبور را پیشِ خدا از وفا طلب
یا کہ تو پاکدامنی صبرِ من از خدا طلب

تیری محفل کی یاد سے زخم دل ہرا ہی، اور عمر بھر ہرا رہے گا،
جب تک جیوں گا، تیری ہی یاد میں سر دھنوں گا۔

آہ! محبت کیش دل سے نہیں دیکھا جاتا، کل جہاں تیری
شبستانِ عشرت بہزار اسبابِ مسرت سجائی جاتی تھی،
جس کی حاشیہ نشینی کا فرض نوعروسانِ چمن ادا کرتے تھے۔
آج وہاں صفِ ماتم بچھی ہی، جو دل تیرے لطف و مروت
کے فیضِ عمیم سے بہرہ یاب تھے، آج اُن کا حال زار ہی،

اے کاش عمرِ رفتہ! تو ہی اپنی رفتار معکوس کر دیتی تاکہ
اُس شوخ ادا کو پھر دیکھ لیتا، اور لے یہ جان پھر تیرے
نذر تھی، اور اے مرگ و زیست کا صدقہ جاریہ تقسیم کرنے
والے!! تجھے میں اپنے لحظاتِ حیات دے کر کہتا ہوں،

شاهزادہ جہانگیر و نور جہاں

انڈین پریس الہ آباد

کہ اُس گلِ رعنا کو ایک بار، تازگیٔ حیات دے کر جلا دے، ایک بار اس کی
بو سونگھ کر پھر اُسی کے ساتھ فرشِ خاک پر سو جاؤں گا، مگر آہ!
یہ سب مجذوبانہ بڑ ہے، یا ازخود رفتگی کے عالم کی خام خیالیاں
جو گیا وہ پھر کہاں آتا، اور جو ہے وہ بھی جانے والا ہے، "کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ"
چمن زارِ امکان کے یہ خوشنما منظر، تماشا گاہِ عالم کے نظر فریب سین،
چاند، سورج، یہ بزمِ انجم، یہ چڑھتی دھوپ، یہ ڈھلتی چھاؤں،
دُنیا کی دلچسپی سے بھری محفلیں، حُسن و جمال کی جھپکتی کرنیں، لالۂ نو
گلفام، عیش و عشرت کے لبریز جام، رونقِ حُسن، بہارِ چمن، یہ
درسِ عرفانی، یہ غلغلۂ پیرِ مغانی، حُسن و عشق کی گرمیاں، زہد و ورع
کی حلقہ بندیاں، الغرض نظمِ دُنیا کی یہ ساری دلچسپیاں آنی جانی
چیزیں ہیں، اگر کسی چیز کو بقا ہے، تو وہ خیالِ فنا ہے، جو منزلِ عشق و
محبت سے پرے ہے، مگر جادہ یہی ہے۔

صد رحمت اُن پاک روحوں پر اور نیک انجام اور مبارک
ہیں وہ اہلِ دُنیا، جنھوں نے اس سرودِ فنا کا نغمہ سمجھ کر اس کے
وجود سے عدم اور اس کی ہستی سے نیستی کا سبق لیا، اس وقفۂ ماندگی
کے بعد وہی لوگ اُس صحبتِ عیش میں پہنچیں گے۔ یا پہنچ گئے ہیں،
جو کبھی برہم ہونے والی نہیں، اور جس میں دُنیا کی ظلمتیں کافور
ہیں، اور نور کا اُجالا پھیلا ہے۔

پیاری نازنین! تیری پاکیزہ فطرت میں بھی یہ سچا خیال
عین الیقین کے درجہ پر تھا، تیرا بطون صدق و صفا کا آئینہ،
کیونکہ مرض الموت میں تیرے وہ جذبات ہر ہر موقع پر ظاہر ہوتے
رہے، جو "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب" کا عقدہ حل کرتے
تھے، اور حسنِ انجام یہ ہوا کہ تیرا سفینۂ وجود عرفانی موجوں کے
مد میں پڑ کر قیامت تک کے لئے غائب ہو گیا، ہمارے خیال
میں اس چاشنی سے تیرا وجدان ذوق آشنا نہ تھا، مگر یہ تیری
سچائی کا کمال تھا، کہ مقررہ وقت سے پہلے اُس سِرِّ خفی کے ظاہر
ہونے میں سبکسری تھی، جسے تو نے ایک عالی ظرفی کی آن کے
ساتھ دُرِ ناسفتہ کی طرح خاطرِ گراں میں پنہاں رکھا "ہر سخن موقع
و ہر نکتہ مقامے دارد"۔

میں کامل وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ گلزارِ جناں میں
تیری منزل اعلیٰ و ارفع ہوگی، جو محبت کا معدن نورانیت کا سرچشمہ
اور مسرتِ جاوداں کا مقام ہے، مگر ہائے!

رفتم ز خود چو در دلم آمد خیالِ تو
تنہا نشستۂ تو و خالی است جائے من

تیرا عاشقِ زار اپنے ہجراں نصیب دل کا قصۂ غم
تجھے سنانے، اور تیرے بجائے تیری لحد سے اجازتِ سفر
طلب کرنے آیا ہے۔

آہ! یہ بے مہری تجھے اس وقت ہرگز سزاوار نہیں، مگر تجھے
خوابِ گراں سے کہاں فرصت، جو تو چونکے، اچھا لے، یہ سورۂ اخلاص
سے دم کئے ہوئے آخری پھول اس کا ہدیۂ شانِ محبت ہیں،
(جو تعویذِ قبر پر چھڑکا دئے گئے)۔

اس کے بعد میں نے تربت کے سرہانے دوزانو بیٹھ کر
اور تعویذِ قبر پر ہاتھ رکھ کر صدقِ دل سے فاتحہ خیر پڑھا۔

اس وقت کی کیفیت نہ پوچھئے، رقت و تاثیر کا وہ عالم
تھا، کہ مجھے خود اپنا ہوش نہ تھا، محویت نے اُس ماہِ سیما کے
ایوانِ نور تک پہنچا دیا تھا، جس میں وہ ایک ادائے تمکین خودداری
کے ساتھ مسندِ زرّیں کار پر حوروں کے جھرمٹ میں شاہانہ جوڑا
پہنے جلوہ آرا تھی، تھوڑی ہی دیر میں نظروں ہی نظروں میں مرے
اس کے گفتگو رہی، پھر اُس نے ایک مطلّا و مذہب لوح اپنے
دستِ نازک سے مجھے دی، جس پر یہ کلمہ بخطِ نور لکھا تھا۔

نصر من اللہ و فتح قریب - اب گویا میں رخصت کر دیا گیا تھا، قبل اس کے کہ میری چشم حسرت بار اس برزخ کے وداعی سین کا نظارہ کر سکے میں جہاں کا تہاں مصروف بفاتحہ تھا، البتہ تعویذ لحد پر اُس لوح کا گماں اب تک ہو رہا تھا، اور وہ طغریٰ آنکھوں میں جھکپا تھا۔

اب میں بخاطر ناخواستہ اُٹھا، ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ ٹپ ٹپ آنسو زمین پر گر پڑے، فاتحہ ثانی پڑھ کر چلا، چلتے وقت فی امان اللہ کی باریک و دلاویز صدا میرے کان میں آئی، لوٹتے وقت خلاف امید میری طبیعت مسرور دماغ تازہ اور دل باغ باغ ہو رہا تھا اور یہ شاید اُس کی ایک لحظہ کی روحانی ملاقات کا اثر تھا، جو اُس غیر فانی اور پاک محبت کا معجزہ ہے جس کے سب کام توجہ اور رجوعِ قلب سے بنتے ہیں۔

ج۔ د۔ عالی

اسیر مغفور

(بعض خود نوشت حالات)

حقیقت میں دیکھو تو دُنیا میں کیا نہیں ہے مگر سب کو فنا ہے۔ اجل سر پر کھڑی ہے، وقفہ کم ہے، اوّل بھی عدم ہے آخر بھی عدم ہے۔ یہ بزم آراستہ کیا پسند آئے۔ ہمارا دل دُنیا سے برخاستہ ہے۔ زیادہ رہنے سے کیا؟ دُنیا دل لگانے کے قابل نہیں ہے۔ کیسے کیسے عزیز قریب اُٹھ کر گوشۂ قبر میں سو رہے جن سے دل بہلتا تھا وہ تابندہ کوکب خاک میں مل گئے۔ دورِ فلک میں جو لوگ مغتنم تھے وہ پردۂ خاک میں نہاں ہو گئے۔ جو زیست میں ہمدم و ہم پیالہ تھے انھیں کا ماتم کرنا پڑا۔ جن کے لئے پوشاکیں قطع کیں انھیں اپنے ہاتھ سے کفن پہنایا۔ شب و روز جن کے ہاتھ میں ہاتھ رہتا تھا ان کے تابوت کے ساتھ جانا پڑا۔ جو آٹھوں پہر پہلو میں رہتے تھے ان کو تختۂ غسل پر لٹایا۔ جو نظروں میں ہر وقت ہم پنجہ رہتے تھے ان کو گور میں لٹایا۔ سرسبز چمن غارتِ پائمالی ہوا بھرا ہوا گھر عزیزوں سے خالی ہو گیا۔ نہ وہ محفل ہے نہ وہ ساقی۔ زندگی کا مزا جاتا رہا۔ زمانے نے کیا کیا رنگ دکھائے اس سرائے میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ جو آیا ہے اُسے ایک دن جانا ضرور ہے، نہ کوئی یار نہ غمگسار فقط مرگ کا انتظار ہے ضعیفی میں جوانی کا مزا کہاں ہم تو رہ گئے زندگی کا مزا جاتا رہا اب کچھ اپنا حال بیان کروں جو سُننے کے قابل ہے، قصبہ امیٹھی جو بہت آباد ہے وہی میرا وطن وہی میرا مولد ہے۔ چمن ہے لیکن خزاں دیدہ۔ رفیقان صاحبِ حشم رئیسانِ عالی ہمم سب اُٹھ گئے، جب نو دس برس کا سن ہوا بخت رسا لکھنؤ میں لایا میرے جنت مقام باپ میر مدد علی تھے محبِ نبی و علی شیعہ پاک صاف اعتقاد عالی وقار بڑے فارسی داں حضرت عباس علم بردار کی اولاد میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ مائل تخلص تھا۔ میں جب قبلہ گاہی کی خدمت میں حاضر ہوا شفقت سے پڑھانے لگے۔ فارسی میں روشن سواد ہو گیا اُستاد بن گیا۔ بہت سے طالب علم آنے لگے۔ آخر فکرِ روزی سے مکدّر ہوا تو پہلے کتب خانے میں نوکر ہوا وہاں خوشنویسوں کا مجمع تھا۔ مجھ کو بھی یہ شوق پیدا ہوا۔ رفتہ رفتہ جب شاعروں سے ملاقات ہوئی شعر کہنے کا ڈھب ہو گیا۔ رنگین شاعری

سید مظفر علی خاں صاحب اسیر

کی ہوس ہوئی، مضامین کی تلاش کرنے لگا، دیوان جمع کرکے دیکھے، پچھلوں کے رنگین کلام یاد کئے، بعض بعض موقع پر عربی زبان کی ضرورت پڑی فکر ہوئی اس کا بھی کچھ علاج کیجئے چچا میر سید علی نے (جو علم خفی و جلی میں بہت دقاق تھے، صرف و نحو میں منتخب روزگار تھے حکمت منطق میں بے مثل، حدیث و قرآن پر شیفتہ آپ نے جلاء العیون نظم کرکے دادِ سخن دی تھی) میرے پڑھانے میں کمال محنت کی چار برس تک ان کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی زمانے سے کچھ ایسا انقلاب کیا فکرِ قوت میں اضطراب ہوا پڑھنے پڑھانے کی صحبت جاتی رہی روزی کی فکر سے پریشان کیا القصہ کچہری میں نوکری کی کچھ انشاگری جانتا تھا۔عمر کے آٹھ برس اسی شغل میں بسر ہوئے۔

خدا کی شانِ رزاقی، وہاں ایک عالم مرزا کاظم علی تھے۔ ان کی خدمت میں مشرف رہا۔حدیقہ حکیم ثنائی پڑھا علم حاصل کیا۔وہ کامل تھے مجھ کو بھی کامل کردیا۔کبھی کبھی میر قائم علی سے پڑھ لیتا تھا۔وہ ایک متقی عالم ہیں۔

ترکِ عادت تو بہت مشکل ہے۔شاعری کا بھی کچھ کچھ خیال رہا، جابجا مشاعروں میں گیا مشاعروں سے صحبتیں رہیں میں نے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں کیا کہ مجھ کو شاعری میں کمال ہے۔ مگر لوگ تو تعریف کرتے ہیں۔ یہ پرچے ہم کو بھی گذرتے ہیں۔ تواریخ کی صبح و شام سیر کی، لغت کی کتابیں پیش نظر رہیں جب حضرت ثریا جاہ خاقانِ زماں محمد امجد علی شاہ زیب تخت و کلاہ ہوئے، بڑے نیک طینت معینِ شریعت فرشتہ خصال تھے تو مدارالمہام وزیر الممالک امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ وزیر ہوئے۔ خدا نے ایسا بلند قدر بنایا کبھی ایک چیونٹی کو بھی نہ ستایا۔صبح سے شام تک وزارت کے کام کرتے اور شام سے صبح تک عبادت میں مصروف رہتے۔

ہر گھڑی خاص و عام کی خبر تھی۔رونق اسلام کی بڑھایا کئے۔روز افزوں تائیدِ خدا رہی لیکن خاکساری بدستور قائم رہی ان کے بزرگ بھی بہت صاحب ثروت قوم بنگش سے فرخ آباد کے رئیس تھے۔جب یہ پہلے پہل لکھنؤ میں آئے تو محلہ تحسین گنج میں قیام کیا۔مکانات خرید کئے۔جب وزارت ملی تو ماہِ نو سے ماہِ کامل ہوگئے۔خاندان کا خاندان ساتھ تھا۔ مرزا سکندر شکوہ کے مکانات اُن کے بیٹے عباس شکوہ سے مول لئے۔

از سرِ نو ان سب کی تعمیر کی، مکانوں کی تقدیر چمک گئی۔ "امین آباد" نام رکھا۔اسی جگہ باغ نیدا ین تھا۔وہ بھی بادشاہ نے مرحمت فرمایا، اس کو خوب تیار کیا اور "امداد باغ" نام رکھا عجب عشرت آباد بن گیا، دو کانوں سے بازار شق القمر بن گیا۔ لوگ نواب کو دعا دیتے ہیں۔ وہاں رہنے والوں کو آرام ہے۔ طبیعت میں حق پرستی کا مذاق ہے۔بجز رونقِ دین اور کچھ حرص نہیں۔ایک مجتہد ملازم ہیں صبح و شام نمازیں ہوتی ہیں۔ہمیشہ للہ تقسیم زر ہوتی ہے۔مرزا حاجی کا باغ مول لیا ہے اس کے قریب درگاہ حضرت عباس علم بردار بنائی ہے، ہاں صبح و شام مجلسیں ہوتی ہیں، زیارت کو خاص و عام آتے ہیں۔

میں بھی ان کے بندوں میں ایک صاحبِ نیاز بندہ تھا۔کچھ ایسا حق نہ تھا جس پر ناز کرتا، مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا محکمہ دیا۔بہت مسرت سے تین برس کٹے کچھ حسبِ حال مقدرت حاصل ہوئی، جو عزیز قریب میرے ساتھ تھے ان کے بخت و نصیب موافق رہے۔خدا کا شکر و سپاس ہے۔ یہ بھی قیاس و وہم سے باہر تھا، یہاں نہ تو حسنِ صورت ہے نہ حسنِ خط

ہو۔ املا بھی غلط انشا بھی غلط۔ شکر کا دم دل کیوں نہ بھرے، خدا ہمارے محسن پر احسان کرے۔

بعد ازاں گردشِ روزگار ہوئی زمانے کا تو کچھ اعتبار نہیں ہو آسمان و زمین دوسرے ہو گئے، فلک نے ہمیں خانہ نشین کر دیا۔ کیا کہوں جو دَورِ زمانہ ہوئے تمام اقارب عدم کو روانہ ہوئے میری زوجہ نے بھی انتقال کیا دل کو نہایت ملال ہوا، میرے سر پر اس قدر بلا پر بلا پڑی کہ دُنیا سے دل اُٹھ گیا۔ زمانے کی سیر بہت کی الٰہی اب انجام بخیر ہو۔

میں یہاں نیک نام رہا اب علی کی محبت میں تمام ہوں سخن مختصر دُنیا سے دل بہت برخاستہ تھا۔ کسی بزم آراستہ سے کچھ کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا، وہاں حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر صاحب سریر رونق افروز تھے، یہ بادشاہ رعایا کا بہت محبوب ہو۔ خدا کو اس کی خوشی منظور ہو۔ اور ایام میں ایسے بادشاہ کہاں، پایۂ تخت بلند رہے چشم بد سے گزند نہ پہنچے۔

مجھ جیسے ناچیز شخص سے خلق کیا۔ امتیازی درجے سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو درحقیقت گلِ انتخاب تھی میں نے حسب حکم اسے نظم کیا۔ سُن کے بہت خوش ہوئے۔ مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا۔ فقط یہاں تک اسیرِ مغفور کے خود نوشتہ حالات تھے۔

اسیر کے دادا کا نام سید محمد علی تھا ابن سید مولوی معین الدین ابن محمد صالح کروری۔ نانا ان کے لکھنؤ کے شیخ زادے تھے۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک مظفر علی خاں بہادر جنگ دربارِ اختری سے خطاب ملا۔

جس زمانے میں نواب محمد سعید خاں والیِ رام پور لکھنؤ میں رونق افروز تھے، اسیر صاحبزادگان عالی شان کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ پھر نواب یوسف علیخاں بہادر فردوس مکاں کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ پھر زمانہ سُلیمان سریر آصف مشیر حاجی حرمین شریفین بلال رکاب نواب محمد کلب علی خاں بہادر میں دربار سخن فہموں سے سجایا گیا اور قدر دانی کا بازار گرم ہوا۔ اسیر بھی بیش بہا تنخواہ سے بلائے گئے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگردوں میں بعد آتش کے انھیں کا مرتبہ تھا۔ ہزار ہا مستفید ہوئے۔ ایک دیوان فارسی گلشن تعشق اور چھ دیوان اُردو میں ہیں۔ ریاضِ مصنفؔ، گلستانِ سخن، دیوانِ اسیر عاشقانہ دیوان ہیں۔ ایک دیوان غیر مطبوعہ ہو، ایک دیوان منقبت موسوم بہ گلدستۂ امانت ہو۔ ایک کُلیات قصائد اُردو، ایک مثنوی دُرۃ التاج ہو جو بادشاہ کی فرمائش سے نظم کی تھی، ایک مثنوی میں نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کی کیفیت لکھی ہو۔ ایک مثنوی معارج الفضائل معجزات ائمہ میں ہو، ایک کتاب زر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسائل علم عروض و قوافی کے فارسی اور اُردو میں ہیں۔ رسالہ بیانِ اضافت، رسالہ تشریح الحروف فارسی میں ہو۔ فوائد مظفریہ علم نحو عربی میں ہو۔ ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں۔

مدت دراز تک مرثیہ و سلام کہا کئے مگر وہ دفتر غدر میں تلف ہو گیا۔

۱۲۲۹ھ میں غازی الدین حیدر بادشاہ تخت نشین اودھ ہوا۔ اسی سال اسیر پیدا ہوئے، واجد علی شاہ کے عہد میں علی نقی خاں وزیر کے ہاتھوں امین الدولہ کی دوستی میں اسیر بھی کچھ دن اسیر رہے۔

اسیرؔ نے قدرتاً شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ بہت پُرگو تھے۔ ساٹھ ساٹھ ستر ستر شعر کی غزل کہا کرتے تھے۔ مصحفیؔ اکثر کہا کرتے تھے، ایک روز یہ آخری شاگرد اُستادوں کی صفِ اول میں جگہ لے گا۔

اسیرؔ جب واجد علی شاہ کے دربار میں رفقا کے معزز عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ خطاب حاصل کیا تنخواہ مقرر ہوئی تو ہمچشموں میں اعزاز بڑھ گیا۔ شاعری چمک گئی۔ بہت سے شاگرد ہوئے۔ اسیرؔ کی غزل گوئی کا رنگ سب سے الگ تھا۔ بہت پُرگو تھے۔ مضامین عالی نظم کرتے تھے۔ اصلاح بہت جلد دیتے تھے۔ جب انتزاعِ سلطنت ہوا اور بادشاہ کلکتے تشریف لے گئے تو اسیرؔ لکھنؤ کو نہ چھوڑ سکے یہاں ان کے قدردان بہت تھے، اکثر رؤسا، اُمرا شاگردوں نے ایک محلہ منشی گنج کے نام سے آباد کیا تھا، اس میں رہتے تھے۔ کشیدہ قامت، گورے کتابی رُو متوسط الجثہ تھے اکثر ٹخنوں تک کا کرتہ پہنتے تھے۔

رشکؔ اور اسیرؔ میں معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ باوجود کمال کے اسیرؔ میں خود نمائی نہ تھی۔ شاعر کی طبیعت کی اُفتاد کا اندازہ ان کے کلام سے ہو سکتا ہے۔ ایک شعر میں اپنی عادت کو نظم کرتے ہیں۔

مثلِ ہلال بدر ہی کب طالبِ نظر ۔۔۔ وہ خودنما نہیں ہے جو صاحبِ کمال ہے

مزاج میں انکسار بہت تھا اور اسی کو پسند کرتے تھے۔ ایک موقع پر نظم میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

جو افتادہ ہیں ان کی ہر جگہ تعظیم ہوتی ہے
ہجومِ خلق ہو ہر چند جائے سایہ خالی ہے

درحقیقت اسیرؔ کے مزاج کی اُفتاد ایسی ہی واقع ہوئی تھی۔ اس میں کچھ تکلف نہ تھا، ہر کہ دمہ سے تواضع پیش آتے تھے۔ علم و فضل کا غرور نہ تھا۔ آخر یہ آفتاب شاعری ۱۲۹۱ھ میں غروب ہو گیا، ان کے انتقال کی ایک تاریخ خواجہ محمد یوسف صاحب یوسفؔ نے کہی تھی جس کا مصرعہ تاریخی یہ ہے۔

ہاں مصحفیؔ کی باقی تھی ایک یہ نشانی

غرض وہ زمانہ شاعری کے لئے بہت اچھا تھا جس میں اسیرؔ، آتشؔ، ناسخؔ وغیرہ اہلِ کمال پیدا ہوئے اور اپنے کمال کی قدر کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئے۔ اب نہ صاحبِ کمال ہیں نہ قدردانِ سخن۔ اہلِ کمال ہیں بھی تو ان کے جوہری کہاں ہیں۔ بہت سے ہیرے اب پتھروں کے ساتھ تل رہے ہیں۔

عشرت لکھنوی

تاجپوشی کے روز ہز اکسلنسی وائسرائے صاحب نے حسبِ ذیل تار حضور ملک معظم کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔

"نہایت ادب و اطاعت کے ساتھ میں یور مجسٹی اور ملکہ معظمہ کی خدمت میں اپنی اور گورنمنٹ ہند و نیز باشندگانِ ہند کی جانب سے اس سعید اور قابلِ یادگار موقع پر نہایت عقیدت مندانہ مبارکباد کا اظہار کرتا ہوں"۔

اس کے جواب میں حضور ملک معظم کا یہ پیام آیا:۔

"ملکہ معظمہ نے اور میں نے آپ کے پیغام کو، جو آپ نے گورنمنٹ و باشندگانِ ہندوستان کی طرف سے بذریعہ تار میری تاجپوشی کے متعلق مجھے بھیجا ہے نہایت مسرت سے وصول کیا۔ براہ مہربانی ان کو ہمارا سچا شکریہ پہنچا دیں، اور یقین دلا دیں کہ ہم ان کے ان وفاداری کے خیالات کی قدر کرتے ہیں"۔

عالمِ خیال کا چوتھا رُخ

مائی ڈیر مسٹر شاکر — جو لطف مجھ میں اور آپ میں ہے، اُس کے اثر کو اپنے دل پر، اور حق کو اپنے دماغ پر تسلیم کر کے میں سردست اپنی ایک نظم جس کا نام "عالمِ خیال کا چوتھا رُخ" ہے "ادیب" میں شائع ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔

یہ مسلسل چار نظمیں ہیں، جن کا

(۱) پہلا رُخ جنوری ۱۹۱۱ء کے "الناظر" (لکھنؤ) میں شائع ہوا، اس میں ایک عورت جس کا شوہر پردیس میں ہے شوہر کی یاد میں محو، اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے۔ اس پہلے رُخ پر مسٹر مشیر حسین، قدوائی، بیرسٹرایٹ لا کا ریویو اپریل ۱۹۱۱ء کے "الناظر" میں نکلا ہے۔

(۲) دوسرا رُخ مارچ ۱۹۱۱ء کے "الناظر" میں شائع ہوا، یہ ایک خط ہے، پردیس سے شوہر کی آمد آمد ہے، عورت انتظار کر رہی ہے، وہ نہ آسکا، اور اُس کا خط اس عذر کے ساتھ آیا کہ ابھی نہیں آسکتا ہے، عورت نے بے چین ہو کے شوہر کو خط لکھا ہے۔ اس دوسرے رُخ پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا کا ریویو جون ۱۹۱۱ء کے "الناظر" میں نکلا ہے۔

(۳) تیسرا رُخ مئی ۱۹۱۱ء کے "تمدن" (دہلی) میں شائع ہوا، اس میں شوہر نے عورت کو اُس کے خط کے جواب میں تسلیاں دی ہیں، اور وعدہ کیا ہے کہ میں آج سے بیسویں دن آؤں گا۔ اس تیسرے رُخ پر سید مقصود علی "آسیوفی" وکیل کا ریویو جون ۱۹۱۱ء کے "تمدن" میں نکلا ہے۔

(۴) چوتھا رُخ یہ ہے، جس کو میں "ادیب" کے لئے بھیج رہا ہوں۔

احمد علی، شوق، قدوائی

شوہر نے خط میں لکھا تھا کہ میں بیسویں دن آؤں گا، آج بیسواں دن ہے، عورت انتظار میں اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے

خط کو ہے بیسواں دن آج، آئینگے "وہ" ضرور ہے　　کیا میں کھنچی ہوئی رہوں "اُن" کی نظر سے دُور ہے
"اُن" کی صدا سُنے تو پھر ہو نہ سکے جگر سے صبر　　پاکے "اُنھیں" کبھی نہ ہو ترسی ہوئی نظر سے صبر
کیا میں جگر کو تھام لوں، کیا میں نظر کو پھیر لوں　　کیا "وہ" اُدھر سے آئیں گے رُخ میں اِدھر کو پھیر لوں
"ان" کی کشش میں اپنے رُخ پھیر نہ سکے تو کیا کروں　　دل سے کروں تو زور میں، دل جو ٹھکے تو کیا کروں
اور اگر نہ آسکے "وہ" ہائے، یہ شک ستم کا ہے　　آ مرے دل میں آ اُمید، وقت ترے کرم کا ہے
شک سے پڑی ہیں پیچ میں، ڈرتی ہوں یاس نہ جائے　　اُس سے چڑھی ہوئی ہوں میں، وہ مرے پاس نہ جائے
آتے ہی یاس کا خیال، کانپ اُٹھی ہوں ڈر کے میں　　دم نہیں دل میں، ہو نہ آج بیٹھتی بند کر کے میں

یاس سے ہوں جلی ہوئی، اُس کو میں جھونکو بھاڑ میں　　ہٹ مرے دل سے اے شک آج، یاس ہے تیری آڑ میں
آئیں گے یا نہ آئیں گے، دل مرا کاش بول دے　　ناخن اگر بنے، تو یہ اشک کی گرہ کو کھول دے
بول اُٹھا وہ میرا دل، کہتا ہے آ رہے ہیں "وہ"　　میرے لئے بہت سا چین تحفے میں لا رہے ہیں "وہ"
دیکھ رہی ہوں آرسی، چہرے پہ رنگ آگیا　　دل نے کیا ہے مُژدہ رو، ورنہ کہاں سے پاگیا
دل کو ملا کہاں سے رنگ، اس کو ملا اُمید سے　　پائے گا یہ کچھ اور بھی آج ہی "ان" کی دید سے
کل مرے سر میں تھا جنوں، آج ہے کچھ غرور سا　　کل مرے دل میں تھا ملال آج ہے کچھ سرور سا
اپنے لبوں پہ بار بار پاتی ہوں میں تبسم آج　　خوش ہو لے مرے لبو، کہتے ہو "اور کچھ" تم آج

گھر کی زمین جاگ اُٹھی، صحن پہ نور چھا گیا　　آئیں گے "وہ" ضرور ہی، مجھ کو یقین آ گیا

ناچ رہا ہے مور بس آج، سُن کے ہوا ہے مور[۵۱] خوش　　اس کو بھی مل گئی خبر، پھرتا ہے کیا چکور[۵۲] خوش

آ کے پپیہے[۵۳] پڑ پڑا، اب جو کہیں گے "پی کہاں"　　اُن سے کہوں گی ہنس کے میں، بیٹھے ہیں یہ، دیکھو "پی" یہاں

دل تو خفا نہیں، مگر، میری نظر جھکی رہے　　بعد کو بات چیت ہو، پہلے زبان رُکی رہے

پلکے "انہیں" اُٹھے زباں، اس میں کہاں یہ ضبط ہے　　اس کو تو بول چال میں "ان" کی زباں سے ربط ہے

بننے کو میں بنوں، مگر، بن بھی سکوں گی، یا نہیں　　تننے کو میں تنوں، مگر، تن بھی سکوں گی، یا نہیں

بن کے شگفتگی خوشی رُخ سے جو کھل پڑے تو پھر　　لطف کے ساتھ کر کے میل "ان" سے نظر لڑے تو پھر

ہونٹھ تو میرے بس کے ہیں، ان کو سکھاؤں ڈھنگ میں　　لیکن اُڑاؤں کس طرح، رُخ سے خوشی کا رنگ میں

ترسی ہوئی ہیں پتلیاں، چین سے کب یہ رہ سکیں　　شوق سے بے قرار ہوں، گرچہ یہ کچھ نہ کہہ سکیں

دل یہ کہے گا میل کر، لب یہ کہیں گے، بول دے　　حُسن کہے گا ہاتھ سے، تو مرے رُخ کو کھول دے

آپ ہی بڑھ چلیں گے پاؤں، آؤں گی ہٹ کے سامنے　　لائیں گی شوخیاں مجھے، گھونگھٹ "اُن" کے سامنے

کشمکش کی بن پڑے، دل کو جو روک تھام لوں　　صبر کی دل میں ٹھان لوں، جبر سے دل پہ کام لوں

بن کے بلائیں "اُن" کے سر آج پڑوں ضرور ہی　　دل میں ہنسا کروں، مگر، مُنہ سے لڑوں ضرور ہی

خط میں گلے میں لکھ چکی، اور گلوں میں لطف ہے　　ہو گی مزے کی نوک جھونک، گرچہ دلوں میں لطف ہے

آنکھ مری جو اُٹھ ہی جائے، جلد نظر کو پھیر لوں　　حرف نظر ہی کو نہیں، بلکہ، میں سر کو پھیر لوں

آئیں جو رُخ کی سمت "وہ" ہاتھوں سے مُنہ چھپاؤں میں　　جھانک کے انگلیوں سے، ہاں، دیکھوں، جو دیکھ پاؤں میں

دانت مرے دبائیں گے، تا کہ رہے زبان بند　　کچھ "وہ" کہیں، تو انگلیاں اُٹھ کے کریں گی کان بند

ایک پلک سے، دوسری، بند رہے، ملی رہے　　جیسے کلی انار کی، سوکھ کے، بے کھلی رہے

بھینچ کے لب پہ دانت ہوں، اور نظر زمیں پہ ہو　　ہاتھ مرے جگر پہ ہو، اور شکن جبیں پہ ہو

میرے لبوں پہ، گر ہنسی، آئے گی چھیڑ چھاڑ میں　　ہاتھ میں لے کے پنکھیا، مُنہ کو کروں گی آڑ میں

لب نہ ہلیں خدا کرے، میں جو انھیں ہلاؤں بھی　　"اُن" سے ملیں نہ چتونیں، میں جو انھیں ملاؤں بھی

سر کو جو میں اُٹھاؤں بھی، تو نہ اُٹھے، جھکا رہے　　دل کو جو میں بڑھاؤں بھی تو نہ بڑھے، رُکا رہے

کچھ جو "وہ" دیں تو یوں نہ لوں، لوں تو نہیں نہیں کے بعد　　لاکھ رکاوٹوں کے بعد، لاکھ چناں چنیں کے بعد

بول اُٹھوں، تو ہو جدا "اُن" سے، روش زبان کی　　"وہ" جو کہیں زمین کی، میں کہوں آسمان کی

"وہ" مرے خفا کی چٹکیاں یاد دلائیں گے مجھے　　چھیڑنے کو ہنسیں گے خود، اور ہنسائیں گے مجھے

مکر سے بدگمان بنوں، اپنی ہی رکھوں ٹیک میں　　لاکھ نہیں نہیں کریں "اُن" کی نہ مانوں ایک میں

دل جو نہ مانے، تو "انھیں" ترچھی نظر سے دیکھ لوں　　یا ہو کواڑ میں دراڑ، جا کے اُدھر سے دیکھ لوں

مجھ سے "وہ" مانگیں یا نہیں، دوں گی ضرور پان میں　　پھیر کے مُنہ بڑھاؤں گی ہاتھ سے خاصدان میں

میری دغا کے جال میں کیا "وہ" اُلجھ ہی جائیں گے　　ساعت میں دل کی چوریاں، یہ "وہ" سمجھ ہی جائیں گے

"آئی لبوں پہ وہ ہنسی" یہ کہیں اور ہنسائیں تو　　لاکھ دباؤں میں، مگر، لب مرے کھل ہی جائیں تو

دل میں جو گدگدی سی ہو، رُک نہ سکے کبھی ہنسی　　باتیں ہی یہ ہنسی کی ہیں، آنے لگی ابھی ہنسی

اُنہہ، مجھے اس کا سوچ کیا، دل میں تو پیچ ہے نہیں　　اپنی وفا کو چھوڑ دے، دل مرا ایسی شے نہیں

دل میں بسے ہوئے ہیں "وہ"، اس میں خیال "اُنہیں" کا ہے　　دل مرا ہے وہ آئینہ، جس میں جمال "انھیں" کا ہے

پھیلے ہیں روح بن کے "وہ" میرے تمام جسم میں　　میری حیات میں "وہی" جان ہیں تمام جسم میں

او مرے دل، کشش کچھ اور، تا کہ "وہ" کھنچ کے آ ہی جائیں　　میں انھیں جلد پا ہی جاؤں "وہ" مجھے جلد پا ہی جائیں

حیا کو ہو رہی ہے دیر، اور وہ مزے کی بات ہے　　دل کو لبھائے ناز سے، حُسن کی یہ بھی گھات ہے

اب تو یہ فکر ہے کہ آج کچھ تو سنگار چاہیے　　ٹوٹ گیا ہے کل بلاق، سونے کا تار چاہیے

شوق کے پاس بھیج دوں، ایک ذرا سا تار کیا　　دام نہ لیں وہ، تو نہ لیں، تار کا ایسا بار کیا

ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں کم، ٹوٹ کے گر گئیں کئی　　آئیں گے اب پڑے میاں، اُن سے منگاؤں گی نئی

مجھ کو بھی سادگی پسند، "اُن" کو بھی سادگی پسند　　پہنوں سپید ہی لباس، ہو گا "انھیں" یہی پسند

بیلیں ہوں، یا ہوں بوٹیاں، چھپتی ہیں کام دانیاں　　چند دوپٹے چھانٹ لوں، رکھی ہیں جامدانیاں

بیل کٹاؤ کی، ابھی، چوک سے میں منگا نہ لوں　　لائی ہے "اچھن" ایک بیل، اس کو بھی کیوں نہ میں لے لوں

بیل چکن کی ہے، مگر کچھ بھی نہیں، دھلی خراب　　ایک تو شربتی مری، دوسرے تیپچی خراب

کس سے منگاؤں بیل میں، سب سے خفا ہیں دیور آج　　لڑ کے گئے ہیں "مٹھن" سے وہ، بگڑے ہوئے ہیں تیور آج

---

۵۱ مور: عورت نے پال رکھا ہے، جس کے متعلق اُس نے شوہر کو خط میں لکھا ہے کہ ع بول اُٹھا وہ میرا مور ہاتھ سے اب تو دل گیا الخ

۵۲ چکور کو شوہر پال گیا تھا، جس کے متعلق خط میں عورت نے لکھا ہے کہ ع پال گئے ہو تم چکور ہوتی بہل اس سے شاد میں الخ

۵۳ پپیہوں کا ذکر عورت اپنے خط میں لکھ چکی ہے کہ ع گھر میں پڑا انار کا اس پہ پپیہے آتے ہیں الخ

کیوں نہ کہوں خدا سے نہیں، خود وہ بناتی ہیں کٹاو — چوک سے لیتی آئے وہ، جاے جو لینے نان پاؤ

ہائیں گوندھ لوں، اگر پھول ہوں خانۂ باغ میں — اب کے برس تو موگرا گھر میں کھلا نہ باغ میں

ہو ہی رہے گا یہ تو سب، مجھ کو خیال ایک ہے — ساس "چپ" اور زبان "چپ"، نند مزور نیک ہے

اُس کی سی بس کی گانٹھ اور کوئی نہ ہو گی شہر میں — رکھی ہے منہ میں اک چھری اُس نے بجھا کے زہر میں

بیٹھی ہے دل میں چٹکیاں کرتی ہے دل کا خون ہے — لائی ہے گھر سے اپنے ساتھ، ہیرے لئے، جنون ہے

جب وہ جلن سے لال ہو گال ہوں گرم دو توے — خود تو ہے لسن، اور داغ جیسے چھلے ہوئے ہوئے

دیکھ کے یہ چمک دمک، وہ مسند روپے سے چلے — ریت میں کوئی جس طرح جیٹھ کی دھوپ سے جلے

آج مجھے بھی ہے گھمنڈ، طنز کا کچھ بھی غم نہیں — اُس کو جو ہے "کسی" پہ ناز، میں بھی کچھ اس سے کم نہیں

اے لو "حضور" آ گئے بندی سنورتی ہی رہی — بن ٹھن پڑا سنگار کچھ، حوصلہ کرتی ہی رہی

احمد علی، شوق، قدوائی

رباعیات شاکر

خوش، روی پہ گُل کی سر نہ دھن اے بُلبل — سُن داغ جگر کے میرے گُن اے بُلبل

سُن سُن کے چمن میں گُل بھی سُن ہو جاے — منقارِ قلم کے نغمے سُن اے بُلبل

شوخی سے حجاب ان کا عاری سمجھو — پردے کو حیا کی پردہ داری سمجھو

اغیار سے اُٹھ کر جھکے میری طرف — اب لطف کو بھی ستم شعاری سمجھو

کس روز ہوا وہ دشمنِ جاں اپنا — نکلا شبِ وصل بھی ارماں اپنا

اس شوخ کا جیب سے دامنِ ناز چھٹا — ہے اپنے ہی ہاتھ میں گریباں اپنا

ہے شوخیِ تمکین کہ سیماب میں موج — رخسار میں تابش ہے کہ مہتاب میں موج

وہ حسن سے اپنے آپ ہیں سکتے میں — آئینہ میں حیرت ہے کہ گرداب میں موج

دنیائے دنی سے کر کرانہ شاکر — یہ دام کا دم ہے کب ہے دانہ شاکر

گر ورج، وہاں کا تجھ کو لینا ہے سراغ — جاسوسِ نفس کو کر روانہ شاکر

عالمِ رویا

خواب کیا ہے؟ اک طلسمی بات ہے — پردۂ تصویرِ وہمیات ہے

خواب کیا ہے؟ رونقِ بزمِ وصال — زینت افزائے شبستانِ خیال

انبساطِ روحِ نفسانی ہے یہ — اک سرور و سیرِ روحانی ہے یہ

ہے خیالاتِ پریشاں کا سماں — عقل حیراں ہو یہ پہنچا دے وہاں

اک نئی دنیا میں لے جاتا ہے یہ — سیرِ رنگا رنگ دکھلاتا ہے یہ

اس نے دکھلائے تماشے دمبدم — چین سے سوتے رہے بستر پہ ہم

جن سے ملنے کی تمنا تھی ہمیں — لا کے پہلو میں بٹھایا ہے اُنہیں

ہوں حواسِ ظاہری یا باطنی — سب نے کی اے خواب تیری پیروی

کان تھے مشتاق جس آواز کے — رازِ مخفی نغمہائے ساز کے

وہ سُریلے نغمہائے دلگداز — جس میں تحریر نے بھرا ہے سوز و ساز

تو نے سنوا کر اُسے تڑپا دیا — دل تک اُس کا خاص اثر پہنچا دیا

چشمِ حیراں کو کبھی بسمل کیا — اچھی صورت پر اُسے مائل کیا

تو نے توڑے ہیں طلسماتِ عجیب — تو نے دکھلائے ہیں اسرارِ غریب

سامنے ہیں کیسی کیسی صورتیں — کس غضب کی پیاری پیاری مورتیں

اس کا مبدا ہے دماغ انسان کا — ہے یہ عشرت خانہ اس مہمان کا

جو نہ دیکھے تھے تغیر وہ دکھائے — عالمِ باطن کے راز اس نے بتائے

یہ بھی ہے قدرت کا اک سرِ خفی — منکشف کیا ہو حقیقت خواب کی

عزیز لکھنوی

قطعۂ تاریخ

(جشنِ تاجپوشی حضور ملک معظم جارج پنجم دام ملکہٗ)

کیا مبارک دن ہے ساعت نیک ہے — ہو مبارک قیصرِ جم جاہ کو

از سرِ اقبال لکھو مہر سال — تاجپوشی ہو مبارک شاہ کو

۹ ۲ ۳ ۱ ۴

ایس - پی مہر

تہنیت

(جشن تاجپوشی حضور جارج پنجم بادشاہِ انگلستان و قیصرِ ہندوستان اداِم اللہ سلطنتہٗ)

یہ کیا انداز ہی کیا عالم آرائی کا ساماں ہی
کہ ویرانہ چمن ہی اور چمن گلزارِ رضواں ہی

زمین و چرخ دونوں مظہرِ عیش و مسرت ہیں
ادھر گلہائے خنداں ہیں ادھر انجمِ درخشاں ہی

سمک سے تا سما چھایا ہوا ہی نور کا عالم
زہے تنویر ہر ذرہ مثالِ مہرِ تاباں ہی

مشامِ روح کو ہی تازگی ایک ایک جھونکے سے
خزاک اللہ موجِ بوئے گل عنبر بداماں ہی

کھلی جاتی ہیں کلیاں دل کی آپ ہی آپ دیکھو تو
ہوائے سرو میں کیف نشاط انگیز پنہاں ہی

مبارک اہلِ گلشن تم کو یہ ایام عشرت کے
کوئی سنبل سے کہدے جا کے کیوں ناحق پریشاں ہی

فراغت کا زمانہ آگیا فضلِ الٰہی سے
دُرِ مقصود سے پُر ہر کس و ناکس کا داماں ہی

ہویدا ہیں در و دیوار سے آثار بہجت کے
کہیں قوقی ترنم زا کہیں بلبل غزل خواں ہی

جوانانِ چمن کی منعقد ہی انجمن دیکھو
خوشی میں آکے باہم ہو رہے ہیں حرف زن دیکھو

رچا ہی آج جشنِ تاجپوشی جارج پنجم کا
نثارِ فرقِ اقدس ہی خزانہ ماہ و انجم کا

خوشی کا وقت ہی یہ کیسا لگن ہی نیک ساعت ہی
ہوا ہی غلغلہ ہر شش جہت بانگِ ترنم کا

رُخِ پُر نور کے صدقے اُترلیں دیکھنے والے
ہی زیبِ تختِ شاہی جانشین اڈورڈ ہفتم کا

لبِ اقدس کی ہر جنبش میں گویا پھول جھڑتے ہیں
تعالی اللہ کیا کہنا ہی اس طرزِ تکلم کا

نگاہِ شاہ بھی اے مرحبا کیا روح پرور ہی
مگر اس کے اشاروں میں اثر پوشیدہ ہی قم کا

سحابِ فیضِ شاہنشاہ سے سیراب ہی عالم
دُرِ شہوار سے دامن بھرا ہی بحر و قلزم کا

قیامِ امن ہی کچھ اس طرح عہدِ ہمایوں میں
عناصر میں بھی اب باقی نہیں امکاں تصادم کا

سبق آموزِ کسریٰ ہی عدالت شاہِ والا کی
کسی پر ہاتھ اُٹھا سکتا نہیں کوئی تظلم کا

رعایا سے محبت کا سدا اظہار ہوتا ہی
کہاں اولاد پر ماں باپ کا یوں پیار ہوتا ہی

مبارک تجھ کو اے ذی مرتبت یہ جشنِ شاہی ہو
ترے قبضہ میں اے والا گہر مہ تا بہ ماہی ہو

رہے قائم ہزاروں سال ظلِ عاطفت تیرا
جہاں میں روز افزوں تیری شانِ کجکلاہی ہو

صد صدِ رحمتِ حق خلق پر ہو تا ابد تجھ سے
تری وابستہ دامن شہا عالم پناہی ہو

تری عظمت دوبالا ہو ترا اقبال روز افزوں
قمر چاکر ترا خورشید لشکر کا سپاہی ہو

ضیا بخشِ جہاں تنویرِ مہر و ماہ ہی جب تک
شہا تیری مسلم شش جہت میں بادشاہی ہو

ہوا خواہوں کو تیرے عیش حاصل ہو زمانہ کا
نصیبِ دشمنِ بدبخت و بدخواہ روسیاہی ہو

ادھر جود و کرم کی تیرے ہو دنیا میں ارزانی
اُدھر تجھ پر نزولِ پیہم لطفِ الٰہی ہو

دعا یہ زباں پہ آگیا پھر مصرعِ اوّل
مبارک تجھ کو اے ذی مرتبت یہ جشن شاہی ہو

رہے تو حکمراں دنیا پہ عیش و کامرانی سے
مُسخر ربعِ مسکوں ہو خدا کی مہربانی سے

محمد فاروق

اخلاقی غزل

حُسنِ اخلاق ہی کو کہتے ہیں جادو اے دوست
دل کی تسخیر کا یہ سیکھ لے پہلو اے دوست

تو خمیدہ ہو اگر شکلِ کماں دُنیا میں
کیوں کشیدہ ہو کوئی صورتِ ابرو اے دوست

دل ستائے گا غریبوں کا تو سُن لے ہم سے
چین پائے گا نہ تو بھی کسی پہلو اے دوست

حسنِ ظاہر پہ شرف رکھتا ہی حُسنِ باطن
پھول اچھا ہی وہی جس میں ہو خوشبو اے دوست

نیک دل ہو کے اگر حُسنِ لیاقت سے ملے
دل سے ہو دوست ابھی دشمنِ بدخو اے دوست

کاہلی چھوڑ دے مائل ہو ریاضت کی طرف
اس سے بہتر نہیں آرام کا پہلو اے دوست

ہند پر ہیں جو تعصب کی بلائیں نازل
غم کے ساماں نظر آتے ہیں ہر سو اے دوست

رکھ نہ ابنائے زمانہ سے خصومت کوئی
دل میں تو ان کو سمجھ قوتِ بازو اے دوست

جائز اصلا نہیں توہین کسی مذہب کی
دینِ اسلام ہو یا مذہبِ ہندو اے دوست

دیکھ پچھتائے گا اُترے گا جب اس مے کا خمار
نشۂ عیش میں غافل ہی عبث تو اے دوست

آنکھ اگر ہی تو زمانے کی روش دیکھ کے چل
کیوں گرا پڑتا ہی اندھوں کی طرح تو اے دوست

مشکلیں سب تری ہو جائیں گی آساں محب
راہِ کوشش میں مناسب ہی تگاپو اے دوست

محب دریاآبادی

چشمِ جاناں

میں تیرے عشق کا بیمار ہوں چشمِ جاناں　　ہمہ تن ساغرِ سرشار ہوں چشمِ جاناں
سخت مجبور ہوں ناچار ہوں چشمِ جاناں　　زیست سے تنگ ہوں بیزار ہوں چشمِ جاناں

شوقِ دیدار میں دُنیا سے گزر جاؤں گا
دیکھنا دیکھنا ایک روز میں مر جاؤں گا

دلِ وحشت زدہ کو ہو گیا سودا تیرا　　رات دن پیشِ نظر رہتا ہی نقشہ تیرا
صورتِ آئینہ ہی محو تماشا تیرا　　شوخیاں کرتا ہی کھنچ کھنچ کے سراپا تیرا

دیکھ کر تجھکو وہ کیا اور کسی کو دیکھے
کھُپ گیا ہو جو نگاہوں میں اُسی کو دیکھے

راستے حُسن پرستی کے دکھائے تو نے　　سرد مہری سے کنول دل کے بجھائے تو نے
خرمنِ صبر و خرد کتنے جلائے تو نے　　ہائے کیا سوتے ہوئے فتنے جگائے تو نے

تیری گردش میں زمانہ تہ و بالا ہی رہا
آہ! حیران ترا چاہنے والا ہی رہا

معدنِ شرم و حیا مخزنِ عفت تو ہی　　سببِ عشق ہی تو وجہِ محبت تو ہی
باعثِ رنج و گرفتاری و آفت تو ہی　　موجبِ صد الم و درد و مصیبت تو ہی

حُسن نے کوٹ کے بھر دی ہی شرارت تجھ میں
کیوں نہ کہہ دوں کہ سمائی ہی قیامت تجھ میں

چمنِ دہر میں حالت ہی عجب نرگس کی　　شوقِ دیدار میں پتھرا گئیں آنکھیں اس کی
غیر حالت رہے کس طرح نہ اس بے حس کی　　تابِ نظارہ جو لائے یہ نظر ہی کس کی

دیکھنے کے لئے گو آنکھ خدا نے دی ہی
نور کی بجلی کسی نے بھی کہیں دیکھی ہی

آنکھ لگتی ہی کہاں تجھ سے جہاں آنکھ لگی　　تیری شوخی و شرارت تو ہی دیکھی بھالی
اس طرف دیکھ سے مُحسن کی او متوالی　　بن کے پُتلی مرے آنکھوں میں سمانے والی

ہائے کس کس پہ چلا دہر میں جادو تیرا
میرے مانند گرفتار ہی آہو تیرا

گوہرِ اشک تری نذر کیا چاہتا ہوں　　حاضرِ بارگہِ حُسن ہوا چاہتا ہوں
کیا بتاؤں تجھے کیا حال ہی کیا چاہتا ہوں　　دے کے دل اک نگہِ مہر و وفا چاہتا ہوں

حکم ہو گر۔ تو بٹھالوں تجھے سر آنکھوں پر
پورے ارماں ہوں۔ جو پاؤں تجھے سر آنکھوں پر

خوش ہوں یہ خواہشِ دیدار گر اندھا کر دے　　تو مگر اک نظرِ لطف سے اتنا کر دے
چشمِ باطن جسے کہتے ہیں اُسے وا کر دے　　راز سب قدرتِ خالق کے ہویدا کر دے

نظر آئے در و دیوار سے جلوہ تیرا
دیکھ لوں ذات میں اپنی ہی سراپا تیرا

جام لبریز محبت کے پلا دے اے جاں　　گرمیِ آتشِ سیّال دکھا دے اے جاں
کلفتِ رنج و الم دل سے بھلا دے اے جاں　　مری سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے اے جاں

سخت بیتاب ہوں سینہ سے لگا لے مجھ کو
اپنے آغوشِ محبت میں سُلا لے مجھ کو

اب نہ باقی رہی دل میں ہوسِ جامِ شراب　　مے پر جوشِ محبت سے ہے سرشار شباب
کروٹیں لیتا ہی دل ہجر میں مانند کباب　　نگہِ لطف لفرما کہ شد ہنگامِ عتاب

تیرا جلوہ رہے دن رات مری آنکھوں میں
اور بسر ہو تری اوقات مری آنکھوں میں

محمد سیف الدین شباب

آج

اُٹھو! اُٹھو! دن گزر چلا ہی، پڑے ہو کن وسوسوں میں، جاگو!
حریف جوشن پہن چکے ہیں، نہیں مناسب کہ رن سے بھاگو!
جگہ جو ہو معرکے میں خالی، تمہارے ہی انتظار میں ہی
کرو دل و جاں سے اُس کو پورا، وہ فرض جو کارزار میں ہی
ہیں شیخ چلّی کے خواب، چھوڑو خیالِ آیندہ و گذشتہ
کہ "آج" ہی، اور کچھ نہیں ماہ و سالِ آیندہ و گزشتہ

اُٹھو! اُٹھو! یہ خیالِ آیندہ چھوڑ دو، طاری ہو جو دلوں پر
کہ "جا کے گھمسان کی لڑائی میں ہم دکھائیں گے اپنے جوہر"
"کریں گے یا جا کے ہم کسی دن ہوائی قلعہ کوئی مسخّر
مصاف میں مُنہ کی کھائے گا ہم سے لاکھ ہو کوئی دیو پیکر"
تمہارے آیندہ کارناموں میں ہو گی بے شبہ شاندار
ملے گی توقیر تم کو بیشک اگر ہو قسمت میں فضلِ باری
مگر نہ پاؤ گے بازوؤں میں تم اپنے طاقت جو "آج" جتنی
تمہاری میداں میں پھر نہ ہو گی کبھی ضرورت جو "آج" جتنی

اُٹھو! اُٹھو! جو رکاوٹیں ہیں، خیال میں بھی اُنھیں نہ لاؤ
جو روز و شب کل گزر چکے ہیں، تم اپنے دل سے اُنھیں بُھلاؤ
ستم ہو! زنجیرِ یادِ ایّام پائے مردانہ پر کڑی ہو
اسیر آج اس کے ہو گئے تم کہ جس کی بوسیدہ ہر کڑی ہو
ہو خواہ شاداں، ہو خواہ غمگیں، نکال دو پاؤں سے سلاسل
یہ زنگ خوردہ ہیں اور پُرانی، تو توڑنا ان کا کیا ہی مشکل؟
نگاہ ڈالو نہ مڑ کے طومارِ کہنہ پر تم کبھی - مگر ہاں
سبق وہ پڑھ لو جو جنگِ "امروز" میں ہو جرأت فزائے مرداں

اُٹھو! اُٹھو! دن گزر چلا ہے، یہ آتی دھیمی سی جو صدا ہے
صدا یہ دشمن کے کوچ کی ہے، تمہارے سر پر جو آ گیا ہے
کرو نہ ہتھیار تیز کرنے میں دیر ہرگز، کہ وقت کم ہے
دگرنہ پھر تم ہو، اور سر پر تمہارے وہ وقتِ پُر الم ہے
کہ آنے والی لڑائی کے خواب سے ہو بیدار جس گھڑی تم
تو یہ سنو پھر کہ "ہو چکی وہ لڑائی" تب ہوش کیوں نہ ہوں گم

(ترجمہ از انگریزی)

محروم

دوست کو پیام

یہ عطا کیا ہے تم نے مجھے سوز و ساز کیسا — مرے دل میں بھر دیا ہے غم جانگداز کیسا
یہ کشاکشِ تمنّا یہ اُمید کامیابی — یہ تخیّلات باطل یہ نمودِ اضطرابی
یہ خلش یہ دردِ پنہاں یہ تڑپ یہ آہ و زاری — یہ ہجوم آرزو کا یہ وفورِ بیقراری
کبھی بیم نامرادی کبھی اشتیاق عشرت — کبھی ذوقِ سازگاری کبھی خوف یاس و حسرت
کبھی محوِ شادمانی کبھی سوزِ دل سے گریاں — کبھی خود بخود فسردہ کبھی خود بخود پریشاں
کبھی شاکیِ زمانہ کبھی شکوہ سنج قسمت — کبھی واصفِ محبّت کبھی نکتہ چینِ اُلفت
نہ ہی چین لمحہ بھر کو نہ سکون ایک دم کو — نہ قرار ہے خوشی کو نہ قیام ہے اَلم کو

تمہیں لطف کیا ملا ہے مری بیکلی سے آخر
تمہیں ہاتھ آ گیا کیا مری بیدلی سے آخر

مرے دل میں تھی تمنّا مرے دل کا مدّعا تھا — مرے دل کی آرزو تھی مرا دل یہ چاہتا تھا
تمہیں مجھ پہ رحم آتا مجھے تم بھی پیار کرتے — مرے شیوۂ وفا کو بھی تم اختیار کرتے
مرے دل کا درد سنتے مرے چارہ ساز ہوتے — مری غمگساری کرتے مرے دل نواز ہوتے
تڑپ اس طرح تڑپتا نہ یہ بیقرار ہوتا — نہ یہ اضطراب ہوتا نہ یہ انتشار ہوتا
مری چشم خونچکاں سے نہ لہو ہی یوں ٹپکتا — نہ جگر میں آگ لگتی نہ یہ شعلہ یوں بھڑکتا
مجھے کیوں جلا رہے ہو مجھے کیوں ستا رہے ہو — مرے نقشِ زندگانی کو عبث مٹا رہے ہو
تمہیں منصفی سے کہہ دو یہ ہے طرزِ ناز کیسا — میں نیاز مند ہوں گر تو پھر احتراز کیسا

مرے زخمِ دل کا کچھ تو کبھی التیام ہو جا
مرے دردِ غم کا ہے تو کہیں اختتام ہو جائے

ارشد تھانوی

رباعی

خوش حال اگر پوچھو تو ہم میں کم ہیں — اک جانِ حزیں ہے، اور ہزاروں غم ہیں
ہیں لائقِ تعریف و ثنا اور ہی لوگ — ہر طور سے افسوس کے قابل ہم ہیں

سید غلام مصطفیٰ ذہین

قطعۂ عبرت آمیز

جانبِ گورِ غریباں کل جو عبرت لے گئی　　ٹوٹی پھوٹی چند قبروں کے نظر آئے نشاں

دل بھر آیا ہائے ان کی بیکسی کو دیکھ کر　　ہو گئے آنکھوں سے بے بس بے تحاشا آنسو رواں

مل کے اک اک قبر سے میں دیر تک رویا کیا　　فاتحہ پڑھ کر چڑھائی چادرِ اشکِ رواں

سایۂ اشجار میں سوتے تھے غافل سب کے سب　　ابرِ رحمت کا کھنچا تھا ان کے سر پر سائباں

زندگی کے تھے یہ جھگڑے اب جو دیکھا بعد مرگ　　ایک ہیں سب دوست دشمن، مہرباں نامہرباں

دلربا تھے جن کے فقرے، جن کی باتیں دلفریب　　ہو گئے کچھ ایسے چپ گویا نہیں منہ میں زباں

منہ سے ہنگامِ تکلم پھول جھڑتے تھے سدا　　ہو گئیں اب ختم وہ تقریر کی رنگینیاں

جن کے اک اک شعر میں شورِ قیامت تھا بھرا　　چپ پڑے ہیں اک طرف وہ شاعرِ معجز بیاں

نظم میں بھی نثر میں بھی جن کو حاصل تھا کمال　　اک دو ورقہ طبع کا جن کی گلستاں بوستاں

کیا کہوں میں دے گئے داغِ جگر داغؔ و امیرؔ　　وہ جلالِؔ باکمال اب ہائے دنیا میں کہاں

سرد اب کیونکر نہ ہو گرمیِ بازارِ سخن　　کچھ شررؔ باقی ہیں لیکن برقؔ آنکھوں سے نہاں

جس کی گویائی کا اک باغِ جہاں میں شور تھا　　یادگارِ ذوقؔ یعنی وہ ظہیرؔ نکتہ داں

تھا سرور افزا کلامِ پاک جس کا وہ سروؔ　　جس کے ہر اک شعر میں اک گنجِ معنی تھا نہاں

قیدِ ہستی سے ہوا آزاد بھی آزادؔ اب　　موت کی تلخی سے چپ ہی ہو گئے وہ شیریں بیاں

خیر سے گذرے جو دم اُس کو غنیمت جانئے　　حالیؔ و شبلیؔ سے ہے اب رونقِ ہندوستاں

ہیں بہت تھوڑے سے باقی ہند میں صاحب کمال　　قدرداں لازم ہے ان کی، لوگ پھر ایسے کہاں

کام جو کرنا ہے کر لو کیا بھروسہ زیست کا　　لے گئی ہے موت چن کر کیسے کیسے نوجواں

چلتے چلتے دے گئے اک داغ یہ سیّد علی　　ہے زمیں سے آسماں تک اک صدائے الاماں

رنگ دُنیا دیکھ کر آنکھیں ہماری کھل گئیں　　خوابِ غفلت سے ہوئے بیدار دیکھا یہ سماں

بھائی سے بھائی یہ کہتا ہے کدھر ہو بھائی تم　　باپ ہے بہرِ پسر اُف! اک طرف نوحہ کناں

خوں فشاں ہے اک بہن اپنی بہن کے واسطے　　یاد کر کے اپنی بیٹی کو کہیں روتی ہے ماں

بے خبر سوتے ہیں یہ ان کو خبر کچھ بھی نہیں　　برق کیا ان پر گرائی اے جفائے آسماں

بوئے گلہائے چمن سے کیا معطّر ہوں دماغ　　بے اثر ہیں اب نسیمِ صبح کی اٹکھیلیاں

کیا اُٹھیں گے یہ بھلا مرغِ سحر کی بانگ سے　　کیا جگائے گی انھیں آوازِ ناقوس و اذاں

عطر آگیں تھی کبھی جن کی شمیمِ جانفزا　　خاک میں آلودہ ہیں وہ گیسوئے عنبر فشاں

حادثاتِ دنیوی سے ان کو کیا خوف و خطر　　کیا بگاڑے گا اب انکا انقلابِ آسماں

خندۂ گل کی صدا سے بے خبر ہیں انکے گوش　　خوش کرے کیا اپنے شیریں راگ سے آبِ رواں

لطف کیا ان کو میسر صحبتِ احباب کا　　ہو گئیں بے رنگ رنگا رنگ بزم آرائیاں

فرقتِ احباب میں آنسو رواں تھے دمبدم　　کہہ رہا تھا اپنے دل میں یہ کہاں اور میں کہاں

سر بزانوئے تفکر میں اسی حیرت میں تھا　　گوشِ عبرت میں مرے آواز آئی ناگہاں

دیکھ اے واصفؔ ذرا انجام پر بھی کر نظر　　کون ہوتا ہے پسِ مردن رفیقِ بیکساں

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے

نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

واصف اکبرآبادی

رباعیات

واعظ کا مقولہ ہے کہ عقبیٰ مل جائے　　منعم کی تمنا ہے کہ دُنیا مل جائے

دُنیا عقبیٰ یہ دونوں چھوڑے ہم نے　　ہم تو یہی کہتے ہیں کہ مولیٰ مل جائے

کیا کوئی سُنے غم کا فسانہ تیرا　　کہہ تو ہی کہاں تھا آشیانہ تیرا

ناداں سمجھ اپنے کو کہ دانا بلبل　　لایا ہے قفس میں آب و دانہ تیرا

سامانِ حیات رنج و غم میں دیکھا　　الفت کا مزہ ترے ستم میں دیکھا

جب تو نے دکھائی آنکھ۔ دل لے کے مرا　　ایک جامِ سفال جامِ جم میں دیکھا

صوفی ہے ترے حال سے بندہ آگاہ　　تو باتیں عبادت کی نہ کر خواہ مخواہ

دل میں بخدا بتانِ کافر کی ہے یاد　　گو ورد زبان ہے تیری اللہ اللہ

عبدالحمید حمید (میرٹھی)

تازہ غزلیں

ہم فقیروں کا ٹھکانا بھی کہیں ہو جائے گا
جام ہمدم شیشۂ مے ہم نشیں ہو جائے گا

آ کے مے خانہ میں جو عزلت گزیں ہو جائے گا
دورِ گردوں اُس کو دورِ ساتگیں ہو جائے گا

دل کو روشن کر اگر ہو نیش زن زنبورِ غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا

بارِ عصیاں روز سے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا

لے چلی تختِ رواں سے خاک مدفن میں قضا
دیدۂ مور اب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا

پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہہ دے گا یقیں ہو جائے گا

کچھ تو رہنے دے قیامت کے لئے بھی اے فلک
کیا عذابِ حشر سب مجھ پر یہیں ہو جائے گا

خودنمائی اس قدر منبر پہ واعظ۔ خیر ہے
ناز یہ کرنے سے کیا تو نازنیں ہو جائے گا

خامۂ و ذہنِ رسا کا روز افزوں ہے کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا

آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہے طرزِ نگاہ
زہر ہو جائے گا یہ۔ یا انگبیں ہو جائے گا

کچھ دنوں نوکِ مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقش۔ دل میرا نگیں ہو جائے گا

بزم میں بے تیرے پہنچائے گا ساغر چشمِ نم
خطِ پیمانہ نگاہِ نکتہ چیں ہو جائے گا

بحث رندوں سے نہ کر جا کے واعظ کہیں
کیا رہے گی پھر۔ اگر ملزم کہیں ہو جائے گا

علی حیدر طباطبائی لکھنوی

عدو ہے باغ میں وہ گلعذار راہ میں ہے
خزاں چمن میں ہے فصلِ بہار راہ میں ہے

خیالِ دوریِ احباب و یار راہ میں ہے
یہ ایک اور طبیعت پہ بار راہ میں ہے

جسے میں دیکھتا ہوں اشکبار راہ میں ہے
بتائے کون یہ کس کا مزار راہ میں ہے

بلائیں لیتا ہوں میں دور ہی سے توسن کی
سنا ہے جب سے کہ وہ شہسوار راہ میں ہے

عجب نہیں ہے وہ جائیں اُٹھا کے دامن کو
بلند خاک سے میری غبار راہ میں ہے

حرم کا شوق بھی ہے بتکدہ کا قصد بھی ہے
مقام دور عجب انتشار راہ میں ہے

نہیں جو کھلتا ہے ساقی سے کاگ بوتل کا
سبب یہ ہے کہ کوئی بادہ خوار راہ میں ہے

اُڑاتا خاک ہے جنگل میں کس لئے قیس
خبر نہیں ترا ناقہ سوار راہ میں ہے

شہیدِ عشق ہزاروں ہیں اُس کے کوچہ میں
قدم قدم پہ بپا اک مزار راہ میں ہے

نکل گئے ہیں بہت دور قافلے والے
خبر نہیں کہ کوئی بے قرار راہ میں ہے

ہر ایک گام پہ لاکھوں ملے ہیں نقشِ قدم
مسافروں کا بھلا کیا شمار راہ میں ہے

عدم کو مُنہ کو چھپائے جو لوگ جاتے ہیں
چڑھاو ہے نہ کسی جا اُتار راہ میں ہے

ہے جس کا عشق تجسس اُسی کا کرتے ہیں
بتوں کا ذکر ہمیں ناگوار راہ میں ہے

کشش تو جذبۂ دل آج اپنی دکھلا دے
لبوں پہ دم ہے مرا اور یار راہ میں ہے

کھلائے ٹھوکریں ماہر نہ نفسِ امّارہ
عدو کے ساتھ کا کیا اعتبار راہ میں ہے

ماہر کنتوری

تا کہ دیکھے حسنِ یکتائے رُخِ یار آئینہ
بن گیا اس آئینہ کا آئینہ دار آئینہ

دونوں آنکھیں آئینہ ہیں دونوں رُخسار آئینہ
دیکھنا اُن کا رُخِ روشن ہے یا چار آئینہ

میں اِدھر صورت سے حیراں وہ اُدھر تصویر سے
بیچ میں ساکت ہے کیوں نقشِ کلِ دیوار آئینہ

جب کہ بازارِ ازل میں تھی نمائش گاہِ حسن
دیکھنے والوں سے پہلے تھا خریدار آئینہ

داغِ غم سے ہو کے روشن دل مرا جلنے لگا
ماہ بن کر بن گیا مہرِ پُر انوار آئینہ

صبح ہوتے دیکھتا ہے اُس بتِ کافر کا منہ
حسن کی دیوی کا ہے شاید پرستار آئینہ

وہ مکدر ہم سے ہیں دل کی صفائی مٹ گئی
ہو گیا آخر غُبار آنے سے ہی بیکار آئینہ

کر کے ثابت رُخ اُدھر منہ پر دیا اُلٹا جواب
خوب محفل میں بنا اُن کا طرفدار آئینہ

تم نے دیکھا ہی نہیں اپنا ابھی حسن و جمال
دل میں رکھ لو گے اگر دیکھو گے اکبار آئینہ

ایک کے دو دیکھ کر ثابت ہوا وہ کٹ گئے
کھل گئے جوہر نظر آیا جو تلوار آئینہ

شکل دیکھی اپنے جینے کی سرکتے ہی نقاب
ہے ترا رُخ ہم کو آسنے آئینہ رخسار آئینہ

میری جانب پشت کر لی اُن کا چہرہ دیکھ کر
ہو گیا اُن کی طرح صورت سے بیزار آئینہ

یوں پڑھاتی ہے سبق ندرت زباں کو طبعِ صاف
جیسے طوطی کو سکھائے طرزِ گفتار آئینہ

ندرت میرٹھی

ایڈیٹوریل

اس ماہ کا پرچہ تمدن ہند کے ایک باب سے شروع ہوتا ہے - یہ کتاب ڈاکٹر بلگرامی مرحوم کی آخری علمی یادگار ہے - بعض اخبارات نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید اب "تمدن ہند" کی اشاعت نہ ہوگی - مگر یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے - کتاب کی چھپائی کا کام شروع ہے اور قریباً چہارم حصہ چھپ چکا ہے - ہمارے مکرم پادری جان ملکم صاحب کتاب کی نظر ثانی کر رہے ہیں، اور انھیں کی نگرانی میں کتاب چھپ رہی ہے - ہندوستان کے قدیم حالات پر جس قدر گہرا پردہ پڑا ہوا ہے اور جس قدر اس قدیم ترین ملک کی نسبت تاریخی لاعلمی چھائی ہوئی ہے اس لحاظ سے تمدن ہند کی اشاعت بے حد ضروری ہے - ہم پادری جان ملکم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اس مفید عام اور لاثانی کتاب کا ایک باب ہمیں عنایت فرمایا، اور وعدہ کیا ہے کہ آیندہ بھی خاص خاص ابواب ادیب کے لئے مرحمت فرمائیں گے -

---

ہم نہایت خوش ہیں کہ ادیب کے جون نمبر کو عام طور پر پسند کیا گیا، اور اردو اخبارات کے علاوہ انگریزی اخبارات نے بھی اس کی تعریف کی بعض ایسے حضرات نے بھی ہماری محنت و کوشش کی داد دی ہے جو ادبی معاملات میں خاص بصیرت اور تجربہ رکھتے ہیں - یوں تو ہمیں بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں، مگر اس موقع پر ہم صرف دو خط ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں -

مولوی ناظر الدین حسن صاحب - ایم - اے - ایل - ایل - ڈی، بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ ایک ایسے معزز و جلیل القدر تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو زمانۂ حال کی بہترین تعلیم و تربیت کا نمونہ ہیں، حال ہی میں آپ یورپ و بلاد اسلامیہ کے سفر سے واپس آئے ہیں - آپ جون نمبر کے متعلق حسب ذیل تحریر فرماتے ہیں :-

"...... یہ رسالہ ظاہری حیثیت سے تو تمام اردو رسائل سے بہتر ہے اور اس کے مضامین بھی ایسے قابل حضرات کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ شاید کسی دوسرے اردو رسالے میں اس اعلیٰ پایہ کے مضامین بمشکل سے نظر آئیں گے - تصاویر کی ترتیب و صفائی بھی بہت ہی قابل تعریف ہے ......"

مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی، عربک پروفیسر نظام کالج، حیدرآباد (دکن) ایک بلند پایہ عالم اور زبان اردو کے زبردست مصنف ہیں اور ادیب کی قلمی اعانت میں آپ نے ہمیشہ غیر معمولی دلچسپی ظاہر فرمائی ہے آپ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

"جون کا رسالہ آپ نے باوجود اس کم مہلت کے بڑی آب و تاب سے نکالا - سب مضامین دلچسپ اور نفیس ہیں - آپ کے حسن انتظام و صحت مذاق و خوبی انتخاب میں کوئی شک نہیں ....."

اسی طرح اور بہت سے حضرات نے ہماری محنت کی داد دی ہے، مگر ہم نے عمداً صرف انھیں دو لکھنوی احباب کے حوصلہ افزا کلمات نقل کئے ہیں، جس سے ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں -

---

ناظرین ادیب یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہمارے محترم مولوی احمد علی صاحب شوق، قدوائی، لکھنوی نے ادیب کی مستقل قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے، چنانچہ اس نمبر میں عالم خیال کا چوتھا رخ شائع کیا جاتا ہے - مولانا شوق نے ابتک عالم خیال کے تین رخ لکھے ہیں، اور یہ چوتھا رخ ان تینوں سے بڑھ چڑھ کر ہے - مولانا موصوف کا دم اردو لٹریچر کے واسطے غنیمت ہے - جن لوگوں کو خدا نے سخن فہمی کا مادہ عطا کیا ہے وہی جان سکتے ہیں کہ آپ کی شاعری کس درجہ لطیف اور پاکیزہ ہے بلکہ بقول تمدن "وہ سدا بہار پھول ہیں جو ہمیشہ مہکتے رہتے ہیں" البتہ کم فہموں سے کوئی شکایت نہیں -

---

یورپ میں مشرقی علوم وفنون وتمدن وآثار وغیرہ کی تحقیقات کے لئے کوپن ہیگن میں ایک خاص محکمہ قائم ہے۔ کبھی کبھی اورینٹل کانفرس کے اجلاس بھی وہاں ہوا کرتے ہیں۔ حال میں ہماری گورنمنٹ نے بھی ایک ایسی ہی کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت محسوس کی، جو ۱۲۔ اور ۱۳۔ ماہ حال کو شملہ میں منعقد ہوئی۔ گورنمنٹ ہند کے مشیر تعلیم مسٹر بٹلر اس کے میر مجلس تھے۔ ۱۸ ماہران علوم کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، جس میں ۹ یورپین، ۵ ہندو اور ۴ مسلمان تھے۔

بحث وتنقیح کے لیے حسب ذیل مضامین تجویز کئے گئے تھے:۔

(۱) مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی۔

(۲) تاریخی آثارِ قدیمہ کی تحقیقات۔

(۳) مشرقی علوم کی امداد، اور مغربی علوم حاصل کرنے کے لئے وظائف دینے کی عملی تدبیروں کو وسیع پیمانہ پر کس طرح اختیار کرنا ممکن ہے؟

(۴) اہل ہند کو ایسی تعلیم دینا جس سے وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے عہدے حاصل کرنے کے قابل ہوسکیں۔

(۵) ہندوستان میں مشرقی علوم کی قدر ومنزلت کیونکر زیادہ ہوسکتی ہے؟

(۶) مشرقی زبانوں کے طریقۂ امتحان جاری کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی جائیں؟

یہ تمام مباحث نتیجہ خیز اور سود مند ہیں، اور اگرچہ ان کے نتائج پر رائے زنی کرنا ہنوز قبل از وقت ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ ان تجاویز کے لیے اگر کوئی صورت بھی نکالی گئی، تو ملک کو بے انتہا فوائد حاصل ہوں گے!

اخبارات میں جو مختصر کیفیت اس کانفرنس کی شائع ہوئی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم مشرقی علوم کے کتب خانے قائم کرنے اور قلمی کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا گیا، نیز یہ بھی قرار پایا ہے کہ گورنمنٹ ہند سے سفارش کی جائے کہ کلکتہ میں مشرقی علوم کی تعلیم کے لئے ایک درس گاہ قائم کی جائے۔

علمی حلقہ میں یہ خبر کمال مسرت وشادمانی سے پڑھی جائے گی کہ اردو کے مایۂ ناز ادیب شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی مدظلہم کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے "شعر العجم" کی تصنیف پر ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام عطا ہوا ہے۔ اس قدر دانی کے لئے ہم پنجاب یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی مولانا ممدوح کو ان کی جگر کاوی اور دماغ سوزی کی واجبی داد ملنے پر دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ ہمارے صوبہ میں صرف مولانا شبلی ہی کی ذات مبارک ایسی ہے، جن کے "سحاب قلم سے علی التواتر علمی بارش ہوتی رہتی ہے"۔ ادیب کے اس نمبر میں ہم آپ کی تصویر بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، اور ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو تا دیر زندہ وسلامت رکھے۔

پنجاب گورنمنٹ کی علمی فیاضیاں مشہور ہیں۔ اردو زبان کی جس قدر سرپرستی پنجاب گورنمنٹ نے کی ہے اس قدر شاید ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ نے بھی نہیں کی۔ ابتدا میں البتہ ہماری گورنمنٹ نے بھی فیاضی کے ساتھ دیسی زبانوں کی ترقی پر روپیہ صرف کیا، مگر اب عرصہ سے یہ صیغہ بند ہے، اور مدتیں ہوگئیں کہ کسی مصنف کو کچھ نہیں دیا گیا، ادھر پنجاب گورنمنٹ ہے کہ برابر اردو مصنفین کو انعام دیے جا رہی ہے۔ حال میں مسٹر ظفر علی خان بی۔ اے کو "معرکۂ مذہب وسائنس" کے ترجمہ کے لیے پانچسو، اور خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں صاحب کو "اساس الاخلاق" کی تصنیف پر تین سو روپیہ انعام دیا ہے۔ ہم ہر دو صاحبان کو مبارک باد دیتے ہیں۔

یقین ہے کہ ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ بھی اس طرف متوجہ ہوگی۔

یہ دیکھ کر نہایت خوشی حاصل ہوتی ہے کہ ہندو مستورات میں بھی بیداری کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ جن لوگوں نے الٰہ آباد کے زنانہ ہندی رسالہ "استری درپن"

کو دیکھا ہی، وہ جانتے ہیں کہ یہ رسالہ شادی شدہ مستورات اور کنواری لڑکیوں کی کیسی اعلیٰ خدمت کر رہا ہی۔ اس میں مضامین بھی زیادہ تر مستورات ہی لکھتی ہیں، اور یہی پرچہ کا مابہ الامتیاز ہی۔ جولائی نمبر سے "استری درپن" کا تیسرا سال شروع ہوتا ہی۔ گذشتہ دو برس میں اس نے نہایت اعلیٰ اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ چوتھی ششماہی جلد (جنوری تا جون ۱۹۱۱ء) جو ۲۶۴ صفحات پر ختم ہوئی ہی۔ بیش قیمت مضامین نظم و نثر کا ایک نادر مجموعہ ہی۔ شریمتی رامیشوری نہرو صاحبہ (ایڈیٹر) قابل مبارک باد ہیں، کہ وہ اپنی ناظرات کی ضیافت طبع کے لئے ایسا عمدہ سامان بہم پہنچا رہی ہیں۔

"استری درپن" کا جولائی نمبر ۴۲ صفحات پر ختم ہوا ہی جس میں چھوٹے بڑے چودہ مضامین درج ہیں، سری کرشن جی کی ایک نہایت عمدہ رنگین تصویر بھی اس میں موجود ہی۔ رسالہ کی خوبیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ع۱ سالانہ قیمت بہت کم ہی۔

"استری درپن" کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں دہلی کے اُردو رسالہ "عصمت" کی قابلِ قدر خدمات کو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے، جو پاکیزہ خیالات، علمی اور ادبی مضامین، اور مفید معلومات کا مخزن ہی۔ ملک کے ممتاز اہلِ قلم کے مضامین کے علاوہ معزز خواتین کے طبعزاد مضامین اس میں بھی ہرماہ شائع ہوتے ہیں، اور ہر پرچہ میں کسی مشہور مقام یا منظر کی تصویر بھی دیجاتی ہی۔ ہمارے مکرم جناب مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری (ایڈیٹر رسالہ) کے مضامین ایک خاص جدت اور نرالی شان کے ہوتے ہیں۔ آپ کا طرز تحریر ایسا اچھوتا ہی کہ اس کی جس قدر داد دیجائے کم ہی (عصمت کی سالانہ قیمت مع محصول ۲ روپیہ ہی)۔

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر جاپانی مصوری کا نمونہ ہی۔ اس میں وہ منظر دکھایا گیا ہی جب کہ ایک بچر کلمارا قیدی اور کالی داس کی تصنیف "میگھ دوت" کا ہیرو، یکش، ابر کو قاصدِ محبت بنا کر اپنی معشوقہ کی طرف روانہ کرتا ہی۔ اس کے ساتھ کی دوسری تصویر آیندہ نمبر میں شائع ہوگی۔

دو ہزار برس قبل کی ایک ہندوستانی عورت۔ دو ہزار برس پیشتر ہندوستانی مستورات کیسی پوشاک پہنتی تھیں، اور کس قسم کے زیورات استعمال کرتی تھیں، یہ باتیں اس تصویر سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ یہ تصویر ایک مورت کی نقل ہی، جو بودھوں کی ایک قدیمی عمارت میں پائی گئی تھی۔ علاوہ ازیں ہندوستانی فنِ سنگتراشی کا کمال بھی اس تصویر سے واضح ہو سکتا ہی۔ اس سلسلہ میں "اجنٹا کے غار کی ایک تصویر" بھی درج کی جاتی ہی۔

سوامی شنکراچارج۔ سوامی شنکراچارج سمجھتے تھے، کہ ہم ہمہ داں ہو چکے اب ہمیں کہ دا تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہی کہ وہ ایک راستہ پر جارہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ کوئی پاسی تاڑ کے پیڑ کو جھکا کر اس میں سے تاڑی نکال رہا ہی۔ شنکراچارج بہت متعجب ہوئے، اور اُس سے دریافت کیا کہ تم نے اتنے بڑے درخت کو کیونکر جھکا لیا؟ اُس نے جواب دیا، علم کے زور سے۔ اتنا سنکر اُنھوں نے معلوم کیا کہ ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا باقی ہی اور ان کا ہمہ دانی کا غرور جاتا رہا۔ اسی واقعہ کو کلکتہ آرٹ اسکول کے ایک مدراسی طالب علم، مسٹر بھینک ٹپا نے اس تصویر میں دکھایا ہی۔ اس مصوّر کی یہ سب سے پہلی تصویر ہی۔

حبقوق نبی کا مزار۔ یہ نبی مسیح سے قریباً چھ سو برس پہلے گزرا ہی۔ اس کا مزار تولیگان میں واقع ہی، جو ہمدان سے ۱۸ میل کے فاصلہ پر ہی۔ تاریخ بائبل پر اس سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہی۔ تصویر کے لئے ہم پادری جان ملکم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"شاہزادہ جہانگیر و نورجہاں" والی تصویر میں جو منظر دکھایا گیا ہی وہ اس قدر عام ہی کہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہی۔

جسوداجی کی تصویر، جس میں سری کرشن کا بچپن دکھایا گیا ہی، ایک بنگالی مصوّر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہی۔

حضرت امیر مرحوم کی تصویر کے لئے ہم مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی عنایت سے یہ تصویر ادیب میں شائع ہوتی ہی۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

روزانہ پیسہ اخبار، لاہور

"**رسالۂ ادیب** الہ آباد یہہ دیکھنا مسرت انگیز ہے کہ رسالۂ ادیب الہ آباد نے اپنے نئے ایڈیٹر مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کے زیر اہتمام نہ صرف اپنی پہلی قابل رشک پوزیشن کو قایم رکھا ہے بلکہ جولائی کے نمبر سے کئی پہلوؤں میں اور ترقی حاصل کی ہے - اور یہہ امر مسٹر شاکر کے ذاتی اثر پر دال ہے کہ منشی احمد علی صاحب شوق کاکوروی کی جس موثر نظم کے اول حصے پر ادیب کے ایک پچھلے پرچہ میں ایک معترضانہ ریویو نکل چکا ہے اُس کا چوتھا حصہ اب جولائی نمبر میں شائع کرنے کے لیئے اُن کو مل گیا ہے اور اُس نے رسالہ کی دلچسپی میں بہت کچھہ اضافہ کردیا ہے - اِس کے علاوہ دوسرے مضامین بھی دلچسپ و مفید ہیں - اور رنگین و ہاف ٹون تصاویر کی خصوصیت بدستور برقرار رکھی گئی ہے، جس سے اُمید بندھتی ہے کہ ادیب مسٹر شاکر کی توجہ سے انشاءاللہ زبان اُردو کی اور زیادہ قیمتی خدمت انجام دیگا"-

رسالہ نظام المشائخ، دہلی

"الہ آباد کا **رسالۂ ادیب** یوں تو ابتداے اشاعت سے ہی اچھی شان میں نکل رہا تھا، لیکن اس کا جون نمبر جو مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کی زیر ایڈیٹری تیار ہوا ہے، خصوصیت کے ساتھہ قابل تعریف ہے - ادیب کے سابق ایڈیٹر، منشی نوبت رائے نظر بوجوہات چند اس سے الگ ہوگئے........اب یہہ کام شاکر صاحب کے سپرد ہوا ہے، جو ایک کہنہ مشق انشا پرداز اور پختہ کار اخبار نویس ہیں - مختلف پرچوں میں کام کرتے انھوں نے رسوخ اور اثر بھی خوب حاصل کرلیا ہے - چنانچہ اس مرتبہ کے رسالہ میں محض ان ہی کی وجہ سے کئی ایسے حضرات کے مضامین شائع ہوئے ہیں، جو ہر جگہہ لکھنا اپنا شیوہ نہیں سمجھتے"-

مولوی محمد الواحدی صاحب، ایڈیٹر نظام المشائخ، اپنے ۳ اگست کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:—

"**ادیب** کا جولائی نمبر پہنچا - کاش میں نے جون کے پرچے پر ریویو نہ لکھا ہوتا، اور اسپر لکھتا - یہہ اُس سے بڑھکر ہے - سوامی شنکراچارج کی تصویر مجھے بہت پسند آئی - خصوصاً اُس کا یہہ فقرہ بڑے غضب کا ہے "معلوم ہوا، کہ کچھہ نہ معلوم ہوا" ... حضرت شوق کے چوتھے خیال کے اندراج کی مبارکباد دیتا ہوں - یہہ رنگ انھوں نے خوب لکھے ہیں - اللہم زد فزد"-

اخبار نیر اعظم، مرادآباد

"**ادیب** الہ آباد کا جولائی کا نمبر ہمارے سامنے ہے - واقعی اسوقت ادیب جس آب و تاب سے نکل رہا ہے وہ ہمارے ہمعصر شاکر صاحب میرٹھی کے اُس شغف اور توجہہ کا نتیجہ ہے جو اُنھیں رسالہ ادیب سے ہے - اور جب تک وہ اس سے ایسی ہی دلچسپی لیتے رہینگے تو یہہ رسالہ ہندوستان کے اُردو رسالوں میں ایساہی سر برآوردہ رہیگا جیسا کہ اسوقت ہے - کیا باعتبار مضامین، اور کیا باعتبار لکھائی چھپائی، ایک امتیازی خصوصیت جو اسکو اور رسالوں کے مقابلے میں ہے وہ اس کا خاص طور سے تصویروں کا انتظام ہے - اس نمبر میں ۹ تصویریں ہیں جو مصوری کا اعلیٰ نمونہ کہی جاسکتی ہیں - ہماری دعا ہے کہ یہہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے"-

اخبار آریہ گزٹ، لاہور

"**ادیب** اردو زبان کا ایک نہایت اعلیٰ اوربیش بہا رسالہ انڈین پریس الہ آباد سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے - سچ تو یہ ہے، کہ اردو زبان میں اپنی قسم کا ایک ہی رسالہ ہے - اس کی تصاویر نہایت رنگین، مضامین ملک کے مشہور اہل قلم کے لکھے ہوئے اور لکھائی چھپائی بہت اعلیٰ ہے - جب سے مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی نے اس کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہے، رسالہ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے - قیمت سالانہ چار روپیہ ہے"—

فوجی اخبار، لاہور

"**ادیب** ادب اردو کا ایک با تصویر ماہوار رسالہ جو منشی پیارے لال صاحب میرٹھی کی اڈیٹری میں الہ آباد سے شائع ہوتا ہے - اس کا ایک نمبر بابت ماہ جون سنہ رواں بغرض ریویو ہمارے پاس پہنچا اور اُس کو شروع سے آخر تک ہم نے بغور مطالعہ کیا - مضامین نظم و نثر دونوں قسم کے عمدہ و دلچسپ ہیں - زبان کی سلاست و خوبی اور خیالات کی پاکیزگی کے بارہ میں صرف اتنا ہی بتلا دینا کافی ہوگا کہ اکثر مضامین اُن مشاہیر فضلا اور اہل قلم حضرات کے

کلک گوہر فشاں کا نتیجہ ہیں جو فی زمانہ ادبی قابلیت اور سخن سنجی کے لحاظ سے تمام ملک میں معروف و محترم سمجھے جاتے ہیں' اور جن میں سے شمس العلما مولانا شبلی صاحب نعمانی - خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر وزیر مال ریاست بہاولپور - شیخ محمد اقبال صاحب ایم - اے بیرسٹر ...... کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - گیارہ تصاویر میں سے جو اس نمبر میں چسپاں ہیں' سب سے پہلی رنگین تصویر میں الف لیلہ کا ایک مشہور سین دکھلایا گیا ہے - باقی کی ۱۰ عکسی تصاویر میں سے ایک میں ملک معظم جارج پنجم اور ملکہ معظمہ میری کو تاج بر سر دکھایا ہے اور دوسری خاندان شاہی کا خاص گروپ ہے جس میں بادشاہ سلامت و ملکہ معظمہ کے ساتھ شاہزادی میری اور پانچوں شاہزادوں کی شبیہیں بھی موجود ہیں- اور یہ فوٹو جو عین جشن تاجپوشی کے ایام میں شائع کئے گئے ہیں' واقعی نہایت نفیس و با موقعہ ہیں - قیمت صرف چار روپئے جو اتنی خوبیوں کے مقابلہ میں کچھہ زیادہ نہیں ہے" *

اخبار آرمی نیوز' لودیانہ

"رسالہ ادیب جو الہ آباد انڈین پریس سے شائع ہوتا ہے ہر ایک اعتبار سے قابل قدر ہے - کاغذ' لکھائی' چھپائی' تصاویر اور مضامین نثر و نظم سب چیدہ ہوتے ہیں - جولائی نمبر میں ۹ تصویریں ہیں' جن میں ایک تصویر جہانگیر اور نور جہاں کی اس موقع کی ہے جبکہ شاہزادہ نے باغ کی روش پر کبوتر نورجہاں کو دئے تھے اور ایک کبوتر اڑگیا تھا - نور جہاں اور جہانگیر کا اصلی لباس معہ شاہی محل کے پارک کے اصلی حالت میں دکھلایا گیا ہے - ایک تصویر جشوداجی کی ہے جو کرشن مہاراج کو گودی میں لئے ہوئے ہیں - ایک سوامی شنکرآچاریہ کی ہے - مضامین میں ایک کہانی بھی کچھہ کم دلچسپ نہیں' جس کا ایک حصہ ناظرین ہمارے بہرہ انتخاب میں دیکھیں گے - غرضکہ ادیب اور زمانہ اردو میں صرف دو ہی رسالے آجکل قابل ذکر ہیں........"

اخبار راجپوت گزٹ' لاہور

"رسالہ ادیب یہہ ماہوار رسالہ دو سال سے شہر الہ آباد سے نہایت آب و تاب کے ساتھہ شائع ہوتا ہے - اس میں خاص خاص علم دوست اور لائق اہل قلم اصحاب کے اعلی اعلی مضامین درج ہوتے ہیں- اور ہر ایک نمبر میں قابل دید متعدد تصاویر ہوتی ہیں - کاغذ چکنا اور نہایت قیمتی' لگتا ہے - چھپائی بہت عمدہ - ہر نمبر تقریباً ۵۶ صفحوں کا ہوتا ہے - ان جملہ خوبیوں کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں' کہ یہہ رسالہ علم ادب کے اُردو رسالوں میں واقعی ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اس نے دو سال کے ہی اندر پبلک کے دلوں میں ایک غیر معمولی عزت حاصل کرلی ہے - اس کا ہر ایک نمبر ایک سے ایک بڑھہ چڑھکر ہوتا ہے جس کے لحاظ سے اس کی سالانہ قیمت چار روپئے بالکل ہیچ ہے - اُمید ہے کہ پبلک اس کی عزت کرنے میں اپنی قدردانی کا پورے طور پر ثبوت دیگی" -

اخبار نور افشاں' لودیانہ (دوبارہ)

"ادیب یہہ ایک علمی' ادبی' اخلاقی' ماہوار رسالہ الہ آباد سے شائع ہوتا ہے' جو قابل دید ہے - ایک وقت مخزن لاہور نے اچھا نام پیدا کیا تھا - مگر جب سے وہ صرف اسلامی پرچہ ہوگیا ہے' اسکی وہ وقعت نہیں رہی' اور نہ اسمیں وہ پہلے ایسے اعلی مضامین ہوتے ہیں - ادیب نے اُس کمی کو خوب پورا کیا ہے - میرے اکثر مسیحی احباب مخزن کو خریدتے تھے' مگر اب انہوں نے اسکو چھوڑ دیا ہے - میں ادیب کے واسطے اُن کی خدمت میں سفارش کرتا ہوں - کیا علمی اور اخلاقی مضامین کے لحاظ سے' کیا زباندانی اور فصاحت کے خیال سے یہہ مخزن سے بڑھکر ہے.....

راقم :— واعظ"

اخبار مخبر عالم' مرادآباد

"ادیب یہہ اُردو کا ایک ہونہار رسالہ انڈین پریس الہ آباد سے پہلے نظر صاحب لکھنوی کی اڈیٹری میں شائع ہوا تھا جسنے چند عرصہ کی اشاعت میں اپنے تمام ہمعصر دیرینہ رسالوں میں ایک نمایاں شہرت پائی تھی - مگر نظر صاحب کی یکایک علحدگی سے یہہ خوف تھا کہ شاید اس رسالہ کا اب یہہ رنگ ڈھنگ قائم نہ رہ سکے - ایکن منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی نے اسکی اڈیٹری کا چارج لیتے ہی اسمیں اور چار چاند لگا دئے' جسکی شہادت کے لئے ماہ جون اور جولائی کے نمبر کافی ہیں کہ کس آب و تاب کے ساتھہ یہہ شائع ہوئے ہیں' جس سے لائق اڈیٹر کی نہ فقط کوشش و قابلیت ہی کا اظہار ہوتا ہے' بلکہ اسکی عام معلومات و تجربہ کا بھی پتہ چلتا ہے - اس رسالہ کے اس نئے دور زندگی

اخبار انڈین وٹنس، کلکتہ

THE INDIAN WITNESS, CALCUTTA.

Adeeb.

"India cannot compare with either Japan or New Turkey in the matter of producing new magazines and papers, but the awakening here has been followed, as in those countries, by a very decided literary activity in the way of papers of various kinds. Among these modern efforts to supply an awakening people with literary food, and news of scientific progress, is the "Adeeb," a monthly illustrated Urdu Journal of Literature and Science. The magazine is decidedly modern in scope and style, and is evidently intended for those who have a spirit of progress, but have not had the advantages of an English education. The editor is Peare Lal Shaker, an Indian Christian, and the magazine is published by the Indian Press at Allahabad. [*Subscription price Rs. 4 annually*].

"The number under review—June, 1911—has twenty articles of various kinds, in addition to the "Editorial Notes." Among the number are three on moral and philosophical lines, one that is distinctly scientific, one historical, two biographical and two bearing on the Coronation. An interesting thing is that there are ten poems, which would indicate the demand there must be among Urdu reading people for poetic expression of thought. There are eleven illustrations, including one of the King and Queen in their Coronation Robes, and a very good one of the present Royal family. The death of the late Dr. Syed Ali Bilgrami calls forth two articles on the life of that distinguished Muhammadan scholar and philanthropist. It is interesting to find a lengthy description of the Planets, their orbits and their moons, together with a special study of Mars, with two illustrations. The most ambitious article, however, is one which is boldly and startlingly entitled "The Universe and what is Therein." Needless to say, this article is not exhaustive!

"The paper and printing of the magazine are good, but the binding could be much improved. Altogether, one cannot but wish success to the editor and publishers of such a magazine, and it must play its part in bringing its constituency up to a higher plane of intellectual and moral life. As the magazine is already half-way through its third volume, it would seem that it has found an appreciative public."

میں جسقدر مضامین لکھے گئے ھیں' عام مقبولیت کا سرتیفکت لئے ھوئے ھیں - جون نمبر میں ۲۱ مضامین جسطرح کہ ھندوستان کے مشاھیر انشاء پرداز حضرات کے زور قلم کا نتیجہ ھیں' اُسي طرح جولائي کے ۲۱ مضامین اعلی پایہ کے ادیب اور فاضل نامہ نگاروں کے سایس لکھے ھوئے ھیں - اور علاوہ ایڈیٹوریل نوٹس کے اسمیں ۹ تصاویر بھي ھیں' جو ھر آئینہ قابل تعریف ھیں.......''

اخبار سول اینڈ ملٹري گزٹ' لاھور

THE CIVIL AND MILITARY GAZETTE, LAHORE.

"A New Urdu Journal.—We have received a copy of the Adeeb, a new monthly published in Urdu at the Indian Press, Allahabad. Its contents are of a varied character and include articles from distinguished writers of the Urdu language in all parts of India."

اخبار ٹریبیون' لاھور

THE TRIBUNE, LAHORE.

"A High Class Urdu Journal.—The Adeeb, a monthly illustrated Urdu Journal published at Allahabad, has come to occupy the foremost position among the Urdu Journals of the country. The general get-up of the Journal is excellent and printing and illustrations are fine. The June number contains 11 illustrations and 21 short articles. Several of them are contributed by well-known Urdu writers of the day. Among the half-tone pictures those of their Majesties King George V. and Queen Mary in Coronation Robes, the Royal Family, and Hindu maidens floating lamps in the Ganges are very attractive. Among other likenesses are those of a Helpless Queen, illustrating a story, the late Dr. Syed Ali Bilgrami, a scene of the Arabian Nights (coloured). Among the writers who have contributed articles to the current number are: Rev. Malcolm Jan, C.M.S., Shams-ul-Ulama Moulvi Mahomed Shibli Naumani, Shaikh Mahomed Iqbal, Rabia Sultana Begum of Hyderabad, Nawab Mahomed Omar Khan, Khan Bahadur Mirza Sultan Ahmed Khan, E.A.C., etc. The Editor, Mr. Piyare Lal Shaker, is to be congratulated for making the Journal so interesting and entertaining."

(قیمت سالانہ للعہ) (فی پرچہ ۶؍)

ادیب

کے قواعد

یہہ با تصویر ماہوار رسالہ جو اُردو علم ادب کی ترقی کا نمونہ ہے ہر انگریزی مہینہ کی پندرھویں کو بقید تاریخ شائع ہوتا ہے - ملک کے نامور اہل قلم، مسلم الثبوت اساتذہ اور بہترین انشا پرداز اسے وقیع، دلچسپ، اور مفید بنانے میں سر گرم ہیں - مضامین کی نوعیت ایسی ہے جو ہر طبقے کیلئے دلچسپ ہو - کوشش کی گئی ہے کہ اسکے مضامین (نثر ہوں خواہ نظم) تعلیم یافتہ مستورات کیلئے بھی اُسیقدر دلچسپ، مفید، اور خوشگوار ثابت ہوں جسقدر تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لئے -

اسکی ضخامت ۴۸ صفحات یا اِس سے زیادہ ہوتی ہے اور صفحہ میں دو کالم ہونیکی وجہ سے اسمیں معمولی تقطیع کے ایکسو صفحات کے قریب گنجایش رکھی گئی ہے - اسکے علاوہ ہر ماہ التزاماً کم از کم ایک رنگین اور آٹھہ عکسی تصاویر دیجاتی ہیں، جنمیں مشہور مصوروں کی صناعیوں کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہیں - بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعروں کی نظمیں بھی حاصل کیجاتی ہیں جو تصویر کی دلکشی کو دو بالا کر دیتی ہیں - قدر دانوں کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہیگا -

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی میں بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کیساتھہ تصاویر چھاپکر اسمیں شامل کیجاتی ہیں جو اسکی مقررہ ضخامت سے علیحدہ ہوتی ہیں - بہر نوع قدردانان علم ادب کے لئے ایک ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہے جو کمی قیمت کے ساتھہ انگریزی میگزینوں سے مشابہ ہے -

اسکی سالانہ قیمت چار روپیہ مع محصول ہے - اِس قیمت میں اِن خصوصیات کے ساتھہ کوئی پرچہ نہیں ملسکتا، بلکہ اس ارزانی کے ساتھہ اسقدر تصاویر بھی (جنکی سالانہ تعداد کم از کم یک صد ہوتی ہے) کہیں دستیاب نہیں ہوسکتیں - نظر بریں معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہے کہ اگر یہہ خدمات قابل قبول ہوں تو علاوہ ذاتی قدردانی کے اسکی توسیع اشاعت میں بھی حتی الامکان امداد فرمائیں -

خریداری کے لئے پیشگی قیمت ادا ضروری ہے - نمونہ مفت نہیں بھیجا جائیگا بلکہ چھہ آنہ وصول ہونے یا ویلوپےایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا - نام اور پتہ صاف و خوشخط لکھا جاے تاکہ پرچہ پہونچنے میں دقت نہ ہو - اگر ایک دو ماہ کیلئے پتہ تبدیل کرانا ہو تو مقامی ڈاکخانہ سے انتظام کرلینا چاہئے اور اگر ہمیشہ یا زیادہ عرصے کیلئے ضرورت ہو تو منیجر ادیب کو اطلاع دیجاے -

اس رسالہ میں مذہبی مباحث اور موجودہ پالیٹکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا - ناتمام مضامین بھی نہیں لئے جائینگے - جس مضمون کے ساتھہ تصویر کی ضرورت ہو اُسکا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائیں - اگر مضمون اور تصویر ساتھہ نہ آئیگی تو مضمون شائع نہوگا - خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جاے ورنہ تعمیل ارشاد نہوسکے گی - تمام خط و کتابت ذیل کے پتہ سے ہونا چاہئے -

منیجر "ادیب"، انڈین پریس، الہ آباد

ہجراں نصیب یکشن؟

انڈین پریس الہ آباد

اگست ۱۹۱۱ء

جلد ۴ — نمبر ۲

گہنے کا رواج

ہاس انوکھے اور تکلیف دہ رواج کی ابتدا یون خیال مین آتی او ربزرگوں سے بھی اسی طرح سُنی جاتی ہے کہ اوّل اوّل حکماء حاذق نے صرف اس نظر سے کہ اشٹ دھات مین خون کے صاف کرنے اور اُسے خوب طاقت و مدد پہنچانے کے اجزا پائے جاتے ہیں۔ اور نیز بہت سے جلدی و خونی امراض کے حق میں معدنی اشیاء کا جسم سے پیوستہ رکھنا از حد مفید ہے۔ پس اُن نازک اندامون کی تندرستی کے واسطے جنھیں قدرت نے فطرتی نزاکت ہونے کے باعث سب سے زیادہ نحیف الخلقت ضعیف الاعضاء، نازک مزاج، نازک دماغ، کمزور، ناتواں، کم خون، کم خوراک، رقیق القلب، لطیف الغذا، ریاضتِ جسمانی سے دم چرانے، سخت ورزش سے بچنے اور شرمانے والی جان پیدا کیا ہے۔ اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہے کہ اُنھیں زیور کی چاٹ پر لگایا جائے۔ چنانچہ غریبوں میں رانگ، کانسے، جست، پیتل، پھول، تانبے، بھرت وغیرہ کا رواج دیا۔ اور امیروں کے سونا چاندی سر چڑھایا۔ جب یہ رواج عام ہوگیا اور لوگ اسے خوبصورتی۔ اعلےٰ درجہ کی نمائش اور زیب و زینت تصور کرنے لگے۔ تو بعد میں رفتہ رفتہ جواہرات اور انکی تاثیرات مثل کواکب ذہن نشین کرکے مرصع ہونے کا ایجاد اور بڑھا دیا۔ جن اوسط درجہ کے لوگوں میں چاندی۔ سونا خریدنے کا پورا پورا مقدور نہ تھا اُنھیں پس اندازی کا مزا اڑانے کی غرض سے اسطرح سمجھایا کہ گہنا رجے کا سنگار۔ بھوکے کا آدھار ہے۔ اس انجیرت نے وہ رواج پایا کہ بھوکا مرنا۔ قرضدار رہنا۔ جان کو آرام نہ دینا قبول مگر نہیں منظور تو گہنے کا نہ رکھنا۔ دن بدن ہزار ہا اقسام کے زیور نکلتے اور اختراع پر اختراع ہوتے چلے آئے یہانتک کہ جسم پر کوئی جگہ خالی نہ رہی جتنے بیرونی اور قابلِ نمائش اعضاء تھے سب ہی بیری کے درخت کی طرح لدگئے جس کے سبب شائستہ

قوموں میں بھی خوشنمائی اوّل درجہ کی بدنمائی اور بدصورتی متصوّر ہونے لگی - گو ہمیں ایک رسم پڑ جانے کے سبب یہ بدنمائی نہیں کھٹکتی تھی - مگر مصلحانِ قوم اس رسم کو اصلاح طلب خیال فرما کر موقع کے منتظر تھے - کیونکہ جو لوگ قانونِ قدرت کی پیروی کرتے یا جن کی قوم میں ان باتوں کا رواج نہیں ہوتا - وہی ایسے امور کو نہایت حقارت اور کراہیت کی نظر سے دیکھا کرتے ہیں - اور زمانہ بھی جسقدر ترقی کرتا جاتا ہے خود ایسے تکلفات کو بلائے طاق رکھتا اور خلائق کی نظروں سے گراتا چلا جاتا ہے - چنانچہ اِس موجودہ وقت نے بھی اِس طرف توجہ کر کے بہت سی چیزوں کے رواج اُٹھا دئیے - اور ابھی تک ہاتھ نہیں کھینچا - پس ایسے ہونہار وقت میں ان زیوروں کے عیوب کی تصویر نہ کھینچنی اپنی اصلاح طلب قوم کو اُن کے عیبوں سے آگاہ نہ کرنا اور جان بوجھکر کنوئے میں دھکّا دینا ہے - لہٰذا آج ہم چند سطریں اسی پر لکھکر قدرتی زینت اور مصنوعی سنگار کا فرق دکھاتے ہیں -

ہمارے ہندوستان کی عورتیں گو اُنھیں کیسا ہی حسُن خداداد اور نہایت خوشنما تناسب اعضا میسّر کیوں نہو - مگر وہ جب تک ایڑی سے چوٹی تک گہنے پاتے میں گوندنی کیطرح لدی پھندی نہ رہیں - گویا حسن صورت سے محروم اور از حد مغموم ہیں - اتنی کسی کو خبر نہیں کہ ارے یہ گہنا نہیں بلکہ چاند سی صورت کو گہن لگاتا ہے - پہلے **جھومر** ہی کو دیکھو جو ماتھے پر جھوم جھوم کر سارا ماتھا چھپا لیتا اور زبردستی قدرت کو اصلاح دے کر تنگ پیشانی بدبختی کی نشانی بنا دیتا ہی - میں حیران ہوں کہ الٰہی یہ جھومر ہے یا کوئی بچھّو - جو کسی گناہ کی پاداش میں ہماری ہندوستانی بہنوں کی پیشانی پر لٹکا ہوا اِس قول کی تصدیق کر رہا ہے کہ قیامت کے روز یہی گہنا سانپ بچھّو ہو کر اسی انداز سے ایک ایک کے ماتھے پر پڑا جھومیگا - **سراسری** پر اگر سرسری ہی نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہو سکتا ہی کہ ایک کنکھجورا ہے جو کنپٹیوں سے لیکر مانگ تک لپٹا ہوا اللہ آمین کی جان مانگ رہا ہے - **ٹیکا** آپ کلنک کا ٹیکا بنا ہوا کہہ رہا ہی کہ مجھ میں سب سے زیادہ ستارہ پیشانی بنا دینے کا ہنر ہے سبحان اللہ جس پیشانی پر یہ کچھ رونق ہو وہ کیوں نہ خوبصورتی کو دوبالا کرے گی ؟ کانوں کی کیفیت مت پوچھو - اوّل تو خود ہی چھیدوں کے مارے کیا کہوں بھِڑ کا چھتّا یا ٹوٹی ہوئی چھلنی کا چمڑا بنے ہوئے ہیں - اس پر طُرّہ یہ ہے - کہ کہیں مگر مچھ جھُول رہا ہے - کہیں **پتّوں** نے بھلے چنگے انسان کو درخت بنا رکھا ہی کہیں **بالیوں** اور **بالوں** نے بن داموں حلقہ بگوش بنا دیا ہے - اگر دوپٹے میں کہیں بالی اُلجھ گئی تو ایک دفعہ ہی رُوئی کے ساتھ سسکی بھروا دی - اور جو کسی ناسمجھ بچّے کا ہاتھ پڑ گیا تو اُس نے اِس ناسمجھی اور کم سِنی پر اونٹ کی نکیل پکڑ کر بٹھا دیا - خود بخود تکلیف کے ہاتھوں بے بس ہو کر ایک ادنٰے بچّے کے سامنے سر جھکائے بنتی ہے - اگر پکنے کان ہوئے تو عمر بھر کو روگ لگ گیا - اِدھر پیپ اُدھر بدبو ہے کہ ناک میں دم کر رہی ہے - واللہ کیا نزاکت اور خوشنمائی ہے کہ جس نے یہ کچھ ناک چنے چبوا کر ناچ نچا رکھا ہی - ناک کی **نتھ** جسے سُہاگ کی نشانی کہتے ہیں عجب نتھنوں میں تیر دیتی ہے - اوّل تو مُنہ پر آکر خاصا چھینکا سا لٹک جاتا ہی - دوسرے ہوا کے جھونکے کو اچھا جھولا بن جاتا ہے - اور جو نتھ بڑھا کر صرف **کیل** پر اکتفا کریں تو اونٹ کی نکیل کے سوا دوسری تشبیہ خیال میں نہیں آتی - **بلاق** خود ریٹ کا پھیپنا ہی - جو غلیظ - بدتہذیبوں کی ناک میں لٹک رہا ہی - گلے کا **طوق** غضب بدشگون گہنا ہی جسے اجنبی ملک کا آدمی سنتے ہی

چونکتا ہے کہ الٰہی اِس بے گناہ پر خدا جانے کونسا سنگین جُرم ثابت ہوا کہ جس کی سزا میں یہ طوق گلے کا ہار بنا۔

گلوبند آپ حیران ہے کہ جو پٹّا کتّوں کے گلے میں پڑنا چاہئے تھا وہ انسان کے گلوے مبارک میں کیوں پڑا؟ **چمپا کلی** ایک سنہری ناگن ہے جو بی سپیرن کے گلے سے لپٹی ہوئی بل مار رہی ہے۔ **جگنی** ایک بڑا بھاری مکڑا ہے جو سینے پر چمٹا ہوا خون پی رہا ہے۔ **بازوبند** پہلے ہی مشکیں جکڑ لیتے ہیں **جوشن** خدا جانے کس لڑائی پر چڑھا کر لے جائیں گے۔ ہاتھوں کے **کڑے** گویا دل کڑا کئے ہوئے ہتھکڑیاں ڈالنے آئے ہیں **چوہے دنتیاں** چوہوں کے سے دانت لگائے ہوئے بات کاٹ کاٹ کر کھانے کو موجود ہیں۔ **چھلّے انگوٹھیاں** وہ جوڑ بند ہیں جنھوں نے ٹوٹی ہوئی انگلیوں کے جوڑ جوڑ کو تھام رکھا ہے۔ **جھانجن۔ پازیب۔ لچھے** خاصی بیڑیاں بہنیں نہیں۔ ٹھکاریاں ہیں۔ جو گھر کی چار دیواری سے جھنکار باہر نکالنے کے جُرم میں پاؤں میں پڑی ہیں۔ **چٹکیاں۔ بچھوے** اوّل تو ان کا نام ہی خدا کے فضل سے کیسا عمدہ اور موزوں ہے کہ اشراف کبھی اس بے رحمی کو پسند نہ کرے۔ جن کے پاؤں کی انگلیوں میں بچھو لپٹیں ان کے سایہ سے خدا بچائے۔ اب میں حیران ہوں کہ جن عورتوں کا سنگار اِس خوبصورتی کے ساتھ ہو انھیں کیا کہوں اور کس نام سے تعبیر کروں۔ جہاں جہاں یہ زیور پہنا جاتا ہے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو برابر اُس کی رگ رگ سے کالے کالے دھبّے پڑے ہوئے معلوم ہوں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جو سمجھدار ہوگی اس مضمون کو دیکھے گی وہ تو اپنے دل میں آپ قائل ہوگی اور جو ناسمجھ اس پر نظر ڈالے گی وہ ضرور ہمیں نکّو بنائے گی۔ ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ جنھیں خدا تعالےٰ نے اوّل دن سے حسین پیدا کیا ہے وہ بن گہنے پاتے ہی لاکھ لاکھ بناؤ دیتی ہیں اور جو قدرت سے بدصورت پیدا ہوئی ہیں اُنھیں نہ گہنے سے چار چاند لگتے ہیں اور نہ زرق برق پوشاک سے۔ ہاں اگر سیرت میں وہ خوبصورتی سے بڑھی ہوئی ہیں تو اُن کا یہ زیور ہزار حسن اور لاکھ گہنے سے زیادہ ہے۔ تم خود دیکھ سکتی ہو کہ جن کی ناک میں فقط نیم کا تنکا۔ کانوں میں ایک ایک بندا۔ ہاتھوں میں ہلکے ہلکے حباب۔ بدن میں سادی سادی پوشاک ہوتی ہے۔ وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور جو سونے جھونے میں ڈوبی پڑتی ہیں وہ کیسی دیوالی کی سی گوجریا ل معلوم ہوتی یا سیتلا کا سا نچا یا دکھائی دیتی ہیں۔ جب اس گہنے کی کمی میں یہ کچھ زیبائش اور موزونی ہے تو اُسکے ترک میں کیا کچھ سادگی اور بے ساختہ پن کی پھبن ہو گی۔

ہم سے پوچھو تو گہنا پہنکر اصلی خداداد خوبصورتی اور قدرتی ساخت کو بھی بٹّا لگانا ہے اِس کے علاوہ اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ بچّوں اور اکثر عورتوں کی جانیں صرف اِس زیور کی بدولت جاتی ہیں۔ پہننے کو ہم منع نہیں کرتے نت نت اور جم جم پہنو۔ آنکھوں سکھ۔ کلیجے ٹھنڈک۔ مگر وہاں تک کہ قدرتی بناوٹ کو اصلاح۔ اصلی خوبصورتی کو داغ جان کو عذاب نہ لگایا جائے۔ رجے کا سنگار۔ بھوکے کا آدھار ہم بھی جانتے ہیں اور ہمارے نزدیک بھی جمع کرنیکے واسطے یہ ایک عمدہ طریقہ تھا لیکن اُس صورت میں کہ بیچتے وقت یا گرو رکھنے کیوقت بہت سا خسارہ نہوا کرتا ایسی حالت میں اِسکے بجائے ٹھوس کڑلے بناکر پہنے جایا کرتے یا کوئی آمدنی کی چیز خرید لیجایا کرتی تو بدرجہا بہتر تھا ہم امیّد کرتے ہیں کہ ہماری ہندوستانی بہنیں اور علی الخصوص زیور کی شوقین عورتیں ہماری اِس تقریر سے ناراض نہونگی ہمنے جو کچھ لکھا ہے صرف ہمدردی کے لحاظ سے لکھا ہے فقط

سیّد احمد دہلوی

فلسفۂ سیاست

فلسفۂ سیاست اصل میں علم تاریخ ہی کی شاخ کی قلم ہے، جس نے زمانہ موجودہ کے علمی انکشافات اور طریقہ استدلال کی آبیاری سے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرلی ہے ایسی حالت میں اب اُسے علم تاریخ کا جزو سمجھنا مصطلحات زبان کو زیر بار کرنا ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ اور فلسفۂ سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے فلسفۂ سیاست کے بغیر علم تاریخ کی تحصیل ناقص اور بلا علم تاریخ جانے فلسفۂ سیاسی کا مطالعہ تحصیل لاحاصل ہے

اصطلاح عام میں تاریخ کا اصلی کام واقعات عالم کا بہ ترتیب جمع کرنا ہے۔ اُس زمانہ سے جبکہ انسان نے حیوانیت اور جہالت کی تاریکی سے نکلکر علم کے پُرفضا اور منور میدان میں قدم رکھا۔ علم تاریخ کی دلچسپیاں ہمیشہ بنی نوع انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی ہیں۔ ملکوں کے انقلابات سلطنتوں کے نبنے بگڑنے کے واقعات، سلاطین، امرا اور شعرا کے حالات، انبیا اور علمار دین کے کمالات، درباروں کی شان وشوکت اور سازشیں، محبان وطن اور مصلحان قوم کی جانبازیاں، علمی انکشافات اور ایجادات، غرضیکہ انسانی جدوجہد کے سب کرشمے تاریخ کے صفحات پر منقوش و مرتسم ہیں۔ تاریخ گویا ایک سفر عام ہے جس پر ہر قسم اور ہر ذائقہ کی نعمتیں چنی ہوئی ہیں۔ اور جس سے ہر شخص اپنے مذاق اور استعداد کے موافق استفادہ کرتا ہے۔ لیکن سائینس نے ان دلچسپ واقعات کے ذخیرہ سے جو معجون مرکب تیار کی ہے وہ مزہ میں پھیکی اور سیٹھی سہی لیکن نفع کے لحاظ سے کسی کھانے سے کم نہیں۔

مورخین نے دنیا کے جو اہم اور سبق آموز واقعات قلمبند کئے ہیں انکا مطالعہ انسان کے لئے نہایت ہی مفید ہے۔ انسانی معاملات میں ایک گونہ ترتیب اور باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ اور یکساں اسباب سے عموماً یکساں نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جو اسباب ایک واقعہ کے پیش خیمہ ہوتے ہیں اُنھیں اسباب کے دوبارہ جمع ہوجانے سے وہی واقعہ پھر ظاہر ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ علم تاریخ تجربہ حاصل کرنے اور دنیاوی معاملات سمجھنے کا بہترین آلہ ہے۔ جب اسباب اور ان کے نتائج پر غور کرنے کا نام عقلمندی ٹھہرا تو لازم آیا کہ ہم اُن واقعات کو جو ہماری نظر سے گذریں ضبط تحریر میں لائیں۔ اور ایک واقعہ کو دوسرے سے مقابلہ اور موازنہ کرنے کے بعد ایک عام اصول مستنبط و منضبط کریں۔ اور اسطرح واقعات ماضی وحال کی عینک سے دوربین کا کام لیں۔ اور آنیوالے دھندلے اور پوشیدہ واقعات کو معلوم کرلیں۔

چونکہ واقعات کے مجموعہ اور مخزن کا نام تاریخ ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ جملہ علوم کی عالیشان عمارتوں کا سنگ بنیاد ہے مثلاً علم ہیئت اور نجوم اُن واقعات اور طبعی حادثات پر مبنی ہیں جو کسی خاص زمانہ میں کسی خاص موقع پر ظہور پذیر ہوئے۔ اور مورخین کے قلم سے صفحۂ تاریخ پر لکھے گئے۔ رفتہ رفتہ خاص قسم کے واقعات تاریخ سے علیحدہ ہوکر خاص علم کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔ اس طرح مختلف واقعات مختلف زمانے میں تاریخ سے علیحدہ ہوکر نئے نئے ناموں سے پکارے جانے لگے۔

دولھن کی سہیلیاں

انڈین پریس الہ آباد

یہاں تک کہ اب علمِ تاریخ بھی ایک خاص قسم کے واقعات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً غلّہ کی گرانی اور مزدوری کی زیادتی و کمی کے اسباب خود دراصل کسی تاریخی واقعہ کے تابع ہوتے ہیں مگر ہم اُن اسباب کو کسی تاریخ کی کتاب میں تلاش نہیں کرتے بلکہ اُس کے لئے سیاست مدن اور علم الاقتصاد کی کتابوں کی چھان بین کرتے ہیں۔ دمدار ستاروں کا نکلنا۔ اجرام فلکی کے عجیب و غریب تغیرات کا کسی خاص زمانہ میں دیکھا جانا۔ مورخین متقدمین نے بطور تعجب انگیز واقعات کے تحریر کیا ہے۔ کسی نے اُسے قہر خدا سے تعبیر کیا کسی نے قرب قیامت کے آثار میں سے سمجھا لیکن زمانہ موجودہ میں ایسے واقعات کو علم تاریخ کا جزو نہیں سمجھا جاتا بلکہ علم ہیئت اور کائنات الجو کے ماہرین ان تغیرات کی کیفیت شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں۔ اگر سائنس کی ترقی اور تیز رفتاری کی یہی کیفیت رہی تو رفتہ رفتہ علم تاریخ سے خاص خاص قسم کے واقعات علیحدہ ہوتے جائیں گے اور پھر اس خرمن میں بجز چند دانوں کے اور کچھ نہ رہے گا۔

کیا یہ دلچسپ علم جو ہر زمانے میں متمدن دنیا کے لئے مایہ فخر و ناز رہا ہے اور جس کا مطالعہ انسانی دماغ کے لئے بہترین تفریح سمجھا گیا ہے۔ سائنس کے ہر لحظہ بڑھتے ہوئے سمندر میں غرقاب ہو جائے گا؟ بادی النظر میں تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ موجودہ کے مورخ جب کسی عجیب و غریب اقتصادی یا طبی واقعہ کا ذکر کرتے ہیں تو بہت مختصر طور پر کسی علم اقتصاد یا فن طب کی کتاب کے حوالے کو کافی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسے واقعات کی نسبت اُن کے خیالات خواہ کیسے ہی دلفریب اور دلکش پیرایہ میں کیوں نہ بیان کئے جائیں ہرگز ایک ماہر فنِ اقتصاد یا ماہر طب کی رائے کے برابر وقعت نہیں رکھ سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ پر لطف الفاظ اور دلفریب طرز تحریر کا جامہ جو پرانے مورخین کے بیان کردہ واقعات کو اس قدر دلکش اور دلفریب بناتا ہے، سائنس کے ہاتھوں تار تار کر کے پھینک دیا جائیگا پس مورخ ایسے علوم کے متعلق خامہ فرسائی کرنا ماہرین فن کا کام سمجھتے ہیں۔ اور اپنی توجہ صرف اُن واقعات تک محدود رکھتے ہیں جن کا تعلق زیادہ تر ملکی اور سیاسی معاملات سے ہے

تاریخ کے قدیم معنوں کے لحاظ سے نوچ کھسوٹ کے بعد جو کچھ سرمایہ بچا ہے وہ بھی رفتہ رفتہ سائنس کے ایک خاص شعبہ میں جا رہا ہے جس کا نام فلسفہ سیاست یا پولیٹیکل سائنس ہے

اس جدید شعبہ کی ترقی اگرچہ انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی لیکن چودھویں صدی عیسوی میں جبکہ اسلامی سلطنت اور اسلامی تمدن کی روشنی ممالک مغربی میں باقی تھی اُسکی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ یورپ اُس وقت ازمنہ متوسط کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں ملفوف تھا کہ ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں ٹیونس میں پیدا ہوا۔ اور ایک ایسے نئے فلسفہ اور نئی سائنس کی بنیاد ڈالی جو ارسطو کے نشان و گمان میں بھی نہ تھی۔ ابن خلدون نے یہ دلیل پیش کی کہ موجودات کے علم کا نام فلسفہ ہے اور چونکہ موجودات کے علوم کا انحصار واقعات کی صحت اور عدم صحت پر ہے اور واقعات کی صحت و عدم صحت کا پتہ تاریخ سے چلتا ہے اس لئے تاریخ ہی ایسا علم ہے جس پر فلسفہ کا اطلاق صحیح معنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کو شاعرانہ لفاظی اور افسانہ نویسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا محض یہ کام ہے کہ واقعات جمع کئے جائیں اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کئے جائیں۔ تعصب اور طرفداری کو بالائے طاق رکھکر ہر واقعہ پر تنقید کا تیز نشتر استعمال کیا جائے۔

فلسفہ تاریخ کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ یکساں اسباب سے یکساں نتایج کا ظہور ہوتا ہے یعنی یہ کہ ایک قسم کے واقعات کا نتیجہ ہمیشہ یکساں ہوتا ہے۔ مثلاً قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی قوم مردانہ شجاعت اور عدل و انصاف کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہے اور عیش و عشرت کی طرف راغب ہو جاتی ہے تو دوسری قوم اور دوسرا تمدن اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ ریگستان عرب کے مٹھی بھر باشندے ہسپانیہ کے دور دراز ملک پر باسانی قابض ہوگئے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ فاتحین میں شجاعت۔ پرہیزگاری اور عدل و انصاف کے جوہر موجود تھے اور مفتوح باشندگان میں یہ صفات مفقود تھیں چند صدیوں کے بعد جب ہسپانیہ کے مسلمانوں نے عیش و عشرت میں پڑکر اپنے آبا و اجداد کی خصوصیات کو پس پشت ڈال دیا تو اصلی باشندگان اسپین نے (جنکو صدیوں کی غلامی نے کمزور کردیا تھا) طارق جیسے دلاور اور شجاع کی اور اس کے ساتھیوں کی اولاد کو کھڑے کھڑے اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ آجکل اگر ہم کسی قوم میں پست ہمتی۔ بداخلاقی سستی اور کاہلی کے آثار دیکھتے ہیں تو ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنا دشوار نہیں ہے کہ یہ قوم عنقریب غارت و برباد ہونیوالی ہے

فطرت انسانی امتداد زمانہ کی وجہ سے تبدیل نہیں ہو جاتی اس لئے موجودہ حالات کے صحیح اندازہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حالات ماضیہ پر غور و خوض کیا جائے اور جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس کے مقابلے اور موازنہ سے آیندہ کے واقعات کا صحیح اندازہ کیا جائے۔ ابن خلدون نے اس جدید فلسفۂ تاریخ کو اگلے زمانہ کے تاریخی حشو و زوائد سے پاک کیا اور صرف ملکی حکومت انسانی سوسائٹی کے بننے بگڑنے اور عروج و زوال کے واقعات یا معاشرتی اور اخلاقی ترقی اور تہذیب و تمدن کی اشاعت اور ان کے نتایج سے سروکار رکھا! ابن خلدون نے نہایت انکساری سے اپنی آخری تحریرات میں بیان کیا ہے کہ اس نے ایک عظیم الشان علم کی بنیاد ڈالی اور بجز خاص خاص اصول کی طرف اشارہ کرنے کے اور کچھ نہیں کیا ہے مگر اُسے قوی امید ہے کہ اس کے بعد دوسرے علماء اُسکی آغاز کردہ تحقیقات کو نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ اس میں نئی نئی شاخیں پیدا کر سکیں گے۔

بقول ڈاکٹر ڈابوار۔ ابن خلدون کی یہ قوی امید پوری ہوئی اور فلسفہ تاریخ ترقی پاکر فلسفہ سیاسی کی صورت میں ظاہر ہوا[1] لیکن افسوس ہے کہ ابن خلدون کے فلسفہ کو نشو و نما دینے اور موجودہ عروج کو پہنچانے والے مسلمان نہ تھے بلکہ یورپ کے عیسائی۔ اسلامی تہذیب و تمدن میں چودھویں صدی سے ایسا زوال آیا کہ مسلمانوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ فلسفہ سیاست جس کے اصول پر آج متمدن دنیا کی سیاست کا دارومدار ہے۔ ایک مسلمان کے دماغ کا نتیجہ تھا!

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس فطرتی خاصہ کے اقتضا سے انسان مل جل کر رہتا ہے۔ لیکن اس کے مل جل کر رہنے سے متعدد نتایج پیدا ہوتے ہیں جن سے مختلف علوم کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً علم سیاست مدن، علم اللسان وغیرہ لیکن فلسفہ سیاست انسانی سوسائٹی کی صرف ایک شق سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان مثل دیگر جانداروں کے خاندان بناکر رہتا ہے گو اُس میں خاندانی تعلقات کا سلسلہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے لیکن خاندان کے محدود دائرہ کے علاوہ ہم انسان کو ایک دوسرے سلسلہ اور زیادہ منضبط نظام کا محکوم

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فلسفہ اسلام مصنفہ ڈاکٹر ڈابوار ۱۲

پاتے ہیں۔ دنیا کے خواہ کسی حصّے میں جاؤ اور کسی آدمی سے سوال کرو کہ علاوہ اپنے خاندانی تعلقات کے وہ کس نظام کا پابند ہے۔ جس کے احکام اور قوانین کے سامنے سر جھکانا وہ بعض حالتوں میں خاندانی قواعد وضوابط سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ اور جس کے ماتحت ہونے کی وجہ سے اُسے خاص حقوق حاصل ہوتے ہیں تو یہی جواب ملے گا کہ وہ کسی حکومت کا پابند اور حلقہ بگوش ہے۔ مثلاً یہی سوال کسی ہندوستان کے مسلمان سے کیا جاوے تو وہ یہی جواب دے گا کہ وہ "برٹش سبجکٹ ہے" ظاہر ہے کہ اِس نظام کو اُس کے خاندانی نظام سے کوئی تعلق نہیں حالانکہ وہ اپنے خاندانی قواعد وضوابط کی پابندی کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ یہ نظام اُس کے مذہب سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ حالانکہ جس مذہب کا وہ پابند ہے اُس کے قوانین وضوابط اور ارشادات کی تعمیل کو اپنا فرض اور سبب نجات جانتا ہے اور گو وہ عربی النسل ہو اور مذہباً اور رسماً اپنے عربی بھائیوں سے متحد ہو اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی اُن سے زیادہ مختلف نہو۔ مگر باوجود ان مشابہتوں کے وہ بالکل مختلف حکومت کے قوانین کا ماتحت ہے اور اہلِ عرب دوسری کے۔

انسانی سوسائٹی کی تقسیم مختلف اصولوں پر کی جاتی ہے۔

علم الانسان کا ماہر کالے۔ گورے۔ زرد۔ اور بھورے حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔

علم الابدان کا عالم سر کی ہڈی کے ساخت کے لحاظ سے اور کوئی بالوں کی رنگت کے لحاظ سے۔

علم اللسان کا ماہر اختلافات زبان کے اعتبار سے۔

لیکن پولیٹیکل سائنس یا فلسفہ سیاست بنی نوع انسان کو بالکل جدا شکل میں تقسیم کرتا ہے۔ اسکی تقسیم کا معیار بالکل انوکھا ہے میں اگرچہ برہما یا سیلون یا گجرات کے باشندے کی زبان کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکوں گا مگر میں اپنے آپ کو اُس کے ساتھ ایک ہی حکومت کا ماتحت سمجھتا ہوں۔ میرے اور اس کے حقوق ایک لحاظ سے یکساں ہیں۔ برخلاف اِس کے گو میں اپنا کاروبار اُسی زبان میں کرتا ہوں جس میں کہ امریکہ کا ایک باشندہ لیکن بلحاظ حکومت وہ دوسری قسم کی حکومت کا حلقہ بگوش ہے اور میں دوسری قسم کی حکومت کا۔

بنی نوع انسان کی تقسیم بلحاظ حکومتوں کے نہایت اہمیت رکھتی ہے اولاً بوجہ اپنی عمومیت کے اور ثانیاً بہ سبب اپنے اثرات اور نتائج کے ہم خواہ کسی حصۂ ملک اور کسی سوسائٹی میں جائیں۔ انسانوں کو گروہ گروہ میں منقسم اور ساتھ ہی کسی خاص قوانین یا رسم ورواج کا پابند پائیں گے اور حکومت ہی ایسا لفظ ثابت ہوگا جو ہر قسم کی جماعت پر حاوی ہوسکتا ہے۔

چونکہ انسان کسی حکومت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اُس کے قوانین اور مراسم کا پابند سمجھتا ہے اور اسکی سلامتی کے لئے اگر ضرورت ہو تو اپنی جان تک سے دریغ نہیں کرتا اور یقین رکھتا ہے کہ حکومت کی خدمت میں ہر طرح کی تکلیف اور سختی برداشت کرنا اُس کا فرض اولین ہے۔ اس لئے ان حکومتوں کی موجودگی کے باعث چند اہم اور دلچسپ واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں:-

(۱) انکا آغاز۔ اُنکی بالیدگی اور ترقی اُن کی مختلف قسمیں اور تبدیلیاں۔

(۲) ایک جماعت کا دوسری جماعت پر اثر۔ آپس کی لڑائیاں اُن کے عہد نامے ملکوں کا الحاق واتحاد۔

(۳) وہ لاتناہی اثرات جو ان جماعتوں کے محکوم ہونے کی وجہ سے رعایا پر پڑتے ہیں یعنی تہذیب وتمدن کی ترقی۔

ناظرین غور کریں کہ محض اس واقعہ کی بدولت کہ انسان
کسی حکومت کا تابع ہوتا ہے ہمارے غور و فکر کرنے کے لئے کسقدر
وسیع منظر سامنے آجاتا ہے۔

پولیٹکل سائنس کا موضوع حکومت ہے۔ چوں کہ حکومت
قائم رکھنے کے لئے ہم ایک نظم و نسق کا رواج دیتے ہیں یا بالفاظ
دیگر گورنمنٹ قائم کرتے ہیں اس لیئے سیاست ملک کے تمام رموز
اور اُن پر غور و خوض کرنا فلسفہ سیاست کے دائرہ میں آجاتا ہے
یعنی جس طرح پولیٹکل اکانمی کا تعلق ملکی دولت سے یا علم الاجسام
انسان کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے یا جبر و مقابلہ اعداد سے متعلق
ہے، یا مساحت فاصلہ اور جسامت سے تعلق رکھتی ہے اسی طرح
فلسفہ سیاست حکومت یا نظام سلطنت اور گورنمنٹ سے واسطہ
رکھتا ہے۔

سیاست ملکی یا گورنمنٹ کی دو شاخیں ہیں۔ اوّل اندرونی
ساخت اور وضع کہ کس طرح پر گورنمنٹ قائم ہوتی ہے اور کن ذرائع
سے سیاست کی کل چلتی ہے۔ دوم بیرونی اثرات یعنی ایک حکومت
دوسری حکومت پر کس طرح اور کس قسم کا اثر ڈالتی ہے اسکا صحیح
اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس صحیح معلومات
اور واقعات کا عظیم الشان ذخیرہ اور معتبر اور مستند تواریخ کی کتب
کا مجموعہ ہو تاکہ مختلف قسم کے واقعات صیغہ وار جمع ہوسکیں مثلاً یہ
کہ مختلف حکومتوں کے قائم ہونے اور ترقی کرنے میں کن کن واقعات
نے مدد دی یا یہ کہ گرد و نواح کی حکومتوں کے تعلقات نے اُنکی
ترقی اور تنزل میں کیا اثرات پیدا کئے۔ اس قسم کے معاملات
میں ہم صحیح نتائج پر صرف اُسی وقت پہنچ سکتے ہیں جبکہ ہمارے
پاس مستند واقعات کا کافی سرمایہ ہو۔

علم سیاست مثل علم کیمیا کے نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں
کسی چیز کے اجزاء کا امتحان آلات اور مشاہدات کی مدد سے کرلیں
مثلاً ہمیں ہوا میں آکسیجن بطور جزو کے ماننے میں پس و پیش ہو تو ہم
فوراً چند آلات کی مدد سے آکسیجن اور نائٹروجن الگ الگ
کرلیتے ہیں اور چند مشاہدات سے ایک حصّہ میں آکسیجن کی خصوصیات
پاتے ہیں اور ایک میں نائٹروجن کی مثلاً آکسیجن میں دہکتے ہوئے انگارے
کا بھڑک اٹھنا اور نائٹروجن میں شمع کا گل ہوجانا۔ اس طرح ہم یقین
کرلیتے ہیں کہ ہوا کا ایک جزو آکسیجن ہے جو بقاء حیات کے لیے ضروری ہے۔

لیکن کسی سیاسی نتیجہ کا امتحان ہم اس طریقے پر نہیں کرسکتے
مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان کی روز افزوں ترقی اور کامیابی
کا راز پارلیمنٹ ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انگلستان کی وضع
کا پارلیمنٹ ہندوستان میں رائج کرنے سے بھی وہی نتیجہ پیدا ہوگا
جو انگلستان میں پیدا ہوا کسی طرح قابل وثوق نہیں ہے۔ حکومت آفتاب
و ماہتاب کی طرح کوئی مادی شے نہیں ہے کہ دوربین اور علم ریاضی
کی مدد سے ہم اس کا مشاہدہ کرسکیں۔ حکومت اخلاقی اثرات سے محصور
ہے جو کام کسی حکومت سے بحیثیت مجموعی ظہور پذیر ہوتا ہے وہ دراصل
فرداً فرداً ہر باشندۂ حکومت کی جد و جہد اور محنت کا نتیجہ ہوتا ہے مثلاً
انگلستان کے تہذیب و تمدن پر شکسپیر اور ملٹن کے علمی کارناموں کا
بہت کچھ اثر پڑا۔ یا شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی پند و نصائح سے تمام مغربی
اور جنوبی ایشیا اثر پذیر ہوا ہے اور اہل ایشیا کے اخلاق و عادات
پر اُنھوں نے گہرا نقش چھوڑا ہے لیکن تاریخ میں ہم اُن صاحبان کمال کے حالات بہت
کم پاتے ہیں پس صحیح سیاسی نتائج پر پہنچنے کے لئے ہماری مشکلات کا حل محض تاریخی
واقعات سے ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام واقعات جو کسی حکومت اور قوم کی ترقی کا
باعث ہوتے ہیں ہمارے پیش نظر ہونا چاہئیں۔ اور جنھیں مورخین یہ سمجھکر کہ یہ
معاملات اُنکے مضمون سے دور ہیں پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد ہمارا یہ
کام ہے کہ حکومت کے قایم ہونے اور وجود میں آنے اور ترقی کرنیکے اسباب کا تذکرہ کریں۔

ظفر عمر (علیگ)

آخری شاہ مغلیہ کی تحریر کا نمونہ

خواجہ میر علی تبریزی کی تحریر کا نمونہ

شیخ ابوالفیض فیضی فیاضی

مسلمان ناز اور فخر کر سکتے ہیں کہ انکے طبقہ میں فیضی سا جامع کمالات شخص گزرا۔ یک فنی تو بہت لوگ گذرے ہیں مگر جامع علوم و فنون صرف فیاضی تھا۔ چنانچہ واقعات ذیل سے معلوم ہوگا۔ مخزن اسرار نظامی کے جواب میں کتاب مرکز ادوار لکھی ہے۔ آغاز کتاب کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم — گنج ازل راست طلسم قدیم
گنج ازل چیست کلام خدا — مہر ابد کرد بنام خدا
نقد دو کون است دریں مایہ درج — چار کتاب است دریں آیہ درج

حروف بسم اللہ کے معنی بیان کرتے ہوئے الرحمن کے الف لام کی نسبت لکھتا ہے۔

ورنگری وحدت و کثرت یکیست — لام و الف در خط وحدت یکیست
لام بدل کردہ الف را مقام — کردہ الف نیز بدل جاے لام
چند بہر حرف شوی مختلف — یک دلی آموز ز لام و الف

حمد میں لکھتا ہے۔

تحفۂ ہستی کہ مشبک نگاشت — نقش بدایع ہمہ یک یک نگاشت
روز برافروخت بہ اقبال صبح — پائے شب آراست بہ خلخال صبح
در دہ دل مشعل توفیق سوخت — خانۂ تقلید ز تحقیق سوخت
صوفی و صافی مترنم ازو — قول کلیم و متکلم ازو
نامیہ از ابر عطایش عجیم — عاقلہ از نطفۂ درکش عقیم
عقل مقدس بہ تہش پا بگل — فکر از و دست تحیر بدل
عقل کجا فکرت یزداں کجا — بر در واجب رہ امکاں کجا
دانش ما چیست بہ علم علیم — فکرت محدث چہ رسد در قدیم
ماسکہ را حوصلہ بر طاق ماند — ناطقہ را سلسلہ بر ساق ماند

توحید میں لکھتا ہے۔

اے ہمہ در پردہ نہان راز تو — بے خبر انجام ز آغاز تو
قدس تو آنجا کہ زند گام را — راہ نہ آغاز نہ انجام را
در تو ہم آغاز ہم انجام گم — ہر دو بلشہر قدمت نام گم

مناجات میں کہتا ہے۔

خاک عدم با تو عروسی نقاب — آب قدم بے تو چو نقش برآب
در جسد خاک تہی روح پاک — طبلۂ عطار کنی جیب خاک
در سر صبح از تو نوائے صبوح — در تن خاک از تو رواں آب روح
جوش دگر بخش بہ صہبائے من — شور دگر ریز بہ سودائے من
خون مرا رونق گلزار دہ — خاک مرا چشمۂ انوار دہ
نقد مرا گرمئ بازار بخش — جنس مرا چشم خریدار بخش
چشمۂ دل کور و جگر ناصبور — بو کہ دہد ساقی خورشید نور
کون و مکاں پرتو ذات تو اند — دیدہ و دل محو صفات تو اند
آمدگی سود نہ آوردگی — ذات تو ہم پردہ وہم پردگی

ترتیب کلام میں تمہیداً کچھ اشعار لکھکر گریز بمدح شاہ کرتا ہے بادشاہ کی تعریف بادشاہ بناکر ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے خیال میں خدا جانے کیا سمجھا اور کیا کچھ کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ حیثیت سے اپنے لئے لقب مداحی پسند نہیں کرتا۔ بلکہ جو کچھ مدح شاہ میں کہتا ہے اس کا نام "جوش ارادت" رکھنا چاہتا ہے اس خیال کی بنیاد تنوع خیالات اور ایجاد پسند طبیعت پر ہی نہیں بلکہ اس میں اہلکاری کے بہت سے اسرار مخفی ہیں۔

سایہ صفت ہر کہ نہ از حق جداست — سایہ نہ گوئیم کہ نور خداست
نام گرامنند شہان بر سرش — آمدہ طغرائے ہوالاکبرش
از ورق غیب سبق یافتہ — رتبۂ ہمنامئے حق یافتہ
اسم نگو عین مسمیٰ است این — اللہ اکبر چہ معنیٰ است این
صورت معنی زہم انگیختہ — کثرت و وحدت بہم آمیختہ
قوت کونین بہ بازوے او — گنج دو عالم بہ ترازوے او
بحر ازل را گہرش ترجماں — علم ابد را سخنش ترجماں
سر چو بہ بالین ہوس کم نہاد — بر سر خود بار دو عالم نہاد
جلوۂ دستے و فریدون دور — جرعہ جامے و فلاطون دور

خطاب

اے دو جہاں عقل مسلم ترا — دور شہنشاہی عالم ترا
ہست دو منشور جہانبانیت — چوں سر تیغ و خط پیشانیت
در ازل از مدح تو بستند طرف — دہ قلم و نہ ورق و ہفت حرف
مدح تو بر فرق ازل خواندہ اند — تخت تو بر دوش ابد ماندہ اند
بر صف کونین دلیر آمدی — دیر جہان دیر کہ دیر آمدی

اس کتاب میں مندرجہ ذیل عنوان ہیں

(۱) خلوت در انجمن (۲) ستایش نفس (۳) ستایش سخن (۴) نیرنگی نامہ (۵) چہرہ کشائی قلم (۶) بہار آفرینش (۷) صفت پرتو دل (۸) فروغ خرد (۹) صنعت علم (۱۰) گونہ حسن (۱۱) جوش عشق (۱۲) ثنائے نظر (۱۳) نشاط بیداری (۱۴) طلوع صبح (۱۵) کوس سفر (۱۶) خزان فنا (۱۷) ترانہ واپسیں۔ خواجہ نظامی اور ملا جامی کی طرح ہر ایک بیان کے ساتھ حکایت نہیں لکھی۔ صرف تین چار جگہ حکایات لکھی ہیں۔

پہلی کتاب جو اس طرز میں لکھی گئی یعنی جو مقطعات صحیحہ یا مضامین نفیسہ پر مشتمل اور ان تمام عیوب سے پاک ہو جو عموماً مشرقی لٹریچر میں پائے جاتے ہیں وہ خاقانی کی تحفۃ العراقین ہے۔ خواجہ نظامی کی ایجاد پسند طبیعت نے اس طرز میں تھوڑا سا تغیر دیکر ایک جدت پیدا کی اور مخزن اسرار لکھی یہ طرز ایسی مقبول ہوئی کہ تمام شعرا نے اسی زمین میں طبیعت کے جوہر دکھائے۔ امیر خسرو کی مطلع الانوار ملا جامی کی تحفۃ الاحرار تو داخل درس ہیں۔ عرفی شیرازی کی ناتمام مجمع الافکار اور زلالی کے کچھ مختلف اشعار بھی متداول ہیں فیضی نے اس کتاب میں شاعرانہ زور دکھانے کے علاوہ یہ مدنظر رکھا ہے کہ کلام محققانہ ہو اور اس سے شاعر کی وسعت معلومات بھی نمایاں ہو تعجب ہے کہ مرکز ادوار میں نعت رسول کا ایک شعر بھی نہیں ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ شیخ کے سامنے مخزن اسرار۔ مطلع انوار۔ تحفۂ احرار رکھی ہوں جن میں متعدد نعتیں ہوں شیخ ان کا جواب لکھنا چاہے۔ تفسیر قرآن لکھے۔ مسلمان کہلائے اور نعت رسول کا ایک شعر بھی نہو۔ حالاں کہ نل دمن میں بڑی بلاغت کے ساتھ نعت لکھی ہے۔ اور جا بجا معتزلہ کا ذکر کرکے خشک فلسفیوں کے انکار پر استہزا کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے بھی اپنی تاریخ میں اس کتاب پر کچھ اعتراض نہیں کیا ورنہ ملا جو اپنی تاریخ کے صفحہ کو فیضی کے کفر و الحاد کا فتویٰ بنانا چاہتا تھا۔ کب درگذر کرنے والا تھا۔

اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہزادہ سلیم جو بعد میں نور الدین جہانگیر کے نام سے تخت ہندوستان پر جلوہ آرا ہوا فیضی و ابوالفضل کا پولیٹکل تعلقات کی وجہ سے سخت دشمن تھا۔ جب بادشاہ ہوا تو اُسے انکی شہرت و لیاقت کی داستانیں ناگوار طبع گزرنے لگیں۔ جہانگیر ہی راہ چلا جو طریق اس کے بعد عالمگیر نے دارا شکوہ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یعنی ابوالفضل اور فیضی کے منشیانہ و شاعرانہ خیالات کو میزان فقہ و شرع میں تولا اور کفر و الحاد کا فتویٰ لگا دیا۔ پس لغت کے

علہ یہ مضمون حدیث عَلَّمَنِی رَبِّی فَاَحْسَنَ تَادِیبِی سے لیا ہے اور بادشاہ کی ناخواندگی کو علم لدنی کا خلعت پہنایا ہے ۔ ۱۲

کل اشعار غالباً نکال دیئے گئے اور باقی کتاب بثبوت ارتداد کے لئے چھوڑ دی گئی۔ بادشاہ یا معشوق کی علالت میں غزل لکھتا ہے۔

یارب بناز پرورنازک نہال مارا   خورشید عافیت کن ابرو ہلال مارا
چون چشم خویش تا کے باشد بہ ناتوانی   در جلوہ آر دیگر مشکیں غزال مارا
بر صفحہ جمالش یکتا ئے دیدۂ ما   از آیت شفا کن فرخندہ فال مارا
اے عافیت کجائی زیں خانہ سر بدر کن   صاف نشاط گرداں دُرد ملال مارا
آن ماہ را بر آور از احتراق اشب   مپسند اے سعادت دیگر وبال مارا
در حلقۂ ملائک ذکریست تازہ گوئی   فیضی کمال صحت خواہد جلال مارا

غسل صحت بادشاہ کے بارے میں کہتا ہے۔

تا صحت ست عنصر شاہ یگانہ را   پیداست اعتدال مزاج زمانہ را
در خواب راحت اند و بیمار نرگسش   کوتہ کن اے طبیب فسون گر فسانہ را
گو شمع گوشہ گیر کہ از صبح عافیت   افروخت آفتاب نخش صحن خانہ را
اے عیش گر بہ پرفت زمن ورنہ کردہ   انبار مقدمت گہر دانہ دانہ را
اے خوش دلی کہ ماندی ازیں بزم گاہ دور   فرسودہ کن ز بوسۂ دن آستانہ را

کہیں واقعات تاریخی کی بھی جھلکی دیتا ہے۔

فیضی بگردش قدح دم بدم کہ شاہ   گجرات فتح کرد بہ بنگالہ میرسد

بعض غزلیں متروک بحور میں ہیں جنکے مضامین وغیرہ سے پایا جاتا ہے کہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی کا تتبع کرتا ہے۔

ساقی دوران گذر زعربدہ سازی   ساغر مے دہ بدور اکبر غازی
نے مے دانش رباکہ محتشماں را   ہیچو سپہر آورد بہ سفلہ نوازی
نے مے بدخو کہ درو مارغ رعونت   یاد نہ دورد ہد بہ معرکہ تازی
نے مے آتش منش کہ در صف بستاں   شہرہ بود گر میش بہ شیشہ گدازی
نے مے بیباک دل کہ بر خرد آرد   ترک ہوس را ہوائے دست درازی
زاں مے یکرنگ کز تصرف باطن   تو بہ دہد چرخ را ز شعبدہ بازی
زاں مے صافی کہ عاکفان صوامع   خرقہ دل را ازو کنند نمازی
زاں مے روشن نظر کہ باز نماید   راہ حقیقت بہ عاشقان مجازی
زاں مے دریا گہر کہ پاک بشوید   از دل عارف خیال نفس طرازی
فیضی اگرچہ در کشی زان مے بے غش   دور نباشد کہ بر دو کون بتازی

بہاریہ غزل

خاک چمن شد ز آب مشک تتاری   آتش گل تیز کرد باد بہاری
ترشحہ کافور ریخت شاخ شگوفہ   سنبل مشکیں بسوخت عود قماری
بر سر ہر شاخ جلوہ گر شد گل ہا   کردہ چو طفلاں بہ اسپ چوب سواری
از پے دوشیزگاں حجلۂ گلشن   آب صفت خاک کرد آئینہ داری
دور نظر بازی است و حسن پرستی   وقت گل افشانی ست و بادہ گساری
غنچہ و نرگس رسیدہ اند فراہم   کوش کہ دل را بدست دیدہ سپاری
جام مے لالہ گوں ز طرۂ ساقی   فیضی اگر عاقلی ز کف نگذاری

فیضی کے قصائد بہت کم ملتے ہیں جسقدر دستیاب ہوتے ہیں وہ یا تو فخریہ ہیں یا مواعظ و نصائح سے پُر۔ قصاید بہت کم لکھے ہیں اور وہ بھی خصوصیت سے بادشاہ کی مدح میں۔

ایک فخریہ قصیدہ کا مطلع ہے۔

خواہم اصلاح نہ کتاب کنم   نسخہ کون انتخاب کنم

ایک ناصحانہ قصیدہ کا مطلع ہے۔

اگر بہ حضرت سلطاں رہ سخن داری   مباد خامشیست بہر خویشتن داری

قصائد کے کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ فیضی نے دربار میں داخل ہونے سے پیشتر جو قصائد امرائے دولت کی مدح میں لکھے تھے وہ بآلاخر سب کے سب غارت ہو گئے چنانچہ فیضی خود کہتا ہے۔

فیضیم شاعر تو نگر دل   ہمت از خاک برکشیدۂ من
گشتہ در آستین ہمت گم   طمع پیرہن دریدۂ من
ایں سواد سخن کہ مے نگری   ہست خونابہ چکیدۂ من
آفرینندہ شاہد است کہ ہست   یعنی آن خاص آفریدۂ من

بر دہ ہوش دل نظارگیان　　جلوۂ طبع شوخ دیدۂ من
بود درکوچہائے تنگ خیال　　جنبش کلک سر بریدۂ من
باشد اکنون زجنس ہائے سخن　　غزل و مثنوی گزیدۂ من
ہر چہ گفتم بمدح اہل دول　　عشق بستردا ز جریدۂ من
ورنہ مے شد شگرف دیوانے　　از غزل ہائے سر قصیدۂ من

دیگر

ایا مسافر اقطار نظم و نثر ببیں　　کہ تا کجا بود اندازۂ مساعیِ ما
ہزار گونہ سخن از زبان ما سر زد　　ہنوز تا بکجا ہا کشد دواعیِ ما
با فتاب شود منتہی بوقت نظر　　چو امتداد پذیرد خط شعاعیِ ما
ز بہر تذکرۂ اہل دید منتخب است　　کہ شد رقم زدۂ کلک اختراعیِ ما
وگرنہ در عدد از نظم ہمگنان کم نیست　　قصیدۂ و غزل و قطعہ و رباعیِ ما

سواطع الالہام - قرآن مجید کی تفسیر عربی زبان اور بے نقط الفاظ میں ہے - اس تفسیر سے فیضی کا کمال تبحر و دستگاہ ادب انشا بخوبی عیاں ہے - حروف مہملہ کا اتنا التزام کیا ہے کہ نام بھی بدل ڈالے - سرلوح پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ لکھا ہے جس میں کوئی منقوط حرف نہیں - سورۂ اخلاص اس تفسیر کی تاریخ تصنیف ہے - جاہل لوگوں نے اس تفسیر کی نسبت مشہور کر رکھا ہے کہ فیضی نے ایک قرآن بنایا تھا اور اکبر کو رسول الف ثانی قرار دیا تھا -

موارد الکلم - علم اخلاق کی ایک کتاب ہے - یہ بھی غیر منقوط حروف میں ہے - روضۃ الادبا میں اس کتاب کی چند سطور نقل کی گئی ہیں - فیضی نے خود بھی اس کتاب پر فخر کیا ہے -

طبع مشکل پسند من اکثر　　مشکلات بدیع ملتزم است
سلک ہائے بلاغت از کلکم　　باسالیب خاص منتظم است
گر دلیلے بدیں سخن خواہی　　در کتاب موارد الکلم ست

ان تصنیفات کے علاوہ اکبر نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا تو فیضی اُس کا مہتمم اور افسر اعلیٰ قرار دیا گیا - رامائن بتیال پچیسی - بھاگوت - جوگ بششٹ وغیرہ کے ترجمے سب فیضی کے قلم سے اصلاح پاکر نکلے مشہور ہے کہ فیضی بنارس پہنچا - اور برہمن بچہ بنکر بنارس کے مشہور مہادیا پاٹ شالہ میں داخل ہو گیا - چونکہ حافظہ تیز - ذہن صاف - فہم درست طبع سلیم - دل راغب - اور علوم کتب خصوصاً عربیت کی استعداد کی مدد تھی اس لئے تھوڑے سے عرصہ میں انتہائے تعلیم تک پہنچ گیا - تمام اُستاد عمدہ چلن - اور اعلیٰ قابلیت کے باعث اس سے محبت کرتے تھے جب اس نے وطن کے لئے اپنے شفیق اُستاد سے اجازت اور رخصت چاہی تو اس نے ایک ہفتہ کے لئے اور ٹھہرالیا اور اپنے گھر میں مشورہ کرکے یہ ارادہ کیا کہ اپنی اکلوتی کنیاں سے فیضی کی شادی کردے جب فیضی سے کہا گیا اس نے صاف کہدیا کہ میں اس لڑکی کو ماں جائی بہن سمجھتا ہوں اور میں خود مسلمان ہوں - استاد یہ سنکر پیکر حیرت بن گیا - آہ بھر کر کہا کہ تو نے کل ہندو دھرم کے ساتھ چھل کیا - مگر اب میرا حق استادی کیا ادا کرے گا - فیضی نے عرض کیا آپ کیا فرماتے ہیں میں دل و جان سے آپ کی پدرانہ اور اُستادانہ شفقت کا مرہون و ممنون ہوں - اور میری استطاعت سے باہر ہے کہ آپ کے انعام و احسان کا حق ادا کر سکوں - اُستاد نے کہا میں ایک خاص عہد لینا چاہتا ہوں تو سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرے گا؟ کہا ہاں - کہا تو گائیتری منتر کا ترجمہ نکرنا فیضی نے عہد کیا چنانچہ اس منتر کو بجنسہ لکھکر ترجمہ نکرنے کی یہی وجہ تحریر کردی -

بیان کیا گیا ہے کہ فیضی اور ابوالفضل نے دین کو دنیا پر نثار کردیا - اکبر نے جسقدر گرگٹ کی طرح رنگ بدلے وہ سب فیضی اور ابوالفضل کے اختراعات کا نتیجہ تھا اکبر ان کے ہاتھ میں پتلی کی طرح تھا - اور اکبر کو آفتاب پرستی بھی انہوں نے ہی سکھائی - کہتے ہیں کہ فیضی و ابوالفضل

رادھا اور کرشن

کو ملحدانہ خیالات اپنے باپ شیخ مبارک سے ارث ملے تھے مگر کسی کے مذہب پر رائے دینا نہایت مشکل ہے اور مردہ شخص کو ملحد و مرتد بنانا بالکل بے سود ہے اس لیے یہ روایت قابل تسلیم نہیں۔ یہ سچ ہے کہ دونو بھائی نورتن میں داخل تھے اور بادشاہ کی جلوت و خلوت کے جلیس و ہمراز تھے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اکبر کے مذہبی خیالات کی مہار اُنہی کے ہاتھ میں تھی محض غلط ہے اکبر کو تحقیقات مذاہب کا شوق تھا اور پولیٹیکل وجوہ سے ہندؤوں سے میل ملاپ ضروری سمجھتا تھا اور غالباً گورنمنٹ برطانیہ کی طرح وہ بھی سمجھا کہ ہندوستان جیسے کشت زار مذاہب میں اپنا طریق عمل گورنمنٹ کو لامذہبی رکھنا چاہیئے۔ ان وجوہ کے ساتھ اکبر جاہل تھا اور ہر فرقہ کے منطقی و فلسفی دلائل کا سننا اور ایک کا دوسرے پر راجح و مرجوح سمجھنا اُس کے لیے مشکل تھا۔ اس لیئے عمر بھر مذہب کو بھی شاہی رنگ رلیاں سمجھتا رہا۔ لیکن جب اکبر کے انجام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہر تاریخ میں لکھا ہوا ملتا ہے کہ مرنے سے تین روز پیشتر اُسنے قاضی اسلام کو بلایا اور اپنے گذشتہ اعمال و افعال و اقوال سے توبہ کی عمر رفتہ پر اظہار ندامت کیا اور کلمہ شہادت پڑھکر حاضرین کو اپنے تشہد کا گواہ بنایا۔ تو پھر کیوں یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ نورتن کے ان روشن اور قیمتی نگوں سے دراصل اپنے ضمیر کی راستی اور اپنی لازوال روح کو ظاہر پر نثار کر دیا تھا۔

یہ مان لینا آسان ہے کہ فیضی ہاں میں ہاں ملانے والوں میں ضرور تھا لیکن یہ یقین کرنا نہایت مشکل ہے کہ اس کے دلی معتقدات اسلام کے خلاف تھے۔ نلدمن میں جس بلاغت و فصاحت اور وسعت بیانی و زور کلامی سے اُسنے رسول کریمؐ کی نعت لکھی ہے اور عام مسلمانوں بلکہ عجائز کی طرح معجزات کا اظہار کیا ہے اُس کے مقابلہ میں ایسی روایتیں محض فضول معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں میں ہاں ملاتے رہنے کا ثبوت اُس کے اکثر اشعار سے ملیگا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

قسمت نگر کہ در خور ہر جوہرے علاست   آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او میکند معائنہ خود در آئینہ   این میکند معائنہ حق در آفتاب

نورے کز مہر عالم آرا پیداست   از جبہ شاہنشہ والا پیداست
اکبر کہ بآفتاب دارد نسبت   این نکتہ ز بنیات اسما پیداست

ایسے اشعار کو میزان فقہ میں تولنا شاعرانہ مذاق سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اشعار میں یہ لوگ دلی معتقدات نہیں بلکہ صرف طبیعت کی شوخی اور فکر کی تیزی دکھایا کرتے ہیں۔

شیخ سعدی جیسے ثقہ اور محدث ایک جگہ لکھتے ہیں "بازن خویش ہم پہلو بودم خواجوے کرمانی آمد و در زد گفتم کیستی۔ گفت منم گفتم بازن خویش ہم سخنم زنم برآشفت کہ مردک چہ میگوئی گفتم آخر شاعر نیستم بہر تو قافیہ گزارم" اگر مذکورہ بالا اشعار یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ فیضی نے اکبر کو آفتاب پرستی سکھائی تو عرفی شیرازی کو کیا کہوگے جس کے قصائد میں آفتاب کی ردیف کا پورا قصیدہ موجود ہے اس قصیدے کے سوا دوسرا کوئی قصیدہ اسنے بادشاہ کی مدح میں لکھا ہی نہیں۔ سینکڑوں لطائف سے فیضی کی ذہانت و طباعی ظاہر ہوتی ہے۔ اس جگہ صرف دو پر اقتصار کیا جاتا ہے

(۱) سلطنت ایران کا سفیر آیا بادشاہ کے سامنے مراسلہ پیش کیا۔ بادشاہ نے خود کھول لیا۔ سرنامہ نیچے۔ اور پایان اوپر۔ سفیر کے لبوں پر مسکراہٹ آنے لگی۔ فیضی جھٹ بول اٹھا "در حضرت ما سخن مگوئید کہ پیغمبر ما نیز اُمّی بود"

(۲) شاہ عباس صفوی کے دربار میں طاہر وحید نے ایک رباعی پڑھی اسقدر مقبول ہوئی کہ فوراً مراسلہ تیار ہوا اور ایک سفیر

ہزار داستاں اکبر کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ مراسلہ کا دربار بڑے تزک و احتشام سے ہوا۔ رباعی پڑھی گئی۔

زنگی بہ فراوانیِ لشکر نازد　　رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزائن پر از زر نازد　　عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

عباس صفوی شیعہ تھا۔ یہ رباعی سنتے ہی اکبر نے گوشہ چشم سے فیضی کی جانب دیکھا۔ فیضی کھڑا ہو گیا اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی

دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد　　فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد　　کونین بذات پاک اکبر نازد

سفیر عباس کو کھسیانا ہونا پڑا اور شعرائے ایران نے فیضی کی روانی طبیعت کا اقرار کیا۔ مگر انصاف یہ ہے کہ طاہر وحید کی رباعی کا جواب نہ بن سکا۔ عباس کو حیدر سے مناسبت ہے۔ کونین کو اکبر کی ذات سے کچھ مناسبت نہیں۔ اور تنقید کی نظر سے دیکھئے تو طاہر وحید کی رباعی کے چاروں مصرعے مربوط ہیں۔ فیضی کی رباعی میں یہ بات نہیں۔ اور چوتھے مصرعہ میں اوّل تو لفظ پاک حشو ہے۔ دوم کونین تثنیہ اور نازد مفرد۔ پس نازند چاہئے۔ سوم تیسرا مصرعہ طاہر وحید ہی کا لوٹا دیا۔ عطائے تو بلقائے تو۔ چہارم طاہر وحید کی رباعی میں اکبر کی ہجو ملیح اور طنز ہے۔ یعنی اکبر کو مال و دولت پر گھمنڈ ہے۔ اور عباس کو ذوالفقار حیدر پر۔ فیضی کے چوتھے مصرع میں اگر اکبر سے مراد خدا ہے تو کونین کا خدا کی ذات پر ناز کرنا کوئی عجوبہ امر نہیں اور اگر مراد ممدوح یعنی اکبر ہے تو بالکل خلاف واقع غلو اور اغراق اور محض خوشامد ہے اگر چوتھا مصرعہ یوں ہوتا تب بھی ایک بات نکل آتی۔

ہر ذرّہ بذات مہر اکبر نازد

بات یہ ہے کہ طاہر وحید نے وہ رباعی اطمینان سے سوچ سمجھکر لکھی اور فیضی نے بے ساختہ فی البدیہہ۔ پس اگر کوئی بات رہ گئی تو اس سے کمال میں نقص لازم نہیں آتا۔ بعض دوسرے شعرا نے بھی طاہر وحید کے جواب میں رباعیاں لکھی ہیں مگر کسی کی رباعی نہ مربع نشین ترجیح ہوئی نہ نقش بکرسی۔

بادشاہ کے تقرب کو فیضی تو غالباً یاوری طالع۔ بلندی و اقبال تصور کرتا ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دربارا نہ زلیست سے اس کے علم و فضل نے بہت کم فائدہ دنیا کو دیا۔ عدیم الفرصت تو تھا ہی عمر نے بھی وفا نہ کی پچاس سال کی عمر میں شنبہ دہم صفر ۱۰۰۴ھ کو چند روز بیمار رہ کر انتقال کیا۔

اکبر بیماری کا حال سنکر عیادت کے لیے خود آیا۔ اور فیضی کا سر تکیہ سے اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور فیضی کو پکارنا شروع کیا۔ نہایت محبت و قلق کے لہجے میں خیر باد کہا۔ فیضی آنکھیں کھولو دیکھو میں تمہارے پاس آیا ہوں حکیم علی گیلانی کو ساتھ لایا ہوں مگر فیضی پر سخت مدہوشی طاری تھی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ مرنے سے چار روز پیشتر مجھکو کہا کہ بادشاہ سے چار یوم کی رخصت لیکر میرے پاس ہی بیٹھے رہو۔ میں نے رخصت لی چوتھے روز انتقال کیا اور پیشین گوئی صحیح نکلی۔ صاحب جامع التواریخ لکھتا ہے کہ شیخ فیضی، کمال خجند، حکیم ہمام نے بہ ترتیب ایک ماہ کے اندر انتقال کیا۔

فیضی نے اپنی مثنوی نلدمن میں پہلا شعر حمد الٰہی میں یہ لکھا ہے

اے در تگ و پوے تو ز آغاز۔ عنقائے نظر بلند پرواز

منقول ہے کہ دوسرا مصرع یوں تھا ع طاؤس نظر بلند پرواز ایک مبصر و مدقق نے اعتراض کیا کہ طاؤس بلند پروازی کجا۔ پس بجائے طاؤس عنقا بایستے یعنی۔ "عنقائے نظر بلند پرواز

لیکن اس میں یہ نفی ہے کہ تگ و پو سے عنقا کے پرواز کو مناسبت نہیں طاؤس البتہ اڑتا بھی ہے اور دوڑتا بھی ہے۔ پس پہلا مصرعہ یوں ہو۔

اے آنکہ در اوج تو ز آغاز　　عنقائے نظر بلند پرواز

اگرچہ تگ و پو سے مراد تلاش و جستجو ہے مگر الفاظ کی مساعدت بھی ضروری ہے۔

احمد حسن شوکت

ازیاد رفتہ سلطنت

بیجانگر

باب سوم

بیجانگر کے دو راجہ

۷۵۱ھ - ۸۰۲ھ = ۱۳۵۰ء - ۱۳۹۹ء

راجہ ہری ہر کا انتقال سلطنت کے لیئے بھاکھا رائے - اور کامپا کی لڑائیاں - محمد شاہ بہمنی کی تخت نشینی - بھاکھا رائے اور کرشن دیو کا محمد شاہ سے اپنے علاقے مانگنا - کرشن دیو اور محمد شاہ کی لڑائی تلنگانہ پر محمد شاہ کی فوج کشی اور ناگ دیو پسر کرشن دیو کا قتل تلنگانہ پر محمد شاہ کی دوسری بار فوج کشی اور قلعہ گولکنڈہ کی فتح - سلطنت بہمنیہ پر بھاکھا رائے کا حملہ آور ہوکر شکست پانا محمد شاہ بہمنی کی وفات اور مجاہد شاہ کی تخت نشینی - مجاہد شاہ کا سلطنت بیجانگر پر حملہ آور ہوکر بندر رامیشورم تک تاخت و تاراج کرنا - بھاکھا رائے کے انتقال پر ہری ہر دوم کا راجہ ہونا - سلطنت بہمنیہ کے اندرونی نزاعات - راجہ ہری ہر دوم کی لڑائی فیروز شاہ بہمنی سے -

[۷۵۱ھ]/[۱۳۵۰ء] میں راجہ ہری ہر کا انتقال ہوگیا تو اُس کے دو بھائی بھاکھا رائے اور کامپا نے سلطنت کا دعوی کیا - اور [۷۵۷ھ]/[۱۳۵۶ء] تک قریباً چھ برس آپس میں لڑائی جھگڑے کرتے رہے - اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کا آدھے آدھے ملک پر قبضہ رہا - کامپا کے مرنے پر اُس کے بیٹے سنگما نے بھی اپنے باپ کے مقبوضات قریباً ایک سال تک اپنے تصرف میں رکھے - لیکن بھاکھا رائے نے بڑی ہی جد و جہد کرکے اُس کے علاقوں کو [۷۵۸ھ]/[۱۳۵۶ء] میں چھین لیا - اس واقعہ کے بعد سلطنت اندرونی نزاعوں سے پاک و صاف ہوگئی - اور بھاکھا رائے تمام ملک کا بالاستقلال فرماں روا بن گیا -

گذشتہ چھ سال میں حسن بہمنی نے ورنگل اور بیجانگر کے بہت سے علاقے فتح کرلیئے تھے اور ان پر ابھی تک اسی کا قبضہ تھا - [۷۵۹ھ]/[۱۳۵۷ء] میں محمد شاہ بہمنی اپنے باپ حسن بہمنی کا جانشین قرار پایا - تو اُسنے خیر و خیرات میں اسقدر روپیہ صرف کردیا کہ خزانہ خالی ہوگیا اور اس حالت کو دیکھکر امرا میں ایک طرح کی بد دلی پیدا ہوگئی - جب یہ خبر مشہور ہوئی تو بھاکھا رائے اور ورنگل کے راجہ کرشن دیو نے اپنے مفتوحہ علاقے واپس مانگے - محمد شاہ نے ایلچیوں کو ڈیڑھ برس تک لیت و لعل میں رکھا - اس عرصہ میں جب خزانہ معمور ہوگیا اور ناراض امرا کی جگہ نئے امرا بھرتی ہوگئے تو ایک دن دربار منعقد کرکے اون ایلچیوں کو طلب کیا اور نہایت

قہر وغضب سے کہا کہ دو ڈھائی برس ہو چکے مگر اب تک رایان تلنگ و بیجانگر نے پیشکش نہیں بھیجی۔ اُنھیں چاہئے کہ بہت جلد تلافی مافات کریں ورنہ اس کا نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔ اس خبر کے پہنچتے ہی کرشن دیو نے اپنے بیٹے ناگ دیو کو بہت سی فوج دیکر قلعہ کولاس پر روانہ کردیا۔ اور بھاکھا رائے نے اسکی مدد کے لیئے اپنے پاس سے بیس ہزار سوار دیئے۔ محمد شاہ نے مقابلہ کے لیئے بہادر خاں کو بھیجا۔ فریقین میں خوب معرکے ہوئے آخر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بہادر خاں ہندؤں کا تعاقب کرتا ہوا ورنگل تک پہنچ گیا۔ جس سے مجبور ہوکر کرشن دیو نے صلح کرلی اور ایک لاکھ ہون اور پچیس ہاتھی پیشکش میں دیئے۔ یہ واقعہ ۷۶۳ھ ۱۳۶۲ء کا ہے۔

اسی سال کے اخیر ایام میں محمد شاہ کے پاس ایک سوداگر نے آکر کہا کہ میں آپ کے لیے گھوڑے لارہا تھا مگر راستہ میں ولم پٹم کے حاکم ناگ دیو نے انہیں زبردستی چھین لیئے۔ اسپر محمد شاہ کو بے حد غصہ آیا اور اُسنے اُسیوقت لشکر کی تیاری کا حکم دیدیا۔ دس روز کے اندر اطراف وجوانب سے فوج آگئی اور گیارہویں روز چار ہزار سپاہیوں کو لےکر بادشاہ ولم پٹم کی جانب روانہ ہوا۔ ایک ہفتہ کی مسافت طے کرنے کے بعد لشکر جب شہر کے قریب ہوگیا تو بادشاہ نے تھوڑے سے آدمی سوداگروں کے بھیس میں شہر کیطرف بھیجے۔ یہ لوگ جب دروازے پر پہنچے تو دربانوں نے روکا۔ اسپر اُنہوں نے بیان کیا کہ ہم سوداگر ہیں۔ راستہ میں راہزنوں نے لوٹ لیا ہے اس لیئے راجہ کے یہاں فریادی آئے ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ فوج آگئی اور مصنوعی سوداگروں نے دربانوں کو قتل کردیا۔ اور حملہ آور بلا کسی روک ٹوک کے شہر میں داخل ہوگئے۔ ناگدیو کو جب محمد شاہ کے آنے کا حال معلوم ہوا تو پیچھے سے نکل بھاگا مگر راستہ میں مسلمانوں نے اُسے گرفتار کرلیا اور جب بادشاہ کے روبرو لایا گیا تو اُس نے نہایت گستاخی سے باتیں کیں اسپر محمد شاہ نے اسے مروا ڈالا شہر پر مسلمان قابض ہوگئے۔ بادشاہ چندروز تک مقیم رہکر واپس ہوا راستہ میں ہندؤں نے کئی حملے کئے جس کی وجہ سے بہت سے مسلمان مارے گئے۔ اور چار ہزار آدمی سے گلبرگہ میں صرف ڈیڑھ ہزار واپس آئے۔

کرشن دیو کو جب اپنے بیٹے ناگ دیو کے مارے جانے کا حال معلوم ہوا تو اُسنے فیروز شاہ تغلق کو دکن کے تسخیر کرنے کی ترغیب دلائی اور خود بھی امداد دینے اور اطاعت کرنے کا وعدہ کیا۔ محمد شاہ نے یہ کیفیت سنکر اطراف وجوانب سے بہت بڑی فوج فراہم کی اور ۷۶۷ھ کے شروع ایام میں خان محمد۔ صفدر خاں۔ اعظم ہمایوں کو ہمراہ لیکر تلنگانہ پر حملہ آور ہوا۔ شروع میں راجہ نے مقابلہ کیا مگر جب اس کو متواتر کئی شکستیں ہوئیں تو ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ بادشاہ نے دو برس اس کا تعاقب کیا ۷۶۸ھ ۱۳۶۶ء میں راجہ نے مجبور ہوکر صلح کرلی۔ اور تین سو ہاتھی۔ دو لاکھ گھوڑے تیرہ لاکھ ہون تاوان جنگ میں دے اور گولکنڈہ کا تمام علاقہ دیکر قلعہ گولکنڈہ کو سلطنت بہمنیہ اور تلنگانہ کی سرحد قرار دیا۔ اسکے بعد محمد شاہ گلبرگہ میں واپس چلا آیا اور اس فتح کی خوشی میں بادشاہ اور امرا نے کئی مہینے تک جشن منائے۔

راجہ ورنگل کے شکست پانے سے بھاکا رائے کو سخت تشویش ہوگئی۔ مگر جب اُسنے یہ دیکھا کہ محمد شاہ اور اُس کے بڑے بڑے امرا گلبرگہ میں عیش وعشرت میں مصروف ہیں تو فوراً تیس ہزار سوار اور نو لاکھ پیادوں کو لےکر سلطنت بہمنیہ

مطبوعہ انڈین پریس الٰہ آباد

حملہ کردیا - اور قلعہ ادھونی کو تاخت و تاراج کرتا ہوا مدگل میں آکر خیمہ زن ہوا اور وہاں کے آٹھ سو مسلمانوں کو جنمیں مرد عورت بوڑھے بچے سب ہی شامل تھے نہایت بے رحمی سے قتل کر ڈالا - اس فتنہ عظیم سے صرف ایک آدمی زندہ بچا جس نے بہت سی تکلیفوں کے بعد گلبرگہ میں پہنچکر بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی - محمد شاہ نے انتقام کا تہیّہ کر کے دولت آباد سے لشکر طلب کیا - لیکن اُسکے آنے سے پہلے خود نو ہزار سوار لیکر روانہ ہوگیا - برسات کا موسم ہونے سے کرشنا خوب چڑھی ہوئی تھی مگر مسلمانوں نے اُسے تین روز میں عبور کر لیا کنارے پر راجہ سے مقابلہ ہوا جس میں قریباً ستّر ہزار ہندو مارے گئے - راجہ نے بھاگ کر قلعہ ادھونی میں پناہ لی - بادشاہ نے اسی جگہ برسات کے بقیہ ایام گذارے - اس عرصہ میں جب دولت آباد کا لشکر بھی آگیا تو بادشاہ نے قلعہ ادھونی پر حملہ کیا اور تھوڑے سے معرکہ کے بعد قلعہ ادھونی فتح ہوگیا - اُسکے بعد بیجانگر کی جانب سفر کی تیاریاں ہونے لگیں - مسلمانوں نے جب دریائے دیدورتی کو عبور کر لیا تو راجہ کو بے حد پریشانی ہوئی اور اس نے اپنے بھتیجے بھوجل رائے کو چالیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادے دے کر مقابلے کے لئے بھیجا - محمد شاہ نے اپنی فوج سے جسمیں پندرہ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے تھے دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادے دیکر خان محمد کو حملے کے لئے آگے روانہ کیا - ۱۴ ذی القعدہ ۷۶۷ھ ؁۱۳۶۵ء کو سہ پہر تک خوب لڑائی ہوئی - قریب تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہوجائے مگر پیچھے سے محمد شاہ بھی بقیہ فوج لیکر آگیا جس سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے - خان محمد پانچسو سوار لیکر ہندوؤں کے لشکر میں گھس گیا اور ایسی ہلچل ڈال دی کہ ہندوؤں کے حواس باختہ ہوگئے - بھوجل رائے زخمی ہوگیا اور راجہ کی فوج پسپا ہو کر بھاگ گئی -

اس واقعہ کے بعد تین مہینے تک متعدد لڑائیاں ہوئیں اور جب راجہ کو بار بار شکست ہوتی گئی تو اُس نے بیجانگر میں جا کر پناہ لی - مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا - لیکن راجہ کی نو لاکھ سپاہ نے شہر کے تمام راستے روک دیئے جس سے مسلمان اندر داخل نہ ہو سکے - جب اسیطرح ایک مہینہ گذر گیا تو بادشاہ نے ایک دن بیماری کا بہانہ کر کے محاصرہ اُٹھا لیا اور اسلامی فوج واپس گئی - ہندوؤں نے تعاقب کیا - کئی روز کے بعد جب دونوں فوجیں ایک میدان میں آگئیں تو رات کے وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کو گھیر لیا - صبح کو اس کیفیت کے دیکھتے ہی ہندو گھبرا گئے اور ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ مسلمانوں نے مار دھاڑ شروع کردی - قریباً دس ہزار ہندو قتل ہوئے اور راجہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ گیا - اس واقعہ سے ہندو راجہ کے مخالف ہوگئے اور اُس سے کہا کہ جب سے تو حکمراں ہوا ہے قتل و خوں ریزی کا بازار گرم ہے اور اب تک ہزارہا ہندو قتل ہو گئے ہیں - مناسب ہے کہ تو آیندہ جنگ و جدل سے باز آکر اپنے بھائی کی طرح مسلمانوں کی اطاعت کر لے تاکہ ملک میں امن و چین ہو جائے - راجہ نے یہ سنتے ہی مجبور ہو کر محمد شاہ سے صلح کر لی - اور بہت سا زر و جواہر تاوان میں دیا -

اس کے بعد قریباً نو برس بیجانگر میں امن و امان رہا - اس عرصہ میں نہ تو بیجانگر والوں نے چھیڑ چھاڑ کی اور نہ بہمنیوں کو فوج کشی کی ضرورت ہوئی - لیکن ۷۷۶ھ ؁۱۳۷۵ء میں جب محمد شاہ کے بعد اُسکا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشیں ہوا تو اس نے بھاگا رائے کو لکھا کہ کرشنا اور تنگبھدرا کے دوآبہ پر ہمیشہ جھگڑا رہا کرتا ہے اس لئے سلطنت بہمنیہ کی سرحد دریائے تنگبھدرا قرار دی جائے اور قلعہ جات نبکاپور و بلگام و گوا ہمیں دے دیئے جائیں مگر راجہ نے اس کے خلاف جواب دیا کہ مدگل و رائے چور

چونکہ پہلے ہمارے قبضہ میں تھے اس لیئے وہ واپس دئےجائیں اور دریائے کرشنا سرحد مقرر کی جائے۔ اس کے سنتے ہی مجاہد شاہ نے بیدر۔ برار۔ دولت آباد سے لشکر طلب کئے اور کل خزانہ شاہی کو لے کر بیجانگر کی جانب روانہ ہوا۔ جب دریائے تنگبھدرا عبور ہوگئی تو صفدر خاں کو قلعہ ادھونی کی تسخیر پر مقرر کیا۔ اس اثنار میں راجہ کی فوج بھی گنگاوتی تک آگئی تھی اس کے مقابلہ کے لیے بہادر خاں اور اعظم ہمایوں بھیجے گئے۔ مگر بیجانگر والے بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے واپس ہوگئے۔ اور تنگبھدرا کے جنوبی جنگلوں میں جاکر پناہ لی۔ بیجانگر بہت سے پیچ در پیچ پہاڑی سلسلے میں واقع ہونے کی وجہ سے ایک نہایت محفوظ مقام ہوگیا تھا اس لیئے بادشاہ نے اُس کا محاصرہ بے سود خیال کرکے راجہ کا تعاقب کیا اور چھ مہینے تک اُسے کوہ وصحرا میں مارتا پھرا۔ پھر اُس نے باقی فوج بیجانگر کے پاس چھوڑ دی اور صرف پانچہزار سوار لیکر انتہائے جنوب میں سمندر تک چلا گیا۔ اور وہاں رامیشوم میں ملک کافور کے سپاہیوں نے جو مسجد بنوائی تھی اور آجکل شکستہ ہوگئی تھی اوسکی مرمت کرائی اور راستہ میں مدورا۔ تانجور۔ کانجی ورم وغیرہ میں تاخت و تاراج کرتا ہوا بیجانگر کو واپس آیا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے بیجانگر پر حملے شروع کیئے۔ مجاہد شاہ نے ایک تنگ راستہ پر قبضہ کرکے اس کی حفاظت کے لیئے چھ ہزار سوار اور بہت سے پیادے تعینات کر دئیے اور خود شہر کے اندر گھس کے لڑتا بھڑتا راجہ کے محل سرا تک پہونچ گیا۔ اس وقت ہندؤں نے مدافعت کے لیئے جان توڑ کوششیں شروع کیں اور مسلمانوں نے بھی مردانگی سے مقابلہ کیا۔

بادشاہ کھڑا ہوا جنگ کا ملاحظہ کر رہا تھا کہ دفعتہً اسکی نظر راجہ کے معبد پر پڑگئی اور جب اسکی نسبت یہ سنا کہ اسمیں لاانتہا دولت محفوظ ہے تو قبضہ کرنے کے لیئے بڑھا۔ ایک ہندو نے بادشاہ کو پہچان کر حملہ کرنے کے لیئے آگے آیا۔ مگر محمود خاں افغان نے اُسے روک دیا۔ اور دونوں میں مار دھاڑ شروع ہوئی۔ قریب تھا کہ محمود مارا جائے مگر بادشاہ خود اسکی امداد کے لیئے دوڑا۔ ہندو نے بادشاہ پر ہاتھ چلایا مگر سر پر خود ہونے کی وجہ سے وار خالی گیا۔ اسکے بعد بادشاہ نے ایک تلوار ایسی ماری کہ مخالف کے دو ٹکڑے ہوگئے اسی اثنار میں راجہ کا بھائی آٹھ ہزار سوار اور چھ لاکھ پیادے لے کر شہر کے باہر آگیا۔ جب یہ حال بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے یہ اندیشہ کرکے کہ اگر مسلمان شہر میں گھر گئے تو بے آب و دانہ مرنا پڑے گا فوراً واپسی شروع کردی اور ستر ہزار قیدی اور بلاتعداد دولت لے کر باہر نکل آیا اور اس کے بعد قلعہ ادھونی کا محاصرہ کیا اور قریباً نو مہینہ معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں مگر کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ سیف الدین غوری[1] نے ان بے فائدہ لڑائیوں کی کیفیت سنی اور بادشاہ کے پاس چلا آیا اور راجہ سے صلح کی باتیں کرکے جنگ موقوف کرادی۔

واپسی کے وقت دریائے تنگبھدرا سے اُتر کر مجاہد شاہ نے تمام فوج روانہ کردی اور اپنے چند مصاحبین کو لیکر دریا کے کنارے مچھلی کے شکار میں مشغول ہوا۔ اور اسیطرح کئی ہفتہ گذر گئے۔ داؤد خاں اور مسعود خاں نے جنھیں بادشاہ سے خصومت تھی اس تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور رات کیوقت موقع پاکر اُسے قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ ۱۳۷۷ء کا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بھاکھارائے کا بھی انتقال ہوگیا اور اسکی جگہ اُسکا نواسہ ہری ہر راجہ بنایا گیا۔

---

[1] ملک سیف الدین غوری مجاہد شاہ کا نانا اور سلطنت بہمنیہ کا وزیر اعظم تھا ۱۲

ہری ہر کو جو سلطنت میراث میں ملی وہ شمال میں کرشنا سے لیکر جنوب میں بندر رامیشورم تک پھیلی ہوئی تھی۔ ملیبار اور سنگلدیپ کے بڑے بڑے راجہ بھی اس کے باج گذار تھے۔ نو لاکھ سے زیادہ فوج خاص سلطنت کی ملازم تھی اور اس فوج کا شمار اس کے علاوہ تھا جسے اطراف و جوانب کے راجہ جنگ کے وقت بطور امداد و اعانت کے بھیجا کرتے تھے۔

راجہ ہری ہر نے انیس سال تک مسلمانوں سے مصالحت رکھی۔ ۷۹۹ھ میں جب محمود شاہ بہمنی کا انتقال ہو گیا تو آٹھ مہینے کے اندر اندر اس کے دو بیٹے غیاث الدین اور شمس الدین تخت نشین ہو کر معزول ہوئے۔ اس عرصہ میں سلطنت بہمنیہ میں عام طور پر بدانتظامی ہو گئی۔ جس سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر والوں نے دوآبہ کے علاقہ جات مدگل و رائے چور پر قبضہ کر لیا۔ ۸۰۰ھ میں جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو اُس نے سب سے پہلے انتظام سلطنت کی طرف توجہ کی اور ملک میں جو خرابیاں برپا ہو گئیں تھیں اونکے رفع کرنے میں مصروف ہوا۔ ہری ہر نے ان معاملات میں مشکلات پیدا کرنا چاہا اور کول اور گونڈ اقوام کے راجاؤں کو اغوا کر کے بہمنیہ سرحد پر شورش برپا کرا دی اور خود بھی ۸۰۰ھ کے اوائل ایام میں بیس ہزار سوار اور نو لاکھ پیادے لیکر سلطنت بہمنی پر حملہ آور ہوا۔ فیروز شاہ دولت آباد اور برار کے لشکر کو نرسنگھ والی گونڈوانہ کے مقابلہ پر روانہ کیا اور خود بارہ ہزار سوار لیکر سب سے پہلے کول کے راجہ کی خبر لی اور آٹھ ہزار کولیوں کو مار کر جب انکی طرف سے بے کھٹکے ہو گیا تو راجہ ہری ہر کیطرف متوجہ ہوا۔ اسلامی فوج نے آکر کرشنا کے کنارے ڈیرے ڈالے۔ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے ندی خوب لبالب تھی اور سوا اسکے راجہ نے گھاٹوں کا بھی بند و بست کرا دیا تھا جس سے مسلمانوں کو ندی کا عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ فیروز شاہ نے اراکین سلطنت سے مشورہ لیکر قاضی سراج کو بارہ آدمیوں کے ہمراہ ہندوؤں کی طرف روانہ کر دیا۔ قاضی نے ایک طوائف سے میل ملاپ کر کے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسے اور اُس کے ایک ہمراہی کو اپنے مسخروں میں شامل کر کے راجہ کی محفل نشاط میں لے جائے۔ رات کے وقت قاضی اور اس کا ساتھی دونوں ملکر اندر چلے گئے اور ننگی تلواریں لیکر مسخروں کی طرح ناچنے اور تماشا کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ایک نے موقع پا کر راجہ کے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ گیارہ آدمی جو باہر کھڑے ہوئے تھے عین وقت پر اندر گھس آئے۔ اور ڈیرے کے تمام آدمیوں کو مار کر ادھر اُدھر چھپ گئے۔ اس واقعہ سے ہندوؤں میں ہلڑ پڑ گئی۔ کسی نے کہا راجہ مارا گیا۔ کسی نے کہا اُسکا بیٹا قتل ہو گیا بعض لوگ یہ شور کرنے لگے کہ فیروز شاہ کا لشکر آ گیا۔ الغرض ان اقسام اقسام کی افواہوں سے ہندو بدحواس ہو گئے۔ اس شور و غل کے سنتے ہی دو سو سپاہیوں نے دریا کو عبور کر کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔ پھر صبح ہونے سے پہلے فیروز شاہ بھی اپنی فوج لیکر اوتر آیا۔ ہندو پریشان ہو کر بھاگنے لگے۔ بادشاہ اُن کا تعاقب کرتا ہوا بیجانگر چلا گیا۔ اس تاخت و تاراج میں چار لاکھ ہندو گرفتار ہوئے اور بہت سا علاقہ پامال ہو گیا۔ راجہ اور اُس کے امیروں نے جب ملک کو تباہ ہوتے دیکھا تو صلح کے لیے ایلچی روانہ کئے۔ میر فضل اللہ انجو وکیل شاہی سے بہت کچھ گفتگو ہوئی اور آخر میں یہ طے پایا کہ راجہ دس لاکھ ہون بادشاہ کو اور ایک لاکھ ہون میر فضل اللہ کو دے تو جنگ موقوف کیجائے گی اور قیدی رہا کر دئے جائیں گے۔ اسپر راجہ نے چھ لاکھ ہون اور رعایا نے پانچ لاکھ ہون ادا کئے اور دوآبہ کا علاقہ بھی واپس دیدیا اس تاریخ سے تنگبھدرا کا شمالی کنارہ سلطنت بہمنیہ کی سرحد قرار پایا۔

حکیم سید شمس اللہ قادری

عالم ومافی العالم

۳

یورے نس (Uranus)

چھوٹے اور نزدیکی سیاروں کا تذکرہ ختم کرکے اب ہم دور افتادہ اور سیارگان صغیرہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں "ہفت سیارگان" قدیم الایام سے مشہور چلے آتے ہیں پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں اگلے شمار میں دو اور سیارے شامل ہوئے اور پانچسو کے قریب "سیارگان خرد" نظام شمسی کے حلقہ میں داخل کئے گئے ہیں۔ ۱۷۸۱ء میں ہرشل نے یورے نس کی اصلیت کو معلوم کیا۔ گو اس کا وجود بحیثیت ستارہ عرصہ سے معلوم تھا۔ انگلستان کے نامآور فلکی فلامسٹید نے تین مرتبہ۔ بریڈلے نے ایک دفعہ۔ مائر نے ایک دفعہ۔ اور فرانس کے ایک عالم ہیئت نے اُسے گیارہ دفعہ دیکھا اور ستاروں کے ذیل میں شمار کیا تھا۔ کچھ عرصہ سے عالمان فلکیات حیران تھے کہ سنیچر اور برہسپت کی حرکتوں کی باقاعدگی اور صحت میں رخنہ واقع ہوتا ہے۔ اس کا اصلی سبب کیا ہے۔ بعض نے خیال کیا کہ ضرور کوئی اور سیارہ ہوگا جسکی کشش انکی گردشوں میں خلل انداز ہوتی ہے۔ آخرکار یہ گمان درست ثابت ہوا۔ ہرشل نے اپنی کوشش اور مشاہدہ سے اسکی تصدیق کردی۔ یورے نس (Uranus) سورج سے ایک ارب اسی کروڑ میل پر واقع ہے اور اس کا قطر تبیس ہزار میل ہے اور اسکی سالانہ گردش چوراسی برس میں تمام ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اُسکا سال ہمارے سالوں کے حساب سے ۸۴ برس کے برابر ہوتا ہے۔ اسکی حرکت محوری ۸۵ روز میں پوری ہوتی ہے یعنی وہاں کا دن ہمارے ہاں کے پچاس دن کے مساوی ہے جب سے یہ سیّارہ دریافت ہوا ہے سورج کے گرد صرف ایک چکّر لگایا ہے۔ دوسرا ہنوز ادھورا ہے اسکی گردش کا دائرہ دس ہزار ملین۔۔۔ یعنی دس ارب میل ہے ہمارے کرۂ ارض سے حجم میں چوہتّر گنا بڑا ہے۔ سر ولیم ہرشل کی رائے میں یورے نس کے گرد چھ چاند گردش کرتے ہیں۔ مگر عالموں کا تازہ ترین خیال یہ ہے کہ اس کے کل چار چاند ہیں۔ جو کرہ ارض برہسپت اور سنیچر کے چاندوں کے برعکس مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ یہہ چاروں چاند (ایریل۔ ام بریل۔ ٹٹانیا۔ ابرون) ایک لاکھ بیس ہزار میلوں سے لیکر پونے چار لاکھ میلوں تک علی الترتیب یورے نس کے اردگرد گھومتے ہیں دوسری عجیب بات یہ ہے کہ سب اسی دائرہ میں گردش کرتے ہیں۔ جسمیں خود انکا مرجع حرکت کرتا ہے جتنی حرارت سورج سے خارج ہوکر ہماری زمین پر آتی ہے اس کا صرف ۱/۳۶۸ حصّہ یُورے نس تک جاتا ہے۔ اگر اسکی اپنی کشش کا عمل معطل ہوجاے تو یہ سیارہ پندرہ برس میں سورج کی سطح پر ہولناک دھماکے کے ساتھ جاگرے گا۔ دوربینوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس میں وہی مادے پائے جاتے ہیں جو برہسپت میں موجود ہیں۔ اس واسطے موسمی تبدلات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ حرارت و برودت کے درجہ میں بھی موانست پائی جاتی ہے۔ ہوا زیادہ کثیف ہے سرخی مائل سیاہ دھاریاں دکھائی دیتی ہیں

مشتری
(جیسا دوربین میں نظر آتا ہے)
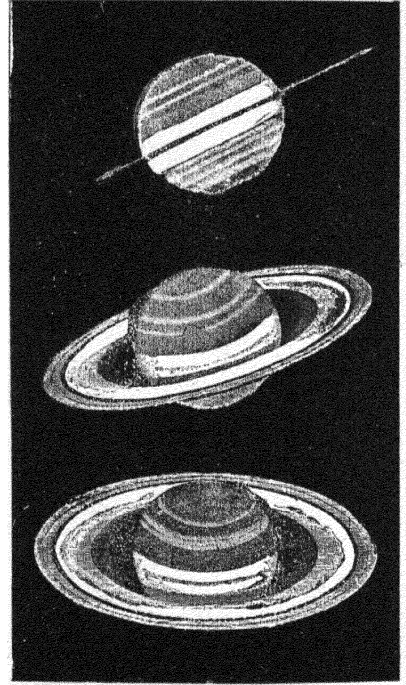
زحل اور اُس کے چھلّے
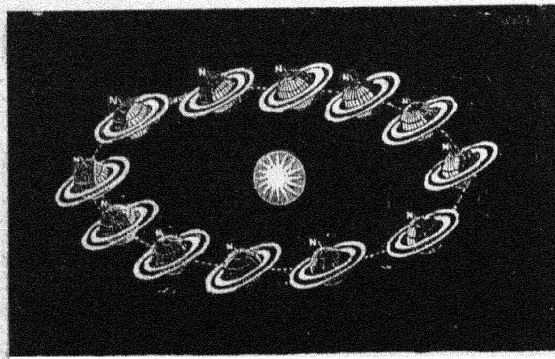
حلقہ ہائے زحل کی مختلف صورتیں

انڈین پریس، الٰہ آباد

چونکہ یہ سیارہ بہت دور افتادہ ہے اس واسطے اسکے متعلق بہت سے امور ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ جن کا زمانہ آئندہ کا سائینس انکشاف کرے گا۔

نپ چون (Neptune)

نپ چون جو اپنی دریافت کے وقت سے لیکر آج تک نظام شمسی کا چوکیدار کہلاتا ہے، نہایت ہی دور افتادہ سیارہ ہے اور ایک اعتبار سے سب سے کم عمر۔ کیونکہ ۱۸۴۶ء میں معلوم ہوکر اراکین نظام شمسی کے گروہ میں شامل ہوا تھا۔ اس سیارہ کی دریافت ریاضی فلکیات کی نہایت شاندار اور معرکۃ الآرا کامیابی ہے۔ محققان فلکیات نے اپنے دوربینی مشاہدوں میں برسوں تک دیکھا کہ یورے نس کی رفتار کبھی بہت تیز اور کبھی سست ہوتی ہے۔ بہت غور و فکر اور دیکھ بھال کے بعد اُسے کسی دور افتادہ سیارہ کی کشش سے منسوب کیا گیا مگر رخنہ انداز سیارہ کچھ عرصہ تک معلوم نہیں ہوا۔ کیمبرج کے سینٹ جانس کالج کے ایک نوعمر گریجویٹ جس کا نام جان کوچ ایڈمز تھا، اور ریاضیات میں معتدبہ دستگاہ کے لیئے خاص شہرت رکھتا تھا، اس مسئلہ کی طرف رجوع ہوا۔ اُس نے اسکے تمام پہلوؤں کو سوچا۔ سیاروں کی رفتاروں اور گردشوں کے زمانوں پر نظر عمیق ڈالی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ یورے نس سے اُس طرف ضرور کوئی بڑا سیارہ ہے جسکی کشش اُسکی حرکت محوری کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اپنے تخمینہ جات کو حوالہ قلم کرکے اکتوبر ۱۸۴۵ء میں انگلستان کے شاہی منجم کے پاس بھیجدیا۔ مگر کسی نے اس سیارہ کو دریافت کرنے کی پروا نہ کی۔ اُسی سال فرانس کا نامآور عالم جین لیویئے بھی اسطرف رجوع ہوا اور اپنے خیالات دو مضامین میں فرنچ اکیڈمی کے حوالہ کیئے۔ تیسرا مضمون اُسنے ۱۸۴۶ء میں لکھا۔ جس میں اس سیارہ کی ضخامت وغیرہ کا بھی اندازہ کیا۔ یہ مضامین برلن رصدگاہ کے مہتمم ڈاکٹر گال کے پاس بھیجکر درخواست کی کہ وہ اس سیارہ کو یورے نس سے آگے معلوم کریں۔ چنانچہ ۲۳ ستمبر ۱۸۴۶ء کو اُس نے ایک چھوٹا سا تارہ دیکھا۔ ادھر انگلستان کا شاہی منجم بھی اسکی تلاش میں تھا۔ وہ نقشے اور اندازے کر ہی رہا تھا کہ برلن سے نپ چون کی دریافت کی حیرت ناک خبر مشتہر ہوئی لالینڈ نے ۸ اور ۱۰ مئی ۱۷۹۵ء میں نپ چون کو مشاہدہ کیا۔ مگر اُسے ستاروں کے ذیل میں داخل کیا تھا۔

نپ چون کا قطر (۳۴۸۰۰) میل اور سورج سے دو ارب اناسی کرور بیس لاکھ میل[۱] واقع ہے۔ یہ نو دریافت سیارہ اپنی گردش سالانہ ۱۶۵ سالوں میں طے کرتا ہے۔ گویا اس کے ہاں کا سال ہمارے ۱۶۵ برسوں کے برابر ہے۔ اسکی ضخامت زمین سے سترہ گنا زائد اور کثافت صرف اُسکا ۱/۵ ہے۔ اور وہ اس سے پچاسی گنا بڑا ہے۔ اس کے ساتھ صرف ایک چاند ہے جو اسکی دریافت کے ایک ماہ بعد ہی معلوم ہوا تھا۔ وہ یورے نس کے چاندوں کی طرح مغرب سے مشرق کو گھومتا ہے اور اپنی گردش پانچ دن اور ۲۱ گھنٹے میں ختم کرتا ہے۔ اس کا فاصلہ نپ چون سے دو لاکھ ۲۳ ہزار میل ہے۔ جتنی حرارت اور روشنی ہمارے ہاں آتی ہے اس کا ۱/۹۰۰ حصہ نپ چون کی سطح پر پہنچتا ہے۔ اور وہ سات سو چاندوں کی روشنی کے برابر ہے۔ اگر نپ چون کی سطح سے سورج کو دیکھا جائے تو وہ بجلی کے بڑے لیمپ کی طرح دکھائی دیگا۔ شاید پوچھا جائے کہ نپ چون پر نظام شمسی کی حد ختم ہوجاتی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

---

[۱] ماخوذ از "نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد نمبر ۱۶ صفحہ ۳۶۲

دو ڈھائی سال ہوئے امریکہ کے علم فلکیات نے اس سے بھی آگے ایک بڑا سیارہ دریافت کیا ہے جو اپنی کشش کا اثر نیپچون کی نقل و حرکت پر ڈال رہا ہے اب "چوکیداری" کی پگڑی اس نو دریافت سیارہ کے ہاتھ آگئی ہے۔ معلوم نہیں کہ آنے والے زمانہ میں عالموں کی علمی کوششوں سے اور کیا کچھ دریافت ہوگا۔ دوربینوں کے سائنس کی ترقی کے دوش بدوش فلکی انکشافات میں بھی اضافہ کثیر ہوگا۔

سنیچر (زحل)

سنیچر (Saturn) پرانے سیاروں میں باعتبار حجم دوسرا اور بلحاظ بُعد چھٹا ہے۔ یہ سیارہ سب سے زیادہ عجیب ہے۔ اس کے اردگرد مسلسل درخشاں حلقے اور دائرے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے ساتھ آٹھ چاند گردش کرتے ہیں اسکا قطر ۷۴ ہزار میل اور سورج سے اٹھاسی کروڑ بہتّر لاکھ میل پر واقع ہے اس کا سال ہمارے بیس سال کے برابر ہوتا ہے۔ اسکی حرکت محوری دس گھنٹہ چودہ منٹ میں تمام ہوتی ہے۔ یہ کرہ زمین سے سات سو ساٹھ گنا بڑا ہے۔ اسکی کثافت زمین کا صرف آٹھواں حصہ ہے۔ جتنی حرارت اور روشنی ہمارے ہاں آتی ہے سنیچر کے حصہ میں اس کا صرف ۱/۹۰ حصہ جاتا ہے۔ مگر وہ ہمارے تین ہزار چاندوں کی برابر ہے اور جانداروں کی حیات کا وسیلہ بن سکتی ہے۔

اگر سنیچر کے سر پر سنیچر سوار ہو جاے اور اسکی کشش بالکل زائل ہو جائے تو یہ پانچ سال دو ماہ میں سطح آفتاب پر آرہے گا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد جلکر کوئلہ ہو جائے گا۔ اسکے ہاں کے موسم بہت بے قاعدہ اور لمبے لمبے ہوتے ہیں قطبین میں برسوں تک جاڑا اور تاریکی رہتی ہے۔

سنیچر کے عجائبات طبعی میں اس کے اردگرد کے ہالے یا چھلے ہیں۔ جن کا شمار کم از کم تین ہے بیرونی حلقہ کا قطر کوئی دو لاکھ۔ دوسرے کا ڈیڑھ لاکھ اور تیسرے کا ایک لاکھ انیس ہزار میل ہے۔ علما کہتے ہیں کہ یہ دائرے یا چھلے دوربین میں نہایت ہی شاندار اور خوب صورت معلوم ہوتے ہیں اور شان یزدانی کی تحسین و آفریں زبان سے نکلتی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سیاروں کے حلقے ہیں جو کشش اتصال سے ایک دوسرے سے مربوط اور منسلک رہتے ہیں۔ گلیلیو نے ۱۶۱۰ء میں یہ حلقے پہلے پہل دیکھے تھے۔ مگر بیان نکر سکا کہ کیا ہیں۔ اسکے کچھ چاند تو اسکے بہت قریب ہیں اور آدھے کے قریب کچھ فاصلہ پر ہیں۔ نزدیک ترین چاند ایک لاکھ بائیس ہزار میل پر اور بعید ترین بائیس لاکھ ستانوے ہزار میل پر واقع ہے۔ انکی گردش فلکی کی مدت بھی مختلف ہے۔ سب سے پہلے ۱۶۵۵ء میں ایک عالم نے اس کا ایک بڑا چاند دیکھا تھا بعد میں رفتہ رفتہ اور چاند بھی دریافت ہوگئے۔

برہسپت (مشتری)

پرانے خیالات
دیوس پتر

برہسپت (Jupiter) جو زمانۂ حال میں سیارگان فلکی میں شامل ہوا ہے قدیم زمانہ میں دیو پرست قوموں کے تمام دیوتاؤں کا گرو گھنٹال سمجھا جاتا تھا۔ سنسکرت میں اس کا نام دیوس پتر یونانی زیوس پیٹر (Zeus Pater) اور لاطینی میں جوپی ٹر (Jupiter) جس کے لغوی معنی ہرسہ زبانوں میں "آسمانی باپ" ہیں۔ پروفیسر میکس مولر مرحوم نے فلسفۃ اللسان کے مطالعہ میں

۱؎ ماخوذ از "گیلری آف نیچر" صفحہ ۹۸-۹۹

"دیوس پتر" اور زیوس پتر۔ میں حیرت انگیز مشابہت پائی اور ان زبانوں کا ایک ہی ماخذ تسلیم کرنے کو تیار ہوئے تھے۔ برہسپت یونانیوں اور رومیوں وغیرہ کے ہاں تمام دیوتاؤں کا باپ اور بارش۔ آندھی اور بجلی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ رعد اور کڑک اس کے خاص مصاحب قرار پائے تھے۔

سیارہ مشتری برہسپت اراکین شمسی میں سب سے بڑا ہے۔ اتنا بڑا ہے کہ باقی تمام سیارے ملکر بھی اس کے مساوی وزن نہیں ہو سکتے۔ یعنی انکی مجموعی ضخامت سے سہ چند زائد ہے۔ اس کا فاصلہ سورج سے اڑتالیس کروڑ میل ہے اور زمین سے انتالیس کروڑ میلوں پر چلتا ہے۔ اس کا قطر ساڑھے چھیاسی اور اٹھاسی ہزار میل کے درمیان ہے سورج کے گرد گیارہ سال میں ایک چکر ختم کرتا ہے۔ اور اس کے ہاں کا سال ۴۳۳۴ دن کا ہوتا ہے۔ کرۂ ارض سے ۱۲۷۹ گنا بڑا ہے مگر وزن میں صرف ۳۳۱ گنا بڑا ہے کیونکہ اسکی کثافت اضافی صرف ۱/۴ ہے۔ اپنے محور پر نو گھنٹے پچپن منٹ میں گھومتا ہے۔

برہسپت کی گردش کے دائرہ کا گھیر تین[۱] ارب میل ہے اور انتیس[۲] ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلتا ہے جو کرۂ ارض کی رفتار کے نصف سے بھی کم ہے۔ اگر اسکی کشش طبعی کا عمل معطل ہوجائے تو دو سال پینتیس دن میں ہولناک دھماکے کے ساتھ قرص آفتاب پر جاگرے اور وہاں ایک بڑے زلزلہ کیساتھ عظیم الشان شگاف ہوجائے۔

شکر سے اتر کر برہسپت سب سے زیادہ درخشاں ہے۔ مگر چونکہ اسکی نسبت کرۂ ارض سے بہت ہی دور ہے اسوجہ سے اسکی درخشانی صرف ستارہ سیریس (Sirius) سے گھٹ کر ہے۔ ورنہ یہ تمام اجرام فلکی میں سب سے زیادہ روشن کرہ ہے۔ پچھلے سال انہی دنوں یہ سیارہ مع دیگر سیارگان کے کرۂ ارض کی زیارت کو آیا تھا اور شام کے وقت پونے آٹھ بجے کے قریب مشرق سے دمکتا ہوا نکلتا تھا۔ جتنی حرارت اور روشنی ہمارے ہاں آتی ہے اس کا صرف ۱/۲۷ حصہ مشتری کے حصہ میں جاتا ہے۔ ہماری زمین چوبیس گھنٹے میں صرف ایک دفعہ اپنے محور پر گھومتی ہے۔ مگر اتنی دیر میں برہسپت دو دفعہ گھوم جاتا ہے اس سیارہ کی سطح پر ایسے موسمی تبدلات وقوع میں نہیں آتے جیسے ہمارے ہاں ہیں۔ خط استوا کے علاقہ میں سدا گرما اور قطبوں میں سدا سرما رہتا ہے۔ کیونکہ اسکا محور بالکل سیدھا ہے۔ لیکن چونکہ بڑی تیزی سے گھومتا ہے اسواسطے نہ تو سردی سخت ہوتی ہے اور نہ گرمی۔

صورت طبعی دوربین کے ذریعے سے جب برہسپت دیکھا جاتا ہے تو اس کے خط استوا کے ہم سطح منطقے۔ اور ٹپکے نظر آتے ہیں۔ ۱۶۳۳ء میں نیپلز میں ساپی اور بارتوی نے پہلے پہل یہ ٹپکے مشاہدہ کئے تھے۔ کبھی کبھی انکا شمار آٹھ ہوجاتا ہے۔ کبھی ایک ہی منطقہ نظر آتا ہے مگر تین ٹپکے عموماً دکھائی دیا کرتے ہیں۔ کوئی معین اور کوئی غیر معین صورت میں نظر آتا ہے۔ بعض چند ہی گھنٹوں میں ناپید ہوجاتے ہیں اور بعض مہینوں تک رہتے ہیں۔ سیاہ ٹپکوں کے خطہ میں گاہے گاہے ایک داغ بھی دکھائی دیا کرتا ہے جو کبھی نظر آتا ہے اور پھر مٹ جاتا ہے۔ مگر منطقوں کے خطوں میں اور بھی سیاہ داغ نظر آیا کرتے ہیں۔ عالموں کا یہ گمان ہے کہ برہسپت کی سطح پر عظیم طبعی انقلاب واقع ہوتے رہتے ہیں جنکی ماہیت ہنوز دریافت نہیں ہوئی ہے اور جنکی وجہ سے

---

[۱] ماخوذ از "نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا" جلد ۱۱ صفحہ ۳۳۸ اور "گیلری آف نیچر" صفحہ ۹۳-۹۴-۹۵۔ [۲] ماخوذ از "گیلری آف نیچر" صفحہ ۹۴

یہ چھکے اور داغ نمایاں ہوتے ہیں۔ سفید ٹیکوں کی بابت یہ خیال ہے کہ وہ بادلوں کی قطاریں ہیں۔ جو اس کے کرہ ہوا میں معلق رہتے ہیں جو سورج کی روشنی میں بہت درخشاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور جس حصہ میں روشنی نہیں پہنچتی وہاں وہ تاریک نظر آتے ہیں۔ اس کی رفتار کی تیزی کے سبب سے بادل خط استوا کے خطوں میں متوازی قطاروں میں جمع ہوجاتے ہیں۔ یہ صرف قیاس ہے۔ اور اسمیں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ یہ کرۂ ہوا کے مظاہر ہیں۔

مشتری کے قمر | برہسپت کے پانچ چاند ہیں۔ گلیلیو نے اپنی نو دریافت دوربین سے ۱۶۱۱ء میں انھیں دیکھا تھا۔ پہلا چاند اپنے مرجع سے دو لاکھ باسٹھ ہزار میل ہے۔ اور سب سے دور کا گیارہ لاکھ انہتر ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے جو بیالیس گھنٹے سے لیکر ۱۶½ دن تک علی الترتیب گردش کرتے ہیں چاند نمبر سوم کا قطر ۳۶۰۰ میل ہے اور باقی دو اور تین ہزار میل کے درمیان ہیں۔ گہن تو واقع ہوتا ہے مگر وہ گھٹتے بڑھتے نہیں جیسے ہمارے چاند میں دیکھا جاتا ہے۔ اور حالات ہنوز دریافت طلب ہیں۔ جو فلکی انکشافات کے ساتھ ساتھ ظاہر ہونگے۔

(باقی آئندہ) **جے۔ آر۔ رائے**

جشنِ تاجپوشی

حضور ملک معظم ہز مجسٹی جارج پنجم خلد اللہ ملکہ، و سلطنتہ، کا جشن تاجپوشی جس کی وجہ سے عروس البلاد لندن جون کے آخری ہفتہ میں گوناگوں دلچسپیوں کا مجموعہ بنا ہُوا تھا زمانہُ حال کے اُن اہم واقعات میں سے ہے جو اپنے معاشرتی و تمدنی نتائج کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نمایاں درجہ حاصل کرنے کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں اور اسکی مسرت آمیز یادگار صفحۂ دنیا پر مدت مدید تک موجودہ و آئندہ نسلوں کی دلبستگی کا ذریعہ ثابت ہوتی رہے گی۔

سلطنت برطانیہ کے ساتھ چشم بد دور آج جو ملکی و تجارتی خصوصیات وابستہ ہیں وہ باخبر اشخاص سے پوشیدہ نہیں۔ جو حکومت روئے زمین کے پانچویں اور بنی نوع آدم کے چوتھائی حصّہ کی مالک ہو جس سلطنت میں کبھی آفتاب غروب نہ ہوتا ہو اور جسکی انصاف پسندی اور معدلت شعاری نے چالیس کرور نفوس انسانی کے قلوب مسخر کر رکھے ہوں اُس کے جاہ و جلال اور عظمت و اقتدار کا اندازہ ناممکنات سے ہے۔ ضروری تھا کہ ایسے ذی مرتبت فرمانروا کا جشن تاجپوشی اُسی تزک و احتشام سے منایا جائے جو اس کے شایان شان ہو۔ مراسم جشن جس اعلے پیمانے پر ادا کی گئی ہیں اور اُن کے اہتمام و انصرام میں جو گراں قدر اخراجات برداشت کئے گئے ہیں اُنکی کیفیت سنکر دل سے بزم کیانی و جشن جمشیدی کے نقشے اُتر جاتے ہیں اور انگریزی سلطنت کی صولت و عظمت کا نقش اور گہرا ہو جاتا ہے۔

جون کی ۲۲ تاریخ اس مبارک رسم کے لئے مقرر تھی۔ مسلسل کئی مہینوں کی کوشش اور لاکھوں کے صرف سے وقت مقررہ

اعلیٰ حضرت شہنشاہ جارج پنجم دام ملکہ و ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا

تک جشن کی تیاریاں ہوا کیں۔ اسکے مبسوط حالات کے لیئے ایک مستقل کتاب درکار ہوگی لیکن مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس موقع پر لندن کی آرائش و زیبائش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔ شاہی مہمانوں کی آمد اور عام نظارگیوں کی کثرت سے لندن کی آبادی میں غیر متوقع اضافہ ہوگیا تھا اور جیسے جیسے تاریخ قریب آتی جاتی تھی ویسے ویسے شہر کی دلبستگیوں کے ساتھ آدمیوں کا ہجوم بھی روز افزوں تھا۔

عام گذرگاہیں، شاہی محلات، سرکاری اماکن، اور پرائیوٹ مکانات اور دُکانیں غرض ہر چیز دل آویزی میں بجائے خود نمونۂ بہشت بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف گورنمنٹ نے موقع کی اہمیت کا خیال کرکے اہتمام جشن میں پوری پوری ہمت دکھائی تھی۔ اور دوسری جانب رعایا نے اپنے ہر دلعزیز بادشاہ کے نام پر ہزاروں اور لاکھوں خرچ کرکے اپنی فرماں پذیری، اور وفاداری کے حوصلے نکالے تھے اور تاریخ مقررہ سے پہلے ہی پہلے لندن میں وہ چہل پہل پیدا ہوگئی تھی جس کا اندازہ کچھ وہی خوش نصیب کرسکتے ہیں جنھیں بذات خود شرکت جشن کی عزّت ملی تھی۔

جشن کا پروگرام پہلے سے مرتب ہوگیا تھا۔ اور ہر جملہ کارروائی اُسی کے مطابق عمل میں لائی گئی۔ ۱۲ر جون کو شاہی محل میں غیر ملک کے سفیروں کی دعوت کی گئی۔ اس میں ہندوستان کے بعض والیان ریاست کے ماسوا اکثر سلطنتوں کے ولیعہد اور شاہی خاندان کے اراکین بھی مدعو تھے۔ مہمانوں کو حضور ڈیوک آف کناٹ کی میزبانی کا شرف حاصل تھا۔ اُسی دن انگریزی نوآبادیوں کے وزرا اور قایم مقاموں کو ملک معظم کے حضور میں باریابی کا فخر عطا ہوا۔ اسی تاریخ میں شب کو نہایت وسیع پیمانے پر شہر میں روشنی کی گئی اور رات بھر لوگ سڑکوں پر گشت لگاتے اور تماشہ دیکھتے رہے۔ خلقت کا بے حد ہجوم تھا۔ راستوں پر کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ یہ رات گذرنے پر وہ صبح نمودار ہونے والی تھی، جس کے دل خوش کن انتظار نے لوگوں کی آنکھوں سے نیند اُڑا رکھی تھی۔ تماشائیوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی اور انکی منتظرانہ حالت اسوقت تک قایم رہی جسوقت تک کہ لندن ٹاور سے توپوں کی آواز نے نعرۂ مبارکباد کی طرح اُٹھکر یہ نہ بتا دیا کہ جشن کی ساعت سعید آپہنچی۔ جلوس کے راستہ پر صبح ہی سے پولیس و فوج کا انتظام ہوگیا تھا۔ گذرگاہ کے دونوں جانب خلقت کا ہجوم تھا۔ ۵۴ ہزار فوج لارڈ کچنر کی نگرانی میں مصروف انتظام تھی۔ اور اس کے علاوہ کثیر تعداد میں پولیس تھی۔ اُنکی متحدہ کوشش سے کسی قسم کا فساد نہیں پیدا ہونے پایا۔ تماشائیوں نے اپنی اپنی جگہ سویرے ہی سے سنبھال لی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا، اور جلوس کی روانگی کے وقت ترشح بھی ہو رہا تھا۔

بموجب قرارداد بکنگھم پیلیس سے جلوس روانہ ہوا پہلے غیر ملکوں کے شاہزادے اور سفیر تھے۔ پھر انگلستان کے شاہی خاندان کے نوجوان اراکین۔ آخری گاڑی میں حضور پرنس آف ویلز۔ شاہزادی میری۔ اور شاہزادہ البرٹ تھے۔ انکو دیکھکر چاروں طرف سے لوگوں نے نعرہائے مسرت بلند کیئے۔ اس حصّہ کے گذرنے کے بعد کچھ وقفے سے توپیں دغنا شروع ہوئیں جس سے معلوم ہوا کہ شاہی جلوس اب محل سے روانہ ہوتا ہے۔ اُسوقت تماشائیوں کے ذوق و شوق کی عجیب کیفیت تھی جسکا اظہار زبان قلم سے ناممکن ہے۔ حضور ملک معظم کی سواری کا دلفریب نظارہ کرنے کے لیئے آفتاب عالمتاب

بھی جو اب تک ابر میں چھپا ہوا تھا۔ اب نکل آیا تھا۔ اور اہل جلوس کی مطلّا وردیوں اور صاف شفاف ہتھیاروں کی چمک دمک نے اُسکی سنہری کرنوں کے ساتھ ملکر عجیب لطف پیدا کردیا تھا۔

سب سے آگے شاہی گارڈ کا بینڈ بج رہا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک گاڑی میں شاہی خاندان انگلستان کے محترم اراکین تھے۔ اور ان کے پیچھے حضور ملک معظم کے بحری وبری فوجی مصاحبین جنکی زرق برق پوشاکیں نظارگیوں کی آنکھیں خیرہ کررہی تھیں۔ ان سب کے بعد ہز مجسٹی کی خاص گاڑی تھی جسمیں خود بدولت اور ملکہ معظمہ رونق افروز تھیں۔ بگھی میں آٹھ سبزہ گھوڑے لگے تھے۔ اس بگھی سے بعض تاریخی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ یہ شاہ جارج سوم کی جشن تاجپوشی کے لئے ۱۷۶۱ء میں تیار کی گئی تھی۔ اسکا وزن چار ٹن سے کسی قدر زیادہ ہے۔ اور اسکی تیاری پر ایک لاکھ پندرہ ہزار روپیئے کی لاگت آئی تھی۔ گل کاری اور پچّے کاری کا کام اسپر اس درجہ پختہ کیا گیا ہے کہ آج بھی وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔

بادشاہ وملکہ کی سواری کے گذرتے وقت ہرطرف سے شور مبارک باد بلند تھا کہ توپوں اور گھنٹوں کی آواز بھی ماند پڑ گئی تھی۔ رعایا کے اظہار شادمانی پر بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ دونوں زیر لب مسکراہٹ سے اپنی دلی خوشی کا اظہار فرماتے جارہے تھے۔ اور بار بار سر اقدس کی حرکت سے اُس کے جوش وخروش اور خلوص کا گویا شکریہ ادا فرماتے تھے

شاہی بگھی کے پیچھے لارڈ کچنر اور لارڈ رابرٹس گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے عقب میں ہندوستان اور نوآبادیوں کی فوجیں تھیں۔ اول الذکر کی موجودگی سے جلوس میں اور ہی لطف پیدا ہوگیا تھا۔ ہر شخص کی توجہ انھیں کے جانب تھی اور تماشائیوں نے عام طور پر ان کے لیئے نہایت گرمجوشی سے چیرز دیئے اور نعرے بلند کیئے۔ جلوس کے آخری حصّے پر شاہی گارڈ کی ایک پلٹن تھی۔ جسوقت جلوس لندن کے مشہور ومعروف گرجے ویسٹ منسٹر ایبے کے قریب پہنچا تو آفتاب پھر چھپ گیا تھا لیکن بارش نہیں ہوئی۔

ایبے پر اسوقت عجیب جوبن برس رہا تھا۔ اسکی آرائش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگ کے پھولوں سے زینت دی گئی تھی۔ اور جگہ جگہ عالیشان خوش وضع محرابیں بنائی گئی تھیں۔ جا بجا سفید ستونوں کی خوبصورت قطار تھیں جن کے اوپر ایک سرے سے دوسرے تک جھنڈیاں لہرارہی تھیں۔ ستونوں میں پھولوں کے ہار لپیٹے گئے تھے اور ان کے اوپر برٹش نوآبادیوں اور دیگر مقبوضات شاہی کے نشانات نصب تھے۔ آرائش میں اگرچہ سادگی کا زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ لیکن اس سادگی میں بھی ہزاروں طرح کی دل آویزیاں پیدا تھیں۔

ایبے کے داخلہ کے وقت ۵½ بجے صبح سے تھا۔ اور ۹ بجے تک تمام نشستگاہیں معمور ہوگئیں تھیں۔ سات ہزار معززین ایبے کے اندر وقت موعودہ پر موجود تھے۔ اور اس تعداد کو ممتاز سرکاری حکام ممبران پارلیمنٹ اور مذہبی رہنماؤں کے علاوہ ہر علم وفن کے قایم مقاموں پر مشتمل سمجھنا چاہیئے۔

شاہی جلوس کے پہنچنے پر سابقہ ترتیب کے مطابق پہلے سفراء وغیرہ اور پھر حضور ولیعہد بہادر اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ حضور ممدوح کے دست مبارک میں ایک چھوٹا سا

تاج بھی تھا۔ آپ ایک نمایاں جگہ پر تشریف فرما ہوئے۔
حضور ملک معظم اور ملکہ میری کی تشریف آوری کے وقت تمام
حاضرین تعظیماً سروقد کھڑے ہوگئے۔ پیشوایان مذہب کے گذرنے
کے بعد حضور ملکہ معظمہ داخل ہوئیں۔ دو بشپ صاحبان اور اکثر
خواتین آپ کے ہمراہ تھیں۔ پھر لوازمات تاجپوشی لائے گئے۔
آخر میں اعلیٰ حضرت ملک معظم تشریف لائے آپ کے دونوں
جانب بشپ صاحبان تھے۔ ممتاز افسران فوج جلو میں تھے۔
آپ کو دیکھکر حاضرین نے نعرۂ سلامتی بلند کیا۔ کہ

"خدا بادشاہ و ملکہ کی عمر دراز کرے"

بادشاہ سلامت کا تخت قرباں گاہ کے سامنے رکھا گیا تھا۔
اس کے داہنے طرف کمیونین سروس[1] کا سامان ایک لانبی
میز پر رکھا تھا۔ چبوترے پر نیلے رنگ کا قالین بچھا تھا جسپر
دو نفیس کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہز مجسٹی اور ملکہ معظمہ نے پہلے
اپنے تخت کے قریب پہنچکر اور سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ کچھ
دعا پڑھی اور پھر کرسیوں پر متمکن ہوئے۔ اس کے بعد آرچ بشپ
آف کنٹربری نے حضور ملک معظم کا تعارف حاضرین سے کرایا
اور بیان کیا کہ

"آپ بلا ریب و شک اس سلطنت کے حکمراں ہیں"

حاضرین نے جواب میں "خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے"
کا شور بلند کیا۔ آرچ بشپ آف یارک نے دعا پڑھی۔ حضور ملک معظم
نے حلف لیا اور جسم مبارک پر تیل[2] کی مالش کی گئی۔ آرچ بشپ
آف کنٹربری نے فرق اقدس پر تاج رکھا۔ اس پر حاضرین نے
نہایت جوش وخروش سے مسرت کا اظہار کیا۔ بگل بجے۔ توپیں
دغیں اور خوشی کے گھنٹوں نے اپنی بلند آواز سے آسمان کو
سر پر اٹھالیا۔

انگلستان میں ہر تاجپوشی کے موقع پر نیا تاج تیار کیا جاتا
ہے۔ ہز مجسٹی جارج پنجم کے تاج میں آپ کے نامور والد ماجد
کے تاج کی بہ نسبت ۲ نیلم۔ ۵۲ ہیرے۔ اور ۵۶ دیگر جواہرات
زیادہ ہیں۔ ہندوستان کے مشہور عالم ہیرے کوہ نور کو اب
علیا حضرت ملکہ معظمہ کے تاج میں جگہ دی گئی ہے۔

تاجپوشی کے بعد ہز مجسٹی تخت پر جلوہ بخش ہوئے۔ حاضرین
نے اظہار وفاداری کے طور پر سر تسلیم خم کئے اور کلیسا۔ رعایائے
انگلستان اور خاندان شاہی کی جانب سے اقرار اطاعت و
فرماں برداری عمل میں آیا۔ اس کے بعد ملکہ معظمہ کی تاجپوشی
کی رسم ادا کی گئی۔ آپ کنٹربری اور یارک کے لاٹ پادری صاحبان
کے ہمراہ قرباں گاہ کے روبرو تشریف لائیں اور آپ کو تاج
پنھایا گیا۔ تخت شاہی کے سامنے سے گذرتے ہوئے آپنے
بھی اظہار وفاداری کی غرض سے سر مبارک خم کیا۔ اس کے بعد
ویر مجسٹیز کو ایک دوسرے چھوٹے سے گرجے میں لے جاکر
خلعت شاہی سے مزین کیا گیا۔ اور واپسی پر حاضرین نے
آوازۂ مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

ان تمام مراسم کے ادا ہونے پر واپسی شروع ہوئی
اور شاہی جلوس اسی تزک و احتشام سے دوسرے راستے
سے ہوتا ہوا واپس آیا۔

۲۲ جون کی شب کو آتشبازی اور روشنی کا اہتمام قابل
دید تھا۔ دوسرے روز جلوس شاہی ایک دوسری گذرگاہ سے

---

[1] یہ ایک مسیحی مذہبی رسم ہے۔ اردو میں اس کو "عشاء ربانی" کہتے ہیں۔ [2] انگلستان کی یہ ایک قدیمی رسم ہے کہ تخت نشینی کے
وقت بادشاہ کے جسم پر تیل ملا جاتا ہے۔

نکالا گیا تاکہ وہ لوگ جو پہلے دن شاہنشاہ کے دیدار سے محروم رہ گئے ہوں آج بہرہ اندوز ہوسکیں۔ آج کسیقدر ترشح ہو رہا تھا لیکن حضور ملک معظم نے گاڑی کھُلی رکھی تاکہ رعایا کو خدا امان والا کی زیارت بسہولت ہوسکے۔

جشن کے موقع کو دلچسپ بنانے کے لئے جہاں سیر و تفریح کے اور سامان مہیا کئے گئے تھے، وہاں دو ایک باتیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ گھوڑوں کی ایک نمائش اولمپیا میں منعقد ہوئی تھی۔ اور ۲۴ جون کو جنگی بیڑہ جہازات کا ملاحظہ کیا گیا۔ اس قسم کا دلفریب نظارہ دنیا کی نظر سے آج تک نہیں گذرا۔ تقریباً چار سو جنگی جہازات جمع کئے گئے تھے۔ حضور ملک معظم نے ملکہ معظمہ کے ہمراہ شاہی بجرے میں جلوہ افروز ہوکر جہازات کے گرد چکر لگایا۔ اور جہاز والوں نے نعرہ ہائے مسرت سے خیر مقدم کیا۔ رات کو ان جہازات پر برقی روشنی کی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں گویا آگ لگی ہوئی ہے۔

۳۰ جون کو کرسٹل پیلیس میں مدارس کے ایک لاکھ بچوں کی دعوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل عجیب چیز تھی جسکی تحریک ملک معظم نے فرمائی تھی۔

اس اجمال سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس خوش اسلوبی و شان و شوکت سے رسم تاجپوشی ادا کی گئی ہے۔ حضور ایڈورڈ ہفتم آنجہانی کے عہد میں بھی اسی موقع پر نہایت دھوم دھام ہوئی تھی لیکن آپ کے عالی منزلت جانشین کی تاجپوشی جس پیمانے پر کی گئی ہے اس کا قیاس صرف اسی ایک بات سے ہوسکتا ہے کہ اب کی مرتبہ تمام اخراجات کا تخمینہ ۵۴ لاکھ روپیہ نقد کیا گیا ہے۔ بحالیکہ گذشتہ مرتبہ ساڑھے تین لاکھ کے قریب صرف ہوا تھا۔ ذیل میں بعض اخراجات کی جداگانہ تفصیل شمار و اعداد کے ذریعے دی جاتی ہے۔ امید ہے کہ ناظرین دلچسپی سے دیکھیں گے۔

عام اخراجات۔	۵۰۰۰۰ پونڈ
اخراجات متعلق فوج۔	۸۰۰۰۰ پونڈ
اخراجات افواج بحری۔	۲۰۰۰۰ پونڈ
ہندوستانی مہمان اور ہندوستانی فوج	۳۷۰۰۰ پونڈ
اخراجات متعلق تعمیرات۔	۳۳۰۰۰ پونڈ
بیرونی سفراء کی مہمانداری	۹۰۰۰ پونڈ
روشنی	۲۰۰۰۰۰ پونڈ

سید محمد فاروق (شاہپوری)

مسٹر میتھیو برون کیمرن

انڈین پریس الہ آباد

مسٹر میتھیو برون کیمرن

اگر آپ کو کبھی لکھنؤ کے کیننگ کالج میں آنے کا اتفاق ہوا ہوگا تو منجملہ اور انگریزی پروفیسروں کے ایک صاحب پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑی ہوگی جو بہت تیکھل ۔ دراز قد اور لاغر اندام ہیں ۔ جنکے چہرے سے متانت و سنجیدگی ٹپکتی ہے آنکھیں اُس شرافت اور ہمدردی کا اظہار کر رہی ہیں ۔ جس کے ساتھ آپ اپنے طلبا سے پیش آتے ہیں ۔ آپ ان کو بہت کم کسی سے گفتگو کرتے پائیں گے بلکہ ہمیشہ یا تو کتابوں کی محبت ہوگی یا اپنا تعلیمی فرض ادا کر رہے ہوں گے ۔ اور اگر گفتگو کرتے بھی ہونگے تو کسی علمی معاملے پر ۔ ممکن ہے کہ کسی اور پروفیسر کو کلاس میں جانے میں دیر ہو جائے لیکن آپ کی یہ کیفیت ہے کہ آدھا گھنٹہ بجا اور گھڑی کی سوئی کی طرح آپ اپنے ٹھکانے پر موجود ہو گئے ۔ کیا مجال کہ اپنے وقت مقررہ میں سے ایک منٹ بھی بیکار چھوڑ دیں ۔ آپکا مقولہ ہے کہ "وقت سے پورا فائدہ ، جو وہ دے سکتا ہے حاصل کر لو" یہی صاحب ہیں جنکی تصویر ہدیۂ ناظرین ہے ۔

پیدائش و عالم طفولیت

اسکاٹ لینڈ جو کہ جزیرۂ برطانیہ کے شمال میں واقع ہے بڑا مردم خیز خطّہ ہے ۔ انگریزی علم ادب کے بعض پیغمبر جنھوں نے انگریزی علم ادب کو یورپ کا علم ادب بنا دیا ۔ اُنھی کی خاک پاک سے اُٹھے تھے ۔ گو اسکاٹ لینڈ رقبہ میں برطانیہ کا بہت بڑا حصّہ نہیں ہے ۔ لیکن برطانیہ کی ترقی میں اُسنے بہت سے کارنمایاں کئے ہیں ۔ اسکاٹ لینڈ کا سب سے بڑا شہر گلاسگو ہے ۔ گو وہ دار السلطنت نہیں ہے ۔ یہ دنیا کے بڑے صنعتی مرکزوں میں ہے اور یہاں ایک یونیورسٹی بھی ہے ۔ اسی شہر میں ۱۸۶۶ء میں جبکہ لارڈ ڈربی تیسری مرتبہ کرسیِ وزارت پر متمکن ہوے تھے اور انکا مشہور پارلیمنٹری رفارم ایکٹ پاس ہوا تھا ۔ مسٹر کیمرن نے پہلے مرتبہ اس دنیا کی روشنی میں آنکھیں کھولیں تھیں ۔ لیکن آپ کا سن بہت ہی کم تھا ۔ جبکہ خاندان پیزلی جو مغربی حصّہ اسکاٹ لینڈ میں ایک مشہور صنعتی مقام ہے منتقل ہو گیا اور یہیں آپ کا زمانۂ طفولیت اپنے پدر بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوا ۔

تعلیم

پڑھنے لکھنے کا آپ کو شروع ہی سے بہت شوق رہا ۔ اور ہمیشہ اپنے ہم سبقوں سے افضل رہے ۔ انسان میں کوئی بھی صلاحیت ایسی نہیں ہوتی جسکے اُبھرنے کے سامان خداوند تعالی مہیّا نہ کر دے ۔ چونکہ مسٹر کیمرن میں علمی دنیا میں خاص شہرت حاصل کرنے کی صلاحیت موجود تھی ۔ آپ کو ہمیشہ برطانیہ کے مشہور مشہور عالموں کے زیر تعلیم رہنے کے موقع ملتے گئے ۔ آپکی تعلیم بھی اپنے مولد یعنی گلاسگو یونیورسٹی میں ہوئی ۔ یہاں آپنے اعلیٰ قابلیت سے ایک وظیفہ ساٹھ پونڈ سالانہ کا چار سال کے واسطے حاصل کیا ۔ یعنی وظیفہ میں آپ چار سال تک پچھتر روپیہ ماہوار پاتے رہے ۔ منطق و فلسفۂ اخلاق میں آپ اڈورڈ کامرڈ

کے جو بعد کو ماسٹر آف بیلیل مقرر ہوئے شاگرد رہے اور امتحان میں
انعام حاصل کیا۔ علم طبعیات لارڈ کلون مرحوم سے پڑھنے کا شرف
آپ کو حاصل ہوا۔ اور اُس میں بھی ایسی مہارت حاصل کی کہ
انعام کے مستحق قرار دیئے گئے۔ آپ کے زمانہ طالب علمی میں
گلاسگو میں اور بھی مشہور و متبحّر عالم پروفیسری پر مامور تھے۔ مثلاً
انگریزی علم ادب کے استاد پروفیسر نکل اور پروفیسر جب جو بعد
میں سَر کے ممتاز خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے۔ اور کیمبرج
کے ریجیس پروفیسر زبان یونانی مقرر ہوئے تھے۔ اور پارلیمنٹ
میں یونیورسٹی کے نایب منتخب ہو کر داخل ہوئے تھے۔ یہ
دونوں بہت بڑے ادیب تا حال خیال کئے جاتے ہیں۔ اور انکی
کتابیں بڑی مستند مانی جاتی ہیں۔ گلاسگو یونیورسٹی سے آپنے
۱۸۸۹ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور کلاسکس یعنی
لاطینی و یونانی علم ادب میں ڈسٹنکشن پایا۔

اس کے بعد فری چرچ ٹریننگ کالج گلاسگو میں معلمی کا
کورس مشہور و معروف ڈاکٹر مارسین سے پڑھا۔ اور امتحان میں
اول آئے۔ باوجود اس قدر انعامات وغیرہ حاصل کر لینے کے
آپ کو اب بھی پڑھنے سے سیری نہوئی اور واقعی بات
بھی یہ ہے کہ علم مثل ایک روشن ستارہ کے ہے جو افق پر نظر
آتا ہے اور طالب علم اُس جہاز راں سے مشابہت رکھتا ہے
جو اُس ستارہ کے رُخ اس امید پر جا رہا ہے کہ اس تک
پہنچ جائے لیکن جسقدر یہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ستارہ بھی
پیچھے ہٹتا نظر آتا ہے۔ سچا طالب علم وہی ہے جو اس تلاش میں
ثابت قدمی کے ساتھ مصروف رہے اور ہمت نہ ہارے۔ چنانچہ
آپ نے لنڈن یونیورسٹی کی سائینس کی ڈگری حاصل کرنے
کا ارادہ کیا۔ اور اس کے واسطے گلاسگو اور لندن میں سخت
محنت کرتے رہے۔ انصاف پسند خدا کی حکومت میں محنت کبھی
رائگاں نہیں جاتی۔ مسٹر کیمرن کی محنت شاقہ ۱۸۹۱ء میں بارور
ہوئی اور آپ نے لندن یونیورسٹی کی بی۔ ایس سی کی ڈگری
فرسٹ ڈویژن میں پاس کی کیوں نہ ہو۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اپنی تعلیم کے متعلق جو حالات درج ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ کس اعلیٰ
پایہ کے طالب علم آپ رہے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اچھا اُستاد وہی ہے جو تعلیم
کتابی سے نہیں۔ بلکہ تعلیم نظری سے سیکھا ہے۔

مسٹر کیمرن کی یہی کیفیت ہے۔ مثل معمولی پروفیسروں
کے انکو علم کی تعریف میں بے معنی راگ گانے کی کوئی ضرورت
نہیں ہے۔ کیونکہ اُنکی زندگی ایک زندہ مثال ہے جو ظاہر کر رہی
ہے کہ کس شوق سے طلبا کو اپنی کتابوں کی خدمت کرنا چاہئے۔

ہندوستان آنا

صانع کل جو بڑا دانا و بینا ہے ہر ایک چیز کسی نہ کسی غرض
کے لیئے بناتا ہے۔ ادنیٰ سے کیڑے سے لیکر بڑے بڑے
بادشاہوں کے سپرد کوئی نہ کوئی خدمت اس شاہ شہنشاہاں
کی ضرور ہی ہوتی ہے اور اُس خدمت کا پورے طور پر ادا کرنا
گویا اُنکی زیست کی علت غائی ہے۔ ہمارے مسٹر کیمرن کے
سپرد ہندوستان میں مشعل علم کا روشن کرنا ہوا
تھا۔ اُنکی تمام گذشتہ زندگی اسی ایک غرض کے پورا کرنے
کے واسطے انکو تیار کر رہی تھی۔ اب چونکہ وہ فارغ التعلیم ہو چکے
تھے ضرورت اس بات کی تھی کہ تعلیم دینے میں کچھ تجربہ بھی حاصل
کرلیں۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے کام پر مامور ہوں۔ کیونکہ سپاہی
کو بھی پیشتر ڈرل وغیرہ سے تیار کر لیتے ہیں تب میدان میں بھیجتے
ہیں۔ چنانچہ مسٹر کیمرن کے سپرد مختلف اقسام کے سکنڈری اسکولوں

کام ہوا اور اسمیں انہوں نے خوب تجربہ حاصل کیا - بعد میں گرنیاک اکاڈمی میں آپ کا تقرر ہوا - یہ وہ اکاڈمی تھی جہاں سے کیننگ کالج کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر میکل جے ہوائٹ مرحوم ہندوستان تشریف لائے تھے اور یہی اتفاق آپکو بھی ہوا کہ ۱۸۹۵ء میں گرنیاک اکاڈمی سے کیننگ کالج کے پروفیسر مقرر ہوکر ہندوستان تشریف لائے اور وہ کام شروع کیا جسکے واسطے قدرت خاموشی کیسا آپکو تیار کر رہی تھی -

کیننگ کالج کی پروفیسری

سولہ سال سے آپ کیننگ کالج میں انگریزی علم ادب و فلسفہ کی پروفیسری کر رہے ہیں - طلبا کو اس امر کا ازحد شوق رہتا ہے کہ آپ کی شاگردی میں آئیں - پیشتر آپ ایف اے کو بھی پڑھاتے تھے - لیکن اب صرف بی اے اور ایم اے کے کلاس آپ کے سپرد ہوتے ہیں -

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ علم ادب کی پڑھائی یہاں لاجواب ہوتی ہے - دیگر کالجوں کے طلبار کو اسکی ازحد فکر رہتی ہے کہ کیمرن صاحب کے لکھائے ہوئے نوٹ کسی طرح دستیاب ہوں - کالج میں گویا آپ ایک مقناطیس ہیں کہ دور دراز مقامات سے طلبا کو اپنی کشش سے لے آتے ہیں - ابھی پارسال کا ذکر ہے کہ جودھپور سے ایک صاحب محض کیمرن صاحب سے ایم اے کا کورس پڑھنے آئے تھے - اس میں شک نہیں کہ آپکا طرز تعلیم بہت ہی سائنٹفک ہے - میں نے اپنی عمر کے اُنیس سال طالبعلمی میں صرف کئے اور متعدد ماسٹروں اور پروفیسروں سے جو ہر طرح لایق تھے پڑھا - لیکن آپ کا ایسا پڑھانے والا دوسرا کوئی نہ ملا میرے اکثر احباب کی جنھوں نے آپ سے پڑھا ہے یہی رائے ہے - میں ذاتی تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ جو طالب علم آپ کی ہدایتوں پر عمل کرے اور آپ کے لکھائے نوٹ بغور پڑھے وہ امتحان میں ضرور اچھی طرح پاس ہوگا - یہ تو آپ کی تعلیم کا ایک ادنی فائدہ ہے - خاص نتیجہ آپ کی تعلیم کا تو یہ ہے کہ جس مصنف کی بعض کتابیں بھی آپ نے پڑھا دیں - اس میں طالب علم کو خاصی دستگاہ حاصل ہوگئی -

آپ کو اپنے طلبار سے خصوصاً اُنسے جنکو پڑھنے کا شوق ہو خاص الفت ہے اور ہر طرح سے انکی مدد کے واسطے تیار رہتے ہیں - لیکن چونکہ آپ میں ظاہرداری مطلق نہیں ہے - شروع شروع میں طلبا کا خیال یہ ہوتا ہے کہ آپ کو ہمسے تعلقات بڑھانا منظور نہیں - حالانکہ یہ خیال جیساکہ میں اور میرے اکثر دوست ذاتی تجربہ سے کہہ سکتے بالکل باطل ہے - اپنے طلبا کی عزت کا آپکو ازحد خیال رہتا ہے - کبھی کلاس میں کسی سے کچھ نہیں کہتے - تنہائی میں چاہے سمجھا دیں - غلطیاں وغیرہ اس طرح بتاتے ہیں کہ درجہ کے لڑکوں کو سوائے اُسکے جس نے غلطی کی ہو نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسکی غلطی ہے -

کالج میں آپ ازحد ہردلعزیز ہیں اور ہر ایک لڑکا چاہے وہ کسی درجہ کا کیوں نہو آپکی وقعت اور محبت سے ہمیشہ اپنا دل گرم رکھتا ہے اور جب تک کالج میں رہتا ہے یہی خواہش رکھتا ہے کہ آپکی شاگردی کا فخر ہو -

لڑکے کیا پرنسپل بھی آپ سے ازحد خوش ہیں - ایک روز وہ کہتے تھے کہ میں اس امداد کا جو کہ کیمرن صاحب سے مجھکو ملا کرتی ہے شکریہ نہیں ادا کر سکتا - ممبران کمیٹی تو گویا آپکو کالج کا مایہ ناز خیال کرتے ہیں - علاوہ پروفیسری کے فرایض کے آپ نے کیننگ کالج اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو اپنے آنے پر زندہ کیا - اور اُس وقت سے ہر سال اس کے صدر انجمن منتخب ہوتے آئے - آپ کا انتخاب ہر سال بڑے جوش وخروش سے ہوتا ہے - اور ہر ایک سکرٹری اپنی سالانہ رپورٹ میں آپ کی مدد

کاشکریہ پُرجوش الفاظ میں ادا کرتا ہے - میں نے ایسوسی ایشن
کی گزشتہ رپورٹیں تلاش کیں لیکن سوائے دو ایک کے اور کوئی
بھی دستیاب نہوئی - ایک میں آپ کے بارہ میں یہ درج ہے -
"انجمن کی کامیابی کا دارومدار زیادہ تر ہمارے پروفیسر
و پریزیڈنٹ مسٹر کیمرن پر ہے جو کہ کالج میں اس قسم کی تمام
تحریکوں کو پدرانہ الفت سے نگاہ میں رکھتے ہیں - انجمن کے
تمام کاروبار کے آپ روح رواں ہیں - آپ کا مہربانی
سے بھرا ہوا دوستانہ برتاؤ اور آپ کا شفقت پدرانہ سے
ہماری دماغی و اخلاقی ترقی کا پیش نظر رکھنا یہ اسباب ہیں جنھوں
نے آپکو ہماری عزّت و محبت کا خاص مرکز بنا دیا ہے - ہم آپکی
محبّت مثل پدر کے کرتے ہیں - اور عزّت مثل گرو کے"

دوسری رپورٹ میں سکریٹری یوں لکھتا ہے :-

"ہماری انجمن کی ترقی کے خاص سبب ہمارے محترم پریزیڈنٹ
ہیں جن سے ہمکو بہت الفت ہے - مُربّی انجمن یعنی پرنسپل صاحب
نے اپنی رپورٹ میں خوب لکھا ہے کہ اس قابلیت محنت و
جوش کے واسطے جو اپنے طلبا کی تربیت کے جزو اعظم ہیں -
صرف کی ہے میرے شکریہ و طلبا کے شکریہ کے مستحق ہیں - انکی
ہدایت سے مباحثہ عمدہ مفید مضامین پر ہوتا ہے اور قوت بیانیہ
ہمیشہ اچھی طرف لگائی جاتی ہے - میں نے سنا ہے کہ آپ ہی
انجمن کے بانی ہیں - اور اس کی پیدائش سے اس وقت تک
اس نے آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی - آپ اس
انجمن کی جان ہیں - آپ اپنے قیمتی وقت کا بڑا حصّہ اس میں
صرف کرتے ہیں - اور ہماری علمی اور اخلاقی ترقی پر پدرانہ
توجہ رکھتے ہیں - محض الفاظ میں ہم کسی طرح آپ کا شکریہ نہیں
ادا کر سکتے - آپ کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ بس یہی ہے کہ ہم انجمن
سے خوب فائدہ حاصل کریں - اُسمیں کم از کم آپ سے نصف
دلچسپی تو لیں اور یہ محسوس کریں کہ یہ انجمن ہماری ہے - آپکی
مثال ہمکو ہمیشہ اپنے نظروں کے سامنے رکھنا چاہیئے - ہمارے
واسطے آپ معیار شرافت ہیں - معیار طالب علم اور معیار استاد
ہیں - آپ کے واسطے اگر لفظ گرو استعمال کیا جاوے بیجا نہو گا -
میں آپ کو اپنی طرف سے اور اپنے ہم مکتبوں کی طرف سے
یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے ہمارے دلوں کو مسخر کر لیا ہے"

یہ تو دو رپورٹوں کے اقتباس ہیں اور جہاں تک مجھے
یاد ہے میں نے اپنے زمانے کی اور رپورٹوں میں بھی ایسے ہی
الفاظ سنے تھے لیکن اُنکا یہاں نقل کرنا زیادہ جگہ لے گا لہذا
انھیں دو پر اکتفا کی جاتی ہے -

آپکے چند قابل طلبا

اسی سلسلہ میں اگر آپ کے بعض قابل طلبا کے نام دیئے
جائیں جو زندگی کے میدان کارزار میں خوب فتحیاب ہوئے
بے جا نہ ہوگا - پنڈت مہیش بل ڈکشت ایم اے جو ہمیشہ فرسٹ
ڈویژن میں ہی امتحانات پاس کرتے ہی نہیں چلے آئے بلکہ
اوّل آتے رہے آپ ہی کے شاگرد ہیں - اب یہ صاحب غالباً
ڈپٹی کلکٹر ہیں -

بابو سوہن لال ایم اے جو گذشتہ سال تک میور سنٹرل کالج
میں پروفیسر تھے - اور اب ڈپٹی کلکٹر ہیں - اور بابو سنیدرو ناتھ
رائے ایم - اے پروفیسر میرٹھ کالج - دابھے چرن مکرجی ایم اے
پروفیسر انگریزی میور کالج بھی آپ ہی کے شاگرد ہیں - لکھنؤ کے
میڈیکل کالج کے جو کہ ۱۵ اکتوبر ۱۱ء سے کھلیگا اناٹومی (تشریح
البدن) کے پروفیسر سید الظفر خان ایم بی سی (لنڈن) کو بھی
آپ ہی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے -

الہ آباد یونیورسٹی سے آپ کا تعلق

آپ کو کالج میں آئے چار سال بھی نہیں ہوے تھے
کہ ۱۹۰۵ء میں آپ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔
باوجود عدیم الفرصتی کے آپ نے یونیورسٹی کے کام میں بہت
دلچسپی لی۔ آپ کی تجاویز پر یونیورسٹی کے نصاب میں کئی قابل
قدر اصلاحیں ہوئیں۔ ان میں سے بعض کا اعتراف وائس
چانسلر چیررڈس نے اپنے کانوکیشن ایڈریس میں ۱۹۰۹ء میں
کیا تھا۔ اور آپ کی تعریف کی تھی۔ یہ بہت بڑی عزت ہے کہ
وائس چانسلر کسی فیلو کے خدمات کی تعریف عوام کے روبرو
کانوکیشن میں کرے اور شاذ ہی کسی کو حاصل ہوتی ہے سکنڈری
اسکولوں کے ماسٹروں کی تربیت میں آپکو خاص دلچسپی ہے
اور یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ الہ آباد میں یہ گریجوئٹ
ٹریننگ کالج قائم ہوا ہے اور یہ بھی تعلیم کے حق میں آپ کی
ایسی عنایت ہے جس کا شکریہ ہم کسی طرح ادا نہیں کر سکتے
علاوہ اس کے کہ ہمارے نوجوانوں کے واسطے عمدہ ذریعہ
معاش نکل آیا۔ اس کالج سے ایک بہت بڑی کمی یہ دور
ہوئی کہ اسکولوں کو لایق طرز تعلیم سے واقف ہیڈ ماسٹر ملنے لگے۔ تاوقتیکہ
ماسٹر جدید طرز تعلیم سے بخوبی واقف نہو وہ لڑکوں کو اچھی
طرح پڑھا نہیں سکتا۔ اس کی تعلیم سے لڑکے آدمی نہیں
بنتے بلکہ طوطے بنتے ہیں۔ پس تعلیم کے حق میں یہ نعمت غیر
مترقبہ ہے۔ کہ ٹریننگ کالج قایم ہوگیا ہے۔ یونیورسٹی کے واسطے
آپ اپنا بڑا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں۔ اور بڑی دلسوزی
سے کام کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونیورسٹی نے
آپکو چند عہدہ حسب ذیل عطا کئے ہیں:-
کنوئیر آف دی بورڈ آف سٹیڈیز۔ اور بورڈ آف
اکزامنرز ان انگلش لٹریچر ممبر آف دی بورڈ آف سٹیڈیز
اور بورڈ آف اکزامنرز آن فلاسفی کنوئیر آف دی بورڈ
آف سٹڈیز اور ممبر آف دی بورڈ آف اکزامنرز ان ٹیچنگ
اس فہرست سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ کس قدر دماغی
محنت صرف یونیورسٹی کے واسطے کرتے ہیں۔

متفرقات

اس قدر محنت شاقہ سے بھی آپ کی سیری نہیں ہوتی
جیسے زمانہ طالب علمی میں آپکو تحصیل علم سے از حد شوق تھا
اور وہ شوق اب تک قایم ہے۔ ویسی ہی اب آپ کو اس کا
بے حد خیال ہے کہ اپنی غیر معمولی قابلیت سے انسان کو
جہاں تک ممکن ہو فائدہ پہنچائیں۔ لیکن آپ کا دائرہ شوق
علم ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ لکھنؤ کا بڑا کتب خانہ جو کہ اب
گورنمنٹ پبلک لائبریری میں شامل ہوگیا ہے اور جو چھتر منزل
کے مغربی گوشہ میں واقع تھا۔ یعنی اسٹیشن لائبریری اُس کے
آپ پانچ سال تک سکریٹری رہے۔ جب سے سرکار نے اسکول
لیونگ سرٹیفکیٹ اکزامنیشن قائم کیا ہے آپکو اُس کے سنٹرل
اکزامننگ بورڈ کا ایک ممبر مقرر کیا ہے۔

لکھنؤ میں اب سرکار کی طرف سے بڑا کتب خانہ قایم
ہو رہا ہے وہ اس مکان میں ہے جہاں شاہان اودھ
کا تخت رہتا تھا۔ یہ پبلک لائبریری امید ہے کہ آئندہ ماہ
جولائی میں کھولی جاوے گی۔ کیونکہ اُسوقت تک فرنیچر تیار
ہو جاوے گا۔ اس لائبریری کے سکریٹری آپ مقرر
ہوئے ہیں۔ اس کتب خانہ کا سکریٹری ہونا محض عزت ہی
نہیں ہے بلکہ اُسکے کام میں سخت محنت کرنا ہوتی ہے جن
صاحبوں کو اس فن میں کچھ بھی دخل ہے وہ جانتے ہونگے

کہ نئے کتب خانہ میں کتابوں کا کلاسیفائی کرنا اور اُن کا ترتیب
دینا کس قدر وقت طلب کام ہے اور کیسی دماغ سوزی کرنا پڑتی
ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ کتب خانہ اس قدر بڑے پیمانہ پر ہو جیسا
کہ لکھنؤ کا سرکاری کتب خانہ ہوگا۔

ناظرین! ان مختصر سوانحی حالات سے آپ اندازہ کر سکتے
کہ مسٹر میتھیو برون کیمرن جنکی ذات پر ان کے طلبا کو فخر ہے کس
پایہ کے آدمی ہیں۔ آپکو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کس قدر محنت فیض
رسانی کی غرض سے وہ کرتے ہیں۔ لیکن ابھی آپکو یہ نہیں بتایا گیا
کہ اُنکے پڑھنے لکھنے کے شوق کا اب کیا حال ہے۔ جناب مسٹر
کیمرن بلا کتاب ایسے ہی ہیں جیسے ماہی بے آب۔ اسوقت تک
آپکی یہ کیفیت ہے کہ کیا لٹریچر کیا فلسفہ اور کیا سائنس ان پر کوئی بھی
جدید کتاب شائع ہوئی اور آپ نے اُس کو اپنا جزو دماغ کر لیا۔
قبل اس کے کہ وہ کتاب ہندوستان میں دستیاب ہو سکے آپکے کتب خانہ
میں نظر آتی ہے۔ ہم لوگوں کو علوم ذیل ان سے سیکھنے کا موقع ملا ہے
اور انہیں انکو خاصی دستگاہ حاصل ہے بلکہ وہ اب تک ان کے
بارہ میں خود نئی چیزوں کی دریافت میں کوشاں ہیں۔ انگریزی
علم ادب۔ فلسفہ۔ باٹنی۔ زوآلوجی۔ فزکس۔ اور فزیالوجی۔ گو آپ
اردو کے عالم نہیں ہیں پھر بھی کبھی کبھی ایسے سوال کر بیٹھتے تھے کہ
کہ ہم لوگ بغلیں جھانکتے تھے

ناظرین! یہ مختصر احوال ایک محترم بزرگ کے جو آپ کے
ملک کی خدمت بہ دل و جان کر رہا ہے اور بہت سے ہندوستانیوں
سے زیادہ کر رہا ہے آپ کے نذر ہیں اور امید ہے کہ آپ
میں جو حضرات طالبعلم ہیں یا ماسٹر یا پروفیسر ہیں وہ اس روشن
مثال سے فیضیاب ہونگے۔ و دیگر حضرات بھی اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

یہ مضمون اس دعا پر ختم کیا جاتا ہے جسمیں مجھے امید ہے
نہ صرف مسٹر کیمرن کے طلبا میرے ہمزبان ہوں گے۔ بلکہ
ناظرین "ادیب" بھی شریک ہوں گے۔ کیونکہ وہ دل سے
ان خدمات کے شکر گذار ہیں جو مسٹر کیمرن ہندوستان کے واسطے ادا کر رہے ہیں

قطعہ

سال و فال و مال و حال و اصل و نسل و بخت و تخت
بادت اندر ہر دو گیتی برقرار و بر دوام
سال خرّم فال نیکو مال وافر حال خوش
اصل ثابت نسل باقی تخت عالی بخت رام
آمین ثم آمین

پنڈت برجناتھ شرغہ

برٹش حکومت کی برکتیں

امن و امان

آج ہے امن و اماں کا دور دورہ ہر طرف
شیر بکری سے الگ ہٹتا ہے، کانٹا پھول سے

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان پر ہندو حکمراں تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں جو ابتری ملک میں پھیلی ہوئی تھی وہ اظہر من الشمس ہے جب ان کے ظلم وستم حد سے گذر گئے، اور خدا نے انھیں اس قابل نہ سمجھا کہ اُن کے ہاتھوں ملک اور اہلِ ملک کی فلاح وبہبود ہو، بلکہ اُن کے دورِ حکومت سے ہندوستان کو زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا۔ تو خدا نے اُنکی سرکوبی کے لئے محمود غزنوی اور محمد غوری ایسے غیر ملکی بادشاہوں کو بھیجا۔ یہانتک کہ ایک وقت چنگیز خان جہاں سوز اور تیمور لنگ کی بھی باری آئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کی باگ ڈور ایک غیر ملکی قوم کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ساڑھے سات سو برس تک ہندوستان انھیں کے قبضۂ اختیار میں رہا۔ اور جب انکو بھی خدا نے اس قابل نہ پایا کہ اُن سے ملک و اہل ملک کی وہ خدمت سرانجام پائے جو اسکی مرضی کے عین مطابق تھی، تو نادر شاہ اور احمد شاہ کو بھیجکر ان کی قوت کو توڑا، اور انکے ہاتھ سے یہ ملک چھین لیا۔ یہ وہ الٰہی انتظام ہے جسمیں کبھی سرِمو فرق نہیں ہوتا۔

اب اسی مشیّتِ ایزدی نے اس قوم کا ہاتھ ہمارے سر پر رکھا جسکو اُسنے اسکا اہل سمجھا اور جسکے سایۂ عاطفت میں ہم ملک کو اسقدر سرسبز دیکھتے ہیں کہ اسکی نظیر کسی اور زمانے میں نظر نہیں آتی مہا بھارت کی عظیم الشّان لڑائی کے بعد، جبکہ ملک کی مجموعی قوت بالکل درہم وبرہم ہوچکی تھی، شاید ہی ہندوستان کو کبھی یہ امن و امان نصیب ہوا ہو، جو اس دور میں ہے۔ اس سے بیشتر یہ حال تھا کہ کبھی تورانی۔ اور کبھی ایرانی، کبھی یونانی اور کبھی ترکستانی ہمیشہ ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے اور ملکی خانہ جنگیاں اسپر مستزاد تھیں۔ شمالی ہند والے جنوبی ہند والوں (وندیاچل سے دکن تک) کو آدمیوں ہی میں شمار نہ کرتے تھے اور خود آریہ ورت (شمالی حصۂ ملک) والوں کو اپنے یہاں کے غریب ہموطنوں کو اسقدر ذلیل وخوار سمجھ رکھا تھا کہ اُن کو ہمیشہ کے لئے شودر قرار دیدیا اور انھیں اسقدر دبایا کہ اُنسے گویا آدمیت ہی مفقود ہوگئی ہے۔ آج تک جہاں کہیں انگریزی حکومت کا کم اثر پہنچا ہے یہی حال ہے کہ کوئی شودر کسی اعلیٰ ذات والے شخص کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا، کھڑا نہیں ہوسکتا، چھاتہ نہیں لگا سکتا، حتیٰ کہ اُس سے دو سَو گز کے فاصلہ پر رہنا اسکے لئے قطعی حکم ہے۔ اللہ رے ظلم! یہ اُسی پُرانے ظلم کی ایک ادنیٰ مثال ہے، جو اب بھی دکن اور اس کے قرب وجوار میں پائی جاتی ہے گذشتہ صدی کے مرہٹہ حملے اور برگی ہنگامے جن سے ملک تحس نحس ہوچکا تھا، ابھی بالکل تازہ ہیں۔ بیچاری مستورات اور معصومین پر جو ناروا اور قابلِ ملامت ظلم وتشدّد ہوتے رہے، وہی ظلم وتشدّد جن کی شہادت آج تک "مرہٹہ ڈچ" سے مل رہی ہے جو کلکتہ کے قریب واقع ہے۔ ڈچ اور پرتگیزوں کی بحری ڈاکہ زنیاں، اور سواحل دریا کے باشندوں کو لوٹنا، ایسے واقعات ہیں، جنکا سلسلہ ہمیشہ اس ملک کی گذشتہ تاریخ

میں جاری رہا ہے۔ برعکس اس کے جبوقت سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلّط ہوا ہے، اُس وقت سے جو امن و امان ملک میں جاری ہے، یا جو آسائشیں ملک و اہل ملک کو حاصل ہیں، ان کو نظرانداز کرنا کفران نعمت ہے، نیز اس خالق حقیقی کی حکمت کا انکار کرنا ہے جس کے انتظام سے ہندستان کو یہ امن و امان نصیب ہوا۔

شمس العلماء مولانا نذیر احمد نے جو نادر خیالات "انگریزوں کی عمد گی سلطنت" کے باب میں ظاہر کئے ہیں کوئی جاہل سے جاہل اور کوڑ مغز شخص بھی ان کی صداقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اور جس شخص کو اپنے ملک اور اہل ملک کا کچھ بھی پاس ہے، وہ ضرور مولانا ئے موصوف کے خیالات کی تائید کرے گا۔ ملاحظہ فرمائیے آپ تحریر کرتے ہیں

"انگریزی سلطنت کی بدولت ہندوستان میں آج وہ روشنی پھیل رہی ہے کہ رات اور دن میں کچھ تمیز نہیں رہی۔ راستے ایسے صاف ہیں کہ جہاں پہلے قافلوں کا گزر نہوتا تھا، اب وہاں جس کا جی چاہے آنکھ بند کرکے سونا اُچھالتا چلا جائے۔ تجارت اسقدر آسان ہوگئی کہ دو دن میں ہزاروں من مال مشرق سے مغرب میں، اور جنوب سے شمال میں پہنچتا ہے شہروں کا پہلے نام ہی نام سنتے تھے اب وہاں جانا ایسی بات ہو جیسے بازار میں سیر کرنے اگر ہزاروں کوس کسی کو کچھ خبر بھیجنی ہو۔ یا وہاں سے کسی کو خبر منگانی ہو تو منہ سے بات نکالنے کی دیر ہے۔ جو خبر بھیجو، اسکی رسید لو، جو بات پوچھو اُس کا جواب لو، پیشے والے اپنے کاموں کی قدر آپ جانتے تھے، صبح سے شام تک جان کھپاتے تھے۔ اب ہر شخص کو اسکی محنت کا پھل خاطر خواہ ملتا ہے۔ یہ غلطی ہمیشہ سے چلی آتی تھی کہ نکمّے آدمی سدا عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے، اور کام کے آدمی ذلیل و خوار پھرتے تھے، یہ اس سلطنت کا صدقہ ہے کہ جتنے حقدار تھے، وہ اپنے حق کو پہنچ گئے کھیتی کا مدار پہلے ہر جگہ بارش یا کنوؤں کے پانی پر تھا۔ اب جمنا اور گنگا چاروں کھونٹ میں دوڑی پھرتی ہیں۔ جہاں جہاں نہر گئی ہے وہاں ہمیشہ سماں رہتا ہے۔ اسکے سوا پہلے بادشاہوں اور امیروں کے سوا غریبوں کی بیماری کا علاج جیسا چاہیئے ویسا نہوتا تھا، کہیں طبیب کو ڈھونڈنا پڑتا تھا کہیں دوائیں مول لینی پڑتی تھیں۔ اب شہر شہر اور قصبے قصبے اور گانوں گانوں سرکاری ڈاکٹر علاج کرتے پھرتے ہیں۔ نہ کچھ ڈاکٹروں کو دینا پڑتا ہے نہ دوا مول لینی پڑتی ہے جسکا جی چاہے علاج کرائے، جو دوا چاہے لے جائے۔ پہلے اوّل تو کتاب ملتی ہی نہ تھی، اور اگر ملتی بھی تھی تو بہت بھاری قیمت کو ملتی تھی اور جو لکھواتے تو ایک ایک کتاب برسوں میں تمام ہوتی تھی اب چھاپہ کی بدولت کتاب اور ترکاری ایک بھاؤ بکتی ہے۔ جو سواریاں پہلے بادشاہوں کو میسّر نہ تھیں وہ آج ادنیٰ ادنیٰ آدمی کے پاس موجود ہیں۔ جو کپڑا پہلے امیروں کو نصیب نہوتا تھا، وہ پنہاریوں کے بچے پہنے پھرتے ہیں۔ پہلے جب کوئی تمام عالم کی سیر کرتا، تب جا کر اُسکو ساری دنیا کی حقیقت معلوم ہوتی، اب ہر ایک ملک کا نقشہ نہایت صحیح کھنچا ہوا کاغذ کے مول بکتا پھرتا ہے، جسکا جی چاہے گھر بیٹھے ساری دنیا کے پہاڑ اور جنگل، دریا اور جزیرے، اور آبادی اور ویرانی کی سیر کرلے۔ پہلے اولاد کو پڑھانا لکھانا اسقدر مشکل تھا کہ اس سے زیادہ اور کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اب سرکاری تعلیم نے اس مہم کو ایسا آسان کردیا، کہ جاہل رہنا مشکل ہے اور پڑھنا لکھنا آسان ہے۔

پہلے شہروں کی صفائی ایک ایسی چیز تھی کہ کبھی اسکا تصوّر بھی دلمیں آتا تھا۔ اب ایک ایک گلی اور ایک ایک کوچہ اور سڑک اور بازار ایسے صاف رہتے ہیں کہ پہلے شاید امیروں کے رہنے کے مکان بھی اتنے صاف نہ رہتے ہوں گے۔ پہلے غریب امیر سے اور رعیت حاکم سے ایسی دبی تھی جیسے غلام اپنے آقا سے دبتا ہے۔ اب ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے ایک جرم قانونی کے سوا اور جو کچھ جس کے جی میں آئے سو کرے، کوئی کسی کا مزاحم نہیں۔ ایک حاکم کے فیصلہ سے ناراض ہو، دوسرے کے یہاں جاکر نالش کرے۔ وہاں بھی خاطر خواہ حکم نہو تیسرے سے کہے۔ چوتھے سے کہے یہانتک کہ بادشاہ کے دربار میں جاکر فریاد کرے۔ جو مذہب جسکا جی چاہے اختیار کرے۔ سرکاری قانونکی جو بات ناگوار معلوم ہو، اُسپر اعتراض کرے۔ غرض اسیطرح کی اور سیکڑوں باتیں ہیں۔"

ایڈیٹر

سامان تاج پوشی
THE ROYAL REGALIA.

انڈین پریس الہ آباد

غمِ فرقت

یکشن کی زبانی

عدوئے راحت و تسکین ہی بلائے فراق	کوئی غریب نہو آہ! مبتلائے فراق
یہ جانِ ناتواں اور اُسپہ صدمہ ہائے فراق	زبس ہے روح گسل درد جانگزائے فراق

قرارِ جانِ حزیں کو نہ تاب ہے دلکو
عجب طرح کا الہی عذاب ہے دلکو

گھٹائیں چھا رہی ہیں کالی کالی بھادوں کی	چمک کے برق گراتی ہے قلب پر بجلی
شبِ فراق کی سختی پھر اُسپہ تنہائی	کسے سناؤں کہانی کہ کسطرح گذری

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم
حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

نفس کی آمد و شد بن گئی دمِ خنجر	کہ پارہ پارہ کلیجہ ہے چاک چاک جگر
دلِ فگار ہے پہلو میں بسمل مضطر	غمِ فراق سے ہے سخت زندگی دوبھر

کہاں ہے آنکھ میں جوشِ سرشک رونے کو
اُمڈ رہا ہے یہ طوفانِ غم ڈبونے کو

یہاں تلک تپِ ہجراں نے کر دیا ہے نزار	ہوا ہے تکیہ سے سر کا اُٹھانا بھی دشوار
وداع ہو چکے صبر و شکیب و تاب و قرار	اُٹھائیگا سرِ شوریدہ منتِ دیوار

عیاں ہے صدمۂ فرقت نے جیسی حالت کی
خدا ہی جانتا ہے کیفیت طبیعت کی

خبر کسے ہے کہ ہے کون وقفِ غم ناشاد	گذر رہی ہے کسی ناتواں پہ کیا بیداد
سُنے ہیں تو نے تو اے ابر نالہ و فریاد	تو ہی سنائیو ہجراں نصیب کی روداد

برس کے حال دکھا دینا دیدۂ تر کا
تبا نا برقِ تپاں حال قلبِ مضطر کا

کبھی نہ روزِ قیامت سے کم ہی ہجر کی رات	ہزار رنج و قلق اور مصائب و آفات
غمِ فراق میں جاں دینی تھی نہ مشکل بات	مگر ہے حسرتِ دیدار صرف وجہِ حیات

اسی امید پہ جانِ نزار باقی ہے
یہی خیال یہی انتظار باقی ہے

رہیں رنج و محن ہے ستم کشِ فرقت	کٹیگی کیسے خدا جانے ہجر کی مُدّت
غمِ فراق نے کی رفتہ رفتہ یہ صورت	کہاں ہے ضعف سے اظہارِ حال کی طاقت

جُدا کسی سے کسی کا کوئی حبیب نہو
یہ درد وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہو

شرر (سہارنپوری)

عظمتِ ہند

رونقِ انجمنِ عالمِ امکاں ہم تھے	وصف تھے جنمیں فرشتوں کے وہ انساں ہم تھے
شمع تھے راہِ ہدایت کی زمانہ کے لئے	روشنیٔ نگہِ گبر و مسلماں ہم تھے
مرکزِ علم تھے ہم دایرۂ عالم میں۔	شمع افروزِ رہِ منزلِ عرفاں ہم تھے
دین و دنیا کے مسائل کے تھے ہم عقدہ کشا	بابِ تحقیق تھے ہم قبلۂ ایماں ہم تھے
خطّۂ ہند میں تھا خطّۂ یوناں کا اثر	علم ارسطو کا تھا حکمت میں بھی لقماں ہم تھے
طبعِ روشن سے تھے ہم فیض رسانِ عالم	صورتِ ذرّہ تھے سب مہرِ درخشاں ہم تھے
بزمِ عالم میں یہ صورت تھی صفائے دل سے	مثلِ پروانہ تھے سب شمعِ شبستاں ہم تھے
گلشنِ دہر میں ہمسا نہ تھا آزاد کوئی	پا بہ گل سب تھے مگر سروِ خراماں ہم تھے
غنچۂ خاطرِ عالم تھا شگفتہ ہم سے	مایۂ نازِ بہارِ چمنستاں ہم تھے
ہوسِ تاجِ شہی ہمّتِ عالی کو نہ تھی	دیکھتے کب طرفِ قیصر و خاقاں ہم تھے
نکتہ آموزِ قدیم و ادب آموزِ جدید	طفلِ مکتب تھے سب اُستادِ دبستاں ہم تھے
شرک سے کفر سے مذہب کو بچانا تھا فرض	یہی دولت تھی فقط جسکے نگہباں ہم تھے
نہ تو محتاج کسی کے تھے نہ ہم دست نگر۔	اپنے خالق کے فقط بندۂ احساں ہم تھے
رحم و ہمدردی و دلجوئی سرشت اپنی تھی	چارہ سازِ غم و اندوہِ غریباں ہم تھے

باغ دلبستانِ وطن کو وہ بیابانِ وطن　　سب یہ قالب تھے کہ جنمیں صفتِ جاں ہم تھے
بلبلِ زار تھے ہم قمریِ ناشاد تھے ہم　　گلِ گلزار تھے ہم سروِ گلستاں ہم تھے
لالہ و یاسمن و نرگس و نسرینِ چمن　　سوسن و سرو و گل و سنبل و ریحاں ہم تھے
قدِ دلجو و رخِ روشن و خالِ مشکیں　　چشمِ مخمور و خمِ زلفِ پریشاں ہم تھے
وہ جفا کاریٔ حسن اور وہ وفاداریٔ عشق　　تیغ ابروئے صنم زخمِ شہیداں ہم تھے
گوہرِ سرِّ حقیقت کی تھی ہر سمت تلاش　　ہر خرابے میں اسی گنج کے جویاں ہم تھے
رہتے تھے جنّ و پری تابعِ فرماں اپنے　　مہرِ انگشتریٔ دستِ سلیماں ہم تھے
تھا مقام اسکا سرِ شاخِ درختِ لاہوت　　چمنِ دہر میں جس گل کے کہ جویاں ہم تھے
کیا کہیں اپنا فروغ انجمنِ عالم میں　　حلقۂ بزم میں مثلِ مہِ تاباں ہم تھے
دینِ زرتشت ہمارے ہی اثر سے چمکا　　آتش افروزِ صنم خانۂ ایراں ہم تھے
ہم مقدم تھے خبر ہم کو موخر کی تھی　　جبکہ قرآن نہ تھا حافظِ قرآں ہم تھے
طمع و حرص کا دھبہ کبھی لگنے نہ دیا　　لوثِ دنیا سے بچائے ہوئے داماں ہم تھے
مرہمِ زخمِ غریباں تھا سدا دستِ سلوک　　دوست بیکس کے تھے ہمدردِ یتیماں ہم تھے
جب سلماں تھا نہ سحباں تھا نہ حافظ نہ ظہیر　　نکتہ پرداز و سخن سنج و سخنداں ہم تھے
نام لکھا تھا سرِ دفترِ عالم اپنا　　علم و اخلاق کے مضمون کے عنواں ہم تھے
اپنے خالق کے حبیب اور سبکی خلائق کے ادیب　　معرفت کیش تھے ہم ہادیٔ ایماں ہم تھے
ہفت اقلیم میں ہر سکّہ پہ نقش اپنا تھا　　کوئی فرمان ہو مہرِ سرِ فرماں ہم تھے
مست ہمسا کوئی خمخانۂ عالم میں نہ تھا　　آبروے جرعہ کشِ بادۂ عرفاں ہم تھے
سب کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں اب ہم صورتِ خار　　یاد ایام کہ جب نازِ گلستاں ہم تھے
اپنے شبنم کیطرح رہتے ہیں گریاں ہر دم　　اسی گلزار میں اک دن گلِ خنداں ہم تھے
پابہ زنجیر ہیں جسطرح علائق سے اب　　اسطرح سے نہ کبھی قیدیٔ زنداں ہم تھے
آنکھ ہر ایک سے اب رہتی ہے نیچی اپنی　　شرم سے یوں نہ کبھی سر بگریباں ہم تھے

اب علاج اپنے مرض کا ہو تو اک بات بھی ہے
اس سے حاصل کہ کبھی عیسیِ دوراں ہم تھے

بشن نراین در

نغمۂ روح

روح کہتی ہے کہ میں ہوں قافِ قدرت کی پری　　گنبدِ گرداں سے بالا تھی مری جلوہ گری
بے نشاں میرا نشاں تھا لامکاں میرا مکاں　　میں ہوں اب در چار دیوارِ مکانِ عنصری
ایکدن وہ تھا کہ اونچی عرش سے پرواز تھی　　اب قفس ہے جسم کا اور رنج بے بال و پری
آج ہوں تارِ نفس سے طائرِ رشتہ بپا　　ورنہ تھی آزاد ہر قیدِ تعلق سے بری
ہے فقط پھیلی ہوئی اک میرے دم کی روشنی　　ورنہ ہے یہ قالبِ خاکی اندھیری کوٹھری
رہ کے اس ظلمت کدے میں ہوں وہ نورانی لقا　　مجھسے کم ہے چادرِ مہتاب کی ضو گستری
وہ دُرِ نایاب بحرِ لم یزل ہوں کیا مجال　　جانچ لے کوئی مبصّر یا پرکھ لے جوہری
میری آب و تاب نے اسدرجہ بخشا ہے فروغ　　قطرۂ ناچیز کو ہے زعمِ والا گوہری
اک جھلک نے میری مشتِ خاک کو چمکا دیا　　ذرّۂ بیقدر نے خورشید سے کی ہمسری
ہائے اس مٹی کے پتلے میں تھا کیا جادو بھرا　　کس فسونگر نے سکھایا اسکو سحرِ سامری
کالبد میں آب و گل کے یوں مسخّر کر لیا　　کوئی جادوگر اتارے جیسے شیشے میں پری
صوتِ موزوں پر مرے سامع کو ہو جاتا ہے وجد　　لحنِ دلکش پر مرے مطرب کو شوریدہ سری
زمزموں سے میرے ہر دل میں ہیں اٹھتے سوز و گداز　　ہو ترانوں سے مرے ہر آنکھ میں پیدا تری
مجھ سے عقدہ کھلتے ہیں سرِّ نفخت فیہ کے　　سیکھتے ہیں مجھسے اسرافیل بھی خنیاگری
ہے مرے دم کا دمامہ عالمِ اجسام میں　　مجھ سے زندہ صنعتِ صنّاع کی صورتگری
میں نہوں تو ساز و سامانِ جہاں سب ہیچ ہیں　　دولت و جاہ و حشم تیغ و علم چترِ زری
ہفت کشور شش جہت سب تابعِ فرماں مرے　　میں نہوں تو پھر کہاں کی تاجداری افسری
سب کا اک میری بدولت تھا زمانے میں عروج　　صولتِ اسکندری شان و شکوہِ قیصری
اب کہاں وہ جشنِ جمشیدی و بزمِ خسروی　　اب کہاں تختِ ہمایونی و تاجِ اکبری
عالمِ بالا میں جسدن بول بالا تھا مرا　　کب وجودِ عنصری تھا زیرِ چرخِ چنبری
تھی یہ تعمیرِ خراب آباد ہستی بے نشاں　　بے ستوں قائم نہ تھا یہ گنبدِ نیلوفری
امرِ ربّی کا معمّا ہے مرا رازِ خفی　　رمزِ خالق کی ہیں مجھ میں حکمتیں لاکھوں بھری
میرا عقدہ حل نہ کر سکتے اگر ہوتے بھی آج　　حافظ و سعدی و جامی و نظامی انوری
کہدیا میں نے یہ نغمے روح کے سنکر شفیق　　آنچہ وصفِ خود سرائی از ہمہ بالاتری

شفیق عمادپوری

مسلکِ گوتم

کوئی تلاش میں اللہ کے پریشاں ہے	کسی کو بہرِ تسلی اصولِ ایماں ہے
کوئی حقیقتِ آواگون کا خواہاں ہے	کسی کے دل میں قیامت کا خوف پنہاں ہے

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

اُلجھتے رہتے نہ یہ روح کے معانی میں	قیام خواب سمجھتے سرائے فانی میں
ادائے فرض سے ڈرتے نہ زندگانی میں	پھنسے نہ رہتے کبھی دردِ جاودانی میں

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

نہ ذبح کرتے یہ بیچارے بے زبانوں کو	فنا نہ کرتے کبھی بھولی بھالی جانوں کو
چڑھا کے بھینٹ نہ خوش کرتے قہرمانوں کو	نہ سرگ نرک سے بھر دیتے آسمانوں کو

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

جو کاسے بھنگ کے پی پی کے مست ہوتے ہیں	افیم کھا کے قوی جنکے پست ہوتے ہیں
شراب پی کے جو محوِ الست ہوتے ہیں	بتوں کے نام پہ جو مے پرست ہوتے ہیں

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

جو بندے بہرِ عصا فیرباز بنتے ہیں	درستم کو زمانے میں باز رکھتے ہیں
وہ جنکے حکم سے جنگی جہاز بنتے ہیں	مدد سے تیغ کی مسند طراز بنتے ہیں

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

عدو کو حسنِ مروت کا یہ صلا دیتے	جہاں سے جنگ و جدل کا نشاں اُڑا دیتے
جو دل کو غازۂ الفت سے یہ جلا دیتے	ذرا سے آئینے کو جامِ جم بنا دیتے

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے۔

سُنا شمیم کلام اس طبیبِ انساں کا	علاج جسنے کیا دردِ یاس و حرماں کا
وہی چراغ ہے اس دہر کے شبستاں کا	بتا یا جسنے طریقہ حصولِ نرواں کا

یہ کاش مسلکِ گوتم سے آشنا ہوتے

شمیم

گلِ نیلوفر

نور کا تڑکا ہے، اور خورشید ہے جلوہ فشاں	قابلِ نظارہ ہے کیفیتِ سیلانِ آب
دشت میں چشمہ اگر ہے دلفریبی سے رواں	پھول نیلوفر کا بھی ہے زینتِ دامانِ آب

گُل بدا ماں ہے مگر کوئی عروسِ شرمگیں	دستِ قدرت نے ہے کھینچا یا کوئی نقشِ فسوں
لب پہ ہے موجِ تبسم کی ادائے دلنشیں	ہلکی ہلکی روئے زیبا پر نقابِ نیلگوں

پڑ رہا ہے آسماں کا عکس سطحِ آب پر	محوِ نظارہ ہے یہ پھر کیں دلاویزی کیساتھ
شرم سے پانی کی چادر میں چھپا لیتا ہے سر	بہتی ہے ہلکی سی کشتی جب کوئی تیزی کیساتھ

اے بہارِ جوئبار، اے نازشِ آبِ رواں	تیری رعنائی کا عالم ہے عجب وقتِ سحر
تو ہے خلاقِ دوعالم کی محبت کا نشاں	اُن کی نظروں میں جو طالبِ عشق کوش ہیں اہلِ نظر

زندگی کے ظلمت افزا، پُرخطر گھنٹوں میں، جب	ہم بھلا دیتے ہیں دل سے تجھکو اے پروردگار
زرد پڑ جاتا ہے چہرہ، خشک ہو جاتے ہیں لب	مسکرا کر ہم کو اک اک گُل میں تو کرتا ہے پیار

اے گُلِ تر! ہے طلسم جلوۂ موہوم تو	ہے خزاں سر پر کھڑی، تیری دو روزہ ہے بہار
اس چمن میں آہ! میں بھی ہوں اسیرِ رنگ و بو	ہستیِ فانی بھی ہے میری بہت ناپائیدار

جلوۂ حسنِ ازل ہر گُل میں، ہر نغمے میں ہے	پردۂ ہستی حجابِ چشمِ حیراں ہے مگر
پرتوِ شانِ جلالی دل کے آئینے میں ہے	شوقِ خود بینی ہے، لیکن، مانعِ ذوقِ نظر

اے طلسمِ عشوۂ نیرنگِ ہستی! ٹوٹ جا!	ہے سرِ شوریدہ کو سودا بہارِ خُلد کا

ٹوٹ جا! اے آئینۂ صورت پرستی! ٹوٹ جا! — دل ہے مشتاقِ تماشا سبزہ زارِ خلد کا

اس سیہ زنداں میں ہوں پابندِ آلام و محن — قیدِ ہستی کی کشاکش سے بہت بیزار ہوں
شورش افزا اک مرقع دہر کی ہے انجمن — تیرا اے برقِ تجلی! طالبِ دیدار ہوں

شاکر

شمع وپروانہ

آہ شب کو ایک محفل میں ہوا میرا گذر — دیکھی جلتی شمع میں نے اور پروانوں کے پر
ہو رہی ہے چھیڑ چھاڑ آپس میں جل جل کر عجب — پر اُسے شیدا بناتا ہے وہ اسکو دیکھ کر
اور دعویٰ ہے یہ اُسکا پاس کوئی آئے کیوں — حسن کی گرمی سے میرے قلب جلتے ہیں اگر
میں نہوں جس بزم میں اس بزم میں اندھیر ہو — میرے دم کی روشنی رہتی ہے ہر دم رات بھر
مفت میں بدنام کر رکھا ہے لوگوں نے مجھے — مجھکو خالق نے دیا شعلہ زبانی کا اثر
میں یہاں کہتی ہوں گو بے زباں ہوں خلق میں — محفلِ عشرت میں رکھیں یا جلائیں قبر پر
تو اگر شیدا نہیں تو آیا کیوں میری طرف — دے جوابِ صاف اسکا عذر جانسوزی نہ کر
بولا وہ ہر ایک اچھی شے پہ کرتا ہے نگاہ — آئینہ ہو اسمیں یا خورشید ہو یا ہو قمر
تیری محفل میں مرا آنا ہے یہ بھی اتفاق — لیکن اس سے عشق کا ثابت ہے کچھ تو دھیان کر
سنکے باتیں دونوں کی سناٹا ہے اک بزم میں — چل رہی ہیں گویا چھریاں پہلوے انصاف پر
اہلِ محفل سنتے ہیں دیتے نہیں کچھ بھی جواب — صاحبِ دل سے رہا جاتا ہے کب یہ دیکھکر
کہدیا دونوں کے منہ پر میں نے بھی بیساختہ — کون ان جھگڑوں کے بکھیڑوں میں پڑے المختصر
اپنی اپنی جا پہ باتیں ظاہرہ تو ٹھیک ہیں — دونوں سچے ہیں کوئی جھوٹا نہیں لیکن مگر

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود
گر نسوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود

ماہ عظیم آبادی

نوحۂ سرور

اے اجل! کس کا چراغِ زندگی گل کر دیا — کس کی میت پر جوانا مرگ کا غل کر دیا
خون کسکی حسرتوں کا بے تامل کر دیا — ختم کسکی زیست کا دورِ تسلسل کر دیا
کس گلِ شاداب کو تونے ملایا خاک میں
پھونک کر اُف کر دیا کس کو خس و خاشاک میں

چاک کسکا پردۂ دامانِ ہستی کر دیا — کسکا وقفِ نیستی سامانِ ہستی کر دیا
اُف یہ کسکو خانماں ویرانِ ہستی کر دیا — تو نے رخصت کونسا مہمانِ ہستی کر دیا
شور برپا ہے یہ کس کی مرگِ حسرتناک کا
اے اجل کسکو کیا پیوند تو نے خاک کا

یہ ستم تو نے بلائے ناگہانی کیا کیا — کسکے ارمانوں پہ پھیرا تو نے پانی کیا کیا
کسکی ہستی تو نے کردی آہ فانی کیا کیا — خاک میں کسکی ملا دی زندگانی کیا کیا
صاعقہ بنکر جلا دی کسکی کشتِ آرزو
کسکی قسمت سے مٹا دی سرنوشتِ آرزو

تیرے ہاتھوں کون وقفِ پائمالی ہو گیا — کسکا پیکر نقشِ تصویرِ خیالی ہو گیا
کسکا پیمانۂ عشرت سے خالی ہو گیا — کون منکر نذرِ صد آشفتہ حالی ہو گیا
حسرتیں نالاں ہیں کسکے خانۂ ویراں میں آہ
تفرقہ ڈالا یہ تو نے کسکے جسم و جاں میں آہ

یہ دیا ہے تو نے داغِ تازہ کسکی موت کا — کھینچتے ہیں اقربا خمیازہ کسکی موت کا
درد و غم ہے سبکو بے اندازہ کسکی موت کا — گونجتا ہے خلق میں آوازہ کسکی موت کا
کسکی میت پر ہجومِ حسرت و ارمان ہے
الوداعِ آخری کا کسکی یہ سامان ہے

کسکو بارِ زندگانی سے سبکدوشی ہوئی — خاک ہو کر خاک سے کسکو ہم آغوشی ہوئی
جان دے کر کسکو حاصل خود فراموشی ہوئی — لب بلب کسکے دہن سے مہرِ خاموشی ہوئی
ہو گئی وقفِ خزاں کسکی بہارِ زندگی

رقص

انڈین پریس الٰہ آباد

نقشِ باطل ہو گئے کسکے نگارِ زندگی

کسکا تو نے اے اجل! چھلکا دیا جامِ حیات   کسکو تو نے کردیا صد حیف ناکامِ حیات

رو کشِ صبحِ قیامت کسکی ہے شامِ حیات   تیرے ہاتھوں ہوگیا کسکا سرانجامِ حیات

خرمنِ ہستی پہ کسکا پھونک کر اُف کر دیا

اک زمانیکو جو سرگرمِ تاسف کر دیا

واے حسرت! اے اجل کمبخت تیرے منہ میں خاک   اُف تری سفاکیاں۔ تو نے کیا اسکو ہلاک

جسکی دل آویز نظمونکی تھی اک عالم میں دھاک   روح فرسا سانحہ ہے اُسکا مرگِ دردناک

جسکے نغمونکی صدا آتی تھی کل تک کان میں

اب نہیں اُسکا پتا بھی عالمِ امکان میں

آہ اے دار السرورِ باغِ جنت کے مکیں   اے سرورِ خوش بیاں۔ اے تاجِ شہرت کے نگیں

تیرے غم سے ہیں دلِ اہلِ قلم اندوہ گیں   یہ وہ صدمہ ہے تلافی جسکی ہوسکتی نہیں

قابلِ صد رنج و حسرت ہے تری بے وقت موت

دے گئی داغِ جدائی سبکو تیری سخت موت

رونقِ بزمِ سخن تھی تیرے دم سے سربسر   گل نئے پھولا کئے تیرے قلم سے سربسر

یہ نمایاں ہے تری طرزِ رقم سے سربسر   پھول تو چنتا تھا گلزارِ ارم سے سربسر

تھی سرور افزا زبس تیری مۓ نابِ سخن

کھل گیا تھا تیری نظموں سے نیا بابِ سخن

ہر صنف میں تیرا اندازِ تخیل تھا نیا   ہر روش میں تیرے لفظوں کا تسلسل تھا نیا

نیچرل نظموں میں تیرا رنگ بالکل تھا نیا   تیری محفل میں جو چھلکا ساغرِ مُل تھا نیا

یہ ٹپکتا ہے ترے ہر شعر تر سے بالیقیں

تو نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے بالیقیں

آئینہ ہر شعر ہے روشن خیالی کا تری   مصرعہ مصرعہ ہے مرقع خوشنمائی کا تری

شوخیِ مضموں نتیجہ طبعِ عالی کا تری   چستیِ بندش ہے نمونہ باکمالی کا تری

گو کہ تھی تیری طبیعت فطرتاً مشکل پسند

ہوتی تھیں لیکن تری پُر درد نظمیں دل پسند

آہ! اے شیوا بیاں سرمایۂ نازِ سخن   غرقِ حیرت کس لیئے ہے اے سرافرازِ سخن

کیوں نہیں اب چھیڑتا تو پردۂ سازِ سخن   دم بخود کس فکر میں ہے نغمہ پردازِ سخن

تیرے نغموں کے لیئے سب گوش بر آواز ہیں

تو اُٹھاتا کیوں نہیں جو پردہ ہائے راز ہیں

اسقدر بھی کیا سرورِ بادۂ سرجوش ہے   اپنی ہستی کا بھی محوِ خواب تجھکو ہوش ہے

کیوں فسردہ تیرے دلکی آتشِ خس پوش ہے   آہ اے شعلہ زباں تو کس لیئے خاموش ہے

تیرے ہونٹوں پر ہے یہ مُہرِ خموشی کس لیئے

راز ہے کوئی وگرنہ پردہ پوشی کس لیئے

خالی از علت نہیں ہے تیرا اندازِ سکوت   تجھپہ شاید کھل گیا ہے عقدۂ رازِ سکوت

دل ہی دلمیں چھیڑتا ہے پردۂ سازِ سکوت   نقدِ جاں دیکر ہوا ہے تو ہم آوازِ سکوت

اب نہ آئیں گی تری دلکش صدائیں کان میں

نام پر باقی رہے گا عالمِ امکان میں

گو فلک نے کردیا ہے تجھکو پیوندِ زمیں   کب مٹا سکتا ہے لیکن تیرے نقشِ دلنشیں

سب کہیں گے تیری نظموں پر صدائے آفریں   ہے سخن ہی سے بقائے نام و شہرت بالیقیں

نقشِ باطل ہو نہیں سکتا کبھی نامِ سرور

ہند میں جب تک رہیگی گردشِ جامِ سرور

برق دہلوی

حبِّ وطن

جس خاک سے بنے ہیں اُسی خاک میں ملیں   گُل ہوں تو اپنے باغ کی خاشاک میں ملیں

بوئے وفا نہ خوئے صفا کا ہو جنمیں رنگ   جلد اے خدا! وہ پھول کہیں خاک میں ملیں

دلکو خبر ہو دل کی تو ہو دل سے دلکو راہ   خط سب کو حبِّ قوم کے اس ڈاک میں ملیں

آنکھوں سے چُن کے دل میں رکھوں پھول کسطرح   کانٹے وطن کے جو خس و خاشاک میں ملیں

خاکِ وطن ہی لیگی **فلک** گود میں ہمیں

کچھ غم نہیں جو پیکِ اجل تاک میں ملیں۔

لال چند فلک

انجامِ گل

وہ دھوپ آگئی، وہ تیرا رنگ اُڑنے لگا
وہ ہر طرف سے شعاعوں نے تجھکو آگھیرا

وہ دلفریب ترا حُسن ہوچلا زائل
فسردگی کی طرف قدرتاً ہے تو مائل

وہ جھک گئی کمرِ شاخ، آگئی پیری
وہ جھُرّیاں ترے رخ پر لبوں پہ ہے خشکی

جو شاخِ نخل تنا ور تھی کبر و نخوت سے
وہ خشک ہوکے جھُکائے ہے سر ندامت سے

نہ تازگی تری باقی، نہ حسن صورت ہی
نہ رنگ شوخ رہا ہے، نہ تیز نکہت ہی

مزا شباب کا لُوٹا جو دھوپ نے آکر
کھڑا رہا شجرِ گل بھی بے بس اور مضطر

ہوئی نمود فلک پر جو شاہِ خاور کی
اُداس ہوگیا، رنگت اُڑی گلِ تر کی

کچھ اُس کو رحم نہ آیا تری نزاکت پر
نہ کھایا اُس نے ترس حُسن پر نہ رنگت پر

کہاں ہے بلبلِ حسرت نصیب شیدائی
نہیں شریک جو تجھپر فسردگی چھائی

نہیں نہیں وہ اسی رنج میں تو ہے بیتاب
کہ اب نصیب نہوگا اُسے گلِ نایاب

گھمنڈ تھا تجھے کس درجہ حُسن فانی پر
اِدھر تو بُو پہ اُدھر رنگِ نوجوانی پر

یہ دو گھڑی کی جوانی تری تھی اے نادان
مگر تجھے نہ رہا انقلاب کا کچھ دھیان

دماغ اب تری خوشبو سے ہوگئے محروم
دلوں کو جس سے تھی فرحت وہ رنگ ہے معدوم

رہا بھی شاخ میں تُو پژمُردہ گل تو ہے بیکار
کہ اس سے رونقِ بُستاں نہیں رہی نہار

جو وصلِ یار سے محوی یہ بے نصیب رہے
تو کس امید پہ گلشن میں عندلیب رہے

محوی لکھنوی

جانِ جہاں

تجھ سے اے جانِ جہاں سبکو ملی روحِ حیات
تجھسے اے نورِ مبیں روشن ہے ساری کائنات

تیری وسعت سے ہے یاں۔ یہ وسعتِ پہنائے دہر
تیری رفعت سے ہے یاں۔ یہ اوجِ سقفِ کائنات

تیرے جلوے سے منور مسجد بیتِ حرم
تیرے رنگوں سے مصوّر گرّدے فرشِ سومنات

تا یہ طرح تماشا۔ یعنی اک تیرا وجود
حاصلِ جان تمنّا۔ یعنی تیری ایک ذات

گلستانِ صد نزاکت۔ اے تری ہر ایک رمز
بوستانِ صد لطافت۔ اے تری ہر ایک بات

تیرے نورِ لطف میں ہنگامہ زار رہتا ہے دن
تیرے ظلِّ عاطفت میں یاں سکوں کدہ ہے رات

تجھ سے ظاہر ہے۔ اگر ہے بھی کسی شئی کا ظہور
تجھ سے ثابت ہے۔ اگر ہے بھی کسی شئی کو ثبات

تجھ سے ہے۔ ہاں تجھ سے ہے۔ اے شرحِ رازِ زندگی
عرصۂ عالم میں ہے کچھ بھی اگر طورِ حیات

تجھ سے اے جانِ دو عالم۔ تجھسے اے جانِ ولی
بس وہی ہے اک تمنّا۔ بس وہی ہے ایک بات

ولی الحق

ادیب

لِلّٰہ الحمد! شگفتہ ہوئے غُنچے دل کے
جھومتی آئی نسیمِ طربِ آثارِ ادیب

اہلِ دل ایک ہی جلوے پہ فدا ہوتے ہیں
دل لُبھا لیتے ہیں مضمونِ گہربارِ ادیب

واہ کیا حسن دل افروز ہے کیا طرز لطیف
اک نظر دیکھ کے سب بنتے ہیں سرشارِ ادیب

دلربا کیسی تصاویر ہیں اللہ اللہ
نقدِ دل دے کے زمانہ ہے خریدارِ ادیب

کونسی آنکھ ہے جو اسکی جھلک پر نہیں غش
کونسا دل ہے نہیں ہے جو طلبگارِ ادیب

ہند کے اہلِ قلم جان سے ہیں اسکے رفیق
ملک کے اہلِ زباں دل سے ہیں انصارِ ادیب

اس پہ ہے حضرتِ شوکت کی نگاہِ الطاف
کیوں نہ پھر بامِ فلک پر رہے معیارِ ادیب

حضرتِ شوق رہیں خلق میں سرسبز مدام
فیض سے جن کے شگفتہ ہوا گلزارِ ادیب

حضرتِ نظم ہوئے جب سے معین و ہمدرد
رشکِ مہرِ منور ہوئے آثارِ ادیب

اے خداوند جہاں حضرتِ شاکر ہیں شاد
جن کے آنے سے بڑھی رونقِ بازارِ ادیب

چشمِ حسّاد سے کچھ خوف نہیں اسکو شہیر
جب کہ افضالِ الٰہی ہیں مددگارِ ادیب

شہیر (فتحپوری)

تازہ غزلیں

بقیہ اشعار غزل مندرجۂ ادیب مئی ۱۹۱۱ء

دود درونِ سوختہ چرخِ بریں نہ ہو
آسودہ کدورتِ کلفت زمیں نہ ہو

سجدہ سرِ نیاز سے نفرت گزیں نہ ہو
گر سنگِ آستاں ترا چیں برجبیں نہ ہو

ہے کیفِ مے سے نرگسِ ساقی جھکی ہوئی
ناز آفریں ہے جو۔ وہ نیاز آفریں نہ ہو

بیژن ہے چاہ میں تو ہے رستم کو اسکی چاہ
غفلت فراسیاب کے زیرِ کمیں نہ ہو

جو سرفرو نہو، وہ کبھی ہو نہ سُرخ رو
ہو موج نشیں نہو تو سیہ رو نگیں نہ ہو

خالِ رُخِ صنم کو سویدائے دل سمجھ
عرفاں کا نقطہ چیں ہو اگر نکتہ چیں نہ ہو

دنیا کی سرزمیں میں ہر دامِ بلا نہاں
دانا اگر ہے طائرِ دل دانہ چیں نہ ہو

گو خاک ہو گئے ہیں یہ سہمے ہوئے ہیں ہم
زیرِ زمیں بھی خوف سے چرخِ کمیں نہ ہو

کیا تند خوئیوں سے دلِ ناتواں کو باک
خاشاک، قہرِ شعلہ سے چیں بر جبیں نہ ہو

تحت الثریٰ بھی رُتبۂ پستی میں کم نہیں
نازاں تو اپنی اوج پہ چرخِ بریں نہ ہو

خود گوشہ تیرے دل کا ہو جب خرمنِ غنا
تو بہرِ توشہ پیشِ خساں خوشہ چیں نہ ہو

تھک کر گرا صدف میں تو کم ظرف تھا گہر
دریا میں اوجِ موج کبھی تہ نشیں نہ ہو

شوکت (میرٹھی)

دیکھوں آزاد گرفتار بنا ہو کیونکر
دل مرا زلف کے پھندوں سے رہا ہو کیونکر

چارہ گر دردِ محبت کی دوا ہو کیونکر
دلِ بیمار کو بے یار شفا ہو کیونکر

سنگدل وہ ہیں یہ شیشے سے سوا نازک ہے
ٹوٹنے میں دلِ مضطر کے صدا ہو کیونکر

چٹکیاں دلمیں لیا کرتی ہے الفت اُسکی
آستیں دیدۂ گریاں سے جدا ہو کیونکر

جسقدر اُنکو مناتا ہوں بگڑ جاتے ہیں
اپنی ناکامیِ قسمت کا گلہ ہو کیونکر

شبِ فرقت دلِ بیتاب کو لطف آتا ہے
تیری تصویر نگاہوں سے جدا ہو کیونکر

چاہنے والوں سے وہ آنکھ ملاتے ہی نہیں
کارگر بزم میں شمشیرِ ادا ہو کیونکر

لب پہ ہر مرتبہ آتی ہے شکایت اُسکی
ہجر کی شب مری مقبول دعا ہو کیونکر

آپ آتے ہی نہیں اسکی عیادت کیلئے
دور آئی عاشق کی قضا ہو کیونکر

یار پہلو میں ہے گلشن پر گھٹا چھائی ہے
ہاتھ اب گردنِ مینا سے جدا ہو کیونکر

سنگدل درد کی باتیں کبھی سنتا ہی نہیں
کسطرح حال کہوں ذکرِ جفا ہو کیونکر

چار ہو آنکھ کہوں حال بن آئے کچھ کام
دور اُن نرگسی آنکھوں سے حیا ہو کیونکر

دن میں سو بار کیا کرتے ہو جھوٹے وعدے
مُنہ سے جو کہتے ہو تم اسکو نبا ہو کیونکر

سر اٹھانے نہیں دیتے مجھے عصیاں یارب
دامنِ شرم مرے رخ سے جدا ہو کیونکر

آگئی حشر کے دن اُسکی محبت ماہر
شکوۂ ظلم و جفا پیشِ خدا ہو کیونکر

ماہر (کنتوری)

عید کا دن ہے وہ اب جانبِ خنجر دیکھیں
ذبح عاشق کو کریں صبر کا جوہر دیکھیں

زُلف سرکا کے جمالِ رُخِ انور دیکھیں
کب یہ دن ہمکو دکھاتا ہے مقدر دیکھیں

گو ترے جلوہ سے ہے خانۂ عالم معمور
خود نظر اپنی جو حاجب ہو تو کیونکر دیکھیں

بے طرح زیست نے روکا ہے لحد کا رستہ
کب مرے قبضہ میں آتا ہے مرا گھر دیکھیں

رکھ کے زانو پہ وہ کیا دیکھتے ہیں خال اپنی
اوجِ آئینۂ و اقبالِ سکندر دیکھیں

خاک اُڑانے پہ جو ہنستے تھے ترے کوچے میں
زانوئے حور پہ تربت میں مرا سر دیکھیں

غیر کو بھی تو انہیں آنکھوں سے دیکھا ہمنے
وائے ہم پر تجھے اِن آنکھوں سے کیونکر دیکھیں

جو یہ کہتے ہیں کہ معراج نہ تھی جسمانی
خاک میری ترے کوچہ میں ہوا پر دیکھیں

فصلِ گل آئے کہ ہم تشنہ لبان مشتاق
دستِ ساقی پہ چھلکتے ہوئے ساغر دیکھیں

خوں سے دامن کو بچانیکی جنھیں کوشش تھی
بھیڑ آکر وہ مزارِ شہدا پر دیکھیں

فی الحقیقت ہو وہی عید کا دن اے آباد
جبدن اس روح کو ہم جامہ سے باہر دیکھیں

آباد (عظیم آبادی)

خون کے دریا بنینگے اور اُبلتے جائیں گے
دل کے ناسوروں سے جو قطرے نکلتے جائیں گے

حشر کے دن سامنا حسنِ ازل کا ہے ضرور
خون اپنے دل کا ہم چہرے پہ ملتے جائیں گے

چھیڑ دے فصّادِ زخمِ دل کا اب جو ہو سو ہو
ہم سے سنبھلا جائیگا جب تک سنبھلتے جائیں گے

اپنے مرکز پر ٹھہر جائیں گے آ کر اے جنوں
گو زمیں کے ساتھ ہم ذرات چلتے جائیں گے

ہاں نہ چھیڑو اے طلبگارانِ اسبابِ نشاط
ہم یونہیں اپنے تصوّر سے بہلتے جائیں گے

گرد اوڑی صبحکو جو رخشِ روش پر سے
کہے جاتے وقت وہ چہرے پہ ملتے جائیں گے

اور ہو جائیگا ان قبروں کا منظر دیکھنا
وہ اگر گورِ غریباں پر ٹہلتے جائیں گے

آئیں تو وہ کشتگانِ غم جو نوآموز ہیں
رفتہ رفتہ میری صحبت میں بہلتے جائیں گے

حدِ منزل بن گیا غیروں کو ہر نقشِ قدم
چلنے والے اب کہاں تک راہ چلتے جائیں گے

زلف کھولی میری بالیں پر کسی نے کہہ کے یہ
تا کجے بیمارِ شامِ غم سنبھلتے جائیں گے

جی میں آتا ہے کہ اپنے دل پہ خنجر مار لیں
اب کہاں تک ہاتھ یوں سینہ پہ ملتے جائیں گے

جائیے بیمارِ غم کے غمکدہ میں کیا ہے اب
سر جھکائے آپ یوں کب تک ٹہلتے جائیں گے

خامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کہکر لکھا
ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

دل کے شعلوں میں شفق پھوٹے گی جلووں کی عزیزؔ
صبح ہوتی جائیگی جتنا کہ جلتے جائیں گے

عزیزؔ لکھنوی

جب کسی کو غمزدہ میں دیکھتا ہوں اے حسنؔ
جی بھر آتا ہے کچھ اپنا ساز و ساماں دیکھکر

حسن امام

کم نہ تھی صحرا سے کچھ بھی خانہ ویرانی مری
میں نکل آیا کہاں ہائے وائے نادانی مری

کیوں بناؤں میں کسی کو رہبرِ ملکِ عدم
اے خضر یہ سرزمیں ہے جانی پہچانی مری

جان و دل پر جتنے صدمے ہیں اسی کے دم سے ہیں
زندگی ہے فی الحقیقت دشمنِ جانی مری

ابتدائے عشقِ گیسو میں نہ تھیں یہ اُلجھنیں
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی آخر پریشانی مری

وحشتِ ہستی میں دواں ہوں مدعا کچھ بھی نہیں
کب ہوئی محتاجِ لیلےٰ قیس سامانی مری

اور تو واقف نہیں کوئی دیارِ عشق میں
ہے جنوں شیدا مرا۔ وحشت ہے دیوانی مری

باغِ دنیا میں یونہی رو ہنس کے کاٹو چار دن
شبنم و گل کی طرح ہے زندگی فانی مری

کر کے ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن
ہو گئی آساں ہر اک مشکل بآسانی مری

ہاں خدا لگتی ذرا کہہ دے تو اے حسنِ صنم
عاشقی اوروں کی اچھی یا کہ حیرانی مری؟

لختِ دل کھانے کو ہے خونِ جگر پینے کو ہے
میزبانِ دہر نے کی خوب مہمانی مری

نغمہ زن صحرا میں ہوں جس طرح کوئی عندلیب
یوں ہے اے محرومؔ سرحد میں غزل خوانی مری

محرومؔ

(منشی درگا سہائے صاحب سرورؔ جہان آبادی مرحوم)

اسقدر گھبرا گیا دل زلفِ جاناں دیکھکر
جسطرح اُٹھے کوئی خوابِ پریشاں دیکھکر

کیا خبر تھی اسقدر دشوار یاں پڑ جائیگی
عشق کر بیٹھے تھے ہم اک کام آساں دیکھکر

کس قدر بھولے ہوئے ہو عیش میں عقبیٰ کو تم
آنکھ کھولو جانبِ گورِ غریباں دیکھکر

اے تغافل کیش اتنا جور جرمِ عشق پر
رحم کر ہم بیکسوں کا تنگ زنداں دیکھکر

دل کو تارِ دل کا نکلنا سنتے تھے اے مہ جبیں
اب یقیں کامل ہوا ماتھے پہ افشاں دیکھکر

تشنگیِ عشق سے خشک ہو چکے تھے لب مرے
منہ میں پانی آگیا چاہِ زنخداں دیکھکر

محویت ایسی ہوئی کہ بت بن گئے حیراں رہے
رونقِ آبادیِ شہرِ خموشاں دیکھکر

یوسفِ مصری بہت نازاں تھے اپنے حسن پر
منہ میں پانی آگیا تیرا زنخداں دیکھکر

دل میں خلشِ غمِ نہاں ہے
جو آہ ہے لب پہ خونچکاں ہے

سوکھی ہوئی ندیاں ہیں آنکھیں
وہ سیلِ سرشک اب کہاں ہے

دم توڑ رہی ہے نامرادی
برسوں سے غریب نیمجاں ہے

دل آنکھوں سے بہ گیا اُبل کر
اے دردِ فراق اب کہاں ہے

رہنے کو نہیں کہیں ٹھکانا
اب مجھ کو زمیں بھی آسماں ہے

نخچے سے جگر کی خیر یا رب!
بسمل ہے غریب نیمجاں ہے

دل ہے کبھی آبلہ کبھی اشک
ہر رنگ میں اب یہ خونفشاں ہے

بولے مجھے دیکھکر سرِ راہ
کیا تو ہی سرورؔ خستہ جاں ہے

اڈیٹوریل

مرزا غالب اُردو لٹریچر کو جس قدر ترقی غالب مرحوم کی بدولت ہوئی ہے، وہ شاید کسی اور بزرگ سے نہوئی ہوگی زمانۂ حال میں جو سلاست نویسی اور خیال بندی کا رنگ انشاپردازی کا خاص جزو معلوم ہوتا ہے، یہ فیضان غالب کے سوا کسی اور سے ممکن ہی نہیں۔ مرزا نوشہ کا جو احسان اُردو زبان پر ہے، اُس کو نہ صرف دلّی کا اسکول آف لٹریچر تسلیم کرتا ہے، بلکہ لکھنؤ۔ اور لکھنؤ کا بھی خاص "شیش محل"۔ وہی غالب جس نے بلند پروازی اور علو خیالی کے ساتھ روزمرّہ اور محاورہ بندی میں ایسا نام پایا کہ سند الوقت رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب، شمس العلما حالی، مرزا مجروح مرزا تفتہ، وغیرہ نے خاقانی ہند اُستاد شاہ حضرت ذوق کی شاگردی کے بجائے اُسی کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا مایۂ ناز سمجھا۔ ہائے! اسی غالب کا مزار اب ایسی کس مپرسی کی حالت میں ہو، کہ اُسے دیکھکر غیر ملک کے رہنے والوں کو حسرت ہوتی ہے، چنانچہ پاینیر کے ایک نامہ نگار، ڈاکٹر مارٹن، نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا تھا۔

"اگلے جو میرا دہلی جانا ہوا تو شاہ نظام الدین اولیاء کے احاطہ کے باہر ایک خادم نے مجھے ایک قبر دکھلائی، پھر اُس کے پاس لے جاکے کہنے لگا کہ یہ غالب کی قبر ہے۔ (آہ! وہی غالب جس کا یہ شعر ہے ؎ غالب نام آورم نام و نشانم مپرس — ہم اسد اللہ ام ہم اسد اللہیم) ٹوٹی ہوئی قبر جسکے سرہانے سنگِ مرمر پر کتبہ اور اُسکی بھی وہ حالت کہ عیاذاً باللہ یہی معلوم دیتا تھا کہ دو ایک برساتوں کے بعد یہ بھی قبر کے ساتھ مل کے تہِ خاک ہو رہے گا؛ اور اسکے ساتھ زبان اُردو کا ایک سربلند عَلَم سرنگوں ہوکر مٹی میں ایسا ملیگا کہ اسکا نشان تک نظر نہ آئیگا تو کیا مجھے اس امر کا حق ہے کہ کلامِ غالب کے دلدادگان پر استفاثہ کردوں؟ مورخ، مصنف، شاعر، جس قوم میں ہوں، وہ اس قوم کے بیش بہا جواہر ہوتے ہیں۔ یہ مال ضائع نہیں کرتے بلکہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں، انکی قبریں نہیں بلکہ بیش قیمت خزانوں کے دفینے ہیں ان تبرکات کی کچھ قیمت نہیں، یہ انمول رتن ہیں۔ ان مقدس تربتوں کو برباد ہونے دینا گناہ ہے، اور گناہ کے ساتھ وہ تقصیر جو آنیوالی نسلیں کبھی بھی معاف نہ کریں گی۔ میری خواہش ہے کہ یہ تربت برباد نہ ہونے پائے، میری یہ تمنا ہے کہ یہ مرقد باقی رہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ یہ ڈھیر قائم رہے اس لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو ایک ایک روپیہ کا عام چندہ ہو، اور پھر دو تین ہزار میں ایک مضبوط چھوٹی سی عمارت بناکر مرنے والے کا زندہ نشان قایم کیا جائے"۔

مندرجہ بالا سطور کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک یورپین ڈاکٹر کے الفاظ ہیں، جو چوٹیں کھائے ہوئے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔ وہ غالب کو قوم کا بیش قیمت مال بتاتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ اس قبر کو برباد ہونے دینا ایسا گناہ اور تقصیر ہے کہ آنے والی نسلیں اسکو معاف نہ کریں گی اس کے یہی معنی ہیں کہ آیندہ نسلیں اس مقدس تربت کو ترکہ میں پانے والی ہیں۔ اس ترکہ میں اصراف کرنے کا موجودہ نسلوں کو کوئی حق نہیں۔ یہ امانت ہے، اور امانت بھی ایسی جو ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچنی چاہیئے۔ آنیوالی نسلیں جب غالب مرحوم کے مزار کی جستجو کریں گی، اور اس کا پتہ یا نشان پانے کے لیے اس قسم کی تکلیف کا سامنا ہوگا جو آجکل کے ماہرانِ علمِ آثار الصنادید کو تابوت سکینہ کے دریافت کرنے میں ہوئی، تو کیا کہیں گی؟ یاد رکھو، کہ یہ جُرم نہ معافی کے قابل ہوگا، نہ ضمانت کے لائق۔ آہ! مرنے والے نے اپنی زندگی ہی میں کہدیا تھا ؎

ہوئے مرکے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

وہ دن تو ابھی دور ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کوئی غالب کلب یا غالب ہال قایم کیا جائے، مگر کیا ہم اس درجہ پست ہمت اور ایسی

نمایاں علمی غفلت میں مبتلا رہیں گے، کہ غالب ایسے زندۂ جاوید شاعر کی مٹی مٹائی قبر کو بربادی سے نہ بچائیں، اور اُس کے رہے سہے نشان کو ابد آلاباد تک قایم رکھنے میں دریغ کریں۔ افسوس سے

کرنے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

غالب مرحوم کا زیادہ ترحق باقیات الصالحات نوابانِ لوہارو، شمس العلما رحالی، بابو اُماشنکر صاحب مصنف آئینہ سکندری، اور لالہ سری رام صاحب ایم۔اے وغیرہ بزرگانِ دہلی پر ہے۔ اگر وہ خاموش ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں **ادیب** کے اجرا کا سب سے بڑا مقصد ملک میں لٹریری مذاق پیدا کرنا ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری کوشش سے غالب کی قبر بربادی سے بچ جائے تو یہ ہماری سب سے اعلیٰ خدمت ہوگی۔ لہذا ہم اس مہینے سے **غالب میموریل فنڈ** (چندۂ یادگارِ غالب) کھولتے ہیں۔ اور شیدایانِ کلامِ غالب سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس مفید تحریک میں حصہ لیں، اور اپنے احباب کو بھی اس طرف رجوع کریں۔ جو کچھ بھی ارسال ہوگا شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ ہاں! یہ بتا دینا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ "غالب میموریل فنڈ" میں جو روپیہ فراہم ہوگا، اس کا بے جا استعمال نہ کیا جائے گا۔ کامریڈ کے قابل اڈیٹر مسٹر محمد علی بی اے، تخمینۂ اخراجات تیار کر رہے ہیں، اور انہوں نے بھی اپنے اخبار میں فنڈ کھولا ہے۔ کافی روپیہ فراہم ہونے پر ایک مستقل یادگاری روضہ تعمیر کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ روپیہ کی فراہمی تک جناب مولوی حسن نظامی صاحب بلادِ اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آجائیں، اور روضۂ غالب کی تعمیر انہیں کی نگرانی میں ہو۔

اخیر میں اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ جب یہ روضہ تیار ہو جائے گا تو موجودہ زمانے کے دلدادگانِ کلامِ غالب کے سر سے بڑا بھاری بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کیونکہ غالب مرحوم کے حل طلب اشعار کو حضرت اُستادی مولانا شوکت مدظلہم اور مولانا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی نے اپنے اپنے "حل کلیات غالب" میں صاف کر دیا ہے، جس سے اُردو لٹریچر پر بڑا بھاری احسان ہوا ہے۔ تیسری بات جس سے زمانۂ حال میں یادگارِ غالب قائم رہ سکتی ہے، وہ دیوانِ غالب کے نہایت ہی خوش خط اور اعلیٰ قسم کے کاغذ پر چھپنے سے پوری ہوگی۔ ممکن ہوا تو **ادیب** ہی اس کمی کو پورا کرے گا، اور جسطرح زمانۂ حال میں شکسپیر، ملٹن، اور دیگر صدر نشینانِ انجمن علمِ ادب انگریزی کی تصانیف عمدہ پیرایہ میں انگلستان سے نکلتی ہیں، یا مولوی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کے ہاں سے "دیوانِ حافظ" اور "مسدس حالی" وغیرہ شایع ہوئے ہیں۔ اُسی طرح نئے پیرایہ میں کلیات غالب معہ تصویر و صحیح سوانح عمری مصنف بھی شایع کی جائے۔

سکھ کنیّا مہا ودیالہ شہر فیروز پور

یہ ایک غلط خیال ہے کہ اس زمانہ میں سچے فدائیانِ قوم، یا ایثارِ نفس کرنے والے، دوسروں کے راحت و آرام کے لئے اپنے جان و مال سے دریغ نہ کرنے والے، قوم اور قوم کے بچوں کے لئے تن، من، دھن، سے ہر وقت خدمت کرنے والے پائے نہیں جاتے۔ ان لوگوں کو ہم علیٰ روس الاشہاد ڈنکے کی چوٹ اعلان دیتے ہیں۔

کمی کس بات کی ہے اس خدائی کارخانے میں

اگر نہیں تو آئیں، اور شہر فیروز پور کے اُس آشرم کو دیکھیں، جو پانچ نومبر ۱۸۹۲ء کو خالصہ نیشن کی پیاری بیٹیوں کے سدھارنے کے لئے بھائی تخت سنگھ جی نے قائم کی، اور اسمیں انکی پیاری بیوی بی بی ہرنام کور نے خاص حصہ لیا۔ چنانچہ اس آشرم کی تاریخ سے پایا جاتا ہے کہ۔

"جب ایک ایسی لڑکی آشرم میں آئی جسکی والدہ اُسے ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دیکر دوسروں کے امتحان کے لیے چھوڑ گئی، تو بھائی تخت سنگھ جی اُسے گود میں اُٹھا کر بی بی ہرنام کور کے پاس لے گئے" اور کہا "جہاں اور بچے ہیں وہاں یہ بھی سہی زندگی ہوگی تو پرماتما کی دیا سے پل رہے گی نہیں تو خیر" چنانچہ اس زندۂ جاوید لیڈی نے اس نووارد کو سینے سے لگایا، اور وہی چھاتیاں، جن سے دودھ پانے کے لیے اُسکا اپنا تنا ترستا تھا، اس کے لیے وقف کر دیں۔"

ان باہمت اور مستقل مزاج میاں بیوی کی کوششوں سے آشرم میں ترقی ہونے
لگی، اور پھر ان کا کام دیکھکر چند اور بھی فدائیانِ قوم ان کے کام میں حصہ لینے کے
لیئے مستعد ہوگئے۔ انھیں میں ایک بھائی ویر سنگھ جی بھی ہیں۔ حال میں اس آشرم
کی طرف سے ایک انگریزی کتاب شائع ہوئی ہے جو ہمارے پاس بھی آئی ہے۔ یہ ان سب
آراء کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً یہاں کے معائنہ کرنے والوں نے آشرم کی نسبت قائم کی تھیں
انہیں میں صفحہ ۱۰ پر جناب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر پنجاب کی بھی رائے ہے، جنھوں نے
۱۰ جنوری کو اپنی لیڈی صاحبہ کے ساتھ اس کا معائنہ کیا تھا۔

پچھلے دنوں اس آشرم کی نسبت یہ سوال پیدا ہوا تھا، کہ اس کا اور سب انتظام تو
ہر طرح قابلِ تعریف ہے، مگر بورڈنگ کافی نہیں۔ اسپر دریافت کیا گیا کہ کسقدر رقم کے
صرف سے عمارت مکمل ہوسکتی ہے، تو پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ ہوا۔ یہ سنکر بھائی تخت سنگھ جی
پہلے تو کسی قدر گھبرائے، مگر پھر خود بخود کہنے لگے "ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا"
اس لیئے انہوں نے سچے دل سے گروگرنتھ صاحب سے وعدہ کیا کہ "جبتک یہ رقم پوری
نہ ہوے گی، وطن سے دور اور چمن سے دور، شکستہ پری اور خستہ حالی سے ننگے پاؤں جا
بجا چکر لگاتا پھروں گا، جہاں کہیں سے جو کچھ ملیگا، غنیمت سمجھوں گا۔ اور جو میری زندگی
میں میری مراد پوری نہ ہوئی تو جیتے جی نہ فیروزپور اور نہ اُس کے آشرم کا منہ دیکھوں گا۔
جسطرح راجپوتوں میں اکثر اسقسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں، کہ وہ کسی بات کے پورا ہونے
تک اپنے حلف کے مطابق بائیں ہاتھ سے کھاتے یا حجامت نہ بنواتے تھے، اُسی طرح میں بھی
یہ رقم پوری نہ ہونے تک جوتا نہ پہنوں گا۔" ہمارے خیال میں سکھ بھائیوں کے سامنے پچاس ہزار
کوئی بڑی بھاری رقم نہیں۔ انہوں نے خالصہ کالج کے لیئے ایک برس میں اسقدر چندہ جمع
کرلیا تھا، کہ محمڈن یونیورسٹی والوں کو دس سال تک نصیب ہوگا۔ امید ہے کہ خالصہ بہادر
اس آشرم کی مدد کے لیئے بھی اُسی قسم کی دریا دلی دکھائیں گے، جو کالج کے موقعہ پر دکھا چکے ہیں۔ کیا
سکھ کانفرنس کے اصولوں میں "استری تعلیم" کی مدد کا کوئی اصول نہیں؟ کیا سنگھ سبھاؤں
میں مستورات کی تعلیم اور خبرگیری اغراض خاص میں داخل نہیں؟ جب یہ سب کچھ ہے، تو کیا وجہ
ہے کہ غریب تخت سنگھ کو زیادہ دن جلاوطنی میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اگر یہ رقم اُس کے ہاتھ
آجائے، تو ہمیں شبہ نہیں، کہ وہ قیمتی وقت جو روپیہ فراہم کرنے میں صرف ہوگا، وہ قوم اور قوم
کے بچوں کی دیگر ضروریات کے رفع کرنے میں صرف ہوگا۔

صحیفۂ زرّیں ہندوستان کے علم ادب کی ہر قسم کی کتابوں کی اشاعت میں جسقدر کشش
و کوشش اور محنت و جانفشانی کے ساتھ، بلا کسی قسم کی قومی یا مذہبی جانبداری کے،
مطبع اودھ اخبار نے کام لیا ہے، اُسی کا حصہ ہے۔ اس کے لائق اور ہونہار مالک و کارپردازوں
نے نہ صرف فارسی، عربی، ہندی، بھاشا، سنسکرت۔ اور اُردو حروف ہی میں کتابیں
شائع کی ہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً ضروریاتِ زمانہ کو محسوس کرکے ہر قسم کی پورا کرنے میں کوئی دقیقہ
اٹھا نہیں رکھا۔ منشی نولکشور صاحب بانی ایک تو خود زمانہ کے رنگ کو پہچانتے تھے، دوسرے
اُنکے کارکن اور کارپرداز بھی نورٌ علیٰ نور تھے۔ منشی ہادی علی رشک۔ لالہ لکا پرشاد
توجہ۔ زرّیں رقم، جواہر رقم۔ منشی امیر اللہ تسلیم، بابو تربھون ناتھ ہجر۔ مولانا بحرالعلوم،
پنڈت رتن ناتھ سرشار، اور خدا جانے کتنے اور درجنوں اہلِ قلم جمع کر رکھے تھے، جو اپنے
وقت کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ ان کی جدت پسندی اور بلند پروازی کے باعث مطبع اودھ
اخبار کی مطبوعات کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ اسی زمانہ
شناس مطبع نے جہاں اور چیزیں آج سے آٹھ دس برس اُدھر شائع کی تھیں، شہنشاہ
خلد آرام گاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر ایک خاص کتاب "صحیفۂ زرّیں" بھی نکالی۔ اس صحیفہ
میں سرکاری کتاب "دربار قیصری" کے تتبع پر وہ جملہ مضامین درج کئے گئے، جنھیں دہلی کے دربار
تاجپوشی کے ساتھ خاص تعلق تھا۔ مختصر تاریخ جلسہ کے بعد رئیسانِ نامدار اور والیانِ ریاستہائے
ماتحت سرکار انگلیشیہ وغیرہ کے حالات معہ تصاویر اس خوش اسلوبی کے ساتھ چھاپے کہ اُس وقت کی زندہ
تاریخ ہیں۔ اگرچہ انہیں دنوں میں ایک دوسری کتاب لاہور سے "یادگار دربار" کے نام سے
مولوی فیروز الدین صاحب نے بھی بڑی کاوش کے بعد نکالی تھی مگر "صحیفۂ زرّیں" کا حجم اُس سے
کہیں بڑا تھا۔ یہ کہنا کہ قدر دانوں نے اس کتاب کی پوری قدر نہیں کی، غلط ہے کیونکہ پچھلے
تجربہ سے اور بھی جرأت حاصل کرنے کے بعد لالہ منوہر لال صاحب بی اے منیجر مطبع نے اسکے
متعلق جو مختصر سی رپورٹ لکھی ہے، نہایت ہی طمانیت بخش ہے۔ "صحیفۂ زرّیں" کی زبان اُردو
تھی، یعنی وہ زبان جو ہندوستان کے بیشتر حصص میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ احاطۂ مدراس
کے لفٹنٹ گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری نے اسکی رسید دیتے وقت یہ لکھا تھا، کہ:۔

”حضور لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر اس کتاب کو دیکھکر نہایت ہی محظوظ ہوئے مگر ان کو یہ افسوس بھی ہوا، کہ یہ ایک ایسی زبان میں ہے جسکو وہ بخوبی نہیں سمجھ سکتے۔ ورنہ اگر وہ اسکو پڑھ سکتے، تو اس سے اور بھی زیادہ لطف اٹھاتے۔ بہرحال وہ کتاب کی پری جمال صورت اور اسکی ظاہر حسن آرائی کے لیئے مالک، مہتمم، ایڈیٹر وغیرہ صاحبان کی محنتِ خاص کا اعتراف کرتے ہیں“

اور کوئی ہوتا تو شاید اس رائے سے اُسکی کمرِ ہمت ٹوٹ جاتی مگر اس واجب الاحترام مطبع نے اس ناکامی کو نپولین کی طرح کامیابی کا زینہ خیال کیا۔ چنانچہ اس بات کو اس نے دل میں رکھا اور اب جو تاجپوشی کا یہ دُوسرا موقع زمانہ نے دکھایا اور دہلی میں شہنشاہی دربار منعقد ہونے کا وقت آیا، تو اس وقت وہ بات بھی سامنے آگئی۔ اب کے پہلے سے بھی کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ اُسی قسم کی ایک دوسری کتاب شائع ہوگی۔ مضامین بھی اُسی رنگ کے ہونگے۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ اسکی زبان انگریزی ہوگی۔ منیجر صاحب نے اسکا نام THE GOLDEN BOOK کے بجائے ایک رہی جامع، اور انگریزی طرز کا نام تجویز کیا ہے یعنی WHO'S WHO یہ نام عموماً ان کتابوں کے ہوتے ہیں، جو ہر سال مشاہیر و نبرد آزمایان روزگار کے حالات میں لکھی جاتی ہیں۔ انمیں کسی خاص قوم یا جماعت کی تخصیص نہیں ہوتی نہ یہ تذکرۂ اولیار کی مانند ایک خاص فرقہ اولیائے کرام کیساتھ علاقہ رکھتی ہے۔ نہ رئیسان نامدار کے حالات سے مخصوص ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں ہر قسم کے ہنرور، پیشہ ور، مشہور اہلِ سیف و قلم، صنّاع، کاریگر وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں ”صحیفۂ زرّیں“ کا یہ انگریزی ایڈیشن اس مبارک عہد جارج پنجم کے آغازِ حکومت کی نہایت ہی عمدہ یادگار ہوگی۔

سنٹرل ہند و کالج گرلز اسکول بنارس	جس ملک کی بہبودی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، اسمیں تعلیم نسواں کا خاص خیال ہوتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بنارس ایسے

مقدس شہر میں بھی ایک لڑکیوں کا اسکول قائم ہے، جسکی رپورٹ بابت سالگذشتہ اسوقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ سالِ زیر رپورٹ (یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء لغایت اخیر ستمبر ۱۹۱۰ء) میں اس مدرسہ میں بہ تفصیل ذیل ۱۶۸ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔

برہمن ۹۷	کھتری ۴۴	} میزانکل ۱۶۸
اگروال ۲۳	دیگر اقوام ۴	

بمقابلہ سال گزشتہ طالبات کی تعداد میں ۱۸ کا اضافہ رہا، اور اوسط حاضری ۱۴۵ رہی

اِس اسکول میں یہ خاص انتظام کیا گیا ہے کہ قبل اس کے کہ بچوں کو یہاں کی رہائش کے قابل بنایا جائے۔ انھیں ایک سال تک ابتدائی حصّہ میں رکھا جاتا ہے بعد ازاں وہ جماعت بندی کے ساتھ سال بہ سال ترقی کرتے ہیں چونکہ ۱۰ جماعتوں کی دو مختلف زبانوں میں تعلیم ہوتی ہے، اس لیئے وقت کا ایک خاص حصّہ صرف ہوتا ہے۔ تین ہندی سکھانیوالی، چار بنگالی پڑھانیوالی، اور چھ مدرسۃ المعلمین کے لیئے تیار ہوتی ہیں۔ دونوں یورپین لیڈیاں اعلیٰ جماعتوں کو حساب، انگریزی، نقاشی اور کشیدہ کاری سکھاتی ہیں۔ آنریری اسسٹنٹ سکرٹری کا کام مسٹر مسنجی داراد صاحب کی اہلیہ محترمہ نے اپنے ذمہ لیا ہے، جو علاوہ کارِ مفوضہ کے لڑکیوں کی خاص معاونت فرماتی ہیں لڑکیوں میں تین بیوگان بھی ہیں جنکی اس قسم کی تعلیم ہو رہی ہے کہ بعد میں دنی درجہ کی استانیوں کا کام انجام دے سکیں۔ آج کل مدرسۃ المعلمین کے معلموں کی بڑی ضرورت ہے۔ بہت سی نیک نہاد اور خدا کی پاک مخلوق نے اپنی خدمات پرنسپل صاحبہ کے زیر اہتمام کر رکھی ہیں، ابرج موہن صاحب اخلاقی، مذہبی اور سنسکرت کی تعلیم دیتے ہیں۔ سب لڑکیوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ بڑی لڑکیوں کو حساب خانہ داری، جغرافیہ۔ تاریخ ڈرائنگ، نقّاشی، مٹی کے کھلونے وغیرہ بنانا۔ سوزن کاری۔ قطع و برید اور کشیدہ کاری بھی سکھائی جاتی ہے۔ چونکہ اب لوگ انگریزی تعلیم کے زیادہ خواہاں ہیں، اس لیئے بڑی لڑکیوں کو اس سے بھی محروم نہیں رکھا جاتا۔ جو لڑکیاں انٹرنس کی تیاری کر رہی ہیں، اُنھیں مس پامر صاحبہ الجبرا اور اقلیدس سکھاتی ہیں۔ مس آرنیڈیل کی عنایت سے لڑکیاں پھول پتّیاں اس خوش اسلوبی سے بناتی ہیں کہ اصل اور نقل میں فرق معلوم نہیں ہوتا۔ لڑکیاں اپنی کرتیاں خود اچھی طرح بنا لیتی ہیں۔ جو رومال لیڈی منٹو صاحبہ کو اس مدرسہ کے معائنہ کے وقت پیش کیا گیا تھا وہ انھیں لڑکیوں کا بنایا ہوا تھا۔ اب اس ہندو کالج گرلز اسکول کی طرف سے مدد کیلیئے عام طور پر چندہ کی درخواست کی گئی ہے۔ چونکہ یہ ایک نیک کام ہے اس لیئے پبلک سے امید قوی ہے کہ اسکی معاونت میں کوتاہی نکریگی۔

اطلاع۔ گذشتہ جلد کی فہرست مضامین اور انڈکس اس نمبر کے ساتھ ارسال ہوگی

تصریح تصاویر

اِس ماہ کی رنگین تصویر ایک جاپانی مصور کے کمال کا نمونہ ہے - ہجراں نصیبی کا جو عالم اس تصویر میں دکھایا گیا ہے' وہ نہایت موثر ہے - ہمارے کرمفرما منشی کندن لال صاحب شرر (سہارنپوری) نے اپنی دلکش نظم میں اسی تصویر کا خاکہ کھینچا ہے - گذشتہ نمبر میں جو تصویر "یکش" کی شائع ہوئی ہے وہ ایک بنگالی مصور کی کھینچی ہوئی تھی' جسمیں ہندوستان کے قدیم فن تصویر اور جاپانی فن تصویر کا تتبع کیا گیا ہے *

"رادھا اور کرشن" کی جو تصویر اس نمبر میں شائع کی جاتی ہے' وہ ایک پرانی رنگین تصویر کے فوٹو سے تیار کیگئی ہے- تاڈ راجستھان میں بھی اسی سے ملتی جلتی ایک تصویر درج ہے - اس تصویر کا طبعی منظر بہت دلکش ہے - اس میں کرشن کو گوپال کی صورت میں دکھایا ہے - رادھا کے عقب میں جو لڑکی کھڑی ہے' وہ اُن کی ہم جلیس ہے - اصل تصویر لفٹنٹ امر سنگھہ صاحب سکنہ مہو (Mhow) کے پاس موجود ہے *

"دولھن کی سہیلیاں" بمبئی کے مشہور و معروف مصور' مسٹر دھرندھر' کے زور قلم کا نتیجہ ہے - بمبئی میں بنیوں کی ایک قوم ہے جسکا نام "پربھو" ہے - سوداگری میں یہہ لوگ بہت بڑھے ہوئے ہیں اور امارت کے لحاظ سے بھی یہہ قوم نہایت وقیع ہے - اِن کے یہاں قاعدہ ہے کہ لڑکی کی شادی ہوچکنے کے بعد دولھن کی سہیلیاں اُسکو مبارکباد دینے کے لئے جمع ہوتی ہیں- اس تصویر میں یہی منظر دکھایا گیا ہے - "پربھو" قوم میں تعلیم نسواں کی خوب ترقی ہے - ان کے یہاں کی عورتیں اچھی پڑھی لکھی اور دستکاری میں یکتا ہوتی ہیں' بلکہ ان باتوں کے لحاظ سے وہ اپنے صوبہ میں اول شمار ہوتی ہیں - اس تصویر کی دلکشی اور جامعیت کا بیان مشکل ہے - ناگپور کی نمایش میں یہہ تصویر بیحد داد حاصل کرچکی ہے *

"رقص" والی تصویر ہندوستان کے فن تصویر کا ایک بہترین نمونہ ہے- الہآباد کی نمایش میں یہہ تصویر بھی رکھی گئی تھی - مبصرین فن تصویر کے خیال میں یہہ تصویر لا جواب ہے *

اگرچہ جون نمبر میں ہم اعلی حضرت شہنشاہ جارج پنجم دام ملکہ و علیا حضرت ملکہ معظمہ میری دام اقبالہا کی دلکش فوٹو شائع کرچکے ہیں' مگر اس دفعہ ایک اور تصویر شائع کی جاتی ہے - یہہ ایک تازہ تصویر کی نقل ہے' اور اُمید ہے کہ ناظرین اسے زیادہ دلچسپی کے ساتھہ ملاحظہ فرمائیں گے *

"سامان تاجپوشی" کی تصویر میں وہ سب چیزیں دکھائی گئی ہیں جو حضور ملک معظم و ملکہ معظمہ کی تاجپوشی کے وقت پر اِستعمال میں آئی تھیں - اسمیں زیادہ تر وہ چیزیں شامل ہیں جن کے لئے اردو زبان میں کوئی لفظ نہیں ہے - لہذا مناسب سمجھا گیا کہ ان کی تصریح انگریزی زبان ہی میں کردی جائے - صفحہ آیندہ پر ان کی کیفیت ملاحظہ فرمائیں *

اس نمبر میں دو قلمی قطعے بھی درج کئے جاتے ہیں - انمیں سے اول قطعہ تو اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ وہ آخری شاہ مغلیہ کا نمونۂ تحریر ہے' اور دوسرا اس لحاظ سے کہ وہ خواجہ میر علی تبریزی کا نمونۂ تحریر ہے جو خوشنویسی میں فرد سمجھے جاتے تھے - قریب چار سو برس گذرے کہ میر علی نے یہہ قطعہ لکھکر بابر شاہ کے حضور میں پیش کیا تھا *

توسیع اشاعت — ذیل کے علمدوست اصحاب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے اس ماہ میں ادیب کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لی ہے اور اپنے احباب کو اسکی خریداری پر مائل کیا ہے :—

(۱) مولوی تدبیرالدین احمد صاحب
(۲) ڈاکٹر ٹی' ریمل صاحب اعلیف
(۳) پادری حاکم جان صاحب
(۴) مولوی محمد قاسم صاحب
(۵) مولوی عبدالکبیر خاں صاحب' سب اِنسپکٹر
(۶) سید غلام مصطفی باوا میاں صاحب
(۷) منشی مغیث‌الدین صاحب نانطی
(۸) منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی
(۹) منشی کاظم حسین صاحب فارسٹ رینجر
(۱۰) حاجی عنایت‌اللہ صاحب

سامان تاجپوشي

THE ROYAL REGALIA

used at the Coronation Ceremony of KING GEORGE and QUEEN MARY.

1. The Imperial Crown. It contains 227 pearls, 2,785 diamonds, 5 rubies, 17 sapphires and 10 emeralds, besides the great South African diamond. Many of these priceless stones have a romantic history. The Black Prince's Ruby in the cross immediately above the Star of South Africa was presented by Don Pedro the Cruel to the Black Prince, and was worn by Henry Fifth at Agincourt in the helmet, which may still be seen over his tomb in Westminster Abbey. In the Cross at the top of the Crown is the miraculous sapphire from Edward the Confessor's ring.
2. The Orb, a masterpiece of the jeweller's art, dating from 1662, copied from the orb of the Saxon Kings, and is symbolic of World Sovereignty, over which rises the cross of Christ.
3. St. Edward's Crown, with which the actual Ceremony of Coronation is performed. Copied in 1662 from the ancient Crown destroyed by Cromwell. This Crown is only worn once during the life of each sovereign, then only for a few minutes.
4. The Ampulla, to contain the Anointing Oil, and
5. the Anointing Spoon are the only remains of ancient regalia which escaped destruction in 1649.
6. The Sword of State, emblem of punishment to evil-doers.
7. The Curtana, or Sword of Mercy with blunt edges.
8. St. George's Spurs, emblem of the King as the fount of all Knightly virtues, and first Soldier in the land.
9. The Sword of Temporal Justice.
10. The Sword of Spiritual Justice.
11. The Royal Sceptre, containing the Larger Pear Shaped "Star of Africa," the largest diamond in the world.
12. The Queen's Sceptre with Cross.
13. The Dove Sceptre, emblem of the King at peace with his subjects.
14. The Ivory Sceptre.
15. The Sword of Offering.
16. St. Edward's Staff, an emblem to guide the King in the footsteps of his canonised predecessor, St. Edward the Confessor.

17-18. The Maces of the Serjeants-at Arms.

اُتّر اور برھن نلا

انڈین پریس الہ آباد

ستمبر ۱۹۱۱ء

جلد ۴ — نمبر ۳

تقسیمِ علمِ ادب

۱۔ تعریف علم ادب ادب وہ علم ہے جس میں بلحاظ ادا رلفظ اور اُسکے معنے کے بحث کی جاتی ہو، اس کی تقسیم، دفعات وتشریحات ذیل سے واضح ہوتی ہے:۔

۲۔ اشجار علم ادب چونکہ علم ادب وسیع علم ہے، اس کے ذیلی علوم اور اس ہی طرح اسکی کیفیت تقسیم، واستحضار اقسام میں طلبا علم کو دقت رہا کرتی تھی، لہذا اشجار ذیل بغرض سہولت بصیرت قایم کیئے گئے:۔

(۱)۔ شجرہ اوّل:

- علم ادب (دفعہ ۱ و ۳ و ۴)
  - بلحاظ ادا رلفظ (دفعہ ۶)
    - تقریر (دفعہ ۷ و ۸)
    - تحریر (دفعہ ۷ و ۹)
    - فصاحت کلمہ (دفعہ ۳۲)
  - بلحاظ معنی لفظ (دفعہ ۶ و ۲۸)
    - موضوع (دفعہ ۲۹ و ۳۱)
    - مہمل (دفعہ ۳۰)
    - فصاحت کلام (دفعہ ۳۳ و ۳۴)

(۲)۔ شجرۂ دوم

- تقریر (دفعہ ۱۰)
  - تجوید (دفعہ ۱۰ و ۱۱)
  - وقف (دفعہ ۱۲ و ۱۳)

(۳)۔ شجرۂ سوم

- تحریر (دفعہ ۷ و ۹ و ۱۳)
  - بلحاظ قامت (دفعہ ۱۴)
    - جلی (دفعہ ۱۵)
    - خفی (دفعہ ۱۶)
  - بلحاظ نوعیت (دفعہ ۱۷)
    - مفردات (دفعہ ۱۸)
    - مرکبات (دفعہ ۱۹ و ۲۱)
      - نسخ (دفعہ ۲۲)
      - نستعلیق (دفعہ ۲۴)
      - گلزار = ریحان (دفعہ ۲۵)
      - طغریٰ (دفعہ ۲۶)
      - شکستہ = دیوان (دفعہ ۲۷)

(۴)۔ شجرۂ چہارم

فصاحت کلمہ
دفعہ ۳۲ و ۳۴

- علم لغت — دفعہ ۳۵ و ۳۷
  - جامد — دفعہ ۳۸
  - مشتق — دفعہ ۳۹ و ۴۰
- علم صرف — دفعہ ۳۶ و ۴۱
  - صیغہ — دفعہ ۴۲
  - خواص باب — دفعہ ۴۳

- تطابق اَلسِنَہ — دفعہ ۴۰
- لسان واحد — دفعہ ۴۰

(۵)۔ شجرۂ پنجم

فصاحت کلام
دفعہ ۳۳ و ۳۴ و ۴۴

- بلاغت — دفعہ ۴۵ و ۴۸
  - معانی — دفعہ ۴۹
  - بیان — دفعہ ۵۱
  - بدیع — دفعہ ۵۲
- ترتیب — دفعہ ۴۶
  - نحو — دفعہ ۵۳
- وزن کلام — دفعہ ۴۷
  - عروض — دفعہ ۵۴
  - قافیہ — دفعہ ۵۸

۳۔ اختلافات علماء جار اللہ زمخشری، جن کا زمانہ حیات ۱۰۷۴ء تا ۱۱۴۲ء مطابق ۴۶۷ھ تا ۵۳۸ھ ہے، اور ابو یعقوب یوسف ابی بکر سکاکی معروف بہ سراج الدین خوارزمی، جن کا زمانہ حیات ۱۱۶۰ء تا ۱۲۲۹ء مطابق ۵۵۵ھ تا ۶۲۶ھ ہے، اور علاوہ اُن کے دیگر علماء نے اپنے تصانیف میں علم ادب کے مختلف اقسام بیان کئے ہیں، کسی نے اس میں کے بعض علوم کے لئے مستقل موضوع اور غایۃ قرار دے کر نصاب علوم ادبیہ بارہ تک پہنچایا ہے، اور کسی نے اُن سے جداگانہ بحث کی ہے، تاہم اُن کا قرار دادہ نصاب قابلِ غور ہے، اور تقسیم مذکور الصدر میں حسب ذیل دس علوم ادب مناسب معلوم ہوتے ہیں:۔

(۱) تجوید (۲) وقف (۳) تحریر (۴) لغت (۵) صرف۔ (۶) تَطَابُقِ اَلْسِنَہْ۔ (۷) بلاغت (۸) نحو۔ (۹) عَرُوض (۱۰) قافیہ۔

۴۔ تقسیم مجوزہ اشجار مندرجۂ دفعہ ۲ سے واضح ہے کہ وہ علم ادب کی تمام شاخوں پر حاوی ہیں۔

۵۔ تعریفات اقسام جسطرح علماء کا اُسکی تقسیم معرض اختلاف بن گئی تھی اس ہی طرح اُس کی تعریفات اقسام میں بھی جا بجا اُن کا اختلاف پایا جاتا تھا، لہذا بشمول بیان کیفیتِ تقسیم، ذیل کے دفعاتِ تعریف میں وہ ہی اختلاف حسب ذیل رفع کیا گیا، جب کسی اِصطلاح سے بحث کی جائے تو مصنف کے معنوں پر لحاظ رکھنا چاہئے، عام مسئلہ ہے کہ "لَا مُشَارَکَۃَ فِی الْاِصْطِلَاحِ"، جب کوئی اصطلاح ایک معنے میں استعمال کی جائے، اور اس ہی اصطلاح کو دوسرا مصنّف مختلف معانی میں استعمال کرے، تو اُنکو مختلف اصطلاحات سمجھنا چاہئے، ورنہ قیاسات میں حد اوسط کے تکرار نہ ہونے سے مغالطہ کا اندیشہ ہے۔

۶۔ ابتدائی تقسیم چونکہ علم ادب میں الفاظ و معانی دونوں سے بحث کی جاتی ہے، اس لئے اُسکی تقسیم اوّلاً بلحاظ ادار لفظ اور ثانیاً بلحاظ معنی لفظ کی گئی۔

۷۔ ادار لفظ تقسیم بلحاظ ادار لفظ کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:۔

(۱) تقریر۔　　　(۲) تحریر۔

۸۔ تعریف تقریر۔ تقریر اُس کو کہتے ہیں جس میں بلحاظ ادار، الفاظ کی کیفیت و نوعیت اور ترتیب سے بحث کی جاتی ہو، مثلاً ؎

سَأَلْتُ الْعِلْمَ مَنْ اَحْیَاکَ حَقًّا
فَقَالَ الْعِلْمُ شَمْسُ الدِّیْنِ یَحْیٰی

یعنی میں نے علم سے پوچھا کہ تیری حیات کی ٹھیک پرورش کس نے کی؟ تو علم نے کہا کہ میرے سچّے زندہ رکھنے والے شمس الدین یحیٰی ہیں۔ مولوی شمس الدین یحیٰی صاحب فیض آباد کے قریب اجودھیا کے رہنے والے تھے، اور ملکِ اودھ اس ہی اجودھیا کے

کے نام سے مشہور ہے، جو زمانۂ قدیم میں اودھ کا دارالسلطنت تھا، اور اس ہی وجہ سے وہ شمس الدین یحیٰی اودھی سے شہرۂ آفاق ہیں، بڑے محدث تھے، علم و فضل اُنکا مسلم الثبوت ہے، سلطان غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت میں گذرے ہیں، حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور بڑے معتقدین میں سے تھے، شاگرد رشید جناب مولانا ظہیر الدین بھکری رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، شیخ نصیر چراغ دہلوی نے آپ کی مدح میں شعر مذکور الصدر کہا ہے۔

۹۔ تعریف تحریر تحریر اُس کو کہتے ہیں جس میں الفاظ کے قلمبند ہونے سے بحث کی جاتی ہو، دیکھو مثال دفعہ ۸ بلحاظ کتابت۔

۱۰۔ تقسیم تقریر تقریر کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:۔

(۱) تجوید۔ (۲) وقف۔

۱۱۔ تعریف تجوید تجوید اُس کو کہتے ہیں جس میں ترتیل و حقوق حروف بغیر تکلف و افراط و تفریط کے اپنے اپنے مخارج میں نہایت لطافت اور کمال خوبی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہوں مثلاً حروف حلقی، وسطی، شفتی کو بکمالِ امتیازِ مخارج بلا استعلاء و استفلاء و بلا تصنع بقانون مقتضائے طبائع حروف ادا کرنا۔

۱۲۔ تعریف وقف وقف کے لغوی معنی رُکنے اور ٹھہرنے کے ہیں، اور باصطلاح قُرّاء نطق کو کسی لفظ کے حرفِ اخیر پر قطع کرنے کو کہتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وقف میں ہمیشہ لفظ کا حرف اخیر ساکن ہوتا ہے، بتفصیل دیکھو رسالہ اوقاف عبارت میں، مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں دال مرفوع ہے، اور بحالت وقف ساکن ہو گئی۔

۱۳۔ تقسیم تحریر تحریر کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:۔

(۱) بلحاظ قامت (۲) بلحاظ نوعیت

۱۴۔ تشریح قامت تحریر بلحاظ قامت کے یہ معنی ہیں کہ کاتب الحروف کے طرز تحریر سے حروف کی ہیئت کذائی اور مقدار معلوم ہو، اور اس لحاظ سے اُس کے حسب ذیل دو اقسام ہیں:۔

(۱) جلی۔ (۲) خفی۔

۱۵۔ تعریف جلی جلی لغت میں ظاہر اور روشن اور واضح کو کہتے ہیں لیکن حقیقت میں کسی چیز کا جلی اور خفی ہونا امورِ اضافیہ میں سے ہے، ایک چیز بہ نسبت دوسرے کے جلی اور بہ نسبت تیسرے کے خفی ہوتی ہے، اس بنا پر کسی خاص اندازہ کا مقتضی نہیں لیکن کاتبین اپنی اصطلاح میں روزمرّہ کے معمولی تحریراتِ دفاتر و مراسلات کی مقدارِ تحریر سے بڑھکر کو جلی کہتے ہیں مثلاً مضمون ہذا کے دفعات خط جلی میں اور اُن کا خلاصہ خط خفی میں ہے۔

۱۶ تعریف خفی خفی لغت میں بمعنی پوشیدہ ہے، لیکن اصطلاح کاتبین میں خط خفی کے یہ معنی نہیں کہ کسی صحیح البصر کی بصارت سے مخفی ہو، بلکہ مراد اُس سے وہ کتابت ہے جو مقابل جلی ہے، جس کا ذکر دفعہ مذکور الصدر میں ہوا ہے۔

۱۷ نوعیت تحریر تحریر بلحاظ نوعیت کے یہ معنی ہیں کہ بہ نظر اپنی ذاتی قابلیتِ انقسام کے، تحریر کتنے اقسام کی گنجائش رکھتی ہے، بر بنا اس لحاظ کے وہ حسب ذیل دو اقسام پر منقسم ہو سکتی ہے:۔

(۱) مفردات (۲) مرکبات

۱۸ تعریف مفردات تحریر مفردات اس کو کہتے ہیں جو حروف تہجّی اپنے اصلی اختراع کے موافق ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کتابت میں آجائیں، مثلاً صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ، نصیحت والے قرآن کی قسم، دیکھو سورۂ ص نمبر ۳۸ نمبر آیۃ ۱/۴۹، یہاں ص مفرد اور باقی الفاظ مرکب لکھے جاتے ہیں۔

۱۹ تعریف مرکبات تحریر مرکبات اس کو کہتے ہیں جو حروف تہجّی ایک دوسرے سے بمقتضائے مقام ملا کر لکھے جائیں مثلاً دیکھو

مثال وغیرہ ۱۸۔

۲۰ طرز قدیم مرکبات الفاظ بذریعہ مرکبات کے بغرض کفایت وقت لکھے جاتے ہیں، مبتدیوں کے واسطے مفردات لکھکر اعراب دینا باعث سہولت ہوتا ہے، لیکن فی زمانہ یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا، مثلاً آیۂ مذکور الصدر اگر بحروف مفردات تحریر کریں تو حسب ذیل قلمبند ہوگی، اور مبتدیوں کو اس کی تہجی اور قرأت میں سہولت ہوگی:۔

صٓ وَالْ قُ رْ اٰنِ ذِی الْ ذِّ کْ رِ

توضیح۔ جب لام کے تحت میں نقطہ ہو، تو اس سے مقصود صفر ہے، یعنے لام ساکت ہے، مثلاً حروف قمری میں الف لام میں لام قرأت میں آتا ہے، حروف شمسی میں وہ ساکت رہتا ہے، دیکھو بحث الف لام۔

۲۱ تقسیم مرکبات تحریر مرکبات کے حسب ذیل پانچ ۵ اقسام ہیں:۔
(۱) نسخ (۲) نستعلیق (۳) گلزار، ریحان (۴) طغرا (۵) شکستہ، دیوانی

۲۲ تعریف نسخ کلام عرب میں نسخ بمعنی تحریر ہے، اور نسخہ بھی اس ہی سے مشتق ہے، اور نسخ اسکی جمع ہے، مثلاً یہ قول خدا "ھٰذَا کِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْکُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" یہ ہماری کتاب ہے، تمہارے مقابلہ میں حق بول رہی ہے، تم جو کرتے ہو، ہم انکو لکھواتے جاتے ہیں، دیکھو سورہ جاثیہ نمبر ۴۵ نمبر آیہ ۲۸
خط نسخ کی شباہت حسب ذیل ہے۔

ب۱۔ اب ج دد۔

ب۲۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

۲۳ ایجاد نسخ خط نستعلیق عموماً فارس میں مستعمل ہوتا تھا عرب نے عبارت عربی کو ممیز کرنے کے واسطے خط نسخ میں لکھنا شروع کیا، تاکہ تحریر فارسی اور عربی میں محض بربنا مشابہت امتیاز ہوسکے۔

۲۴ تعریف نستعلیق نستعلیق، الفاظ، نسخ و تعلیق سے مرکب ہے، نسخ بمعنی لکھنے، اور تعلیق بمعنی لٹکانے کے ہے، مراد اُس سے سنبھال کر لکھنا ہے، خط نسخ میں اسقدر نوک اور پلک نہیں ہوتی ہیں۔ جس قدر خط نستعلیق میں ہوتی ہیں۔ اور اس ہی وجہ سے نستعلیق لکھنے میں بہ نسبت خط نسخ کے زیادہ دیر لگتی ہے، خط نستعلیق کی شباہت حسب ذیل ہے:۔

ب۱۔ اب ج در۔

ب۲۔ خدایا جہاں پادشاہی تراست ز ما خدمت آید خدائی تراست

۲۵ خط گلزار خط خواہ نسخ ہو یا نستعلیق، جب اُس میں بیل بوٹے بھر دیئے جائیں، تو اس کو خط گلزار کہتے ہیں، گلزار بمعنی پھولوں کی جگہ کے ہے، یہ لفظ فارسی ہے، عربی میں لفظ ریحان بمعنی بالنگو کے ہے۔ اور جس خط میں پھول اور بوٹے وضع کئے جائیں اُسکو خط ریحان کہتے ہیں۔

الله
خط گلزار

۲۶ خط طغرا طغرا بالضمہ طا، ایک پرند کا نام ہے جسکی ہم شکل خط طغرا لکھا جاتا ہے، اور یہ عموماً پروں کے مشابہ ہوتا ہے، اور لفظ طغرا بمعنی مخلوط ہے، چونکہ اس خط میں بھی حروف کلمات مخلوط رہتے ہیں اس ہی وجہ سے اسکو طغرا کہتے ہیں، یہ ایک پیچیدہ خط ہے، جسکو سلاطین اکثر اپنے فرامین میں استعمال کرتے ہیں، سلطان روم اور امیر کابل اپنے فرامین اور سکک میں ابتک استعمال کرتے ہیں۔

خط طغرا

۲۷ خط شکستہ خط شکستہ اکثر دفاتر میں مستعمل ہے، اور محررین اُسکو بوجہ تعجیل کام میں لائے ہیں، شکستہ بمعنی ٹوٹے ہوئے کے ہیں اور اسکے حروف اسطرح ٹوٹے ہوتے ہیں کہ بلا مہارت کامل کے اُن کا پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔

بنام جہاندار جاں آفرین
خط شکستہ

۲۸ تقسیم بلحاظ معنی لفظ چونکہ بعض الفاظ واضع کی

طرف سے معانی کے لیئے موضوع ہوتے ہیں، اور بعض بلا وضع واضع، اور بلا معنی ہوا کرتے ہیں؛ اس لیئے لفظ کے بلحاظ معنی حسب ذیل دو اقسام قرار دئیے گئے:۔ (۱) موضوع ۔ (۲) مہمل۔

۲۹۔ تعریف لفظ موضوع | لفظ موضوع اس کو کہتے ہیں جو کسی خاص معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ مثلاً رَبٌّ۔ باعتبار وضع لغوی بمعنی پروردگار مستعمل ہے۔

۳۰۔ تعریف مہمل | لفظِ مہمل اس کو کہتے ہیں جو واضع سے کسی معنی کے لئے موضوع نہو۔ مثلاً روٹی ووٹی؛ یہاں ووٹی تابع مہمل لفظ روٹی کا ہے؛ ورنہ لفظ ووٹی کے بنفسہٖ کچھ معنی نہیں ہیں؛ اس قسم کے توابع مہمل اکثر زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔

۳۱۔ تقسیم لفظ موضوع | لفظ موضوع کلمہ اور کلام دونوں پر حاوی ہے؛ بنظر استعمال فصاحت بھی دونوں میں پائی جاتی ہے؛ لہٰذا اسکی تقسیم حسب ذیل دو اقسام پر کی گئی ہے:۔

(۱) فصاحت کلمہ ۔ (۲) فصاحت کلام۔

۳۲۔ تعریف فصاحت کلمہ | فصاحت کلمہ اس کو کہتے ہیں جس میں تنافرِ حروف اور غرابت و مخالفت قیاس لغوی نہو؛ مثلاً اللّٰہ۔

۳۳۔ تعریف فصاحت کلام | فصاحت کلام اس کو کہتے ہیں جسمیں تنافرِ کلمات اور ضعفِ تالیف اور تعقید نہو مثلاً اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا = بیشک یہ لوگ بھی داؤ چل رہے ہیں؛ اور ہم بھی داؤ چل رہے ہیں۔ دیکھو سورۂ طارق نمبر ۸۶ نمبر آیۃ $\frac{15}{\text{۵۹۵۱}}$ و $\frac{16}{\text{۵۹۵۲}}$

۳۴۔ تقسیم فصاحت کلمہ | فصاحت کلمہ حسب ذیل دو علوم کو متناول ہے۔ (۱) علم لغت (۲) علم صرف۔

۳۵۔ تعریف علم لغت | علم لغت اس کو کہتے ہیں جس میں لفظ کے جوہر اور مادہ سے بحث کی جاتی ہو۔ مثلاً دیکھو دفعہ ۲۶

۳۶۔ تعریف علم صرف | علم صرف اس کو کہتے ہیں جس میں ہیئت لفظ سے بحث کی جاتی ہو۔ مثلاً يَضْرِبُ فعل معروف میں 'یَ' مفتوح اور 'ض' ساکن اور 'رِ' مکسور اور 'بُ' مضموم ہونا چاہیئے۔

۳۷۔ تقسیم لغت | بلحاظ تجویز عقلی لغت میں حسب ذیل دو اقسام کی گنجائش ہے۔ (۱) جامد (۲) مشتق۔

۳۸۔ تعریف جامد | جامد اس لفظ موضوع کو کہتے ہیں جو نہ کسی لفظ سے مشتق ہو، اور نہ اُس سے کوئی لفظ مشتق ہو مثلاً رَجُلٌ = مرد۔

۳۹۔ تعریف مشتق | مشتق اس لفظ موضوع کو کہتے ہیں جس سے مختلف صیغے بن سکتے ہوں۔ مثلاً قول بمعنی کہنے کے ہے؛ اور قائل اور مقولہ اسی سے مشتق ہیں۔

۴۰۔ تقسیم مشتق | مشتق کا وسیع دائرہ قائل اور مقولہ کو اپنا مرکز قرار دے کر لسان واحد کیا بلکہ تطابق اَلسنہ پر جا کر محیط ہو جاتا ہے:۔ تماثیل

۱ ۔ یَاھُوْ اولیاء اللہ کے نزدیک اسماء اللہ میں سے ہے؛ عبرانی میں بھی یہ اللہ کا نام ہے؛ اور وہ اس وجہ سے کہ یہود میں اللہ کا نام لینا خلاف ادب خیال کیا جاتا تھا؛ بجائے اُس کے 'یَاھُوْ' استعمال کیا کرتے تھے، توریت میں اُس کو جَھُوَا۔ یَاھُوْ سے تعبیر کیا ہے، 'جَ' کا 'ی' سے تبادلہ علم تطابق اَلسنہ سے واضح ہوتا ہے؛ مثلاً اجودھیا = ایودھیا؛ جوگ = یوگ؛ 'ی'، حرفِ علت ہے، جب اسکو واضح کرنا ہوتا ہے، تو ج سے بدل دیتے ہیں؛ اللہ کو منادی کرنے میں بوجہ کثرتِ استعمال یَاھُوْ عبرانی میں نام الٰہی ہو گیا ہے؛ انگریزی میں جہوَوَا (Jehovah) کہتے ہیں۔

۲ ۔ 'مَا'، یا 'اَمَّا'، کو فارسی میں 'مادر' اور انگریزی میں 'مدر'، اور 'ماما'، کہتے ہیں؛ اور سنسکرت میں 'ماتا'، اور عربی میں 'اُمٌّ'، کہتے ہیں۔ یہ تمام الفاظ، ایرانی اور شامی زبانوں کے

مادہ واحد سے ہیں، کیونکہ مولود بعد ولادت شفتین سے اپنی والدہ کو بآسانی پکار سکتا ہے؛ لہٰذا اصطلاحات مذکور الصدر اَلسنۂ مختلفہ میں قریب المخرج ہیں۔ اور یہ مسئلہ علم تطابق اَلسنہ سے بآسانی حل ہوتا ہے۔

۴۱ تقسیم صرف | علم صرف میں حسب ذیل دو امور سے بحث کی جاتی ہے (۱) صیغہ (۲) خواص باب۔

۴۲۔ تعریف صیغہ | صیغہ اُس ہیئت کو کہتے ہیں جو ترکیب حروف اور حرکات سے حاصل ہو۔ مثلاً فتح اور تفتیح؛ فتح بمعنی کھولنے اور کشادہ کرنے کے ہیں۔

۴۳۔ تعریف خواص | اصطلاحات کے خاص ابواب میں جانے سے معنی مخصوص پیدا ہوتے ہیں؛ کون صیغہ کس باب میں جاتا ہے؛ جاکر کیا معنی پیدا کرے گا؛ یہ ہر زبان کے محاورہ پر منحصر ہے؛ مثلاً مفلس کے لفظی معنے متمول اور پیسہ رکھنے والے کے ہیں؛ لیکن باب افعال کا خاصہ بعض صیغوں میں سلب شے کا ہی؛ اس وجہ مفلس وہ شخص ہے جسکے پاس پیسے نہ رہے ہوں۔

۴۴۔ تقسیم فصاحت کلام | حصر عقلی سے فصاحت کلام حسب ذیل تین اقسام میں منحصر ہے۔ (۱) بلاغت (۲) ترتیب (۳) وزن کلام۔

۴۵۔ تعریف بلاغت | بلاغت کے لغوی معنی پہنچنے کے ہیں۔ اور اصطلاح میں اُس علم کو کہتے ہیں جس میں کلام کے مقتضائے حال سے تطبیق اور اس کے وضوح و خفا و تحسین پائی جاتی ہو؛ دیکھو شعر مندرجہ دفعہ ۸۔

۴۶۔ تعریف ترتیب | ترتیب کلام سے علم نحو میں بحث کی جاتی ہے اور اسکی تفصیل دفعہ ۵۳ میں درج ہے۔

۴۷۔ تعریف وزن کلام | وزن کلام اس کو کہتے ہیں جس میں کلام کے موزوں ہونے سے بحث کی جاتی ہو؛ اسکی تفصیل علم عروض اور قافیہ کی بحث میں دفعات ۴۹ تا ۵۸ درج ہے۔

۴۸۔ تقسیم بلاغت | بلاغت کے حسب ذیل تین اقسام ہیں۔ (۱) معانی (۲) بیان۔ (۳) بدیع۔

۴۹۔ تعریف معانی | علم معانی اُسکو کہتے ہیں جسمیں لفظ مقتضائے حال سے مطابق کیا جاتا ہو۔ مثلاً حسب ذیل التفاتات ثلثہ جو علماء علم معانی و علم بیان و علم بدیع کے ہاں منجملہ علوم بلاغت کے انواع بلیغ سمجھے جاتے ہیں۔

ب۔ التفات غیبت سے خطاب کی طرف مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ...... اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ ہر طرح کی تعریف اللہ کو ہے...... ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں؛ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں؛ دیکھو سورۂ فاتحہ نمبر ا نمبر آیہ ا و ۵۔

ت۔ التفات خطاب سے غیبت کی طرف مثلاً هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ الخ۔ اللہ وہ ہی ذات ہے، جو تم کو خشکی اور تری میں لئے پھرتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو، اور وہ سواران کشتی کو باد موافق کے ذریعہ سے لیکر چلتی ہیں؛ اور وہ اُس سے خوش ہوتے ہیں؛ یکایک کشتی کو ایک ہَوا کا جھونکا آلگتا ہے الخ؛ دیکھو سورۂ یونس نمبر ۱۰ نمبر آیہ ۲۲/۱۳۸۶۔

ث۔ التفات غیبت سے تکلم کی طرف مثلاً وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ۔ اور اللہ وہی ذات ہے، جو ہوائیں چلاتا ہے؛ پھر ہوائیں بادل کو ابھارتی ہیں؛ پھر ہم بادل کو مُردہ شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں؛ پھر ہم اُس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مَرے پیچھے زندہ کر دیتے ہیں۔ اس ہی طرح مُردوں کا اُٹھنا بھی ہوگا؛ دیکھو

سورۂ فاطر نمبر ۳۵ نمبر آیہ ۲،۱/۴۳ ۔

۵۰۔ تعلیق مثال | مثال اوّل میں مقتضائے حال، سلسلہ قائم رکھنا چاہئے تھا؛ یعنے جیساکہ ابتدائے فاتحہ بلاخطاب ہے اُس ہی طرح بیان مابعد بلاخطاب ہونا تھا۔ جائز تھا کہ بجائے اِیَّاکَ نَعْبُدُ، اِیَّاہُ نَعْبُدُ، اور بجائے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، اِیَّاہُ نَسْتَعِیْنُ۔ ہوتا؛ لیکن بلحاظ قواعد بلاغت جن فوائد کا یہ خلاف مقتضائے حال فقرہ، مخزن تھا، سچ تو یہ ہے کہ اِیَّاہُ نَعْبُدُ اُن سے یک لخت بے بہرہ تھا؛ دیکھو کتب علم معانی؛ علم معانی کا یہی فرض ہے کہ بحر بے پایان کتاب سماوی کے اس قسم دُرِ ناسفتہ فوائد سے ہمارے روحانی افلاس کو دور کرے؛ علیٰ ہذا القیاس دیکھو مثال ثانی و ثالث المتفاتات آخر الذکر۔

۵۱۔ علم بیان | علم بیان اس کو کہتے ہیں جسمیں کلام کے وضوح وخفاء معنی میں مختلف تعبیرات سے بحث کی جاتی ہو؛ یہی اعتبارات ہیں جن کی وجہ سے کلام میں بلاغت کا حسن ذاتی پیدا ہو جاتا ہے؛ مثلاً یہ قول خدا، وَیُطَافُ عَلَیْهِمْ بِآنِیَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَکْوَابٍ کَانَتْ قَوَارِیْرَا۠ قَوَارِیْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِیْرًا۔ اور شیشیوں پر چاندی کے باسنوں اور شیشے کے آبخوروں کا دور چل رہا ہوگا؛ مگر شیشے ایسے ہوں گے جیسے چاندی کے؛ دیکھو سورۂ دہر نمبر ۷۶، نمبر آیہ ۱۵/۵۵ و ۱۶/۵۶؛ واضح رہے کہ شیشہ کو چاندی کا کہنا محض مقصود اسکی صفائی اور قیمتی ہونا ہے۔

۵۲ تعریف بدیع | بدیع کے لغوی معنی نادر اور عجیب کے ہیں۔ اور اصطلاح میں اس علم کو کہتے ہیں جسمیں کلام کی تزئین اور تحسین اور اُس کے معنی واحد میں صُوَرِ متقابلہ کے جمع ہونے سے بحث کی جاتی ہو۔

تمثیلاً۔ مثا۔ ب۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ج وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۔ ہم خدا کے رنگ میں ہیں؛ اور اس سے رنگ میں کون اچھا ہو سکتا ہے؛ اور ہم اُس ہی کی عبادت کرتے ہیں؛ دیکھو سورۂ بقر نمبر ۲ نمبر آیہ ۱۳۸/۱۴۵ ؛ ۔ ب

بدی را بدی سہل باشد جزا   اگر مردی اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاءَ

دیکھو بوستاں مصنفہ شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ان امثلہ میں وہ الفاظ مذکور ہیں، جو اُن کے غیر کے واسطے موضوع ہیں؛ مثلاً رنگ خدا کا نہیں، مگر اپنے واسطے مستعمل کیا ہے؛ یا مثلاً برائی کے انتقام کو بدی سے تعبیر کیا ہے؛ ان دونوں امثلہ میں مشاکلہ محضہ مستعمل ہے۔

۵۳۔ تعریف نحو | علم نحو اُس کو کہتے ہیں جس میں الفاظ کلام کے باہمی تعلقات سے بحث کی جاتی ہے؛ زبان عربی میں چونکہ آخر کلمہ کے اعراب کی بحث بھی ضرور ہوتی ہے وہ اکثر تعلقات الفاظ پر منحصر ہوتی ہے؛ لہذا اس کا ذکر بھی اس ہی علم میں کیا جاتا ہے؛ مثلاً تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ ۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے؛ یعنی ہلاک ہوگیا؛ دیکھو سورۂ ابولہب نمبر ۱۱۱ نمبر آیہ ۱/۶۲۲، تَبَّتْ فعل ہے، اور یَدَا، اصل میں یَدَانِ تھا؛ لیکن بوجہ مضاف ہونے کے نون اعرابی ساقط ہوگیا ؛ ابولہب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، لیکن مشرف باسلام نہیں ہوا۔ اور وہ اور اُس کی بیوی رسول خدا کو اذیت پہنچاتے تھے؛ اُن کے واسطے یہ سورۃ بطور بددعا کے ہے؛ ابولہب کنیت ہے؛ نام اُس کا عبدالعزیٰ ہے؛ حالت رفع میں ابولہب اور حالت جرّی میں ابی لہب کہتے ہیں؛ ابی لہب مضاف مضاف الیہ ملکے کنیت مضاف الیہ ہے، یدا، کا؛ اور یدا، ابی لہب، مضاف مضاف الیہ ملکر فاعل ہے، فعل تبت کا؛ فعل ساتھ فاعل کے ملکر جملہ فعلیہ ہے اور یہ جملہ فعلیہ دعائیہ ہے؛

اس سے واضح ہے کہ یہ جملہ انشائیہ ہے نہ خبریہ؛ اس قسم کے مباحث سب علم نحو سے متعلق ہیں۔

۵۴۔ تعریف عروض علم عروض اسکو کہتے ہیں جس میں الفاظ کے وزن سے بحث کی جاتی ہو مثلاً یہ قولِ خدا عروض کے بحر وافر میں ہے

وَیُخْزِهِمْ وَیَنْصُرْکُمْ عَلَیْهِمْ وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ

- خدا اُنکو رسوا کرے؛ اور تم کو ان پر غلبہ دے؛ اور مومنین کے سینوں کو تشفی دے، دیکھو سورہ توبہ نمبر ۹ نمبر آیۃ ۱۴

۵۵ بحرِ آیۃ آیۃ کریمہ مذکورۃ الصدر کی بحر حسب ذیل ہے:۔

(۱)۔ مَفَاعِیْلُنْ　مَفَاعَلَتُنْ (سالم)　فَعُوْلُنْ (مقطوف)
مَفَاعِیْلُنْ (معصوب)　مَفَاعِیْلُنْ (معصوب)　فَعُوْلُنْ (مقطوف)

۵۶۔ تقطیع آیۃ تقطیع آیۃ کریمہ مندرجہ دفعہ ۵۴ حسب ذیل ہے:۔

وَیُخْزِ هِمْ	وَیَنْصُرْ کُمْ	عَلَیْهِمْ
مَفَاعِیْلُنْ	مَفَاعَلَتُنْ	فَعُوْلُنْ
وَیَشْفِ صُدُوْ	رَ قَوْمِ مُؤْ	مِنِیْنَ
مَفَاعِیْلُنْ	مَفَاعِیْلُنْ	فَعُوْلُنْ

۵۷ ہدایت جائز نہیں ہے کہ آیہ کریمہ دفعہ ۵۴ بطور راگ کے پڑھی جائے بعض آیات قرآن مجید موزوں ہیں۔ لیکن اُن کی تلاوت خوش الحانی سے کرنا جائز ہے؛ بطور شعر اُنکو نہ پڑھنا چاہئے، جب کلام موزوں ہو تو اس کو اصطلاح میں نظم کہتے ہیں؛ اور جب غیر موزوں ہو تو اُس کو نثر کہتے ہیں۔

۵۸ تعریف قافیہ قافیہ وہ علم ہے، جس میں آخر کلام کے موزوں ہونے سے بحث کیجاتی ہو مثلاً ہے

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِعُرْفٍ کَمَا
اُمِرْتَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِیْنَ
وَلِنْ فِی الْکَلَامِ لِکُلِّ الْاَنَامِ
فَمُسْتَحْسَنٌ مِنْ ذَوِی الْجَاهِ لِیْنٌ

معافی کا شیوہ اختیار کر، اور حسب الامر اچھے کام کی نسبت فرمائش کرتا رہ؛ اور جُہّال سے اعراض کر؛ اور بات چیت میں سب سے نرمی سے پیش آ؛ کیونکہ صاحب مرتبہ کو نرمی پسندیدہ ہے

محمد نظام الدین حسن

قِران السعدین۔ اس کتاب کے مصنف حیدرآباد دکن کے ایک مشہور ہندو، راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغرؔ ہیں۔ راجہ صاحب موصوف ایک علمدوست شخص اور زبانِ اُردو کے زبردست حامیوں میں سے ہیں، اور متعدد علمی کتابوں کے مصنف و مؤلف بھی ہیں۔ ہر ایک زبان میں عموماً اور اُردو میں خصوصاً اشیاء و اسماء کی تذکیر و تانیث کا مسئلہ نہایت مشکل ہے۔ ایک ایسے وسیع اور مخلوط اللسان برّاعظم میں، جیسا کہ ہندوستان ہے، تذکیر و تانیث کے متعلق فرق ہونا، اور غلطیوں کا پھیلنا قدرتی بات ہے۔ راجہ صاحب ممدوح نے اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں زبانِ اُردو کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور کچھ شک نہیں کہ مستند و مسلّم الثبوت ادیبوں اور شاعروں کے کلام سے نظائر و امثال تلاش کرنے، اور اس کتاب کو ترتیب دینے میں، راجہ صاحب نے بہت کچھ محنت و عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ آپ اس کتاب کی تدوین کے لئے خاص طور پر پبلک کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کتاب کی مجموعی ضخامت ۱۶۶ صفحات ہے اور قیمت عصہ؎ شائقین قابل مصنف سے حیدرآباد (دکن) کے پتہ پر طلب فرمائیں۔

Indian Press, Allahabad.

پرنس بسمارک
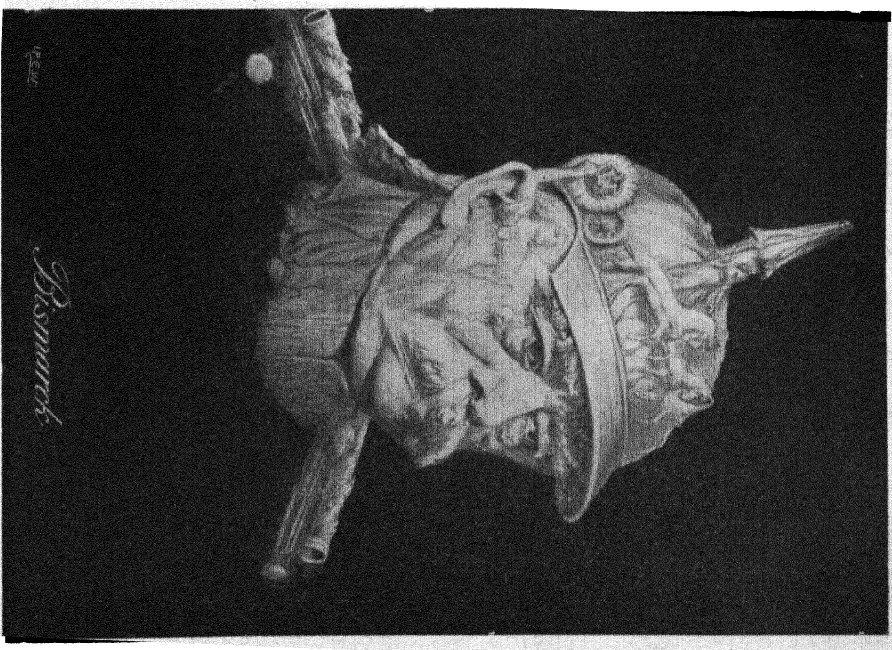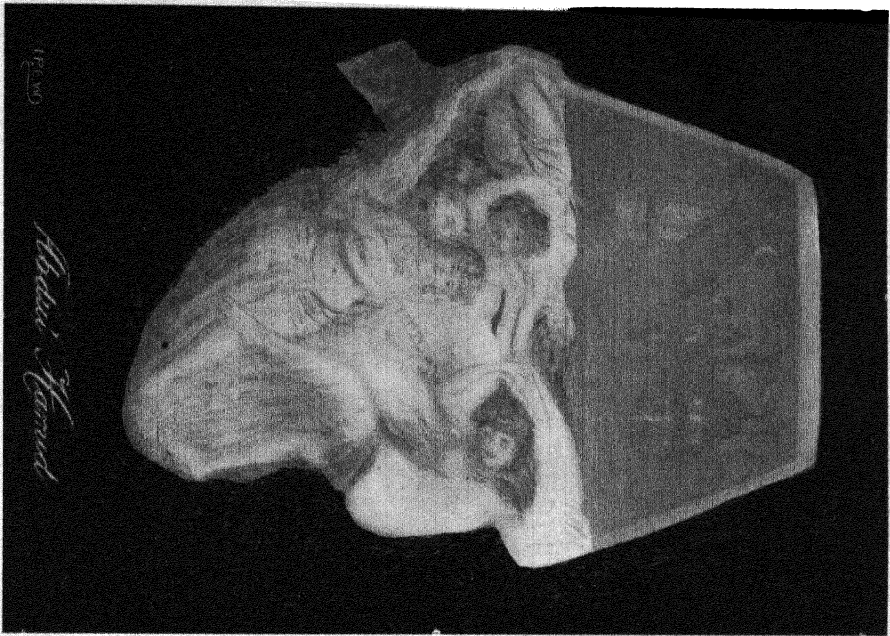
تمدّن

معاشرت، سیاست، اور مذہب

جملہ کائنات میں سب سے اہم وہ شے ہے جو تمام موجودات میں مشترک ہے، اور وہ کسی کے نزدیک وجود مطلق یا روح ہے، کسی کا خیال جوہر و قوت کا طرفدار ہے، اور کوئی مادّہ کا نام لیتا ہے۔ بہرصورت یہ امر مسلم ہے کہ ایک خاص چیز دنیا کی ہر چیز میں پنہاں ہے۔ لیکن مخلوقات کے اقسام اگر علیٰحدہ علیٰحدہ کردیئے جائیں، تو ہر نوع میں کئی چیزیں مشترک ملیں گی۔ مثلاً انسان میں علاوہ اُس خاص شے کے کئی چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو سب انسانوں میں موجود ہیں منجملہ اُن کے تمام بنی آدم کے اجزا ترکیبی وہی ہیں جو ایک انسان کے، مگر ان اجزا کی کمی و بیشی کیوجہ سے یہ متحد الحقیقت ذات اسقدر مختلف الاوصاف ہوگئی ہے کہ آدم اوّل سے اسوقت تک جتنے افراد گزرے ہیں انمیں سے کوئی دو فرد بھی ایسے نہیں ملتے جو آپس میں ہر طرح یکساں ہوں۔

اس اختلاف کا سبب، اجزا ترکیبی کی کمی بیشی اور اس اتحاد کا باعث، اجزا ترکیبی کا وجود ذاتی، پیش نظر رکھ کے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس اتحاد حقیقی و ذاتی اور اس اختلاف فطری و صفاتی کے درمیان کیسے تعلقات ہیں، اور دونوں سے فرداً فرداً کیا کیا منافع ہیں۔

اگر انسان متحد الحقیقت نہوتا تو اُسکا وجود یا اس میں روح یا مادہ یا قوت ایجابی و سلبی یا زندگی یا جان نہ ہوتی، کیونکہ جس شے نے انسان کو متحد رکھا ہے وہ تمام اشیار میں اہم ہے۔ (اگرچہ وہ شے جو نوع انسان میں متحد ہے دوسری چیزوں میں بھی ہو، مگر اسوقت ہم کو سوائے انسان کے اور کسی سے بحث نہیں۔)

اس لحاظ سے مادۂ اتحاد انسان میں مقدم قوی تر اور علت وجود ہے۔

اس کے مقابل میں انسان کی صفت اختلاقی اگر نہوتی تو کم از کم انسان انسانیت سے خارج ہوتا۔ تمام موجودات یعنی موالید ثلاثہ میں نوع انسان کو جو خاص امتیاز حاصل ہے اس کا دار و مدار اسی اختلاف صفاتی پر ہے ورنہ با عتبار ذات سب متحد ہیں خواہ نباتات ہوں یا جمادات۔

کم و بیش اختلاف کا سامان ہر ذرّہ میں موجود ہے مگر اختلافات کی کثرت و عظمت جس شدت سے انسان میں ہے وہ کسی نوع میں نہیں۔ اگر انسان کے ہر فرد کو ایک خاص امتیاز نہوتا تو بہت سے نقصانات ہوتے جو ضرورتا ایک شخص کو ہوتی وہ سب کو ہوتی اور جب وہ ضرورت قابضانہ ہوتی تو سب متصادم ہو جاتے۔ صفات انسانی تو درکنار ذات انسان کا وجود نہ رہتا۔ اگر صورت ہی میں اختلاف نہوتا تو کوئی تعیّن یا کاروبار آپس میں نہو سکتا جیسا کہ حیوانات مطلق میں ہے۔

یہ دونوں اتحاد اور اختلاف فطری ہیں۔ گو اوّل الذکر مقدّم اور قوی ہو مگر جب یہ دونوں اپنی ظرف سے کچھ آگے بڑھتے ہیں تو طرح طرح کے نقصانات کا احتمال ہوتا ہے۔

ان دونوں کی ترقی وتنزلی بھی انھیں دونوں کی مختلف نسبتوں سے واقع ہوتی ہے۔ اختلافات صفاتی کی وجہ سے ہر انسان کا سب لوگوں سے یکساں تعلق نہیں ہے، ہر شخص پر ہر ایک کا وہ اثر ہے جو دوسرے کا اور دوسرے پر نہیں۔ اس لئے بعض کا اتحاد بعض کے ساتھ ترقی کر کے اسدرجہ پر ہوجاتا ہے کہ اُسکا نام محبّت یا عشق رکھنا پڑا، اور جب وہ اوسط درجہ میں ہوتا ہے تو ہمدردی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مگر جب یہ اثر اسکے برعکس ہوتا ہے تو اوّل نفرت پھر عداوت ہوجاتی ہے۔

اس اتحاد و اختلاف کے جزر و مد نے اتنی تعداد اور اس قدر مقدار کے نامتناہی سلسلہ پیدا کردئے ہیں کہ ہر انسان بجائے خود ایک دنیا ہے اور دنیا بھی وہ جو دوسرے عوالم سے متعلق اور ہم معاملہ۔

اِن اختلافات کے اقسام اور ان کے نام تو قلمبند کرنا محال ہے مگر اختلافات کے مخزن اور معدن یہ ہیں۔

طبایع، کیفیات، حالات امزجہ، خیالات، مقاصد، ضروریات، واقعات، رفتار، گفتار، اشکال، تاثیرات، ان سب امور میں سے ہر ایک امر اختلافات کا ایک وسیع اور گنجان جنگل ہے۔ جبتک یہ اختلافات فطرت کے دائرہ میں رہیں اسوقت تک کوئی ذاتی یا صفاتی نقصان متصوّر نہیں، مگر جب اپنے فطری حدود سے تصنعات کی طرف بڑھیں اور ترقی پذیر ہوں تو وہی نقصانات پیدا ہوں گے جو اتحاد ذاتی اور اختلاف صفاتی کی عدم موجودگی میں ہو سکتے ہیں۔ ان نقصانات کی اصلاح اور انسداد کے لئے وہی شے کافی ہوسکتی تھی جو مثل اختلاف صفاتی کے فطری ہو، بلکہ اُس سے مقدم اور قوی تر تاکہ اُسپر غالب آسکے۔

حکمت صناعی نے اس اختلافی فطرت کا مدّمقابل اتحادی حقیقت کو پہلے ہی سے تجویز کر رکھا تھا اور درحقیقت یہ تجویز بڑی حکیمانہ تھی کہ اتحاد حقیقی ذاتی کو اختلاف صفاتی پر مقدم رکھا اور قوت بھی اُسی میں زیادہ رکھی اور یہ تقدیم و ترجیح ایسی ہی ہے جیسی ذات کو صفت پر۔

جب دنیا کی کمسنی تھی اسوقت تو ان اختلافات نے پاؤں نہیں پھیلائے، مگر جب آدمیوں کے ساتھ ساتھ ضروریات بھی بڑھتے گئے، تو ہر خطّہ کے روشن خیال لوگوں کو یہ فکر ہوئی کہ ہم اپنے آپ کو مع اپنے سامان کے (جو اسوقت نہایت ہی ضروری اور قلیل تھے) محفوظ رکھیں، اور یہ اپنی حفاظت اُسیوقت ممکن تھی جب علاوہ اور انتظامات کے اپنے ہموطنوں کی بھی حفاظت کا خیال رکھا جاتا، کیونکہ کوئی بندوبست ایسا کافی نہیں ہوسکتا تھا کہ اگر اس کے ہموطن اُسے برباد کردینا چاہیں، جب بھی وہ محفوظ رہے۔ لامحالہ یہ اصول قرار دینا پڑا کہ "دوسروں کو نقصان نہ پہنچاؤ، تا خود بھی نقصان نہ اٹھاؤ گے"! اس فطری اور ذہنی عہدنامہ کے ساتھ ہی ساتھ حفاظت کے انتظامات بھی اپنی اپنی حیثیت کے موافق کئے گئے۔ اور امتداد زمانہ نے اونکو ترقی دیکر مکمّل کرنا شروع کیا۔ پہلے قناتوں پر قناعت کرتے تھے اب مٹی یا پتھّر کی چار دیواری بننے لگی؛ پہلے سایہ دار درختوں پر اکتفا تھی، اب چھت پٹنے لگی؛ پہلے کوئی قیامگاہ معیّن نہ تھا، آج سلسلۂ کوہ میں ہیں تو کل کف دست میدان میں۔ اب اپنے رہنے اور اپنے سامان زندگی رکھنے کے لئے ایک محفوظ احاطہ ہوگیا، اسی کا نام **تمدن** رکھا گیا۔

دنیا کی مجموعی حالت پر ایک سرسری مگر جامع نگاہ ڈالنے سے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ جہاں انسان کی ضرورتیں روز بروز بڑھتی گئیں وہاں اسکو اپنی ضرورتوں میں انہماک بھی بڑھتا گیا، اور

اس انہماک و ترقی ضروریات نے یہ سب چیزیں ایجاد کرادیں، جو آج دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ پہلے انسان برہنہ رہتا تھا۔ پھر پتوں کا لباس۔ پھر چمڑے کا اب اتنی وضعیں اور پارچے ہوگئے کہ اگر ہر شخص ایک نیا کپڑا پہنے تو اقسام پارچہ و لباس ضرور کافی ہوں گے۔

اوائل میں خودرو پھلوں اور کوپلوں پر گزر تھی یا شکار کے کچے پکے گوشت سے پیٹ بھر لیا جاتا تھا۔ اب کھانوں کی اتنی قسمیں ہوگئیں کہ شمار نہیں۔ ابتدا میں صرف چھ ضرورتیں تھیں، مگر جب انکی تعداد بڑھنے لگی تو اسیطرح جس طرح تمدن میں دوسروں کا تعلق لازمی تھا، ان معاملات میں بھی ابنائے جنس سے کام پڑا۔ اوّل اوّل ایک خاندان کے لوگ آپسمیں مل جل کر رہنے لگے۔ سب کا باورچیخانہ اور خوابگاہ ایک ہی احاطہ میں، پھر اہل ہمسایہ سے تعلقات پیدا ہوئے۔ بعد اس کے سوسائٹیاں قایم ہونے لگیں، اور آپس میں ایک دوسرے کی شرکت و اعانت سے عیش و عشرت کرنے لگے۔ اس برتاؤ کا نام **معاشرت** رکھا گیا۔ یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اتحاد و اختلاف اور ان دونوں کی فطری نسبتوں اور حقیقی ضرورتوں نے تمدن و معاشرت کی نباڈالی اسلئے تمدن و معاشرت بھی فطری ہوئے اور قانون قدرت و اصول فطرت میں تمدن و معاشرت کا وہ مرتبہ ہے جو انسان میں اخلاط یا عناصر کا۔ اگر معاشرت کسی قوم سے اٹھا لیجائے تو وہ انسانیت کے دائرہ سے باہر ہوجائے، اور اگر تمدن رفع ہوجائے تو بربادی اور فنا ہر وقت اسکی تاک میں رہے۔ ہر ایک شئے کی ضد ایک ہوتی ہے، تمدن اسقدر وسیع اور اہم شئے ہے کہ اسکی ضدیں چند در چند الفاظ کا ایک پورا جملہ آسکتا ہے۔ یعنی تمدن کی ضدیں وحشیانہ آزادی اور خانہ بدوشی کے مجموعے کو پیش کر سکتے ہیں۔ علم الانسان میں اصل اصول تمدن ہے اور انسان کو زندہ و کامیاب رکھنے کے لئے علاوہ تمدن کے اور کوئی باہمی تعلق نہیں۔ معاشرت اسی تمدنی ترقی کے دوسرے زینے کا نام ہے۔ جب تمدن کی یہ شان ہے اور اصول فطرت قانون قدرت اور انسانی زندگی کی جان ہے اور اس قدر صاحب حسب و نسب ہے کہ اس کے والدین اتحاد ذاتی اور اختلاف صفاتی ہیں تو لازم ہوا کہ اس کے برقرار رکھنے کے لئے وہ قوت پیدا کی جائے جسکا مقابلہ کوئی فرد کیا کوئی گروہ نہ کرسکے، اور اگر کسی وقت میں کوئی کرسکے تو وہ تمدن ہی ہو۔

اس قوت کا احساس عام طور پر تمام اہل تمدن کو نہیں ہوا بلکہ ان روشن خیال اہل تمدن کو جو قوم یا ملک کے لیڈر کہلاتے ہیں اور گو ایسے لیڈر ہر زمانے میں ہوئے بلکہ اب تک ہیں، مگر قانون قدرت نے جن ضرورتوں سے انکو پیدا کیا انکو اتنا عرصہ دراز گزرا کہ اب خود معمولی لیڈر بھی اپنی علت آفرینش کو بھول گئے، اور اسیوجہ سے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اس وقت وہ ضرورتیں نمایاں طور پر تقاضا کر رہی تھیں، اسوجہ سے ان لیڈروں نے بآسانی یہ تجویز کر لیا کہ تمام اہل تمدن میں سے ایک یا چند اشخاص ایسے منتخب کئے جائیں جنکو اختلاف صفاتی نے خاص قوتیں عنایت کی ہوں اور ان قوتوں کے زور پر مخالفین تمدن پھر اس دائرہ انسانیت میں لائے جائیں اور تمدن کی نبیاد مضبوط ہوجائے۔ یہ طاقت جو اصول تمدن کو بزور قائم رکھے حکومت کے نام سے اور اس کی انتظامی طاقت سیاست کے لفظ سے مشہور ہوئی۔ سیاست کے تفصیلی قواعد مدوّن ہو کر قانون بنے اور جسطرح حکومت کے بانی روشن دماغ اہل تمدن تھے اسیطرح قانون حکومت جنکی مجموعی شرکت و اعانت سے نافذ کیا گیا وہ بھی

اہل تمدن ہی کے زور آور افراد تھے ان سب کا نام فوج ہو گیا۔

اگرچہ تمدن سے فوج تک کا سلسلہ ایک ہی زمانے یا ایک ہی ملک میں مسلسل اور مرتب نہیں ہوا بلکہ جیسے معرض حکومت کی بنا کسی زمانہ میں پڑی اور پھر کسی وقت روم و یونان میں قانون مدوّن ہوا مگر تمام دنیا کی اس متفقہ کوشش اور مختلف ممالک مختلف زمانوں کے لیڈروں کی علو ہمتی اور روشن خیالی نے باوجود کامیابی پورا کام نہیں کیا اور اختلاف صفاتی کا غالب مدمقابل نہیں قائم کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام تمدنی ضرورتیں نکلتیں اور تمدن میں ایک دوامی پختگی کا مادہ پیدا ہو جاتا۔

قبل اس کے کہ ہم ان مسائل پر روشنی ڈالیں ہمکو اوّل تمدن کے انقلابات ترقی و تنزل اور اس کے اصول و فروع پر ایک تاریخی مگر اجمالی نظر ڈالنا ضرور ہے۔

یورپ کا معمولی تمدن اگرچہ پہلے سے تھا مگر گیارھویں صدی عیسوی سے ترقی پذیر ہوا۔ کیونکہ جنگ صلیبی جو کہ ۱۰۹۶ء سے ۱۲۷۰ء تک رہی، اسکی جنگی تقریب نے استفادہ، معاملت اور معاشرت وغیرہ کے اس قدر سلسلے قائم کر دیئے کہ ہزاروں جدید امور تمدن و اصول معاشرت اہل یورپ نے اہل عرب سے لئے، یہاں تک کہ جسقدر اقسام ترقی تمدن و معاشرت کے ممکن ہیں ان سب پر یورپ کو اہل عرب کے ذریعہ سے دسترس ہوئی۔ ان سب کی تفصیل کے لئے ایک کتاب ضخیم چاہیئے مگر ثبوت کے واسطے مسیحی مورخوں کا حوالہ کافی ہے۔ رابرٹ، ریانڈ وازیل، برنارڈ۔ زاک دی، ابن کا بتین (شاہزادی قسطنطنیہ)، ولیم صوری، وغیرہ نے باتفاق ایسا ہی لکھا ہے۔ آخر الذکر نے جو کچھ رائے ان اہل یورپ کی بابت دی ہے قریب قریب اکثر مورخوں نے ایسا ہی لکھا ہے۔

اسی لئے سب مورخوں کا بیان ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں؛ ولیم کے رائے کا آخری فقرہ یہ ہے کہ:-

"اُن کی بد فعلیاں اس درجہ خلاف فطرت انسانی ہیں کہ اگر کوئی مورّخ اُنکی تصویر کھینچنا چاہے تو اس بار عظیم کا تحمل نہیں ہو سکتا"

اور ڈاکٹر گستاولی کا یہ بیان شہادت کے لئے کافی ہے کہ

"ان صلیبی لڑائیوں سے عام یورپ کی تمدنی حالت درست ہوگئی اور تمدنی فائدہ عربوں سے صرف یورپ کو نہیں بلکہ تمام دنیا کو پہنچا"

اب یہ ضرورت نہ رہی کہ تمدن میں سب سے آخری نمبر جس کا ہے اس کے لئے ثبوت بہم پہنچائیں مگر قدیم کسکو ہے اسکا پتہ بتانے میں تاریخ اسقدر طویل العمر نہیں۔

ہرودوطس یونانی سیّاح و مورّخ جو کہ حضرت عیسیٰ سے ۴۸۰ برس پہلے گزرا ہے وہ اپنے قدیم زمانہ کے حالات میں ملک یمن کو تمدنی ترقی کے اُس درجہ پر بتاتا ہے جس کے آگے کوئی اور مرتبہ نہیں اسکی تصدیق مسعودی اور اراتسطین کی شہادت سے بھی ہوتی ہے اور شہر صور کی تعمیر حضرت عیسیٰ سے ۲۱سو برس پہلے ہوئی، جہاں افریقہ اور ہندوستان کی چیزیں آتی تھیں۔ (جو تمدن و معاشرت کی پیدائش کے کئی ہزار برس کے بعد ضرورت سے زیادہ ہونے کے باعث ایجاد ہوئی ہونگی) مثل عطر و خوشبو و مسالے اور سفوف طلا وغیرہ اور حضرت عیسیٰ سے ۱۷۵۹ برس پہلے مصر میں ایک بادشاہ سلاطین رابعہ کا حکومت کرتا تھا جو کہ اپنے خاندان کا سترھواں بادشاہ تھا۔

جب تمدن کی کمسنی ہوگی تو کئی ہزار برس کے بعد وہ ایسا تجربہ کار پیر فرتوت ہوا ہوگا کہ شہروں کی بنا پڑے، تمام دنیا کی تجارتی منڈی قرار دیجائے، معاشرت کی تمام ضرورتیں پوری ہونے کے بعد غیر ضروری اشیا رالضاعف ہوں، اور اسکے استحکام

کے لئے حکومت کی بنا پڑے، اور پھر شاہانہ سلسلہ خاندانی چلے یہانتک کہ حضرت عیسیٰ سے ساڑھے سترہ سو برس پہلے مصر میں سترھواں بادشاہ تھا۔ ان سب واقعات سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ تاریخ سے تمدن ابتدا کا پتہ لگانا محال ہے۔ مگر مذہبی تاریخوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یمن، مصر، اور ہندوستان کو تمدن میں تمام ممالک پر سبقت ہے اور از روے قیاس روم و چین کو بھی جگہ دے سکتے ہیں، اگر توریت اور وید کے ماننے والے جو دعوی تمدنی اوّلیت کا کریں تو ہم کسی دستاویز سے انکو نہیں جھٹلا سکتے۔

تمام مذہبی اور غیر مذہبی تاریخوں سے عقل و قیاس جو نتیجہ نکالتا ہے وہ یہ ہے کہ طوفان نوح سے پہلے چھوٹے پیمانے پر اور بعد کو بڑے پیمانے پر ہر مرتبہ تمدن نے ترقی کی اور ہر مرتبہ زوال آیا یہ سلسلہ برابر جاری رہا خصوصاً روم، یونان، چین ہندوستان، یمن اور مصر و ایران میں۔ مگر روس انگلستان امریکہ، افریقہ اور فرانس وغیرہ پر دو ہی ایک مرتبہ ستارہ تمدّن نے روشنی ڈالی بلکہ ان میں سے بعض کو تمدنی ترقی کا اعلی درجہ پہلے ہی مرتبہ نصیب ہوا ہے۔ اور یہ گیارھویں ہی صدی عیسوی سے جسکی ضروری تفصیل ہم اوپر کر چکے ہیں، یورپ کی خوش نصیبی نے اسکو اسی زمانہ سے ترقی دینا شروع کی جب سے عربوں کا تمدن زوال آمادہ ہونے لگا اور اب تک نہ اُنکا عروج نہ اُنکا زوال کسی مرکز پر ٹھہرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بہرصورت دنیا کے مہذب ممالک میں خدا جانے کتنی مرتبہ تمدن کے باغ میں بہار اور خزاں آئی غالباً اتنی ہی مرتبہ جتنی دفعہ کوئی باغبان پیدا ہوا اور مرگیا۔ جب کسی شہر کا تمدن کمال زوال پر پہنچا تو قدرت نے اُنہی اصول پر جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ایک شخص ایسا مبعوث کیا کہ اس نے سنبھالا اور قبل اس کے کہ اختلاف صفاتی کی افراط تفریط نوع انسان کو اُس ملک سے بالکل برباد کر دے جہاں اسنے تمدنی اصول بالکل تقویم پارینہ سمجھ لئے ہیں پھر اُنہی اصول کی تجدید کی اور ترقی شروع ہوئی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

اب ہمکو صرف یہ دیکھنا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا تو نہیں ہے جسپر ترقی تہذیب تمدن و معاشرت کا زمانے میں بھی نہ حکومت کے قانون کا زور چلا ہو، نہ معاشرت کی دلچسپی کا جادو۔

امریکہ اور چین کے اصلی باشندے، ہندوستان کے کنجڑ اور عرب و شام و مصر کے بدو تمدنی قیدوں سے ہمیشہ آزاد رہے ان مختلف اقوام کے دماغ میں عموماً اور بدوؤں کے ذہن میں خصوصاً آزادی کا ایک ایسا مستقل خیال تھا کہ تمدنی پابندیوں کو قید سخت سمجھتے تھے۔ مرصع مطلا مکان انکے نزدیک جڑاؤ پنجرہ تھا اہل تمدن انکے خیال میں غلام ہیں اور ان کی طرز معاشرت کو وہ نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر انھیں دولت عظیم دیکر گھر میں رہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ زر و جواہر کو اپنی آزادی کی سب سے بڑی نعمت پر قربان کر دیں اور اُسی سلسلۂ کوہ یا میدانِ دشت میں چلے جائیں جہاں اُنکی وہ جائداد جس کو کوئی چُرا نہ سکے یعنی آفتاب کی شعاعیں اور ریت کے ذرّے ہمیشہ کے لئے انھیں کافی ہیں۔ میوہ کے درخت لگانے اور زراعت کرنے کی ترغیب سے وہ ہمیشہ بُرا مانتے رہے۔

پانچہزار برس تک کوئی ان کی آزادی میں فرق نہ لا سکا۔ ممالک عرب پر یونانی رومی مصری عجمی قوموں نے باری باری حکومت کی مگر نہ کبھی اُنھوں نے خراج دیا نہ کوئی اور اثر حکومت کا لیا اور نہ انمیں وہ تبدیلی ہوئی جو حکومت کے بدلنے سے رعایا میں بھی واقع ہوتی ہے۔ عرب کا جو سلسلۂ کوہ اُنکا تفریح گاہ تھا

اُس کے دامن میں تین ایسے سرسبز و شاداب پائیں باغ سیکڑوں مرتبہ پُر بہار اور خزاں رسیدہ ہوئے مگر انھوں نے تو کیا اُنکے مویشیوں نے بھی اُدھر رُخ نہ کیا۔ انکو متمدن بنانے کے لئے معاشرت کا سبز باغ اور حکومت کی زبردست طاقت کافی نہ تھی انکی تہوّر قلبی فصاحت لسانی اور آزادخیالی پر نہ کوئی اضافہ ہوسکا اور نہ کمی۔

ان بدوؤں کو کم سے کم اتنا تمدن دینے کے لئے کہ وہ فنا ہوجانے سے بچ جائیں علاوہ معاشرت وحکومت کے کسی بے انتہا با اثر قوت کی ضرورت تھی۔ وہ قوت اِدھر انکو انکی استعداد کے موافق اپنا پابند کرتی اور اُدھر بادشاہوں اور مقننوں کو بھی کسی ایسی ہی طاقت کی ضرورت تھی کہ وہ انکی حکومت پر غالب آسکے اور خود ان پر حکومت کرسکے علاوہ ان دو باتوں کے جو لوگ معاشرت کی لذت کو ہیچ سمجھتے ہیں اُن کے دلوں پر ہرگز کوئی قانون حکومت نہیں اثر کرسکتا! کیونکہ وہ بادشاہوں کو فقیر سے بدتر سمجھتے ہیں، اور اہلِ دولت کی کوئی ہستی اُن کے ذہن میں نہیں۔ بہرحال ضرور ایک ایسی قوت کی حاجت تھی جس کے قبضۂ قدرت میں بادشاہ و وزیر بھی اُسیطرح ہوں جسطرح خدمتگار اور ایک بہادر بدمزاج بھی اس حکومت کا ایسا ہی محکوم ہو جیسا ضعیف بیمار بڈھا ایسی قوت جس چیز میں ہے اسی کو **مذہب** کہتے ہیں یہی مذہب وہ شے ہے جو تمام مذکورۂ بالا ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے اور یہی ایک ایسی طاقت ہے کہ انسان کے اختلاف صفاتی کی بے اعتدالیوں کو رفع کرنے کے لئے اتحاد ذاتی وحقیقی کو اس کے سامنے لاکے کھڑا کرسکتی ہے۔ اور جسقدر مذہبی اصول میں انحطاط ہوگا اُسیقدر تمدنی امور میں۔

تمدن ومعاشرت کے لحاظ سے جس طرح عرب کی سرزمین بمقابلہ ہندوستان وغیرہ کم مایہ ہے اسیطرح اہلِ عرب کے خصائص شجاعت اور جنگ پرستی وغیرہ بھی مخالف تمدن ہیں اور تمام دنیا کے آزادوں میں سب سے زیادہ سخت عرب ہی کے آزاد بدو ہیں ان سب وجوہ سے اکثر مذہبی پیشوا یعنی انبیا اسی سرزمین پر مبعوث ہوئے مصر شام اور عرب سے زیادہ دنیا کے کسی مقام پر نبیوں کی بعثت نہیں ہوئی اور روح مذہب کے سب سے بڑے دو خاکی قالب بھی انھی ممالک میں تعمیر ہوئے ایک بیت اللہ دوسرے بیت المقدس۔

جتنی مرتبہ ان ممالک کا تمدن کمالِ زوال پر پہنچا اُتنی ہی مرتبہ ایک نبی نے آکے پھر سنبھالا سب سے زیادہ اور سب کے آخر میں پیغمبر اسلامؐ تشریف لائے کیونکہ اسوقت حضرت موسٰی کا زندہ کیا ہوا تمدن اسقدر مردہ ہوچکا تھا کہ شہری اور غیر شہری باشندوں کے اختلاف صفاتی حد فطرت سے بڑھ گئے تھے عنقریب وہ خاندانی لڑائیاں جو پشتہا پشت تک بلکہ اُس زمانہ تک جبکہ ایک متنفس بھی زندہ رہے چلنے والی تھیں۔ طائف الملوکی نے حکومت کی قدیم مجموعی اور زبردست قوت کو توڑ کر اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ بالجبر اصول تمدنی کے برقرار رکھنے کا زور نہ رکھتی تھی۔ مذہب جو سب سے زیادہ قوت باطنی کا مجموعہ ہے اسقدر متغیر اور مسخ ہوگیا تھا کہ بیت اللہ میں ۳۶۰ بت جمع کردئے گئے تھے گویا ایک ہی ملک میں ہر گروہ کا مذہبی مرکز جُدا تھا، اس سے زیادہ ضروری وقت پیغمبر آخرالزماں کے ظہور کا کوئی نہ تھا اور نہ اس ملک کے سوا کسی اور جگہ ایسی شدید ضرورت تھی۔

ناطق لکھنوی

تزکیۂ اخلاق

علم اخلاق دنیا کے ہر ایک مہذب ملک میں پایا جاتا ہے، صرف فرق یہ ہے کہ ماہرین علوم مغربی نے اس فن کو علم فقہ اور مذہب سے علیحدہ کرکے ایک نیا فن قرار دیدیا ہے، برخلاف اس کے علمائے مشرق اسے مذہب اور علم باطن کا جزو ضروری سمجھتے ہیں۔ راقم الحروف کا روئے سخن اُن لوگوں سے ہے جو وجود خدا، ہستیٔ روح، اور عالم بالا کے معتقد ہیں ضمناً اسقدر لکھدینا شاید بے ربط نہو کہ وہ مبصرین فلسفۂ اخلاق جو وجود خدا، اور روح کے قائل نہیں ہیں، اور جنھوں نے اپنے فلسفہ کی بنیاد تجربہ اور دیگر اصول پر قایم کی ہے، تزکیۂ اخلاق کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق ہمارے ہم آہنگ ہیں۔ انسانی زندگی کا مآل کار کچھ ہی ہو، بنی نوع انسان کی دنیوی ترقی اور اطمینان کے لئے با اخلاق ہونا ایک لازمی امر ہے۔

ہمارے معاشرتی تعلقات بھی بغیر پابندی اخلاق دشوار ہوجاتے ہیں۔ جہاں تک انسان کی دنیوی فلاح و بہبودی کا تعلق ہے، اسکے لئے علم اخلاق کی پیروی کو مغربی علمائے علم اخلاق ضروری سمجھتے ہیں۔ دین یا عقبیٰ کے وجود اور فرایض سے چونکہ انکو ابھی تک دلچسپی، یا یوں کہئے کہ کافی علم نہیں اس لئے انھوں نے اخلاقی احکام اور ضروریات کو محض دنیا تک محدود رکھا ہے۔ بہرکیف ہمارا منشا یہ ہے کہ خواہ کسی ملک یا کسی گروہ کا علم اخلاق کیوں نہ ہو، ان میں سے ہر ایک تزکیۂ اخلاق کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے جبکہ دنیا کی بہبودی اور نظام معاشرت کا دار و مدار تزکیۂ اخلاق پر ہے، تو روحانی زندگی میں کامیابی کے لئے، ظاہر ہے کہ کس حد تک اُسکی پابندی ضروری اور لازمی ہونی چاہئے۔

عام طور پر بوجہ لاعلمی یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ علم باطن کی تحصیل محض مرشد کامل کی نظر کیمیا اثر اور فیض روحانی پر منحصر ہے، نہ کہ اپنے مساعی جمیلہ پر۔ ایک حد تک یہ صحیح ہے کہ مرشد کامل کی اعانت بغیر روحانی زندگی کی دشوار گذار راہ بآسانی طے نہیں ہوتی، مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مرشد کامل صرف اسیوقت سالک پر توجہ کرتا ہے جب کہ اسے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ سے مزین پاتا ہے۔ جب تک ضبط، ریاضت، اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ سالک اپنی مستعدی اور شوق دلی کا ثبوت نہیں دیتا، مرشد اگر واقعی میں کامل ہو ہرگز اُسکی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔

اس قدر ضروری تمہید کے بعد اس امر کو بخوبی ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ تزکیۂ نفس و اخلاق، روحانی زندگی کا پہلا مقدمہ ہے۔ بغیر اس کے تحصیل علم باطن کا خیال محض ہوس ہے۔

عالم معرفت میں حضرت موسیٰ سے بھی زیادہ عالی ظرف درکار ہے، بقول عرفی ؎

عشق اگر مرد لیست مردے تاب دیدار آورد
ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد

جبتک اخلاق درست نہو، اور نہ نفس پاکیزہ، اُسپر رموز و حقایق باطن کا انکشاف بجائے مفید ہونے کے نہایت مہلک اور خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ایک نا اہل شخص کے ہاتھ میں

بندوق یا طپنچہ اگر دیدیا جائے تو بجائے کارآمد ہونے کے
اس کے لئے مضرت کا باعث ہوتا ہے۔ جس شخص میں اسقدر
بھی ذاتی استعداد نہو کہ بذریعہ کوشش بلیغ اپنے ظاہر و باطن عادات
اور اخلاق کو درست کر سکے، وہ روحانی زندگی کے مراحل کیسے
طے کر سکتا ہے؟۔ مرشد کا فرض صرف ہدایت ہے۔ عمل طالب
کا کام ہے۔ فرض کرو! کہ ایک شخص جو نان شبینہ کو محتاج ہو،
تمہارے پاس بامید اعانت آکر سائل ہو، تو تم زیادہ سے
زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ اُسکی کچھ کفالت کردو یا جو کچھ ماحضر موجود ہو
اُس کے سامنے رکھدو، باقی رہا اس غذا کا کھانا، دانتوں کا
چلانا، ہضم کرنا، یہ سب اس شخص گرسنہ کا کام ہے۔ فرض کرو!
کہ مرشد علم معرفت کے کل رموز ایک دم سے تمہیں بتادے، تو کیا
تم بغیر ذاتی سعی و محنت عارف ہو سکتے ہو؟ ہرگز نہیں ؎

آن کس است اہل بشارت کہ اشارت داند
نکتہا ہست بسے محرم اسرار کجاست

تزکیۂ اخلاق کی کوشش یوں تو ہر عاقبت اندیش کو بدل وجان
کرنی چاہیئے، مگر طالب حق کے لئے اس سے کسی طرح مفر نہیں۔
خدا کے حضور میں باریابی کا یہ پہلا زینہ ہے۔

مسلمانوں میں عرصہ سے یہ رائج ہے کہ جب سالک کسی
بزرگ کی خدمت میں بغرض تعلیم روحانی حاضر ہوتا ہے تو اُسے اپنے
گناہوں سے تائب ہو کر پیر کے ہاتھ پر بیعت لینی پڑتی ہے، یا
توبہ و استغفار کے بعد مرشد کے سامنے خدا سے وعدہ کرتا ہے کہ ممنوعات
شرعیہ سے پرہیز کرونگا، اور اوامر و نواہی کا بطریق احسن پابند
رہونگا، مگر ان میں سے کتنے مرد میدان ہیں جو اس عظیم الشان
وعدہ کو، (وہ بھی کس کے حضور میں خدائے برتر اور مرشد کامل کے)
ایفا کرتے ہوں۔

لفظ توبہ کا اصلی مفہوم اہل باطن کے نزدیک کچھ اور ہی ہے۔ لوگ
یہ سمجھتے ہیں ؎

رات بھر پی پیا کی صبح کو توبہ کرلی — رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

گویا کہ توبہ بچوں کا کھیل ہے یا طفلانہ دوستی ہے جب چاہا توڑ دیا اور
جب چاہا دوست بن گئے۔

یاد رکھنا چاہیئے توبہ وہی صحیح ہے جو ایک بار کرنے کے بعد تا
زیست قایم رکھی جائے۔ انسان کو چاہیئے کہ توبہ کرنے میں جلدی
نہ کرے۔ پہلے اپنے خیال اور عادات کی جانچ کرے۔ دیکھے کہ مجھ میں
اس قدر کافی اخلاقی جرارت اور قوت ارادی ہے کہ اگر میں
ایکبار توبہ کروں تو ہمیشہ اس کا پابند رہ سکوں گا یا نہیں۔ توبہ قطعی
ارادہ کا نام ہے۔ جسوقت طالب عزم بالجزم کرلیتا ہے کہ میں
راہ خدا پر استقلال اور صبر کیساتھ بلاخوف و خطر چلونگا اور مکروہات
دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤنگا، اسوقت اسکو
توبہ کرنی چاہیئے۔ توبہ وہی مقبول ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ وہی
توبہ کارآمد ہوتی ہے جس کے بعد انسان دوبارہ افعال مذموم
اور اعمال قبیحہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اسیواسطے مرزا سودا کہہ گئے
ہیں کہ شیخ کو چاہیئے کہ سالک کو تعلیم فنا سے پہلے دنیا کے تعلقات
سے متنفر کردے ؎

خانہ پرور چمن ہیں آخر اے صیاد ہم
اتنی رخصت دے کہ ہولیں گل سے ٹک آزاد ہم

کیونکہ جسقدر دنیا کی محبت بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر مشکلات زیادہ
ہوتی جاتی ہیں ؎

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا مجھے — اے الفت چمن ترا خانہ خراب ہو

اکثر نیک نیت اور حوصلہ مند سالک جب خدا کی راہ پر
چلنے کا قصد کرتے ہیں اور تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس میں سرگرم

عام نظارہ قلعہ و مندر سری رنگ نائک

ہوتے ہیں تو اپنے گناہوں کے بار گراں کو خیال کر کے متاسف
اور خدا سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ بوجہ غلطی یہ سمجھتے ہیں
کہ اخلاق کی درستی محض خدا کی توفیق و برکت پر منحصر ہے۔ جب تک
خدا مدد نہ کرے گا تزکیۂ اخلاق ممکن نہیں؛ یہ خیال درست نہیں؛
علمائے علم النفس کے قدیم و جدید ہر دو گروہ کی یہ قطعی رائے
ہے کہ خیال و تصوّر میں حیرت انگیز قوت ہے۔ انسان جس
قسم کا خیال یا تصوّر بار بار دل میں کرتا اور لاتا ہے اُسی قسم
کے خیال و تصور بجنسہ خود بخود کچھ روز کی مزاولت کے بعد دماغ
میں پیدا ہونے لگتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی خیالات
افعال کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں، اور انسان
سے بلا اختیار سرزد ہوتے ہیں؛ اس اصول کے بنا پر ہمیں چاہئے
کہ بجائے گذشتہ بے عنوانیوں اور گناہوں پر بار بار سوچنے اور
افسوس کرنے کے نیک افعال اور راست خیال کو اپنے دل میں
جگہ دیں، اور اُنھیں کا بار بار تصوّر بھی کریں؛ اس طریقہ سے راست
گفتاری اور راست کرداری ہمارے جزو دماغ ہوجائے گی
اور ہم بجز نیک افعال کسی مذموم فعل کے کبھی مرتکب نہ ہوں گے۔
"چھاندوگیہ اپنشد" میں لکھا ہے کہ انسان خیال کا مخلوق ہے۔ جیسے
خیالات اُس کے دل میں جاگزیں ہوتے ہیں ویسے ہی آخر
میں وہ خود بن جاتا ہے۔ اسی لئے دنیا کے ہر ایک بانی مذہب نے
درستی خیال کی نہایت شد و مد سے تاکید کی ہے کیونکہ یہ مسلم الثبوت
مسئلہ ہے کہ اخلاق پسندیدہ کے لئے پاکیزہ خیالات نہایت ضروری
ہیں۔ انسان سے جو فعل سرزد ہوتا ہے پہلے وہ عالم خیال
میں نشو و نما پاتا ہے، بعدہ فعل پسندیدہ یا ناز یبا کی شکل میں
اگر عالم ظاہر میں نمودار ہوتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ
سے اہل ہنود میں زناربندی کی رسم چلی آتی ہے، ایک زنار میں
تین دھاگے ہوتے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ جب اس زنار پر نظر
پڑے، خیال و قول و فعل کی درستی اور ضبط کا تصوّر دل میں قائم
رہے اس لئے کہ انھیں تین زبردست انسانی قوی کے قابو میں
کرنے کا نام تزکیۂ اخلاق ہے۔ جس شخص نے اس "تثلیث"
اخلاقی کو زیر کرلیا، اس کے لئے سارے اخلاق کو درست
بنانے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ انسانی گناہ انھیں
تین قوتوں کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں۔ پارسیوں
میں بھی ایک سفید فیتہ کمر کے چاروں طرف تین بار باندھتے
ہیں۔ اس کا مقصد بھی سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ انھیں قوٰی
انسانی کی اصلاح کا خیال ہر وقت دل میں قائم رہے۔

عادت ایک زبردست قوت ہے۔ اگر انسان نے شروع
سے نیک افعال کی عادت ڈال لی تو اُسے اخلاق کی اصلاح
میں چنداں دقت نہیں ہوتی۔ جس طرح عادت انسان کو حیرت
انگیز مدد دیتی ہے اُسی طرح نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ عادت کو
سنسکرت میں سُبھاؤ کہتے ہیں اور سُبھاؤ کو دور کرنا سخت دشوار
کام ہے۔ اگر ارادہ پختہ ہو تو آہستہ آہستہ اس پر غالب آسکتا ہے
البتہ بعضے اولو العزم ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جہاں انکو اپنی عادت
کی غلطی معلوم ہوگئی فوراً چھوڑ دیتے ہیں اور اس کا نام نہیں
لیتے" بھگوت گیتا میں ایک اشلوک ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ
ایشور نہ کرم کو اور نہ کرم کے کرنے کو اور نہ کرم کے پھل کو پیدا
کرتا ہے۔ یہ کل امور سبھاؤ سے پیدا ہوا کرتے ہیں اس لئے انسان
کو اپنے سبھاؤ کی درستی میں بہت کوشش کرنی چاہئے" ایک شاعر
کہتا ہے ؎

ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت
اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی

ہمیں چاہیئے کہ جسم و دماغ کو اپنا غلام بنالیں ہم ان کے مالک بنیں نہ کہ وہ ہمارے۔ یہ صرف عادت کی درستی پر موقوف ہے۔ جب تک ہم جسم و دماغ کے برے عادات کی غلامانہ پیروی کرتے رہیں گے ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں باطنی کشمکش اور مجاہدہ شروع ہوتا ہے سالک و غلام میں عرصہ تک جنگ رہتی ہے آخر غلام کو شکست فاش ہوتی ہے اور مالک کے سر فتح کا سہرا بندھتا ہے۔

ایک بار جب سالک نے قطعی طور سے یہ سمجھ لیا کہ فلاں فعل بد ہے اور اس کا ترک لازمی، تو اُسے مردانہ وار نہایت صبر و استقلال سے کام لیکر اس فعل بد کے دور کرنے کی سعی کرنا چاہیئے۔ چونکہ عادت ایک مدت مدید کی مہارت اور پیروی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لئے اگر بعض اوقات انسان سے دوبارہ وہی فعل سرزد ہوجائے تو بے دل اور مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ع۔ بہ مطلب میرسد جویاے کام آہستہ آہستہ۔

درستی اخلاق کا عملی طریقہ یہ ہے کہ مقابل و متضاد عادات کو از سر نو اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ علل و اسباب کا سلسلہ ہر دو عالم یعنی باطن و ظاہر میں یکساں جاری ہے۔ فرض کرو کہ تم میں بدگوئی کی عادت ہو، تو تمہیں چاہیئے کہ بدگوئی کا خیال نہ کرو! بلکہ خوش کلامی کی عادت ڈالو! کچھ روز کے بعد جب یہ عادت پختہ ہوجائے گی تو بدگوئی خود بخود زائل ہوجائے گی۔

نفرت کو محبت سے، بدی کو نیکی سے، دروغ گوئی کو راست گوئی سے، غیظ و غضب کو مآل اندیشی اور ضبط سے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے، اگر کسی کمرہ میں تاریکی ہے تو مزید تاریکی کا اضافہ کرنے سے تاریکی ہرگز دور نہ ہوگی، بلکہ روشنی پیدا کرنے سے تاریکی فنا ہوجائے گی۔ دوسرا طریقہ تزکیۂ اخلاق صحبت صالح یا ست سنگ ہے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　صحبتِ طالح ترا طالح کند

نیک یا بد صحبت نہایت اثر پذیر ہوتی ہے۔ یا خدا کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے۔ ؎

بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے ذوق　　کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینہ سے

"آنند"

پولیسمین ۔ اس کتاب کے مؤلف مسٹر ظفر عمر صاحب بی اے۔ (علیگ) ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بدایوں ہیں۔ اصلاح پولیس ملک کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے، جو کل ملک کے دل میں اس وقت شعلہ زن ہے۔ یہ اصلاح بہت کچھ اہل پولیس کی انفرادی تعلیم و تربیت اور اخلاق پر موقوف ہے۔ مسٹر ظفر عمر نے اس رسالہ میں اہالیان پولیس کے حقیقی فرایض، آداب، اخلاق، برتاؤ کو ایسے سنجیدہ اور دل آویز پیرایہ میں دکھایا ہے کہ اگر اہالیان پولیس ان پر عامل ہوں تو ہندوستان کی پولیس "فرشتۂ رحمت" بن جاے۔ جس دل سے یہ خیالات نکلے ہیں، کوئی شک نہیں، کہ وہ پولیس کا ایک بہترین اور خدا ترس ٹائپ ہے۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ ہر پولیسمین اس کو اپنی جیب میں رکھے اور روزانہ اس کا ورد کرے۔ شروع کتاب میں حضور ملک معظم جارج پنجم کی ایک نہایت شاندار و تاجدار تصویر بھی ہے۔ ضخامت ۱۴۲ صفحات، جیبی تقطیع۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

عالم ومافی العالم

۴

سیّارگانِ صغیر[1]

سیّارگانِ کلاں کے ذکر بالانفراد کے بعد اب چھوٹے چھوٹے سیاروں کا ذکر کرنا مناسب ہے، جو نظامِ شمسی کا جزو قرار پائے ہیں انیسویں صدی کے آغاز سے پیشتر ان کا وجود کسی کو معلوم نہ تھا؛ ۱۸۰۱ء میں پیاسی نے پلرمو (سسلی) میں ایک چھوٹا سا سیارہ دریافت کیا۔ اس سے اور عالموں کے دل میں بھی یہ ہوس پیدا ہوئی، کہ ہم بھی اس قسم کے سیّارے معلوم کرکے نام پیدا کریں۔ چنانچہ ول برس نے ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۷ء میں دو دریافت کئے۔ اور ۱۸۰۴ء میں ہارڈنگ نے ایک اور دریافت کیا۔ اس کے بعد عالموں نے یہ خیال کیا، کہ شاید آسمان اُن کے وجود سے خالی ہوگیا ہے، مگر ۱۸۴۵ء میں ہنکے جرمن محقق کی کوشش سے ایک اور معلوم ہوا۔ جس سے یہ امید بندھی، کہ چھوٹے سیاروں کے شمار میں کوئی خسارہ نہیں واقع ہوا ہے۔ اس کے بعد سے ہر سال دس بیس نئے سیّارے دریافت ہوتے رہے ہیں۔ اس مبارک کام میں فلکی فوٹوگرافی نے بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اور دوربین سے وہ کام نہیں نکلتا۔ جو فوٹوگرافی سے ہو رہا ہے۔ آسمان پر چاہے کتنا ننھا تارہ اور چاہے کتنے فاصلہ پر ہو، اور دوربین کی زد سے بچ جائے۔ مگر فوٹوگرافی کی مار سے وہ کبھی نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء سے آج تک پانچ سو سے زائد سیّارے معلوم ہو چکے ہیں۔ یہ سب کے سب منگل اور برہسپت کے درمیانی خطّہ میں گردش کرتے ہیں، مگر بہت چھوٹے ہیں۔ ان میں کے سب سے بڑے سیّارے سیریز کا قطر ۴۸۵ میل ہے۔ باقی اس سے کہیں چھوٹے ہیں۔ انکی حرکت محوری بہت بے ٹھکانہ ہے۔ اروس (Eros) جو ان سب میں بہت مشہور ہے۔ اگست ۱۸۹۸ء میں دریافت ہوا تھا۔ یہ گردش کرتا ہوا زمین کے بہت نزدیک آجاتا ہے، اور کوئی سیارہ اتنا نزدیک نہیں آتا ہے۔ حال کے مشاہدوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی درخشانی تغیر پذیر ہے۔ عالموں کا یہ خیال ہے کہ یہ دوہرا سیّارہ ہے۔ اور یہ دونوں ایک ساتھ پانچ چھ گھنٹوں میں گردش کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اُن چار سیاروں[2] کا بھی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو سنہ ۱۸۰۱ء ۱۸۰۲ء ۱۸۰۴ء اور ۱۸۰۷ء میں علی الترتیب دریافت ہوئے تھے۔ اور ان کے نام یونانی دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں، یعنی سیریز (Ceres) پالس (Pallas) جُونو (Juno) اور ویسٹہ (Vesta) ہیں۔ ویسٹہ سورج سے ساڑھے بائیس کروڑ۔ جونو چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میل۔ سیریز اور پالس چھبیس کروڑ چالیس لاکھ میلوں کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ ویسٹہ۔ پالس۔ آئرِس اور فلورا سیارگانِ خرد میں سب سے بڑے اور سب سے زیادہ درخشاں ہیں۔ سب سے چھوٹے کا قطر صرف پچاس میل ہے۔ اور سب سے بڑے کا پانچ سو میل کے قریب ہے۔ فلورا سورج کے قریب ترین اور ہائی جیا (Hygiea) اور ٹھیمِس

[1] ماخوذ از "نیو انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا" جلد نمبر، صفحہ ۱۹۱ [2] "گیلری آف نیچر" صفحہ ۹

(Themis) بعید ترین ہیں۔ آنے والے زمانہ کے عالموں کی کوششوں سے کیا ظہور میں آئے گا۔ کوئی پیشین گوئی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ مگر یہ قرین قیاس ہے کہ ایسے ایسے عجائبات خلا کا انکشاف ہوگا جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انسان حیران ہوں گے۔

نظام شمسی کے تذکرہ میں اُن اجرام فلکی کا ذکر خاص ہوچکا۔ جو قابل بیان ہیں۔ یعنی سیارے اور اُن کے چاند۔ اور سیارگان خرد۔ دمدار تارے " آوارہ گردان سماوی " میں شامل ہیں کبھی کہیں۔ کبھی کہیں۔ یہ کسی قاعدہ آسمانی کے تابع نہیں رہتے، اس لئے انکا بیان قلم انداز کیا جاتا ہے۔

شہاب ثاقب یعنی ٹوٹنے والے تارے

شہاب ثاقب بھی ہمارے مطلب سے بہت متعلق نہیں۔ اور نہ بہت ضروری ہیں۔ ان سے ہر کوئی آشنا ہے۔ رات کو تارے ٹوٹتے کس نے نہیں دیکھے ہیں؟ چھوٹے چھوٹے اجرام ہوتے ہیں۔ اور منتشر بے مہار کی طرح خلا میں گھومتے پھرتے ہیں جب اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں، تو ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں جس سے رات کے وقت شعلے اور شرارے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تارے زمین پر بھی آپڑتے ہیں۔ جو بڑے بھاری سیاہ پتھروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ دس بارہ برس ہوئے جنوبی افریقہ میں رکیپ کالونی) ایک جگہ ایک بڑا وزنی شہاب ثاقب گرا۔ جو زمین کے اندر دھس گیا۔ اور پچاس فٹ گہرا گڑھا بنا دیا۔ اس میں لوہا۔ کانسہ۔ گندھک۔ سلیکہ۔ مگنشیا۔ چونا (لائم) اُلومینا۔ پوٹاس۔ سوڈا۔ اکسائیڈ آف منگنیز۔ تانبہ۔ کاربن وغیرہ چیزیں[1] پائی گئی تھیں۔

اسپکٹرو اسکوپ سے یہ معلوم ہوگیا ہے۔ کہ یہ اشیا تقریباً تمام اجرام فلکی میں پائی جاتی ہیں۔ اور بہت سے سیارے انہی شہاب ثاقبوں کے مجموعے سے بنتے ہیں، جیسا عالموں کا ایک گروہ تسلیم کرتا ہے۔

اجرام فلکی کس طرح بنے؟

ارکین نظام شمسی و ساکنین خلائے آفتابی کے تذکرہ کے بعد اب اُس مسئلہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جو اس حصہ مضمون کا عنوان ہے۔ اور یہ ایک سوال ہے جسے ہر تجسس پسند دل پوچھیگا۔ یہ سورج۔ چاند۔ تارے۔ سیارے۔ وغیرہ ساکنین خلا کس طرح وجود پذیر ہوئے؟ اور ان کا ہیولا یعنی مادۂ عالم کیا ہے! اس مضمون میں اسکا جواب بہم پہنچایا جائے گا۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ متقدمین کا تکوین کے بارہ میں کیا خیال تھا۔ کیونکہ اُنکے خیالات اور تعصبات ایک بڑی حد تک متاخرین کو ورثہ میں ملے ہیں۔ اور اُنسے ہر کوئی واقف ہے۔ مگر یہاں پر علوم جدید سے جو جواب ملتا ہے، وہ نقل کیا جائے گا، اور اُسسے اہل نظر اور شائقین پرانے خیالات سے مقابلہ کرکے تفاوت اور تخالف بھی معلوم کرسکتے ہیں۔

(۱) نظریہ سحاب

سب سے بڑا خیال اجرام خلائی کے بارے میں نظریہ سحاب یعنی نیوبلر ہائی پاتھےسس (Nebular Hypothesis) ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ نیوبلا یعنی دخانی سفید درخشان مادہ سے جو آسمان میں ہر جگہ موجود ہے۔ دنیا اور عالم بالا کروڑوں برسوں کے بتدریج ارتقا سے وجود میں آئے۔ دسمبر یا بھادوں کے مہینوں میں جب مطلع بالکل صاف ہوتا ہے اور آسمان میں تارے اسی طرح چمکتے اور بہار دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کسی ہال کی چھت میں فانوس بلوریں لٹکتے معلوم ہوتے ہیں۔ کہکشاں میں اور دیگر حصص خلا میں بہت سفید انبار سے نظر آتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ

[1] منقول از " موزرا ینڈ جیالوجی " مصنفہ ڈاکٹر سیموئل کنس صفحہ ۵۵۔

جیسے شملہ ۔ دارجیلنگ یا کسی اور برفانی مقام میں موسم سرما کی صبح کو زمین پر برف پڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔ یہ سفید سا مادہ ۔ نیوبلہ، یا دخان یا سحاب سماوی کہلاتا ہے ۔ اسی سے بقول ارباب سائنس ۔ دنیائیں بنی ہیں ۔

اسکاٹ لینڈ کے مشہور فلکی جیمز فرگیوسن نے ایک خط میں کسی دوست کو لکھتے ہوئے بائبل کے بیان آفرینش کی تصدیق کی کہ خدا نے عالم بالا کو اسی طرح بنایا جیسے بائبل میں لکھا ہے ۔ یعنی اُسنے نیوبلہ یعنی سماوی کی طرف اشارہ کیا تھا ۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جرمنی کے مشہور فلاسفر کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں یہ خیال ظاہر کیا ۔ کہ آسمان میں درخشاں گیس اور غیر معین سحاب[1] ہے جو عالم کا مادہ ہے ۔ اور جس سے بتدریج یہ عالم وجود پذیر ہوے ۔ مگر سر ولیم ہرشل اور فرنچ عالم لاپ لیس نے بہت مشاہدہ اور تحقیق کے بعد اس خیال کو نظریہ کی صورت میں ظاہر کیا ۔ لاپ لیس نے ریاضی اصول سے یہ دیکھا کہ نظام شمسی کے جملہ ارکین آفتاب عالم تاب کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف چکر لگاتے ہیں ۔ اور ہر سیارہ اور ماہتاب بجائے خویش اُسی رُخ پر گھومتا ہے ۔ دوسری بات اُسے یہ نظر آئی کہ تمام سیارے سورج کے گرد اور سب چاند اپنے مرجع اصلی کے ارد گرد اُسی دائرہ میں گردش کرتے ہیں جس میں کرہ ارض سورج کے آس پاس طواف کرتی ہے ۔ اس کا کیا باعث ہے ؟ کہ یہ سب ایک ہی رُخ پر گھومتے ہیں ۔ اس کی وجہ اس نے یہ قرار دی کہ شروع میں نظام شمسی کے جملہ ارکین درخشاں گیس یا براق سحاب کی صورت میں تھے ۔ (مگر اس نے خود کسی نیوبلہ کو کبھی نہیں دیکھا تھا) اُس نے خیال کیا کہ انقباض (Contraction) اور انجماد (Condensation) سے رفتہ رفتہ حلقے بنتے چلے گئے ۔ سورج بھی اسی طرح بنا تھا ۔ اور اب وہ سکڑتا چلا جاتا ہے ۔ سر ولیم ہرشل نے کچھ عرصہ تک آسمانوں کا مشاہدہ کیا ۔ نیوبلوں[2] کے گروہوں کی دیکھ بھال کی اور جو ستارے یا سیارے عالم ارتقا کے ابتدائی مرحلوں میں تھے، انکی حالتوں کو بھی دیکھا ۔ اور یہ رائے دی، کہ تمام عالم سحاب سے بنے ۔ اس مسئلہ کی رو سے یہ مانا جاتا ہے، کہ شروع میں آسمان کے سب حصوں میں نہایت گرم سحاب[3] یا گیس کے تودے تھے ۔ کشش ثقل سے انکے اندر گردش پیدا ہو گئی ۔ جو لاکھوں کروڑوں برسوں تک رہی آخر کار گھومتے رہنے سے حرارت خارج ہوتی گئی، اور ذخیرہ میں انقباض پیدا ہوا ۔ بڑے ڈھیر سے ٹکڑے ٹوٹ کر علیحدہ ہوتے رہے جو حلقوں میں بجائے خویش گھومتے رہے ۔ آخرش بے شمار زمانوں کے گذرنے کے بعد انہوں نے ٹھوس اجسام کی صورت اختیار کر لی ۔ اور اس طرح سیارے چاند اور نظام ہائے شمسی وجود میں آئے ۔

نظریہ سحاب کا دم چھلا اس نظریہ میں پروفیسر جارج ہوارڈ ڈارون (کیمبرج) نے ۱۸۸۵ء میں یہ اضافہ کیا ہے، کہ زمین اور چاند کروڑوں برس پیشتر ایک دوسرے سے جدا نہ تھے جیسے اب ہیں ۔ اُس دور افتادہ زمانہ میں ہمارے کرہ ارض گیس کے ڈھیر کی صورت میں اپنے محور پر تین اور پانچ گھنٹوں کے درمیان میں گھوم رہی تھی اس گردش اور کشش آفتاب سے اس میں شق واقع ہوا ۔ چھوٹا ٹکڑا چاند بن گیا اور بڑا زمین کا کرہ بنا ۔ یہ خیال مسئلہ سحاب کا دم چھلا اور ضمیمہ سمجھا جاتا ہے ۔

نظریہ سحاب کی تائید و تصدیق حال کی تحقیق سے جو اسپکٹروسکوپ سے ہوئی ۔ یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہو گیا ہے ۔ کہ عالم سحاب یا درخشاں گیس سے وجود میں آئے ہیں ۔

---

[1] از "اوڈنس آف ماڈرن اسٹرانامی" مصنفہ ہکٹر میکفرسن مطبوعہ لندن جنوری ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۲۶-۲۲۷- [2] ۔ "انسائیکلوپیڈیا ا ڈیوانز ینشنل" جلد نمبر ۵ صفحہ ۵۶۴-

[3] از "اوڈنس آف ماڈرن اسٹرانامی" (فلکیات کی سرگزشت) صفحہ ۲۲۸-

سس آلہ نے سورج ستاروں اور نیو بلہ کے کے اجزائے ترکیبیہ کی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔ وہ گیس سے بنے ہیں۔ اس سے زمین کی ابتدائی تاریخ اور مختلف حالتوں کا پتہ لگتا ہے۔ آسمان کے اجرام کی اصل کا فوٹو بھی اس آلہ نے پیش کر دیا ہے۔ ان میں سے بعض ہنوز عالم طفولیت میں، بعض شباب میں۔ بعض مہمان چندروزہ، اور بعض مردوں کے ذیل میں داخل ہو گئے ہیں۔ برہسپت گو زمین سے کئی سو گنا بڑا ہے[۱] مگر ارتقا کی پہلی منزل میں ہے۔ اس کا مطلع زمین سے زیادہ مکدر اور بادل سے بھرا ہوا ہے۔ اس سے بادل تو پیدا ہوتے ہیں مگر وہ سورج کی گرمی سے نہیں۔ بلکہ اس کی اندرونی بے حد گرمی کے سبب سے اٹھتے ہیں۔ جب تک یہ بادل دور نہوں برہسپت زمین کی حالت کو نہیں پہنچ سکتا۔ سنیچر۔ یورےنس۔ اور نپچون بھی ہنوز ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں الجھے پڑے ہیں۔ حرارت وہاں اس قدر ہے کہ روئیدگی اور جانداروں کی ہستی ناممکن ہے۔ صرف شکر زمین کے ہم رتبہ ہے، جو اپنے حجم طبعی میں بھی اس کے لگ بھگ ہے۔ منگل اپنے ارتقا میں زمین سے چند قدم آگے ہے۔ اپنی چھوٹائی کے سبب سے ارتقا کی تمام منزلوں سے گذر گیا۔ بڑھاپے کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ اس کے سمندر خشک۔ دریا برباد۔ اور انکی جگہ دلدلی نباتات ہے۔ ہوا لطیف اور ہلکی ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں، کہ منگل مردوں کے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ ایسے کئی مردے اجرام آسمان میں موجود ہیں۔

ہمارا چاند۔ سیاری زندگی کا آخری مرحلہ پیش کرتا ہے۔ یہ سرد اور خشک مادّہ کا ڈھیر ہے۔ وہاں ہوا کا نام و نشان نہیں، سمندر اور جھیلیں سب خشک ہو گئی ہیں۔ پہاڑوں کی ننگی چوٹیاں روئیدگی سے معرّا ہیں۔ یہی حال منگل کا ہونے والا ہے۔ اور چند کروڑ سال کے بعد یا اس سے پیشتر ہماری دنیا کا بھی یہی حشر ہوگا۔

(۲) میٹیورٹک تھیوری۔ یہ دوسرا تکوین عالم کے بارہ میں میٹیورٹک تھیوری (Meteoritic Hypothesis) یعنی مسئلہ شہاب ثاقب ہے۔ اس کے موجد سر نارمن لاکیئر مشہور عالم فلکیات ہیں۔ یہ حال ہی کا ہے۔ اس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ تمام سیارے اور ستارے ان شہاب ثاقبوں کی ترکیب سے بنے ہیں، جن سے عالم بالا معمور ہے۔ عالموں کا ایک گروہ اس نظریہ کا قائل ہے۔ سیموئل لینگ نے اپنی مشہور کتاب "مسائل مستقبل" (پرابلمز آف فیوچر) میں ایک فصل اس امر کی بحث کے لئے مخصوص کی ہے، کہ عالم بالا میں کیا ہے؟ اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شہاب ثاقب بیشمار ہیں جن سے خلا کا ہر گوشہ بھرا ہوا ہے۔ سر نارمن لاکیئر کی نظریہ کے سب عالم حامی نہیں ہیں۔ صرف ایک چھوٹا گروہ مانتا ہے۔ برعکس اس کے نیوبلر تھیوری یعنی نظریہ سحاب کو قبولیت عامّہ کا فخر حاصل ہو گیا ہے۔

(باقی آیندہ)

جے۔ آر۔ رائے

دُرِ شاہوار - (یہ سلسلہ یادگار مولوی سید امجد علی صاحب اشہری مرحوم) یہ کتاب خاندان رسالت کے سب سے بڑے ہیرو حضرت علیؑ کے فلسفیانہ پر معنی اقوال کا بامحاورہ اردو ترجمہ ہے۔ کسی قوم کی حقیقی عظمت اسکی اخلاقی و روحانی فضیلت پر موقوف ہے۔ اخلاقی و روحانی ترقی کا پہلا زینہ "خود شناسی" اور "اپنی اصلاح" ہے۔ ان اقوال کی روشنی میں انسان کو اپنی حالت کا انکشاف ہوتا ہے۔ محبان اہل بیت اس کتاب سے بیش بہا نصائح حاصل کر سکتے ہیں۔ اسکی قیمت ۸ آنے جو بہت زیادہ ہو۔ شائقین دفتر رسالہ ادیب ۔ الہ آباد سے بنارس چھاونی سے طلب فرمائیں۔

---

[۱] از آؤٹ لائنس آف ماڈرن اسٹرانامی، صفحہ ۲۲۲ و ۲۲۵۔

[۲] از نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا، جلد ۵ صفحہ ۷۸۵۔

فرانس کے اخبارات

فرانس بھی شائستگی اور تہذیب میں کسی سلطنت سے کم نہیں اور اخباروں کی قدر دانی اور رتبہ سنجی میں تو اس کا پایہ بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔ ناظرین سنیں گے تو متحیر ہو جائیں گے۔ پیرس (دار السلطنت فرانس) کے اخباروں کی عظمت اللہ اکبر۔ روزانہ اخبار" لاپٹی جرنل" ہی کو لیجئے جس کی اپنی عالیشان تعمیر دار الاخبار میں ۸۰۰ ملازم کام کرتے ہیں۔ ایک لاکھ پچاس ہزار ماہوار کا تو صرف کاغذ ہی خرچ ہوتا ہے۔ اس کی روزانہ اشاعت ۱۰ لاکھ ہے اور مختلف مقامات پر اس کی ۲۰ ہزار ایجنسیاں کھلی ہوئی ہیں۔ ناظرین اسی سے رفعت و شان کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دوسرا روزانہ اخبار" طان" ہے جس کے دفتر میں ۹۰۰ آدمی کام کرتے ہیں۔ صرف تار برقیاں حاصل کرنے کو ۲ لاکھ روپیہ سالانہ صرف ہوتا ہے اور جس کے ایڈیٹر ایک سو سے زیادہ ہیں۔ کسی کی تنخواہ چار ہزار روپیہ ماہوار سے کم نہیں۔ یہ وہ اخبارات ہیں جن کے ہاتھ میں پبلک اور گورنمنٹ دونوں کی باگ ہے، چاہیں جوش کو اُبھار دیں، چاہیں ٹھنڈا کر دیں۔ چاہیں جنگ کرا دیں چاہیں صلح، جنکی اشاعت کے لئے سپیشل ٹرینیں جاتی ہیں سینکڑوں مضمون نگار مذکورہ بالا اڈیٹروں کے علاوہ ہیں۔ جو گھر بیٹھے لاکھوں روپیہ پاتے ہیں۔ امیر کبیر بنے ہوئے ہیں۔ اور سب سے مستغنی۔ فی مضمون پانچہزار روپیہ تک اجرت پاتے ہیں۔ سب کے سب علما و فضلا اور فلاسفر ہیں۔ معلومات کی یہ وسعت کہ ان کا سینہ جام جہاں نما ہے۔ جو نامہ نگار سر بکف ہو کر اور جنگوں کے معرکوں میں جا کر وقائع نگاری کرتے ہیں لاکھوں روپیہ سے اپنی پاکٹیں بھرتے ہیں۔ جنگ اُن کے حق میں گویا پیداوار کی فصل ہوتی ہے۔ اُن کے مقابلہ میں اب ہندوستان کے مرحوم اخبارات پر نظر ڈالئے گا تو یہ معلوم ہوگا کہ اصلی انسانوں کے مقابلہ میں اُن کی بھونڈی نقلیں یا مٹی کی تصویریں ہیں۔ یورپ میں کسی جدید اخبار یا رسالے کے نوٹس پر جب تک ۴۰ یا ۵۰ ہزار درخواستیں نہیں آجاتیں شائع نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں پُرانے پُرانے اخباروں کی دس پندرہ ہزار اشاعت گویا معراج ہے اور سیکڑوں اخبارات تو ایسے ہیں جن کے مالک خود ہی ایڈیٹر خود ہی منیجر، خود ہی پرنٹر، خود ہی کپازیٹر، خود ہی سنگ ساز اور ضرورت آپڑے تو لنگوٹا کسکر خود ہی پریس کی کل کھینچنے پر بھی چُست۔ آپ کاج مہا کاج ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ - خود رند سبو کش
خود بر سر آں کوزہ خریدار برآمد - بشکست و رواں شد

یہ تحریر مبالغہ نہیں بلکہ واقعی اور چشم دید ہے۔ اور ہم حوالہ دے سکتے ہیں، لیکن اس میں نہ غریب پریس کی اہانت ہے نہ اس کا کچھ قصور۔ بلکہ سارا قصور ملک کی ناتربیت یافتگی کا ہے جس ملک میں فیصدی بمشکل پانچ لکھے پڑھے خود سرکاری رپورٹ سے ثابت ہوں وہاں اخباروں کی کیا قدر۔ یہ پانچ فیصدی وہ طلبہ ہیں جو حال میں تعلیم پا رہے ہیں۔ دس پندرہ سال پیشتر کا ذکر نہیں جب کہ تعلیم کو وہ نمونہ تھا جو آج کل ہے۔ یعنی جہالت اور بھی زیادہ تھی۔ اس کے برعکس ولایت میں فیصدی ۹۵ لکھے پڑھے اور پانچ ناخواندہ۔ خود ہم سے میرٹھ کے سابق ڈسٹرکٹ جج مسٹر مارکم صاحب بہادر نے ہندوستانی پریس کی بابت یہ الفاظ فرمائے

تھے کہ "جب کسی کو افلاس سے شکست ہوتی ہے تو اخبار یا پریس جاری کر دیا جاتا ہے۔"

غور و انصاف سے دیکھئے تو ہندوستان میں اب تک ایک بھی ایڈیٹر اور انشا پرداز پیدا نہیں ہوا۔ اکثر اخباروں اور رسالوں کا لٹریچر دیکھکر ہنسی بھی آتی ہے، اور غصہ بھی۔ ہنسی تو اُن کی دکانداری دوڑ دھوپ پر، اور اپنے عیب کو ہنر سمجھنے پر، اور غصہ ملک کی نا قدر دانی اور بے حسی پر۔ یورپ میں اخبارات روحانی غذا ہیں۔ کان کھودنے والے اور گاڑیوں کے کوچبان تک اخبار خریدتے ہیں۔ جیل کے قیدی تک غل مچاتے ہیں کہ ہم اخبار نہ دیکھیں گے تو مر جائیں گے۔ ہمارے کھانے پینے میں جتنی چاہو کھینچ کرو مگر اخبار دیکھنے کی آزادی نہ چھینو۔ اللہ اللہ اخباروں کی یہ قدر!

ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کا مقابلہ اہل یورپ کی تعلیم و تربیت سے کیا جائے تو اخباروں کی موجودہ حالت نسبتہً ترقی پر نظر آئے گی۔ یورپ کی چند صدی قبل کی تعلیمی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی۔ اگر ہندوستان میں زیر سایہ برٹش تعلیم و تربیت ترقی کے زینے پر اسی طرح پہنچتی رہی تو نہ صرف چند صدی بلکہ ایک ہی صدی میں کچھ کی کچھ ہو جائے گی۔ دیسی پریس ابھی طفلانہ حالت میں ہے۔ وہ خبروں میں، تاروں میں، مضامین میں انگریزی اخباروں اور جرنلوں کا کاسہ لیس ہے اور اس کو فخر سمجھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس کے پاس سرمایہ نہیں۔ اور سرمایہ اس وقت ہو کہ پبلک حوصلہ بڑھائے، اور قدر دانی کرے۔ نہ ابھی تک اعلیٰ درجے کے انشا پرداز پیدا ہوئے۔ اور ترقی اُسی فن کو ہوتی ہے جس میں معاش کو ترقی ہو۔ جو مالکان اخبار نسبتہً وسعت رکھتے ہیں، وہ انشا پردازی اور لٹریچر کی ترقی میں رقم کیا معنی کوڑی بھی خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اخبار کو اپنا ذاتی مال بنا رکھا ہے نکہ پبلک کا مال۔ اخبار اُن کے اپنے خیالات سے پُر ہوتا ہے نہ کہ پبلک خیالات سے۔ اور ہندوستانیوں کے طبائع مختلف ہیں۔ پس اخباروں میں پبلک خیالات کی اشاعت کی ضرورت ہے۔ ترقی نہ کرنے کی ایک قوی وجہ یہ بھی ہے۔

اس معاملہ میں ہم اپنے پیارے ہونہار ادیب کو مستثنیٰ اور فرد پاتے ہیں کہ اس میں کیسے کیسے جادو نگار اور انشا پرداز جمع ہیں اور کیسے کیسے سوشیل اور نیچرل مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ کہ اول سے آخر تک پڑھ جائیے مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی اور "العطش العطش" اور "ہل من مزید" کی صدا لگاتی ہے۔ پھر چھپائی۔ کاغذ۔ خوشخطی اہل کمال اور عمائد و رؤسا کی دلکش تصاویر الغرض دلچسپیوں کے کل سامان موجود۔ بایں ہمہ حجم ۶۰ صفحات۔ پیٹ بھر کر ہر قسم کے دلکش مضامین۔ اس سے مالک کی نیک نیتی اور اُسکی پبلک فیاضی کا اچھی طرح پتہ لگ سکتا ہے۔ پھر ادیب جو دلہن کی طرح آراستہ ہو کر نکلتا ہے تو وہ مالک کے ارمانوں کی شہادت دے رہا ہے کہ پبلک اپنی فیاضی اور قدر دانی کا جس قدر ہاتھ بڑھائے گی میں اس عروس نو کی مشاطگی کر کے اُسی قدر اس کا حسن و جمال بڑھاوں گا۔ اس سے بڑھکر مالک کے خلوص کا اور کیا ثبوت ہوگا۔

اگرچہ ہمکو یقینی طور پر معلوم ہے کہ ادیب میں ابھی تک آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی بھی طاقت نہیں آئی مگر مالک کی ہمت کے دم خم وہی ہیں۔ کیا طاقت ہے کہ اولوالعزمی ماتھے پر چین بھی آنے دے بلکہ اپنی شے کے عمدہ بنانے پر اُس کے دل کی اوج موج بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اُنکا عمل انجیل مقدس کے اس مقولے پر ہے کہ "آسمان بھی اُنھیں کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں"۔ اور لارڈ بیکنسفیلڈ آنجہانی کا یہ قول اسکو یاد ہے کہ "استقلال کامیابی کی عمدہ دلیل ہے"۔ ادیب انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اب تمام ناظرین ادیب کا فرض ہے کہ حتی الوسع دو دو نئے خریدار اپنے ادیب کے لئے پیدا کر کے سیلف ہیلپ کا کرشمہ دکھائیں اور مالک کی ہمت بڑھائیں۔

شوکت میرٹھی

سری کرشن کا بچپن

انڈین پریس الہ آباد

خوفِ رُسوائی

(۱)

ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں ایک نازک اندام نفیس پوش عورت میز کے سامنے رخساروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔ مگر ظاہرا اس خیال میں غور کی محویت نہیں ہے۔ بلکہ بے چینی اور انتشار۔ اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار اُس کے حسین چہرے پر نمودار ہیں۔

سرلا۔ بابو دھرن چودھری کی بیوی تھی۔ دھرن کلکتہ کے ایک ہونہار بیرسٹر تھے۔ خلیق اور غریب نواز فیشنبل سوسائٹی سے محترز رہنے والے۔ نہ بال سے رغبت۔ نہ گھوڑ دوڑ کے شیدا۔ وہ تھیٹروں اور پولیٹکل جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ ان کی اوقات کا بیشتر حصہ اپنے مقدمات کی تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا۔ جہاں تکلف اور ظاہرداری کے بدلے خلوص اور دوستی کے مراسم برتے جاتے تھے۔ دھرن کو فیشن سے انتہا درجہ کی نفرت تھی۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ کا ہر ایک گوشہ پولیٹکل خبروں سے گونج رہا تھا۔ مگر دھرن کو اُنسے صرف اتنی ہمدردی تھی کہ اخبارات میں اُن کا تذکرہ دیکھ لیا کرتا۔ پولیٹکس سے اُسے مناسبت نہ تھی وہ اپنے دوستوں میں ایک سیدھا سیلیم الطبع۔ صلح پسند۔ میانہ رو۔ خوش باش آدمی مشہور تھا۔ اس کے برعکس سرلا نیشنلسٹ عقائد کی عورت تھی۔ اُس نے اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم پائی تھی اور ہندوستان کے پولیٹکل اور اقتصادی معاملات سے اُسے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک بار وہ اپنے کالج کی لیڈی پرنسپل سے صرف اس بنا پر جھگڑ پڑی کہ لیڈی صاحبہ نے برسبیل تذکرہ ہندوستانی عورات کے متعلق زبان سے کچھ اہانت آمیز کلمات نکالے تھے۔ آزادی نسواں کے متعلق بھی اس کے خیالات بہت وسیع تھے۔ باوجود ان اسباب کے وہ ہندوستانی محبت اور جذبات کی عورت تھی۔ وضع کی پابند شوہر کی ادب اور محبت کرنے والی۔

سرلا سوچتی تھی "کیا یہ ممکن ہے؟" "انھیں ان معاملات سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ یہ سب کسی بدخواہ کی شرارت ہے۔ کسی سیہ باطن شخص نے یہ دروغ اختراع کیا ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں۔"

(۲)

حقیقت یہ تھی کہ آج پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کئی کانسٹبلوں کے ساتھ دھرن بابو کے مکان کی تلاشی لی تھی۔ منگل کے روز چار بجے شام کو ہیریسن روڈ کے کنارے ایک نوجوان بنگالی نے ایک انگریز افسر پر بم گولہ چلایا تھا۔ اس ہولناک حادثہ نے سارے شہر میں کھلبلی ڈال دی تھی۔ خانہ تلاشیوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ دھرن بابو پر اس قتل کی اعانت کرنے کا جرم لگایا گیا تھا جو شخص سنتا اُسے حیرت ہوتی۔ دھرن بابو! نہیں۔ وہ ہرگز ایسے معاملوں میں شریک نہیں ہو سکتے!۔ وہ ایسے سیدھے سادے۔ سلامت پسند۔ اپنے کام میں شب و روز محو رہنے والے آدمی تھے کہ کسی کو اُن کے متعلق ایسی متوحش خبر سنکر اعتبار نہیں آتا تھا اور دھرن بابو پر یہ شبہ محض ایک مخبر کے بیان کی بدولت عائد ہوا تھا۔ مخبر نے صاف صاف کہا تھا کہ منگل کو چار بجے دھرن بابو ہیریسن روڈ پر موجود تھے۔ اور اُنھوں نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے

بم گولہ دیا تھا۔ اسی بیان کی بدولت آج دھرن بابو کی خانہ تلاشی ہوئی۔ صندوق۔ الماریاں، کاغذات، خطوط ایک بھی تفتیش کنندہ افسر کی متجسّس نگاہوں سے نہ بچا۔ اور باوجودیکہ کوئی ثبوت ایسا نہ ملا جس سے دھرن بابو پر اعانت جرم کے شبہ کی تائید ہو سکے۔ تاہم سپرنٹنڈنٹ نے انھیں زیر حراست لے لیا۔ سرلا انھیں پریشان کرنے والے واقعات کے اثر سے اس وقت بے چین ہے۔

وہ خیال کرتی تھی "ضرور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے غلطی ہوئی اُس نے دھوکا کھایا۔ منگل کو چار بجے دھرن عدالت میں ہوں گے، عدالت سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ اُن کے موکل اور احباب اسکی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر دھرن نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو اپنی بریت کا ثبوت کیوں نہ دے دیا۔ ممکن ہے اس وقت گھبراہٹ میں انھیں خیال نہ رہا ہو۔ اب ضرور انھوں نے صفائی کر لی ہوگی اور غالباً آتے بھی ہوں گے۔"

ان خیالات سے سرلا کا دل ذرا ہلکا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک موٹر کار دروازہ پر آ کر رُکی۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ مسرّت سے بیتاب ہو کر زینہ سے نیچے اُتری۔ موٹر گھر ہی کا تھا۔ مگر اس میں دھرن بابو کے بجائے جوتندر و بیٹھے ہوئے تھے۔ جو دھرن کے دلی دوستوں میں تھے۔

سرلا نے پوچھا "دھرن کہاں ہیں۔ دیکھا پولیس والوں نے کیسی حماقت کی ہے۔ تم جانتے ہو منگل کے دن شام کے وقت وہ ہائی کورٹ میں تھے۔ کیوں صفائی ہو گئی نہ۔ کب تک آئیں گے؟ تم اُن سے ملے تھے؟"

جوتندرو کے چہرہ نے سرلا کے خیال کی تائید نہیں کی۔ وہ فکرمند اور دردناک نگاہوں سے سرلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے گھبرا کر کہا "جوتن! تم اس قدر پریشان کیوں ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔؟"

جوتن نے کچھ سوچ کر جواب دیا "شاید دھرن آج شب کو نہ آ سکیں۔ ممکن ہے کچھ توقف ہو۔ جونہی ان کی صفائی ہو گئی۔ غالباً ان کا تم سے ملنا ضروری ہے۔ میں خیال کرتا ہوں۔۔۔" یہ کہتے کہتے جوتن بابو رک گئے۔ سرلا تاڑ گئی کہ یہ کوئی منحوس خبر لائے ہیں۔ گھبرا کر بولی "جوتن! مجھے اس وقت پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہو۔ مجھ میں اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کیا دھرن ابھی رہا نہ ہو سکیں گے۔ کیا انھوں نے اپنے بریت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ وہ منگل کو چار بجے عدالت میں تھے۔ میرے خیال میں یہ تو بہت کافی ثبوت تھا۔"

جوتندرو نے لمبی سانس لیکر کہا "وہ منگل کے دن سہ پہر کو وہ عدالت میں نہیں تھے۔"

سرلا "کیا! عدالت میں نہیں تھے۔ آخر تب کہاں تھے؟

جوتندرو "یہی تو وہ بتلاتے نہیں۔"

سرلا "کیوں آخر وجہ؟ کیا آپ ہی اپنے دشمن ہو گئے ہیں؟"

جوتندرو "وہ مطلق کچھ نہیں ظاہر کرتے۔ عدالت میں ان کے ۲ بجے تک رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کرایہ کی گاڑی میں بیٹھکر کہیں گئے۔ مگر کہاں گئے اور ۲ بجے سے ۶ بجے تک کہاں رہے۔ اس کا وہ کچھ بھی پتہ نہیں دیتے۔"

سرلا نے عالم وحشت میں سر کو ہاتھوں سے تھام کر کہا "میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ دھرن کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس سازش میں شریک ہوں۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے کہیں تب بھی مجھے اعتبار نہیں آ سکتا۔ گر وہ صاف صاف حقیقت حال کیوں نہیں کہتے۔ کیا تم لوگوں نے انھیں سمجھایا نہیں"؟

جوتندرو "سمجھایا کیوں نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے سر مغزنی کرتے

رہے۔ مگر جب کچھ ان کے خیال میں آئے۔ اور وہ ایسے کم فہم نہیں ہیں کہ ہمکو اُن کے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ یہ ایسے نازک موقع پر اُن کا کچھ صاف صاف نہ کہنا کیسے خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں بلا سے میں چند سالوں کے لئے جلاوطن ہو جاؤں گا۔ جلاوطنی اور قید جھیلنے کے لئے آمادہ ہیں مگر منگل کو کہاں تھے۔ یہ نہیں بتاتے۔ اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید کچھ تمہیں معلوم ہو۔ کچھ معلوم ہے؟ وہ زیادہ تر کہاں آتے جاتے ہیں"؟

سرلا نے سر ہلا کر جواب دیا "میں نے انھیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو اب تک اسی خیال سے خوش تھی کہ منگل کو چار بجے وہ ضرور کچہری میں رہے ہوں گے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر وہ کیوں خاموش ہیں۔ کیا سمجھے ہوئے ہیں، ذرا مجھے اُن کے پاس لے چلو۔ شاید وہ مجھسے کچھ اپنے دل کی بات کہیں۔ ضرور کہیں گے۔ میں انھیں سمجھاؤں گی مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زبان سے حقیقت حال سن لوں گی۔ وہ میری درخواست کو رد نہیں کر سکتے۔ بس مجھے اُن کے پاس لے چلو"۔

سرلا کا گلا بھر آیا۔ جوتندر تسکین دہ لہجہ میں بولے "میرا بھی یہی خیال ہے کہ شاید تم سے وہ کچھ بتلائیں۔ اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ مگر اب رات زیادہ آگئی ہے۔ اور اس وقت اُن سے ملاقات کرنے کی کوشش فضول ہے۔ مجسٹریٹ کی اجازت ملنی مشکل ہوگی۔ میں کل تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ ایشور نے چاہا تو سب اچھا ہی ہوگا۔ ہائیں! یہ کیا۔ دل کو ڈھارس دو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے"۔

سرلا کی آنکھوں میں اشک اُمڈے ہوئے تھے۔ مگر اُس نے ضبط کیا۔ اور جوتن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "جوتن! تمہاری ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ مگر میں انھیں فراموش نہیں کر سکتی"۔

سرلا کی آواز پھر رک گئی۔ وہ کیسی خوش خوش زینے سے اتری تھی۔ دھرن کی واپسی کی امید نے اُس کے چہرہ کو روشن کر دیا تھا۔ مگر اب اس پر حسرت و یاس کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جوتن بابو آہستہ آہستہ فکرمند کمرہ سے باہر چلے گئے۔ وہ سوچتے جاتے تھے "غریب! ابھی اُسے کیا خبر کہ کیا بیتنے والی ہے۔ کاش وہ ظالم اپنی زبان سے کچھ کہدیتا۔ مگر تب بھی۔ عجیب گومگو کا معاملہ ہے"۔

(۴)

دس بج گئے تھے۔ سرلا نے کچھ نہیں کھایا۔ نوالے منہ سے باہر نکلے آتے تھے۔ وہ پلنگ پر گئی۔ مگر نیند نہ آتی تھی۔ میز کے سامنے اخبار لے کر بیٹھی۔ مگر اخبار ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھڑکی کی طرف۔ تب وہ اٹھکر ٹہلنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت دھرن کے پاس چلوں۔ چلکر مجسٹریٹ سے کہوں کہ مجھے اُن سے ملاقات کرنے دو۔ کیا وہ انکار کرے گا؟

ہائے۔ دھرن اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ کاش میں انکے پہلو میں ہوتی۔ کیا وہ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپائیں گے۔ کیا اس وقت انھیں میرا خیال ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا دل جھنجھلا اُٹھتا اور وہ اپنے شوہر کو بے رحم خیال کرتی۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ میں کس قدر بے چین ہوں۔ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے پر بھی انھیں میرے دل کا اور میری محبت کا اندازہ نہوا۔ وہ کیوں خاموش ہیں۔ آہ کیوں۔

ٹہلتے ٹہلتے اُس کی نگاہ دھریندر کی میز پر پڑی۔ خطوط۔ کاغذات۔ اخبارات اوراق پریشان کی طرح بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ سرلا اضطراری طور پر بیٹھ گئی۔ اور انھیں سمیٹنے لگی یکایک اس کی نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو میز کے نیچے گرا ہوا تھا۔

اس نے چاہا کہ اسے اٹھاکر دوسرے خطوط کے ساتھ رکھ دے۔ مگر اس پرزے پر چند ایسے الفاظ نظر آئے جو خود بخود اُسکی آنکھوں میں چبھ گئے۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کے پردہ میں اس کی پریشانیوں کا راز پوشیدہ تھا۔ "منگل کے دن ۸ بجے"! سرلا چونک پڑی۔ اُس نے پرزے کو اٹھالیا۔ منگل کے دن ۸ بجے ہی کا تو یہ واقعہ ہے۔ اُس نے اِن الفاظ کو پھر غور سے دیکھا۔ کیا اس پرزہ کو ان واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ کیوں میں نہ اُسے پڑھوں۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ انداز تحریر سے بھی وہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ مگر خط کو پڑھوں؟ سرلا باوجودیکہ شوہر کو دل وجان سے چاہتی تھی۔ لیکن انگریزی تعلیم کے اثر نے اُس کے دل میں یہ خیال قایم کر دیا تھا کہ مجھے اپنے شوہر کے پوشیدہ خطوط پڑھنے کا کوئی مجاز نہیں ہے کیا میں اس خط کو پڑھ لوں تو وہ مجھسے ناراض ہوں گے۔ یقیناً اس سے ان معاملات پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی اس میں کوئی ایسی بات ہرگز نہیں ہوسکتی جو دھرن مجھسے چھپانا چاہتے ہوں۔ بالفرض اس میں کوئی مخفی بات ہی ہو۔ تاہم میں اس وقت اسے پڑھنے کی مستحق ہوں۔ تہذیب جدید کی یہ قیدیں ایسے نازک موقعوں پر عمل میں نہیں آسکتیں۔ کیا مجھے اُن کے رازدار بننے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ میں ثابت کر دوں گی کہ میرے دل میں بھی باتیں اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں جس طرح اُن کے دل میں۔

اس نے خط کھولکر دیکھا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ سرلا ایک ہی نگاہ میں اُسے پڑھ گئی۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا گویا میرے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت ہوگئی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ میں کاغذ کا وہ پرزہ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں دیوار کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کا چہرہ خاک کی طرح زرد ہوگیا تھا عضو مفلوج کی طرح اس کے دل ودماغ اس وقت بیکار ہو گئے تھے خط کا مضمون بھی خیال میں نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ یکایک اس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اور ساری کیفیت نظروں کے سامنے صورت پذیر ہوگئی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس کی۔ اور کرسی پر گر پڑی آہ اِس خموشی کے یہ معنی ہیں! اسی لئے زبان پر مہر لگی ہوئی ہے" خیر۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ سرلا سوچنے لگی۔

بیشک یہ خط دھرن کو اس الزام سے بری کر دے گا۔ جو اُن پر عائد ہے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ میں اِسے مجسٹریٹ کے سامنے رکھدوں گی۔ ذرا سی تحقیقات میں سارے واقعات کھل پڑیں گے۔ اور دھرن فوراً رہا ہو جائیں گے۔ لیکن اُس کے بعد پھر کیسے نبھیگی! کیا اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کی محبت کرسکیں گے۔!"

اسے پھر خیال آیا۔ کیا یہ مناسب ہے کہ میں اس راز کو اس طرح طشت از بام کر دوں جن کے مخفی رکھنے کے لئے دھرن یہ سب کچھ جھیلنے کو تیار تھے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں خموشی اختیار کروں۔ اور انھیں اس الزام کا خمیازہ اٹھانے دوں جس سے وہ بالکل پاک ہیں۔ انھیں بچانا میرا فرض ہے۔ آخر اُس کے دل نے فیصلہ کرلیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرہ میں آکر ایک چادر اوڑھ کر باہر نکل پڑی۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اُسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

سرلا قدم بڑھاتے ہوئے تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت مکان کے سامنے آکر رکی کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور ایک عورت میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھتی دکھائی دیتی تھی۔ سرلا کو دیکھتے ہی اس عورت گھبرا کر

پوچھا "سرلا! تم یہاں کہاں؟ اتنی رات گئے۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا دھرن بیمار تو نہیں ہیں؟"

سرلا نے میز کے سامنے آکر کہا "کیا تم نے نہیں سُنا کہ دھرن پر حادثہ بمب میں شریک ہونے کا جرم عائد ہوا ہے۔ مخبر کا بیان ہے کہ جس وقت قاتل کے ہاتھ میں بمب دیا گیا اُس وقت دھرن وہاں موجود تھے۔ یہ منگل کے چار بجے دن کا واقعہ ہے دھرن کا بیان ہے کہ مجھے ان سانحات کا مطلق علم نہیں۔ اور نہ اُس وقت میں وہاں تھا۔ لیکن یہ وہ نہیں بتاتے کہ اُس وقت تھے کہاں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں منگل کے دن چار بجے شام کو وہ کہاں تھے؟"

وہ عورت چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی "منگل کو چار بجے!۔ اُس دن تو وہ ... " کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بہت مدھم لہجہ میں بولی "کیوں وہ کچھ بتاتے نہیں کیا۔ سوا کچہری کے اور کہاں ہوں گے!"

سرلا نے جواب دیا "نہیں اُس دن وہ عدالت میں نہیں تھے" مگر ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ اُگل پڑی "اور اس معاملہ میں وہ اس لئے خاموش ہیں کہ شاید اظہار حال کسی کے نام نیک پر دھبہ لگادے اب میرے سامنے ایسی بھولی نہ بنو۔ میں سب جان گئی ہوں۔ ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو" یہ کہکر اس نے وہی خط میز پر پھینک دیا۔

اس عورت نے لپک کر خط اُٹھا لیا۔ اور اس پر اُٹھتی ہوئی نگاہ ڈالکر کسی قدر بیباکانہ لہجہ میں بولی "مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔ بیشک دھرن کو مجھ سے محبت ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے!"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ تب سرلا نے حکمانہ انداز سے کہا "تو تمھیں بچا کیوں نہیں لیتیں۔ اس خط کو مجسٹریٹ کے پاس بھیجدو۔ اور دھرن فوراً چھوٹ جائیں گے"۔ یہ کہکر وہ لوٹ پڑی۔ اور اپنے خانۂ محزون میں چلی آئی۔

تڑکا ہو گیا تھا۔ اور سرلا کی آنکھیں ابھی نہیں جھپکی تھیں۔ اسے اب دھرن کی رہائی کی فکر نہ تھی اس فکر سے اب وہ آزاد ہو گئی تھی۔ مگر جن فکروں نے اس وقت اسے گھیرا تھا وہ اس سے بھی زیادہ جانکاہ تھیں۔

"تھوڑی دیر میں وہ یہاں آتے ہوں گے۔ مجھ سے ملاقات ہو گی کیا میں ان سے مل سکوں گی؟ اب میں کس دعوے پر۔ کس برتے پر اُن سے ملوں گی۔ جب یہ میں جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہے۔ تو میں کونسا منہ لیکر ان کے سامنے جاؤں گی جب تک میں الفت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُن پر اعتبار تھا۔ مگر اب! آہ اب میرے لئے زندگی میں کیا امید ہے میرا دل۔ میری جان میری آرزوئیں۔ میری زندگی کی خوشیاں سب ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ محبت سے عورت کا سہاگ قائم ہے میرا سہاگ اب کہاں!"

سرلا کی آنکھیں کھڑکی کے باہر سبزہ زار کی طرف لگی ہوئی تھیں گویا وہ مستقبل کے وسیع میدان میں قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اُسکے دماغ میں اب احساس کا مادہ نہ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس۔ نیند اور تکان۔ یہ ضرورتیں اسے بالکل محسوس نہ ہوتی تھیں۔ سست رفتار دن چڑھتا جاتا تھا اور سرلا وہیں کھڑکی کے سامنے انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھرن کی اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ مگر سرلا کو اس کی زیادہ تشویش نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ ایک حلیم اور متین شخص سمجھتی رہی۔ اُس نے بارہا اُن سے اُن کی بے نمکی اور بے اعتنائی کی شکایت کی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کے دلکو تسکین ہو گئی تھی کہ ان کی طبیعت ایسی متین واقع ہوئی ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ طبعاً اظہار جذبات سے محترز رہتے ہیں وہ اس کی طرف سے ہمیشہ بے تعلق سے رہتے تھے۔ کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ کن چیزوں کا شوق ہے ایسا شاذ ہی کبھی اتفاق ہوا تھا کہ وہ دُرگا پوجا کے دن سرلا کے لئے کوئی تحفہ لائے ہوں۔ سرلا سمجھتی تھی کہ مقدمات کی مصروفیت

اِن بے اعتنائیوں کا باعث ہے۔ اسے یقین تھا کہ گو ظاہر نہ سہی۔ مگر دل سے وہ میری محبت کرتے ہیں۔ مگر اب اِن سرد مہریوں کا راز سمجھ میں آگیا۔ وہ اب دوسری عورت کے دام محبت میں گرفتار ہیں۔ جب محبت کا رشتہ نہ رہا تو تمدنی رشتہ کس کام کا مگر باوجود ان سرد مہریوں کے وہ شوہر کی محبت میں مخمور تھی۔ اُس نے انھیں اپنے دل میں جگہ دیدی تھی اور اب کسی طرح ہٹا نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ محبت اُس کے لئے سوہان روح ہی کیوں نہ ہو۔ بیشک یہ خیالات حسد اور جلن کے سبب سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر حسد کی تیزی اور جانکاہی محبت کی کسوٹی ہے۔

بہت دور تک سوچنے کے بعد سرلا اِس نتیجہ پر پہنچی "میں اب ان کا دامن چھوڑ دوں گی۔ اس کے سوا میرے لئے اب اور کوئی تدبیر نہیں ہے میں نے اب تک نادانستہ انھیں قید جبر میں رکھا ہے اب میں انھیں چھوڑ دوں گی۔ اُن کا گلا چھوٹ جائے گا۔ اُنکی زندگی آرام سے گذرے گی۔ ایشور کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ سرسبز رہوں۔ انھیں خوش دیکھکر میں بھی خوش ہو لیا کروں گی"!

انھیں خیالات میں دس بج گئے۔ سرلا اب تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک ایک گاڑی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دھرن بیٹھے ہوئے تھے۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ مگر وہ بے جان لاش کی طرح بیٹھی رہی۔ زینہ پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور ذرا دیر میں دھرن کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرلا اب بھی کچھ نہ بولی۔ اُسے الفاظ ہی نہ ملے دھرن نے اُس کے پاس آکر آغوش محبت میں لینا چاہا۔ اور بولے "کیوں سرلا تم میری خاطر بہت پریشان تھیں"؟ سرلا نے منہ پھیر لیا اور ہٹ گئی۔ دھرن نے کچھ خیال نہ کیا۔ کہنے لگے "پولیس والوں نے کیسی حماقت کی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ کسی طرح خانہ عافیت میں تو پہنچے۔ رات بھر مصیبت میں مبتلا رہا"۔

سرلا خاموش اُن کے چہرہ کی طرف تاکتی رہی۔ کیسی مکر کی باتیں ہیں۔ دھرن کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی بے تکلفی وہی آزادی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سرلا زیادہ متحمل نہو سکی۔ ترش لہجہ میں بولی "تم یہاں کیوں آئے؟" دھرن نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا "سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ اپنے گھر کے سوا اور کہاں جاتا۔ تم میرے آنے سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کیا بات ہوئی؟"

سرلا "ابھی اُس سے ملاقات کی یا نہیں۔؟"

دھرن "کس سے؟ تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا"۔

سرلا "دھرن۔ اب یہ تجاہل مت جتاؤ۔ اب حیلہ سازیوں کا موقع نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں صفائی کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔ مجھپر تمہاری ساری باتیں روشن ہو گئیں ہیں۔ ایک خط میری نظر سے گذر چکا ہے جو مجھے میز کے نیچے گرا ہوا ملا۔ یہ خط میں نے تمہاری معشوقہ کو دکھایا۔ اور غالباً اُسی نے اسے مجسٹریٹ کے یہاں پیش کر دیا اس لئے اب مجھ سے دخل فصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری خوشی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمھیں شوق سے لطف زندگی اٹھانے کے لئے آزادی دیتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں مجھے اور پہلے کیوں نہ معلوم ہو گئیں ورنہ تمھیں اتنے عرصہ تک قید بے جا میں نہ رہنا پڑتا"۔

دھرن بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر راز طشت از بام ہو گیا۔ میں نے کیا حماقت کی کہ خط کو چاک نہ کر دیا۔ اس نے وہ خط مجسٹریٹ کے یہاں دیکھا تھا۔ اور حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا کہ کیونکر یہ وہاں پہنچا۔ مگر یاد نے کچھ کام نہ دیا تھا۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اوپر جھنجلایا۔ مگر سرلا کی خوشامد کرنے لگا "میری جان! میں سخت نادم ہوں۔ واقعی مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر کیا تم میری اِس خطا کو

معاف نہیں کر سکتیں۔ اگر کسی کے کان میں اس کی ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری خیر نہیں۔ ابھی تک یہ بھید چھپا ہوا ہے مجسٹریٹ بڑا دانا شخص ہے۔ اُس نے خط کو دیکھکر مجھے تو رہا کر دیا۔ مگر اُسے عدالت میں پیش نہیں کیا۔ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے مگر تم خوب جانتی ہو کہ لوگوں کو ایسی باتوں کی کیونکر تلاش رہتی ہے۔ پبلک کو دوسروں کی رسوائی و بدنامی میں مزہ آتا ہے۔ میری خاطر سے تم اس تذکرے کو زبان پر نہ لاؤ۔ غلطیاں انسان سے ہوتی ہی ہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو حلفیہ کہتا ہوں کہ اب کبھی اُس کے دروازہ پر نہ جاؤں گا"۔

سرلا "کیوں تم اُس پر عاشق نہیں ہو؟۔ اس کی آبرو کے خوف سے تم قید اور جلاوطنی جھیلنے پر آمادہ تھے۔ اور اب تم کہتے ہو میں اُس کے دروازے پر نجاؤں گا۔ کیا اتنی جلد دل سے نقش محبت مٹ گیا۔! ان فریب کی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تم شوق سے خوشیاں مناؤ۔ میں ذرا بھی مخل نہوں گی۔ حسد کا کانٹا میں کسی کے پہلو میں کھٹکنا نہیں چاہتی"۔

دھرن کرسی پر بیٹھ گئے اور غمناک لہجہ میں بولے "سرلا! ایسی باتیں بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہیں۔ جب تم دیکھتی ہو کہ میں حد درجہ نادم اور پشیمان ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ تو تمھیں ایسی باتیں کر کے میرا دل نہیں دکھانا چاہئے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے میں کس حد تک نقصانات اٹھانے کے لئے تیار تھا۔ اگرچہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر مجھے جلاوطن ہونا گوارا تھا بجائے اس کے کہ منگل کے دن اپنے حرکات کا پتہ دوں۔ اب تک طرح طرح کی افواہیں اڑتی ہوتیں۔ یقین مانو اس رسوائی کے مقابلہ میں۔ میں جلاوطن ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔

سرلا "اگر راہ محبت میں قدم رکھا ہی تو رسوائی کا کیا خوف! اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمھیں سوسائٹی کا اس قدر خوف نہ کرنا چاہئے"۔

دھرن "کیسی باتیں کرتی ہو۔ سرلا! سوسائٹی کا خوف خدا کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم نے یہ روش اختیار کی تو میری عزت خاک میں ملا دوگی۔ اور میرا استقبل سیاہ ہو جائے گا میں سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ سرلا۔ تم اس وقت غصہ میں ہو مگر جب تمہاری طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔ غصہ فرو ہو جائیگا اور تم اس مسئلہ پر غور کروگی تو یقیناً میری خطا معاف کر دوگی۔ ایسی بہت کم عورتیں ہوں گی جنھیں اپنی زندگی میں ایسی گتھیاں نہ سُلجھانی پڑتی ہوں۔ میں مبالغہ نہیں کرتا ہوں۔ سوسائٹی میں ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر پردہ کے اندر۔ میں دوسیر کا شیدا سہی۔ کیا تمھیں بھی میری محبت نہیں۔ اُسی محبت کے صدقے تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب پھر ایسا موقعہ کبھی نہ آئے گا"۔ یہ کہکر دھرن باہر چلے گئے۔ اور سرلا وہیں خاموش بیٹھی سوچتی رہی "سوسائٹی کا شیرازہ ایسے کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہے"!

د۔ ر

بیجک کبیر صاحب (ہندی) اسلام اور ہندو مذہب یا توحید و شرک کی جب ہندوستان میں مڈبھیڑ ہوئی تو بعض ہندو بزرگ اسلام کے غلبہ اور تاثیر سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ کوشش کی کہ ہندو مذہب کی زمین میں توحید و تصوف کا باغ لگایا جائے۔ ان بزرگوں میں سے بھگت کبیر اور باباگرونانک بہت مشہور ہیں۔ یہ بیجک کبیر صاحب انہی نادر خیالات کا مجموعہ ہے جسکو بابا دری احمد شاہ صاحب ساکن ہمیرپور نے مرتب کیا ہے۔ شمالی ہند کے عوام میں کبیر صاحب کے بیجک کو وہی درجہ حاصل ہے جو مثنوی مولانا روم کو اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں میں ہم امید کرتے ہیں کہ بابا دری صاحب اس کا اردو ایڈیشن بھی شائع کریں گے قیمت عہ

مولوی سیّد احمد صاحب دہلوی

مولوی سیّد احمد صاحب اپنی بہترین تالیف "فرہنگ آصفیہ" کی وجہ سے علمی دنیا میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت بسیط، ضخیم، جامع، اور مستند اردو لغت ہے۔ آپ سے پیشتر کسی اہل زبان نے اس اہم کام کی طرف برائے نام بھی توجہ نہیں کی۔ جس کے سبب اردو زبان ایک نامکمل اور ادھوری زبان خیال کی جاتی تھی۔ آپ نے چونکہ تقریباً اپنی تمام عمر اسی کی تحقیق میں صرف کر دی، اور اردو دنیا پر ایک غیر معمولی احسان فرمایا، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کا مختصر علمی تذکرہ "ادیب" میں شائع کر کے بادہ نوشان بزم اُردو کو ذوق روحانی حاصل کرنے کا موقع دیں:-

مولانا موصوف نویں محرم ۱۲۶۲ھ مطابق ۸ جنوری ۱۸۴۶ء کو بمقام دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے، اور شاہ صابر بخش کے باغ واقع فیض بازار میں ہوش سنبھالا۔ آپ مولوی حافظ سیّد عبد الرحمن صاحب مرحوم خلف مولوی سید خواجہ علی صاحب مغفور کے بیٹے ہیں۔ آپ کے جدّی بزرگوار سادات و علمائے بخارا سے حسنی و حسینی سیّد اور حضرت غوث پاک رح کی اولاد امجاد سے ہیں۔ ننھیالی بزرگوار حضرت موت واقع یمن۔ (ملک عرب) سے اولاد و احفاد جناب امام جعفر صادق تبیلہ بالفقیہہ کی نیک یادگار ہیں، جنھیں ہمایوں بادشاہ کی وفات پر اس کی چاہتی ملکہ (نواب حمیدہ بانو عرف حاجی بیگم والدہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند) کمال ارادت و عقیدت سے باجازت سلطان روم حج سے واپس ہوتے وقت ۹۴۹ھ ہجری میں تیمناً اپنے پیارے خاوند کی فاتحہ خوانی کے واسطے ہمراہ لے کر آئی تھی۔ اور ان بزرگوں کے نام سے ایک بستی موسوم "عرب سرائے" ہمایوں بادشاہ کی قبر کے پاس آباد کر دی۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُس قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بنوا دیا۔ آپ کے ماموں حاجی مولوی سیّد عبد اللہ بالفقیہ صاحب رئیس شملہ و دہلی ایک بڑے مہمان نواز، امیر، پارسا و عابد مشہور امصار و دیار ہنوز زندہ و سلامت ہیں۔ عبادت الٰہی سے کام ہے۔ ہر وقت اصلاح حال و تزکیۂ باطن میں مصروف رہتے ہیں۔ حاجی صاحب کے پاس وہ قابل زیارت شجرہ اب تک موجود ہے، جو ان کے بزرگوار عرب سے لیکر آئے تھے۔

مولوی سیّد احمد صاحب نے درسی کتابیں بڑے بڑے اساتذہ سے گھر پر اور سررشتۂ تعلیم کی کتابیں مختلف سرکاری مدارس اور نارمل اسکول دہلی میں پڑھیں۔ تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے رہا۔ بالخصوص اُردو زبان کی تدوین پر جان و دل سے مائل و فریفتہ رہے۔ زبان اُردو کے شعرائے ماضی و حال کا کلام مدتوں دیکھا۔ شہزادگان دہلی و نیز نامی گرامی علما، فضلا، حکما اور شعرا کی صحبتوں میں بھی بیٹھے۔

ایام طالب علمی میں ایک فارسی منظوم طفلی نامہ اور ایک انشائے تقویت الصبیان۔ بقید تلازمہ اُردو میں تصنیف کی چنانچہ یہ انشا اُسی زمانہ (۱۸۶۹ء) میں دہلی سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۸۶۹ء میں ایک رسالہ کنز الفوائد (یعنی مناظرۂ تقدیر و تدبیر) تصنیف کر کے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر گورنمنٹ کی طرف سے دو سو روپیہ کا انعام مرحمت ہوا۔ اور اول مرتبہ

سرکاری خرچ سے یہ کتاب چھپکر مشتہر ہوئی، اور مصنف کو بھی بہت سی جلدیں عطا کی گئیں۔

آپ کو اپنے زمانۂ تعلیم سے یہ دھن لگی ہوئی تھی، کہ کوئی اردو کی مکمل مصطلحات یا کامل لغات جمع کی جائے۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں خدا پر بھروسہ کرکے یہ کام شروع کردیا۔ کنز الفوائد کے انعام نے اس کام کے حق میں آب حیات کا کام دیا۔ مصنف کی ہمت بڑھادی، اور اس رقم سے بہت سا ضروری سامان خرید کیا جس کے سبب سے آپ کی تصنیف و تالیف کا شوق اور بھی دوبالا ہوگیا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں ایک اور کتاب موسوم بہ وقائع درانیہ اردو میں تالیف فرمائی۔ گورنمنٹ نے اس کتاب پر بھی از راہ قدردانی ڈیڑھ سو روپیہ بطور انعام مرحمت فرمایا۔ اس سے اور بھی سہولت حاصل ہوگئی، اور موجودہ مشکلات دور ہوگئیں اور تدوین کا کام اس جوش کے ساتھ شروع کیا گیا کہ آپ کا ایک جوان بھائی محنت شاقہ کی وجہ سے مرض سل میں مبتلا ہوکر لقمۂ موت ہوگیا۔ افسوس!

چونکہ خداوند مطلق کو اُن کے ہاتھوں سے یہ کام لینا منظور تھا اس لئے مولوی صاحب اس صدمۂ عظیم پر بھی اپنے عزم صادق سے باز نہ آئے۔ اور اس طرح جان توڑ کر منہمک ہوگئے کہ چھ برس کے عرصہ میں لغات اردو کا بہت سا حصہ مسودات کی صورت میں تیار کرکے ابتدائی مسودات کی صفائی شروع کردی۔

ہمت اگر سلسلہ جنباں شود مور تواند کہ سلیماں شود

اسی زمانہ میں ڈاکٹر ایس۔ ڈبلو۔ فیلن صاحب انسپکٹر مدارس صوبۂ بہار ایک ہندوستانی انگلش ڈکشنری لکھ رہے تھے۔ اور انکو دہلی کے ایک ایسے اسکولر (ماہر زبان) کی ضرورت تھی جو اُن کی ڈکشنری کی تدوین میں مدد دے۔ چونکہ مولوی صاحب موصوف کی لغت کا تذکرہ گاہے گاہے اخبارات میں چھپتا رہتا تھا اس لئے ڈاکٹر فیلن صاحب نے پتہ لگاکر خود دہلی کا قصد کیا۔ اور وہاں پہنچکر انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے منشی فقیر چند کو۔ اور اردو میں تیار کرنے کے واسطے مولوی سید احمد صاحب کو منتخب فرمایا۔ ڈاکٹر فیلن صاحب ارمغان دہلی کے تیار شدہ اجزا اور مسودوں کو دیکھکر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلنے سے تم کو ہم سے اور ہم کو تم سے بہت کچھ مدد ملے گی۔ مولوی صاحب نے دو عذر پیش کئے۔ اوّل یہ کہ میرے لغات کے کام میں ہرج ہوگا۔ میں اس کا عاشق ہوں۔ اُس کے ہرج سے میری روح کو صدمہ پہنچیگا دوم یہ کہ میں نے نارمل اسکول میں سرکاری وظیفہ پر تعلیم پائی ہے فی الحال نائب مدرس ہوں۔ حسب قاعدہ تین سال تک دوسری ملازمت نہیں کرسکتا۔ فیلن صاحب نے جواب میں فرمایا کہ آپ کے لغات کے کام میں ہرج نہ ہوگا۔ آپ شوق سے اپنا کام جاری رکھ سکیں گے رہا دوسرا عذر! میں انسپکٹر صاحب مدارس حلقہ انبالہ اور صاحب ضلع بہادر دہلی سے اجازت دلوادوں گا۔ میں دانا پور پہنچکر دو چٹھیاں ہر دو صاحبان موصوف کے پاس بھیجوں گا۔ وہ بطیب خاطر آنے کی اجازت دے دیں گے۔ بالآخر مولوی صاحب دانا پور تشریف لے گئے، اور فیلن صاحب کے پاس مقیم ہوکر مصروف کار ہوئے۔

فیلن صاحب ان کے استقلال اور محنت پسندی سے بہت خوش تھے۔ علاوہ تنخواہ کے اور بھی سلوک کرتے تھے۔ بعض اوقات منشی صاحب موصوف کے مکان پر آکر ان کی مصروفیت دیکھتے اور تعریف کرتے جس کا اشارہ انہوں نے اپنی کئی چٹھیوں میں کیا ہے۔

پورے سات سال میں فیلن صاحب کی ڈکشنری ختم کرکے ۱۸۸۰ء میں حسب طلب مہاراجہ الور اُن کا سفرنامہ لکھنے

کے لئے چلے گئے۔ چھ مہینے میں سفرنامہ تیار کرکے تنخواہ کے علاوہ معقول انعام لے کر گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کی نائب مترجمی پر لاہور چلے آئے۔ یہ سفرنامہ دلچسپ اور قابل دید ہے۔

جن لوگوں نے سنہ ۱۸۷۰ء کے اخبارات "انجمن پنجاب" کوہ نور لاہور، اودھ پنچ، اکمل الاخبار وغیرہ ملاحظہ کئے ہوں گے وہ بتا سکتے ہیں کہ اس انداز کا سفرنامہ آج تک کسی رئیس نے نہیں لکھا جس قدر سفرنامہ تیار ہوتا جاتا تھا۔ مولوی سید احمد صاحب اُسکی ایک ایک نقل اخبارات میں دیتے جاتے تھے۔

ہنوز فیلن صاحب کی ڈکشنری زیر تالیف تھی، کہ اس عرصہ میں مولوی صاحب نے چند اور کتب تصنیف فرمائیں۔ مثلاً ھادیُ النساء ٹھیٹ بیگماتی زبان میں نہایت دلچسپ اور شوق انگیز تحریر کی، جس پر فیلن صاحب نے صرف زوردار ریویو ہی نہیں لکھا۔ بلکہ گورنمنٹ بنگال میں سفارش کرکے بہت سی کتابیں فروخت کرادیں۔ انشای ہادی النسا سنہ ۱۸۷۴ء سے اب تک اور طبعی تعلیم سنہ ۱۸۸۰ء سے تا حال متعدد مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

سنہ ۱۸۸۵ء کے آخر سے سنہ ۱۸۸۶ء تک آپ نے اُردو زباندانی کے سلسلہ کا ایک نمونہ اخبار انجمن پنجاب میں چھاپنا شروع کیا تھا۔ یہ نمونہ ان کی مفصلہ ذیل کتب کا تھا۔ جن میں سے ارمغان دہلی کے سوا باقی کتابوں کے چھاپنے کی ابتک نوبت نہیں آئی۔ اور آتی بھی کیونکر! فرہنگ آصفیہ کے اخراجات، وقت کی قلت، اور دیگر مصائب نے ان کی بلند حوصلہ طبیعت کے پر پرواز توڑ دیئے تھے اگر زمانہ نے فرصت دی تو شاید یہ آرزوئیں بھی پوری ہو کر رہیں!

تکمیل الکلام یعنی خاص پیشہ وروں کے اصطلاحات۔ تحقیق الکلام یعنی اُردو زبان کے نکات جن کی جھلک رسالہ "علم اللسان" مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور میں دیکھ لیجئے۔ رس کھان۔ یعنی ٹھیٹ ہندی زبان کے دوہوں، گیتوں، پہیلیوں، مکرنیوں، بجھوں، وغیرہ کا عمدہ مجموعہ ہے۔ ریت بکھان یعنی اہل ہنود کے اعلے خاندانوں کی رسمیں۔ ناری کتھا۔ یعنی ہندو عورتوں کی روزمرہ دلچسپ بول چال بطور مکالمہ۔ قواعد اردو۔ لغات النسا۔

سنہ ۱۸۷۷ء میں آپ نے ارمغان دہلی کے نام اپنی ڈکشنری کا پہلا حصہ جس میں صرف الف ممدودہ کے الفاظ ڈیڑھ سو صفحوں میں کلاں تقطیع پر درج ہوئے تھے چھاپ کر شائع کیا۔ اس حصہ کو دیکھ کر جان لینا چاہئے کہ مولف فرہنگ آصفیہ کی آرزو یہ تھی کہ ساری کتاب اسی طرز پر حسب مسودہ اولین چھاپی اور مشتہر کی جائے۔ مگر زر کثیر کہاں سے لاتے۔ جو اس پر بھی لگاتے، اور اپنی ضروریات زندگی کو بھی پورا کرتے۔ ناچار افسردہ خاطر ہو کر بیٹھ رہے اور موجودہ صورت پر ہی اکتفا کی۔ اب ارمغان کے اس حصہ کو بھی فرہنگ میں شامل کر دیا، تاکہ یہ نمونہ آیندہ فرہنگ نگاروں کے لئے مشعل راہ ہدایت ہو۔

اسی اثنا میں آپ نے اور کئی چھوٹی موٹی کتابیں مفید خلایق لکھیں۔ جن میں سے کچھ تو چھپ گئیں اور اکثر مسودات کی صورت میں پڑی رہ گئیں۔ مطبوعہ کتب کے نام یہ ہیں:-

تحریر النسا یعنی ہادی النسا کا دوسرا حصہ، لڑکیوں کا قاعدہ، لڑکیوں کی پہلی کتاب، بی راحت زمانی کا قصہ، جس سے وقت کی قدر مقصود ہے۔ اخلاق النسا۔ بچوں کا رکھ رکھاؤ۔ یہ سب کتابیں تعلیم نسواں کے متعلق اُنہی کی زبان میں لکھی گئیں ہیں۔ علم اللسان، جس میں ہر ایک زبان کی ابتدائی، وسطی اور آخری حالت بطور لکچر بیان کی ہے۔ رسوم دہلی جس میں پیدائش سے بیاہ، شادی اور مرنے تک کی رسمیں نہایت دلچسپ عبارت میں بیان کی ہیں۔

غیر مطبوعہ کتب میں سے بعض کے نام اوپر آگئے ہیں، اور بعض کے یہ ہیں۔ جو اُن کے بعد لکھی گئیں۔ سیر شملہ، مع تاریخ شملہ جو سر وقار الامرا بہادر وزیر دکن کی تشریف آوری کے موقع پر بمقام شملہ اُن کی یادگار میں پیش کی۔ (یہ کتاب انڈین پریس الہ آباد سے عنقریب باجازت مصنف شائع ہونے والی ہے۔) اُردو ضرب الامثال۔ روزمرہ دہلی۔ رسوم اہلِ ہنود دان دہلی حالات فرقہائے مختلفہ مع رُسوم۔

جب مولوی سید احمد صاحب ڈاکٹر فیلن صاحب کی ڈکشنری سے فارغ ہوکر آگرہ۔ اور آگرہ سے لاہور، نائب مترجمی کے عہدہ پر آئے تو خیال کیا کہ اتنی بڑی لغات کا چھاپنا میرے احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔ نیز ایسی مطول کتاب کی خریداری اہلِ ہند کی مقدرت سے بعید ہے۔ لہٰذا اصل کتاب کا خلاصہ کرنا اور ۱۳۰۲ھ سے ماہوار رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس موقع پر حسب ضرورت و مصلحت وقت نظائر، نوٹ، وجہ تسمیہ، اور مادّہ وغیرہ کا پورا التزام نہیں رکھا بلکہ معانی بعیدہ سے بھی احتراز فرمایا۔ لیکن بااین ہمہ وہ خلاصہ بھی ایسا طویل و ضخیم ہوا کہ اس کے چھپوانے کا عقدۂ مشکل پھر بھی حل نہ ہوسکا۔

بالآخر سین مہلہ تک چالیس نمبر نکال کر آئندہ رحمت خداوندی کے امیدوار ہوکر بیٹھ رہے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا مشغلہ ترک نہ فرمایا۔ وہ اپنے اشغال و افکار میں مصروف تھے کہ اُنکی دعا کا تیر نشانہ پر پہنچ گیا۔ اُن کی امید کا پودا سرسبز ہونے کو آیا۔ یعنی ۱۸۸۸ء میں سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام نظام کی مبارک صورت میں ایک فرشتۂ غیبی ملک دکن سے شملہ میں بارانِ رحمت بنکر نزول فرما ہوا۔ یہ اُس زمانہ میں شملہ ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی تھے۔ صرف ایک عرضی کے وسیلے سے اُن کے حضور تک پہنچ گئے پورا مسودہ پیش کیا۔ مطبوعہ رسالے اور دیگر کتب نفیسہ تحفۃً اُن کے سامنے رکھے اور حضور نظام کے نام نامی پر ڈیڈیکیٹ کرنے کی اجازت لی۔ الغرض کُل مسوّدہ مع رسالجات شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کے سپرد ہوا کہ اس پر رپورٹ کریں۔ سید صاحب نے قابلِ تحسین رپورٹ کی، جس کی نقل جلد چہارم میں موجود ہے۔ اس پر سررشتہ پانچسو روپیہ کا انعام اور چارسو جلدوں کی خریداری منظور ہوئی۔ اور ختم کتاب پر معقول انعام کا وعدہ کیا گیا۔ پس اسی وقت سے اس کتاب لاجواب کے طبع ہونے کی بنیاد پڑ گئی۔ اور نام اُس کا "فرہنگ آصفیہ" رکھا گیا۔

غرض جس لغات کی ابتدا ۱۸۶۸ء میں کی گئی تھی وہ ۱۸۹۲ء میں ختم ہوئی۔ اور ۱۹۰۱ء میں بہمہ وجوہ تکمیل کو پہنچکر حضور نظام والا مقام کی نظر تلطف سے پایۂ تحتانی تک شائع ہوگئی ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

اس عرصہ میں آپ کئی مرتبہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۰ء میں، دوسری بار ۱۸۹۳ء میں، تیسری دفعہ ۱۸۹۵ء میں، چوتھی بار ۱۹۰۱ء میں۔ پہلے سفر میں سر آسماں جاہ بہادر کے عروج کا، دوسرے میں نزول کا زمانہ دیکھا۔ تیسرے سفر میں نواب سر اقبال الدولہ بہادر کا دورۂ دورہ نظر آیا۔ چوتھے سفر میں سر مہاراجہ کشن پرشاد کا موجودہ عہد نظر افروز ہوا۔ اور ہر ایک سفر میں کچھ نہ کچھ کام بنتا رہا۔ لیکن افسوس کہ حضور نظام کی حضوری کا شرف حاصل نہ کرسکے جس کی آپ کو کمال آرزو تھی۔ چنانچہ اسی شوق میں آپ نے ایک مضمون موسوم بہ "بیکر خیال" اپنے عرضِ حال میں لکھا جو قابل دید ہے۔ اور جلد چہارم کے اخیر میں درج ہوا ہے۔

جس وقت یہ فرہنگ ختم ہوگئی، تو حسب وعدہ پانچہزار روپیہ

کا انعام مرحمت ہوا۔ اور بعد میں پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔

فرہنگ آصفیہ میں ساٹھ ہزار کے قریب لغات، محاورات، مصطلحات، ضرب الامثال وغیرہ موجود ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے بھی از راہ قدردانی ۱۹۰۱ء میں پانچسو روپیہ کا انعام اور ہزار روپئے کی خریداری سے مصنف کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

علیا حضرت قیصرۂ ہند جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ بادشاہ انگلستان اور لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی طرف سے بھی قبولیت کا اعزاز بخشا گیا۔ رئیس پالن پور اور رئیس ٹونک نے بھی خریداری سے دل بڑھایا۔ ۱۹۰۵ء میں جس وقت شہزادہ پرنس آف ویلز دہلی میں تشریف لائے، تو سر ڈبلیو لارنس صاحب بہادر چیف آف دی اسٹاف کے وسیلہ سے ایک پر تکلف نظم "خیر مقدم" اور رسالہ رسوم مسلمانان پیش کیا۔ جس کی قبولیت سے حضور پرنس آف ویلز بہادر بالقابہ نے مفتخر فرمایا۔ چنانچہ یہ "خیر مقدم" اخبار پایونیر، مورننگ پوسٹ وغیرہ میں بھی مع خبر اعزاز قبولیت شائع ہو گیا تھا۔

مولانا موصوف کا مفصل حال فرہنگ آصفیہ کے سرورق، اس کے ہر حصہ کے دیباچوں، اور جلد چہارم کے خاتمہ سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ اور یا اُن کی خودنوشت سوانح عمری سے جو کسی موقع پر شائع کی جائے گی۔

الغرض، مولوی سید احمد صاحب نے زبان اُردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور ابھی تک اسی میں منہمک ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے۔

شہیر (فتحپوری)

مندر سری رنگ جی واقع ترچناپلی

اس مندر کا، جس کے اندر قصبہ سری رنگم کا بڑا حصہ ہے، طول شمال سے جنوب تک ۲۸۰۰ فٹ، اور عرض مشرق سے مغرب تک ۲۵۰۰ فٹ ہے۔ گویا یہ ۱۴۴ بیگھے آراضی پر پھیلا ہوا ہے۔ اتنا بڑا مندر کسی مقام پر نہیں ہے۔ سری رنگم کا خاص دیول سات فصیلوں کے اندر ہے۔ جا بجا چاروں طرف چھوٹے بڑے اٹھارہ گوپر بنے ہوئے ہیں۔ جن میں دو بہت بڑے ہیں۔ اور باقی سب چھوٹے۔ ان کے بیچ میں بہت سے دروازے بھی ہیں۔

باہر کے چاروں طرف کی فصیلوں کے درمیانی حصہ میں ایک ہی طرح کا ایک ایک بڑا دروازہ ہے جو گوپر کی طرح معلوم ہوتا ہے اگر ان دروازوں پر گوپر بنائے جاتے تو اُن کی اونچائی قریب ۳۰۰ فٹ کے ہو جاتی۔ ان میں سے ترچناپلی کی طرف کا جنوبی دروازہ اُنچائی میں ۴۳ فٹ اور لمبائی میں (دہنے بائیں) ۱۳۰ فٹ اور عرض میں ۱۰۰ فٹ ہے۔ دروازہ میں بڑے بڑے پتھر کھڑے کئے ہوئے ہیں جن میں سے بعض ۴۰ فٹ سے بھی زیادہ اونچے ہیں۔ جنوبی دروازہ سے جاتری لوگ اندر کے ساتویں کوٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں ایک ہسپتال ہے اور ہر روز بازار بھی لگا کرتا ہے۔ اس کوٹ کے درمیان چاروں طرف پختہ سڑک بنی ہوئی ہے جس کے بازوؤں میں معمولی لوگوں کی بستی ہے جنوبی

جملۂ ہفت کوٹ مندر سری رنگ ناتھ

اندرونی حصہ مندر سری رنگ ناتھ

انڈین پریس الہ آباد

دروازہ سے چار پانچ سو گز پر کاویری ندی کی جنوبی شاخ کی ایک چھوٹی سی شاخ واقع ہے جس میں جاتری لوگ اشنان و دان کیا کرتے ہیں۔ کاویری کی شمالی شاخ، جس کو کولرون کہتے ہیں مندر کے شمالی دروازہ سے آدھے میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر ہے۔

چھٹویں کوٹ میں تین طرف چھوٹے چھوٹے، اور جنوب کی طرف ۷ درجہ والا ایک بڑا گوپر ہے۔ کوٹ کے اندر چاروں طرف سڑک کے بازوؤں میں برہمنوں اور پنڈوں کی آبادی اور دوکانات ہیں۔ چاروں بازوؤں کی دیوار تخمیناً ۲۰ فٹ اونچی ہے۔
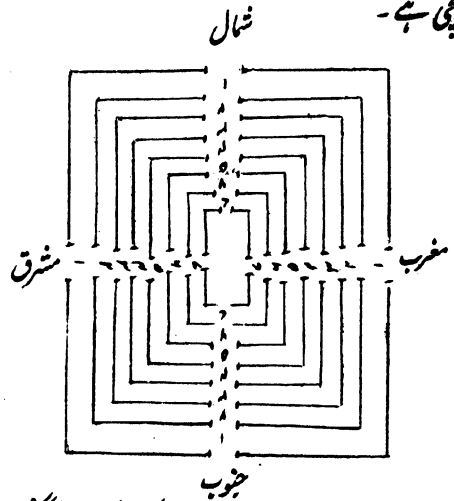
شمال
مغرب
مشرق
جنوب

پانچویں کوٹ میں چاروں طرف ایک ایک چھوٹا گوپر، اور کوٹ کے اندر چاروں طرف سڑک کے بازوؤں میں برہمنوں اور پانڈوں کے مکانات ہیں۔

چوتھے کوٹ کے جنوب اور شمال میں ایک ایک چھوٹا گوپر اور مشرق کی طرف ۱۵۲ فٹ اونچا ایک بڑا گوپر ہے اس کے اوپر کا حصہ ناتمام ہے، اگر کامل ہوتا تو وہ ۲۰۰ فٹ سے زیادہ اونچا ہو جاتا۔ اس کے نیچے کا دروازہ ۴۴ فٹ اونچا ہے۔ اس کوٹ میں کئی ایک بڑے بڑے منڈپ بنے ہوئے ہیں جن میں سے ہزار ستون کا منڈپ تخمیناً ۵۰۴ فٹ لمبا اور ۱۳۰ فٹ چوڑا ہے اس منڈپ میں ۶۰ صف ہیں اور ہر ایک صف میں ۱۶ استون ہیں اور ہر ایک ستون ۱۸ فٹ اونچا ہے، اس کوٹ کے مشرق والے بڑے گوپر کے غرب میں بھی ایک منڈپ ہے جس میں سنگ تراشی کا کام بہت اعلیٰ درجہ کا کیا ہوا ہے۔ گھوڑوں اور سواروں کی پوری پوری شکلیں بنی ہوئی ہیں تیسرے کوٹ میں جنوب و شمال کی طرف ایک ایک گوپر اور مغرب کی طرف ایک کھڑکی ہے۔ جنوبی گوپر کے سامنے جانب شمال گرڑ منڈپ میں گرڑ کی ایک بہت بڑی رنگین بنی مورتی ہے۔ اُس کے شمال میں ایک چبوترہ کے پاس سونے کا ملمع کیا ہوا گرڑ ستمب ہے۔

کوٹ کے گوشہ پر "چندر پشکرنی" نامی ایک مدوّر خوبصورت تالاب ہے جس میں جاتری لوگ اشنان اور مارجن کرتے ہیں اس کے پاس مہالکشمی کا بڑا مندر، رامچندر کی مورتی، اور ویکنٹھ ناتھ بھگوان کا قدیم استھان ہے۔ وہاں کئی ایک دیوتا اور رشیوں کی بھی مورتیں ہیں۔ دوسرا کوٹ ۱۹۰ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ جس کے غرب میں ایک دروازہ اور جنوبی حصہ میں دالان اور منڈپ ہے۔

پہلے کوٹ کا دروازہ جنوب میں ہے۔ کوٹ کے شمالی حصہ میں سری رنگ جی کا نج مندر ہے جس کے نیچے کا حصہ مدوّر اور اوپر کا سکھر طلائی ملمع کا ہے۔ مندر کے پیچھے کی چھت میں دیوتاؤں کی مورتیں کندہ ہیں۔ سری رنگ جی کے نج مندر کے پیچھے ایک کوپ (باولی) اور ایک مندر ہے جس کے پیچھے پیتل کا ایک پتھر زمین میں نصب ہے۔ وہاں سے سری رنگ جی کے نج مندر کا سکھر دکھائی دیتا ہے سکھر پر ایک سونے کا کلس ہے۔ تھوڑی دور آگے ایک اونچے دالان میں بھی ویسا ہی ایک پتھر نصب ہے، جہاں سے

واسدیو جی کی وہ برنجی مورت نظر آتی ہے، جو مندر کے سیکھر پر ہے۔

مندر کا پوجاری ایک روپیہ لے کر جاتری کی طرف سے سری رنگ جی کی پوجا اور کافور کی آرتی کر دیتا ہے۔ جو جاتری روپیہ نہیں دیتا وہ اوقات مقررہ پر درشن کر کے چلا جاتا ہے۔ مندر میں درشن کرنے والوں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ خاص مندر ایک چھوٹی سی کوٹھری کی طرح ہے۔ سری رنگ جی کے خزانے میں سونا۔ چاندی۔ پنّا۔ ہیرا۔ اور لعل وغیرہ سے جڑے ہوئے لاکھوں روپیہ کے جواہرات اور ظروف ہیں۔ جو اُنہی کے متعلق ہیں۔

سری رنگ جی کا موجودہ مندر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ کل مندر ایک ہی وقت میں نہیں بنا۔ بلکہ بتدریج، موقع بموقع اس کی توسیع ہوتی گئی۔ یہاں ہر سال ایکادشی کا بڑا میلہ ہوا کرتا ہے۔ اس موقع پر ایک بڑا پنڈال بنایا جاتا ہے اور اس میں قسم قسم کی تصاویر (جو دیوتاؤں، دیویوں، حکاموں، سپاہیوں اور قیدیوں وغیرہ کی ہوتی ہیں) کھینچی جاتی ہیں۔ اس پنڈال کی تیاری میں تخمیناً چار ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے۔

سری رنگ جی کا ذکر حسب ذیل پرانوں میں موجود ہے۔ بخیال طوالت وہ واقعات یہاں نہیں لکھے گئے۔

(۱) سری مد بھاگوت۔ سکندہ ۱۰ ادھیاے ۷۹
(۲) متس پران۔ " ۲۲
(۳) پدم پران۔ پاتال کھنڈ۔ اترادہ " اوّل
(۴) والمیک راماین۔ اترکانڈ۔ ۱۲۱ دان سرگ
(۵) سری رنگ مہاتم ادھیاے۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۸۔

ہ۔ م۔ ر

نوجوان بیوہ کی شبِ تنہائی

"وہ نہیں آیا! نہیں آیا اور نہیں آسکتا، ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا کے جھونکو! جاؤ، جاؤ، مجھے نہ چھیڑو، میرے سینہ کی آگ کو نہ بھڑکاؤ۔ تم بیشک روح کو تازہ کرنے والی چیز ہو۔ تم بلاشبہ قلب کو عجیب فرحت بخشتے ہو، مگر یاد رکھو کہ تم خود کوئی چیز نہیں ہو۔ مطمئن دماغ، اور بادۂ وصل سے سیراب دل کے لئے تم اس وقت بہترین نعمت ہو لیکن اس دل، آہ، اس کمبخت بیچین و بے قرار دل کے لئے جو فرقت کی آگ سے جل رہا ہے، تم زہر آلود نشتر ہو، تم اس کے زخموں کے لئے نمک ہو، ہاں! تم خونخوار اژدہے ہو، جاؤ! جاؤ! تم جلتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکتے ہو، تم کسی کی یاد کو ساتھ لاتے ہو اور ہر بار ایک نیا نشتر لگاتے ہو۔ جاؤ! جاؤ!! مجھے نہ ستاؤ، مجھے نہ رُلاؤ"!

"کیا تم میری زلفوں کو پریشان کرنے، میرے گیسوؤں کو درہم برہم کرنے آئے ہو؟ یہ ٹھیک ہے، چلو! خوب زور سے چلو!! اپنا کام کرو، بیشک انھیں پریشان کر دو! انھیں درہم برہم کر دو!! اور تھوڑی سی خاک لاکر ان پر ڈالدو!!! یہ مجھے چھیڑتے ہیں۔ مجھ سے دل لگی کرتے ہیں"۔

"پیارے ماہتاب! کیا تو بھی اب رخصت ہوتا ہے؟ کیا تو بھی مجھ سے منہ چھپانے لگا؟ ہاں اس وجہ سے کہ میں تجھ میں اور اُس منور چہرہ میں کچھ مشابہت پاکر تجکو شوق سے رہی تھی، اور دل بہلا رہی تھی، خیر، بسم اللہ جائیے! آپ بھی جائیے!! آپ بھی

منھ چھپا لیجئے!!! میں دل میں اٹھنے والے درد کی چمک سے دل بہلاؤنگی، میں آج ان حسرتوں اور تمناؤں سے لڑنے کا مشغلہ نکالوں گی، آج ان سب کا گلا گھونٹونگی، سب کا خون کردوں گی، اور سینہ کے اندر، نہیں خاص دل میں دفن کروں گی۔ جلاؤں گی؟ کچھ پرواہ نہیں، پھونکدونگی؟ بہت خوب پھر آہوں کے ساتھ دھواں بنکر نکلیں گی؟ مناسب ہے۔ خون بنکر اشکوں کے ساتھ بہینگی؟ بہتر ہے مگر نہیں! ہرگز نہیں!! انھیں میرے سینہ کے اندر قید ہونا پڑے گا۔ بیشک ان کو دل کے اندر گھٹنا ہوگا میں حکم دیتی ہوں آگ لگائیں، جلائیں!! پھونک دیں!!! مگر باہر نہ نکلنے پائیں"

"اچھا! یہ ستاروں کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی ہے؟ کیا یہ بھی رخصت ہو رہے ہیں؟ رخصت! آہ، یہ کوئی لفظ ہے یا زہر سے بجھا ہوا نشتر؟ اور خونخوار خنجر؟ او ظالم! چبھ اور چبھ! بیٹھ اور بیٹھ، چیر اور چیر، اچھی طرح ٹکڑے کر۔ کاش یہ دل نہ بنتا، اسکا وجود ازل سے نہ ہوتا"

"ہا ہا! کیا دنیا میں کوئی اور بھی مجھسا مصیبت زدہ حسرت نصیب، اور درد دل کا مریض ہے؟ سنوں کیا کہتا ہے؟ "پی کہاں" "پی کہاں" آ، اے میرے ہم داستان آ۔ مگر تو تو اپنے پی کو ڈھونڈتا ہے، بلاتا ہے، ہاں تو تجھکو "پی" کے مل جانے کی امید ہے۔ خوش نصیب، بڑا خوش نصیب۔ تو میرے پاس کیوں آئے گا۔ تو ایک خوشگوار، نہایت ہی دلچسپ امید سے دل بہلاتا ہے۔ آہ! میرے پاس وہ آئے جس پر یاس کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو جس سے دائمی ناامیدی نے یہ دلچسپ مشغلہ بھی نہایت بے رحمی، اُف، سخت بے دردی کیساتھ چھین لیا ہو۔ جس کی زندگی موت سے لاکھ درجہ بدتر ہو۔ تکلیف دہ ہو۔ زندگی! نفرت، نفرت، نہایت ہی بُری چیز، سخت تکلیف دہ زمانہ۔ مگر میرے لئے۔ اس خوش قسمت پپیہے کے لئے نہیں۔ اُسکی زندگی تو قابل رشک ہے۔ "انتظار" "امید" "شوق" "تلاش" کس قدر پیارے لفظ ہیں، کس قدر دلچسپ اور خوش آیند مشغلے ہیں۔ "او "پی" کے تلاش کرنے والے! جا، جا، یہاں نہ بول، اس اجڑے ہوئے، ہمیشہ کے لئے اجڑے ہوئے امید اور شوق کی باتیں یاد دلاکر، زندہ درگور حسرت نصیب اور مایوس دلوں کو نہ دکھا۔ جا! کسی چمنستان میں، ہرے بھرے گلزار میں جا، اور وہاں اپنے پی کو تلاش کر۔

پی کا خیال، پی کا شوق، پی کی حسرت دید۔ رحم! او آسمان رحم!! دل پھٹا، دماغ جلا، سینہ شق ہوا، اور جگر کباب ہوا۔ ترحم! او میری قوت حافظہ ترحم!! مجھے چھوڑ دے، مجھے دیوانہ بننے دے، مجھے پاگل ہونے دے، مجھے گریبان چاک کرنے دے ورنہ میری جان لے۔

منتقی امروہوی

نظام المشائخ دہلی اُردو زبان کا یہ ماہوار پرچہ مولوی محمد الواحدی صاحب کی ایڈیٹری میں دہلی سے نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ صوفیۂ مشائخ کی دینی و دنیوی اغراض کی حمایت اس کا مقصد خاص ہے۔ ہندوستان میں بہت سے اُردو رسائل شائع ہوتے ہیں۔ مگر صرف "نظام المشائخ" ہی ایک ایسا پرچہ ہے، جو اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ اپنے احاطۂ مقاصد سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب، جو آجکل بلاد اسلامیہ کی سیاحت کو تشریف لے گئے ہیں، اس کے اعلیٰ مدیر ہیں۔ ان کے سفر کے حالات بھی اسی میں سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں، جو بجائے خود نہایت دلچسپ ہیں۔ اس کے قلمی معاونین کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، جسمیں کئی مسلم الثبوت اہل قلم و اساتذہ شامل ہیں۔ ہم "نظام المشائخ" کی اس ترقی و کامیابی پر اپنے مکرم دوست کو مبارکباد دیتے ہیں (حجم ۴۰ صفحات ماہوار قیمت سالانہ [illegible] فی پرچہ [illegible] ملنے کا پتہ فیض بازار دہلی)

"سینس اینڈ رلجن"

یعنی

"علم طبعیات اور مذہب"

مائی ڈیر شاکر! آپ کے لطف سے میں نہایت خوشی اور دلچسپی کے ساتھ مجبور ہوا ہوں اس لطف پر وہ لطف اور بڑھ گیا جو آپ کی توجہ سے "ادیب" میں پیدا ہو گیا ہے۔ آج میں ایک ٹکڑا اپنی طویل نظم "سینس اینڈ رلجن" کا "ادیب" کے واسطے بھیجتا ہوں، یہ نظم پانچ سو اشعار سے زیادہ کی ہے۔ اس کے بعد اور نئی نظمیں بھیجوں گا۔

نہیں ترجیح[1] ممکن بے مرجّح، علم کہتا ہے
عدم پر کیوں ہوئی ترجیح ہستی کو سبب کیا ہے
کسی ذی عقل سے یہ فعلِ[2] ترجیحی ہوا صادر
ہے ناداں مادّہ وہ فعلِ عقلی پر نہیں قادر
کہا دہری نے، بن[3] جاتی ہے خود ہر شے ضرورت پر
مگر نوعیں ہیں بے حد اور نہیں سب ایک صورت پر
نظامِ عالمِ ہستی کو ہے درکار حکمت بھی
خرد، تدبیر، ارادہ، اختیار، اور علم و حکمت بھی
مسلّم ہے کہ ظرفِ مادّہ ہے عقل سے خالی
تو کیونکر اُس نے حکمت اور صنعت کی بنا ڈالی
ہُوا بے عقل عالم کس طرح وقت اور ضرورت کا
بنا موجد وہ کیونکر ہر نئی ترکیبِ صورت کا
نہیں[4] ہوتا علاقہ علّت و معلول کا زائل
تو معلول اپنی علّت سے ہوا کیوں بعد پر مائل
کروڑوں[5] سال بچھڑا کس طرح معلول علّت سے
بلا علّت کو یہ فہم توقف کس جبلّت سے
ہوا[6] ہے سینس خود قائل کہ استعداد حادث ہے
تو اجزائے بسیط میں قدیم ایجاد حادث ہے
قدیم[7] علّت کو ہو معلولِ علّت ہو مگر حادث
وہ ہے اک جزوِ علّت، کل بھی حادث جزو اگر حادث
نہ تھی ذرات[8] میں کیوں قوتِ ایجاد پہلے سے
وہ خود تھے تو نہ تھی کیوں اُن میں استعداد پہلے سے
رہی جنبش[9] تو کیوں رکھا معطّل کاروبار آخر
کیا کس فہم سے نوعوں کا برسوں انتظار آخر
تو کیا کہتی رہی امید اُن کی آج، کل، پرسوں،
کبھی وقت آئے گا، یوں ہی رہے وہ منتظر برسوں
عبث[10] اور بے نتیجہ مادّہ برسوں رہا کیوں کر
کیا کس شے نے پھر آمادہ اُس کو قابلیت پر
سمجھ[11] کیوں آئی وقت اور حاجتِ ایجاد کی اُس میں
تو کیا عقل آ گئی ترکیبِ استعداد کی اُس میں
جو دہری[12] مادّے کے باخرد ہونے کا قائل ہو
تو ہر ہر جزو کے ادراک کا اثبات مشکل ہو

---

[1] یہ منطق کا مسلّم مسئلہ ہے کہ ترجیح بلا مرجّح ممکن نہیں [2] بحث یہ ہے کہ عالم عدم سے وجود میں لایا گیا، تو وجود کو عدم پر ترجیح کوئی ذی عقل ہو اس لئے کہ مادہ جسکو سینس خود بے عقل تسلیم کرتا ہے اس ترجیح کا فعلِ عقلی صادر نہیں ہو سکتا [3] یہ قول کہ بنانیوالا کوئی نہیں ہے، مادہ سے ہر شے اپنی ضرورت کے وقت خود بخود بن جاتی ہے درست نہیں ہے، اس لئے کہ بے حد اقسام مختلف صورتوں کی ہیں، وہ بے حکمت نہیں بن سکتیں [4] سینس کا مسئلہ ہے کہ علّت سے معلول کا علاقہ زائل نہیں ہوتا، اب بحث یہ ہے کہ مادہ جو علت ہے وہ [5] کروڑ سال بیشتر بن چکا تو جو شے مدّت تک بعد بنی وہ معلول تھی، اُسکو علّت سے استقدر بعد کیونکر ہوا [6] معلول کو، وہ مال اپنی علت سے بچھڑا، یہ توقف کس فہم یعنی سے [7] اور ہوا [8] سینس دسے کو قدیم گو استعداد مادّہ کو حادث کہتا ہے، اس صورت میں اجزائے بسیط کو قدیم اور ایجاد کو حادث کہنا چاہئے کیونکہ ایجاد کا وجود استعداد کا تابع ہے، اجزائے بسیط وہ ذرات ہیں جو مادّہ کے ساتھ ہی وجود میں آئے مادہ جن سے مخلوق کا وجود ہوا، بسیط کا مطلب یہ ہے کہ غیر محدود ہے [9] سینس کی رو سے علت قدیم اور معلول حادث ہے یہ محال ہے اس لئے کہ معلول علت کا جزو ہے، اور فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ جزو حادث ہے تو کل بھی حادث ہے [10] یعنی مادے کے ذرات بسیط میں قوت ایجاد اور استعداد پہلے ہی کیوں نہ پیدا ہوئی [11] سینس نے حرکت کو حرکت مادے کے لئے لازمی مانا ہے، اور حرکت ہی ذرات کے متعدد اشیا کے وجود میں آنے کا سبب ہے، حرکت بھی فطری ہے تو باوجود حرکت کے مادے نے کاروبار ایجاد کو معطل کیوں رکھا اور کس فہم سے (حالانکہ وہ نافہم ہے) برسوں تک انواع موجودات کا انتظار کیا [12] اگر وہ مدّت تک عبث اور بے نتیجہ رہا، تو یہ اصول فطرت کے خلاف ہے، اور ایجاد کی قابلیت پیدا ہوئی آخر اُسے کس شے نے آمادہ کیا [13] مادہ جو نافہم اور بے عقل ہے، اسکو وقت مناسب اور حاجت ایجاد کی سمجھ کیونکر آئی کیا اُسمیں ترکیب استعداد کی عقل آ گئی [14] اگر دہری (یعنی خدا کا منکر) مادے کو باخرد کہے تو بے شمار انواع موجودات اور ان کے بے شمار اجزا کے

وہ، جو خود کور بھی، بے عقل بھی، بے دست و پا بھی ہو
تعجب ہے، مصوّر بھی، مقنّن بھی، خدا بھی ہے
کرے ترتیبِ عالم اور خود ہو بے خبر اُس سے
وہ خود خلقت سے ناداں، خلقِ عالم ہو مگر اُس سے
جو ٹھہرے مادّہ حادث[1] تو بے شک بات بن جائے
ثبوتِ بُعدِ استعداد میں دقّت نہ پیش آئے
جو زیرِ بحثِ علمی، مسئلۂ قوّت[2] کا آتا ہے
تو کیا کیا سائنس زورِ انتقال اس میں دکھاتا ہے
جُدا ہر قوّتِ طبعی کو پہلے اس نے مانا تھا
الگ عالم میں اُس نے فعل ہر قوت کا جانا تھا
ہے اب قائل کہ در اصل ایک ہی سب کی حقیقت ہے
تغیّر، ہیئتوں کا، منتقل[3] ہونے کی صورت ہے
وہ کل قائل تھا جس کا، آج اس حالت سے منکر ہے
اسی فہم اور اسی قوّت پہ وہ قدرت سے منکر ہے
وجودِ کائنات اک شکل پر اِن میں سے جانو تم
طریقِ نشو[4] مانو، یا طریقِ خلق[5] مانو تم
جو مانو نشو کو، تو مادّے سے ابتدا سمجھو
اُسی سے اُس کے اجزائے بسیطہ کی بنا سمجھو

عناصر اُنشو میں پھر آئے، ان اجزا کی قوّت سے
معادن ہو گئے موجود پھر ایجاد و فطرت سے
نباتات اور حیوانات رنگِ نشو پھر لائے
جہانِ نشو میں اجسامِ موجودات یوں آئے
ہوئیں فرعیں جُدا اصلوں سے اور پھیلیں زمانے میں
بڑھیں پھر ہر طرف نوعیں جہاں کے کارخانے میں
جما رنگِ توالد پھر تو حیوانوں میں کثرت سے
صفاتِ اصل پھر پانے لگیں نوعیں وراثت[6] سے
تباین[7] نے بدل دیں جب صفات اونکی، نمو ان کی
تو نوعیں مختلف آنے لگیں پیشِ نظر اُن کی
بقا میں[8] پھر پڑا جھگڑا کہ رکھئے زندگی باقی
مٹی شکلِ ضعیف آخر، رہی شکلِ قوی باقی
ہوا پھر انتخاب[9] اُن میں سے اک مدت گذرنے پر
رہا انسان، سب نوعوں سے اعلیٰ منتخب ہو کر
تباین[10] ہو، مگر وہ حد سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا
عَرَض سے وہ تجاوز کر کے جوہر ہو نہیں سکتا
صُوَر[11] کا مادّے کے ساتھ دہری نے قدم مانا
تو کیا مابعد کی شکلوں میں اُن کو منقسم جانا

۱؎ اگر مادّہ حادث مان لیا جائے تو بعدِ استعداد کی بحث میں دقّت نہ پیش آئے، یعنی وہ حکیم مطلق کی حکمت کا نتیجہ قرار پا جائے ۲؎ قوت طبعی ۳؎ سائنس نے پہلے روشنی، پانی، ہوا، حرارت، قوت کہربائی غرض سب قوتوں کو علیحدہ علیحدہ تسلیم کیا تھا لیکن اب تحقیقاتِ جدیدہ سے اس بات کا قائل ہوا ہے کہ سب قوتوں کی اصلیت ایک ہی ہے، انتقال سے مختلف شکلیں ظہور میں آتی ہیں، مثلاً حرکت قوت کہربائی کی جانب، قوت کہربائی حرارت کی جانب، حرارت روشنی کی جانب منتقل ہو جاتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس ۴؎ طریق نشو، یعنی مادّے کی قوتِ طبعی سے خود ہی وجود میں آنا ۵؎ طریق خلق، یعنی خالق مطلق کی قدرت اور حکمت سے پیدا ہونا ۶؎ قانون وراثت سائنس کے چار قوانین میں سے ایک قانون ہے جس کا مطلب ہے کہ ہر فرع اپنی اصل کی وراثت میں کچھ نہ کچھ ضرور پاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب نشو کے طریقے سے موجودات بنتی گئیں تب توالد کی کثرت ہوئی، اور فرعیں اپنی اصلوں کی صفات اصل پانے لگیں ۷؎ تباین سائنس کے چار قوانین میں سے ایک قانون ہے، یعنی ہر فرع اپنی اصل سے کسی نہ کسی صفت میں ضرور متغایر ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ قانون تباین نے جب فرع کی صفات اور نمو کو اصل سے بدل دیا تب انواع کی حالتیں مختلف نظر آنے لگیں ۸؎ تنازع للبقا بھی سائنس کے چار قانون میں داخل ہے یعنی انواع موجودات میں قوی اور ضعیف ہیں جن کا تنازع ہر وقت واقع ہوتا ہے اور بالآخر نوع قوی نوع ضعیف کو مٹا دیتی ہے ۹؎ قانون انتخاب بھی سائنس کے قوانین میں داخل ہے یعنی فطرت مختلف انواع میں سے قابل کو منتخب کر لیتی ہے، مطلب یہ ہے کہ انسان موجودات میں سب سے منتخب ہو کر اعلیٰ قرار پایا ۱۰؎ بعض علمائے سائنس اس جانب بھی گئے کہ تباین سے فرع اپنی اصل سے اس قدر بھی بدل سکتی ہے کہ وہ عرض سے جوہر ہو جائے۔ جوہر وہ ہے جو قائم بالذات ہو جیسا شمس، اور عرض وہ ہے جو قائم بالغیر ہو جیسی دھوپ، مطلب یہ ہے کہ اصل نوع جوہر ہو اور فرع عرض، یہ محال ہے کہ عرض اس قدر متغیر ہو کر جوہر ہو جائے، یہ بحث اس امر پر ہے کہ ایک نوع کبھی نوع جداگانہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں، اپنی ہی اصل کی نوع میں فرع ہو سکتی ہے، البتہ تباین سے کچھ تغیر شکل میں ممکن ہے ۱۱؎ دہری کا قول ہے کہ تمام صورتیں جو ہمیشہ عالم ظہور میں آتی رہیں گی مادّہ کے ساتھ ہی قدیم ہیں، تو کیا وہ صورتیں قدیم مابعد کی شکلوں میں جن کو حادث کہنا چاہیے، تقسیم ہو رہی تھیں؟

اگر ایسا[1] ہے تو ہر صورت قدم کی شکل باقی ہے
قدم کے ساتھ تکرارِ قدم پھر لازم آتی ہے
قدم[2] ذاتی ہو یا بالغیر مٹنا ہے محال اُس کا
نہیں ممکن کسی منطق سے عالم میں زوال اُسکا
جو پچھلی[3] صورتوں سے، صورتیں پہلی، ہوئیں زائل
تو کیوں پھر فہم دونوں کی حداثت کا نہ ہو قائل
وہ[4] باقی ہیں تو ٹھہرا لغو فعلِ مادّہ بے شک
عبث رکھا انھیں برسوں تک اور رکھے گا برسوں تک
قدم مانا صُوَر کا تو ہوا دہری کو یہ حاصل
کہ نابود تو مشکل، کہ موجود تو مشکل
یقیں[5] دورِ حقیقی کا ہو، ایسا ہے کہیں ممکن
مقدّم ہو وجود اپنے سبب پر، یہ نہیں ممکن
خدا سے مادّہ، اور مادّے سے ہو خدا پیدا
تو حیرت ہو کہ پہلے کون اِن میں سے ہُوا پیدا
کہیں دورِ[6] معیّت ہو تو کچھ حجّت نہیں ہم کو
وہ ممکن، اور اُس سے سابقہ رہتا ہے عالم کو

تسلسل[7] کس طرح تسلیم کر لینے کے قابل ہے
کہ وہ برہانِ سلمی[8] اور تطبیقی[9] سے باطل ہے
غلط[10] رازِ حیات آیا ہے علم و فہمِ دہری میں
کہ ہے وہ جلوۂ فعلِ عناصر وہمِ دہری میں
وہ اک وصفِ وجودی ہے نہیں حاوی ہے علم اُس پر
وہ نفسِ ذات سے زائد، مگر ہے ذات کے اندر
عقیدہ ہے یہ دہری کا کہ ہے ہر شے ہمیشہ سے
نہ اوّل ہے، نہ آخر، یوں ہی عالم ہے ہمیشہ سے
زمانہ ابتدا کی حد نہ رکھے، یہ سمجھ کیا ہے
کسی کے دل میں کیا ایسا تصور آ بھی سکتا ہے؟
یقیناً[11] آ نہیں سکتا، تو اب کہئے محال اُس کو
ہے ناقص عقل اُس کی جو کرے ممکن خیال اُس کو
غلط ہے سینس پر یہ شک کہ ہے خالق سے برگشتہ
وہ ہے اک علم، دیوانہ نہیں ہے جو ہو سرگشتہ
وہ دہریّت ہے جو چاروں طرف آوارہ پھرتی ہے
غلط راہوں میں اکثر ٹھوکریں کھا کھا کے گرتی ہے

---

۱ اگر یہ ہے، یعنی صُوَرِ قدیم صُوَرِ مابعد میں تقسیم ہو رہی ہیں، تو قدم کے ساتھ قدم کی تکرار لازم آتی ہے، اور یہ محال ہے ۲ قدم کی دو صورتیں ہیں، ایک قدم ذاتی، یعنی اُس شے کی اصلیت جسکی ذات خود اسکے ظہور کی مقتضی ہو جسطرح شمس، دوسری قدم بالغیر، یعنی اُس شے کی اولیت جس کا ظہور دوسرے کی ذات سے متعلق ہو جسطرح شمس کا نور فلسفہ کی کسی دلیل سے دونوں کا زوال پذیر ہونا ثابت نہیں ۳ مطلب یہ ہے کہ اگر صورِ قدیم صورِ مابعد میں تقسیم ہوئیں، تو صورِ قدیم باقی نہ رہیں، زائل ہوگئیں، اور زوال حادث ہونے کی دلیل ہے۔ ایسی حالت میں صورِ قدیم اور صورِ مابعد دونوں کا حادث ہونا کیوں نہ تسلیم کیا جائے ۴ اگر دہری یہ کہے کہ صورِ قدیم اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں تو یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ مادّے نے مدتوں انہیں عبث یعنی بیکار رکھا اور یہ فعل لغو ہے جو قانونِ فطرت کی رو سے جائز نہیں ۵ دورِ حقیقی، یعنی دو چیزوں کے وجود کا ایک دوسرے پر منحصر ہونا۔ اسکی اتنی شکل بھی پیدا ہو سکتی ہے، موجود شے کا وجود اپنے سبب یعنی اُس شے کے وجود سے سبقت پا جائے جس نے اُسے موجود کیا ہے، مثلاً خدا سے مادّے کا اور مادّے سے خدا کا وجود، یہ عقلاً محال ہے ۶ دورِ معیّت، یعنی ایک علت کے دو ایسے معلول جن میں سے بعض کا وجود بعض پر منحصر ہو، مثلاً ابر سے سایہ اور سائے سے ظلمت، ابر علت ہے جس کے سایہ اور ابر دونوں معلول ۷ تسلسل، یعنی ایک غیر مختتم سلسلہ جو ازل (مبدا) کی غیر محدود جانب) کی طرف چلا جائے، اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ خدا کا وجود کسی اور شے پر مبنی ہو، اور اس شے کا وجود کسی اور شے پر۔ ایسے غیر متناہی سلسلے سے خدا کی ذات قدیم نہیں رہتی بلکہ حادث قرار پاتی ہے۔ اور یہ محال ہے ۸ برہانِ سلمی منطقی برہان ہے، مثلاً مثلث کی دو ساقوں کو غیر متناہی فرض کر کے دونوں کے بیچ میں جو مسافت واقع ہو اُن میں خطوط آڑے کھینچ دیئے جائیں۔ پھر جتنا طول ساقین کو دیا جائے گا، اتنی ہی مسافت پیدا ہوگی اور اس میں خطوط بڑھیں گے مگر سب خطوط دو حدوں میں گھرے رہیں گے ۹ برہانِ تطبیقی، مثلاً دو سلسلے دو امور کے قائم کئے جائیں۔ ایک قبل کا اور دوسرا بعد کا، پھر اس دلیل سے کہ عددِ ناقص عددِ زائد کے برابر نہیں ہوتا دونوں سلسلوں میں سے ایک ایک عدد کو ساقط کرتے جائیں یہاں تک کہ ایک سلسلہ ختم ہو جائے اور دوسرا باقی رہے (یہ براہین اس قدر دقیق اور وسیع ہیں کہ اس مختصر نوٹ میں نہیں سما سکتے)۔ ۱۰ حیات کا اصل راز دکھلا تو دہری نے کہا کہ وہ مادّے کے اجزائے مشترکہ اور اسکے عناصر ممتزجہ کی باہمی تاثیرات کا ایک ظہور ہے ۱۱ یہ منطق کا یہ مسلّم مسئلہ ہے کہ جس امر کا تصور دل میں آ ہی نہ سکے، وہ محال ہے، مطلب یہ ہے کہ زمانہ جو موجود ہوا اور گذر رہا ہے، اسکی ابتدا کی کوئی حد نہ ہو اور تسلسل کے ساتھ اُس کی ہمیشگی غیر محدود مانی جائے ایسا تصور ہو ہی نہیں سکتا لہذا محال کو ممکن کہنا مقتضائے عقل نہیں ہے۔

کبھی ظن اِس طرف مائل کبھی وہم اُس طرف راہی
عبث فکر اس طرف مائل، غلط فہم اُس طرف راہی
نتیجہ فکر کا ہے فلسفہ، قطعی وہ کیونکر ہو
تغیّر اس میں اکثر ہو، تبدُّل اس میں اکثر ہو
جو مذہب فلسفہ ہی پر ہو، تو مشکل یہ پیش آئے
کہ بدلے فلسفہ تو رنگ مذہب بھی بدل جائے
تغیّر جس کا شیوہ اور تبدُّل مدعا ٹھہرا
وہ مذہب رنگ ٹھہرا، پیرہن ٹھہرا، ہوا ٹھہرا

احمد علی شوق قدوائی

رُباعیاتِ رشید

(از سید محمد مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشیدؔ لکھنوی)

بالوں کی سیاہی، آہ! ہیہات گئی ۔۔۔ کہتے ہیں جوانی جسے وہ رات گئی
پیری نے زبان کی فصاحت کھودی ۔۔۔ لو، صبح ہوئی، رات گئی، بات گئی

مُدت سے جدائی کا الم باقی ہے ۔۔۔ اک عمر سے یہ نشانِ غم باقی ہے
یوں جُھک کے جوانی سے ملا وقتِ وداع ۔۔۔ جب سے اتبک کمر میں خم باقی ہے

سو رنج میں روز کم سے کم کھاتا ہوں ۔۔۔ جو کوئی نہ کھا سکے وہ غم کھاتا ہوں
پیری کی طرف دیکھ کے آتی ہے شرم ۔۔۔ جب اپنی جوانی کی قسم کھاتا ہوں

کیوں کُنجِ لحد کے متصّل جاؤں گا ۔۔۔ کہنے کے لئے مطلبِ دل جاؤں گا
پیری سے نہوں گا منکسر اور رشید ۔۔۔ جُھکتے جُھکتے زمیں سے مِل جاؤں گا

پیری سے زمانہ کوئی چارا ہم کو ۔۔۔ قُوت کا قوا کے، تھا سہارا ہم کو
تنہا موت آکے کیا بنا لیتی رشید ۔۔۔ پیری نے شریک ہوکے مارا ہم کو

مذاقِ عشق

تشبیب قصیدہ

خداوندا بحُسنِ یوسف و عشقِ زلیخائی ۔۔۔ نہ آئے دامنِ عصمت پہ میرے داغِ رسوائی
بحقِ نرگسِ مستِ بتاں یارب وہ آنکھیں دے ۔۔۔ کہ جو ہوں انتظارِ وعدۂ فردا میں پتھرائی
مطیعِ حکم کریں قوتِ ادراک کو میری ۔۔۔ سمجھ میں کچھ نہ آئے پھر کسی کی بات سمجھائی
دماغ ایسا عطا کر اپنے سودائے محبت میں ۔۔۔ جسے ہو پختہ مغزانِ جنوں سے تازہ بہتائی
وہ دل دے ہو جبیں پر جسکی نقشِ قشقۂ وحشت ۔۔۔ فضائے مُلکِ وحدت میں کرے جو دشت پیمائی
وہ دل دے اے خدا جو کشتۂ طرزِ تغافل ہو ۔۔۔ وہ دل دے جو کہ ہو جا نداد ناز خود آرائی
وہ دل دے جو کہ ہو سر تا قدم اک آبلہ یارب ۔۔۔ تپک میں جسکی شوخی حسن کی دیتی ہو دکھلائی
گُل زخمِ محبت سرزمینِ دل سے یوں نکلیں ۔۔۔ کہ خود حسنِ ازل ہو شوق سے جن کا تماشائی
وہ ناخن دے کریں خونِ جگر سے جو حنا بندی ۔۔۔ رہیں داغِ جنوں کی سینہ کاوی پر جو شیدائی
ترے وادیٔ وحدت میں نہو مجھ سا دیوانہ ۔۔۔ ترے صحرائے قدرت میں نہو مجھ سا سودائی
نہاں کر میری آب و گِل میں اپنے جذبِ الفت کو ۔۔۔ مخمرِ عشق سے کر میرے اشکالِ ہیولائی
مجھے اُس بحرِ عشقِ سرمدی کا ایک قطرہ دے ۔۔۔ کہ جس نے انبیا کے چشمۂ دل میں جگہ پائی
بوقتِ ذبحِ اسمٰعیل جسنے دلدہی کی تھی ۔۔۔ خلیل اللہ کو دیدے کے تعلیم شکیبائی
بیاضِ دیدۂ یعقوب جسکی صبحِ عشرت ہے ۔۔۔ سوادِ محبسِ یوسف ہے جسکی شامِ تنہائی
چراغِ حسن سے پایا تھا کاجل جسنے زنداں میں ۔۔۔ کہ چشمِ پیرِ کنعاں میں لگائے کحلِ بینائی
وہ عشق ایسا ہو جس سے امتحاں گاہِ مصیبت میں ۔۔۔ لیا ایّوب دل نے مدتوں درسِ شکیبائی
یہی ہے باعثِ بیداریٔ بختِ مہِ کنعاں ۔۔۔ یہی ہے حاصلِ تعبیرِ رویائے زلیخائی
اسی نے میکدے میں حسن کی ساقی گری کی ہے ۔۔۔ اسی نے بزمگاہِ ناز میں کی بادہ پیمائی
یہی دامالسرورِ حسن میں ہمرازِ وحدت تھا ۔۔۔ یہی بیت الحزن میں تھا انیسِ شامِ تنہائی
یدِ بیضا کا تمغہ وادیٔ ایمن میں لوا کر ۔۔۔ اسی نے حضرتِ موسیٰ کی کی تھی عزت افزائی
سرِ البستانِ وحدت میں اسیکا دور دورہ تھا ۔۔۔ اسی گلشن میں خوشبوئے گُلِ باغِ الست آئی
اسی کی خصلتیں کچھ کم نہیں ہیں خرقِ عادت سے ۔۔۔ اسی کے دم قدم کیساتھ اعجازِ مسیحائی

بھلا یوں بے ستوں کیا تیشۂ فرہاد سے کٹتا — اسی نے بازوؤں میں کوہکن کے دی توانائی

اسی کی ہر رگِ دل تھی زمامِ ناقۂ لیلےٰ — یہی تو نجد میں تھا رہ نوردِ دشت رسوائی

اُٹھیں دودِ سیاہِ آہ کی جب آسماں تک ہم — تو اس نے کعبۂ لیلیٰ میں اذاں ناقوس سے دلوائی

یہی وہ خضر ہے پیرِ طریقت بنکے مجنوں کو — زمانے میں بیاباں در بیاباں خاک چھنوائی

اسی نے دیکھکر جوش و خروشِ حضرتِ موسےٰ — مئے دیدار میں داروئے بیہوشی بھی ملوائی

یہی کرتا رہا پروانگی شمعِ حقیقت کی — یہی حسنِ ازل کا بدوِ فطرت میں تھا شیدائی

یہی تھا واقفِ اسرارِ آدابِ عبودیت — اسی نے آستانِ حسن پر کی ناصیہ سائی

اسی کے آئینہ خانہ میں ہر سو ایک جلوہ ہے — اسی سے حسنِ خود بیں کو ہوا دعوئ یکتائی

یہی ہے مقتلِ جاں دادگانِ خنجرِ ابرو — یہی ہے مشہدِ دلکشتگانِ تیغِ رعنائی

یہی ہے مسکنِ آوارگانِ دشتِ ناکامی — یہی ہے مدفنِ افتادگانِ کوئے رسوائی

یہی تھا حکمراں ملکِ حقیقی و مجازی میں — اسی نے عمر بھر دونو جہانمیں کی ہے دارائی

اسی وادی کے ہر ذرّہ میں وسعت ہے بیاباں کی — اسی دجلہ کے ہر قطرہ میں جزر و مد دریائی

بنا کر اُسنے دار الضرب دلمیں داغ کے سکّے — ہر اک پہلو پہ اُس کے حسن کی تصویر کھچوائی

خیالِ حسن میں اک ذرّہ اسنے خاک کی ڈالی تھی — انھیں ذرّوں سے پروانوں نے خلعت مہر منیری پائی

یہی ہے موجدِ علمِ حدیثِ شمع و پروانہ — یہی ہے واضعِ قانونِ صبر و ناشکیبائی

ہر اک ناسور اسکا دوربینِ جلوۂ جاناں — ہر اک زخم اسکا اک گلدستۂ باغِ تماشائی

یہی ہے راکبِ اسپِ سریع السیرِ بیتابی — یہی ہے غاشیہ بردارِ شوقِ جادہ فرسائی

نبردِ اہلِ دلمیں یہ کماں بر دوش رہتا ہے — اسی کے ناوکِ دلدوز میں ہے زورِ گیرائی

یہی ہے گوہرِ نایاب اُس بحرِ حقیقت کا
طلسمِ لفظِ کن سے جسنے کی ہے قدرت آرائی

عزیز لکھنوی

جلوۂ جاناں

دیکھ برزخ میں ذرا جلوۂ طاؤسِ حرم — ہے یہی جلوہ جو ہے رونقِ صد باغِ ارم

کیفِ نظّارگیٔ حسن کی دل میں ہے عجب — شوق ہے تجھکو تو آ دیکھ تماشا کوئی دم

اِن میں جو آکے مِلا وہ بھی ہوا دریا دل — آشنا قلزمِ عرفاں کے ہیں کیسے حاتم

پھر یہ دیدار کہاں اسکو سمجھ جلوۂ برق — دیکھ دم بھر میں ہوئی جاتی ہے صحبت برہم

طرفہ نیرنگ ہے یہ رنگِ تماشائے جمال — شوق کو رام کر اپنا کہ یہ ہے آہوئے رم

ہو جو کم کیف تو پھر ذوقِ تماشا کیا ہو — جذبۂ شوق ہو تو کیف کا کیوں نشہ ہو کم

حال کی قدر نہیں وقت نہیں قابو میں — ہوش در دم کو سمجھ دم ہے یہ دم بھر میں عدم

نقشِ موہوم مٹا واہمہ خلّاقِ ذہن — کوچۂ وہم کی ہے راہ بہت خم در خم

ہے ادھر سروِ سرافراز سراسر مائل — خاکسار اُسکو پسند آئے ترے سر کی قسم

سینے بریاں ہوئے جنکے وہ ہے انکا دمساز — ہے وہ محوِ جگرِ خستہ و چشمِ پُر نم

ناظرِ جلوہ ہیں وہ جو ہیں ازل سے ہی سعید — جن کا ہے طالعِ فرخندہ نہیں بختِ دژم

روبرو کیوں نہ ہو وہ آئینۂ غیب و شہود — چشمِ باطن جو ہو وا ہو تو کیوں ہوں گوشِ اصم

پاسِ انفاس کے جادے سے چلا آ سالک — سن تو یہ بانگِ جرس گونجتی ہے کیا پیہم

جوگ کے سادھوؤں کا آکے مہا بن دیکھو — تم کو آئے گا نظر جلوۂ طاؤسِ حرم

شام سندر ہے اسی بن کی گپھا میں غائب — نے نوازی میں ہے سرمست وہ جانِ عالم

کنزِ مخفی ہے وہ استارِ خفا میں روپوش — چشمِ دل کے لئے مشہود ہے یہ سرِّ اعظم

خلوتِ دل میں یہی ایک ہے دمساز رفیق — جان و دل سے یہ ہوا مونسِ جان و ہمدم

جذبہ سکر ہیں مجذوب تماشا ہے نظر — دیکھ لے سالکِ مجذوب نگاہِ محرم

کیوں نہ ہو جلوۂ مستور تجلّی پیکر — مظہرِ فیض ہے جب خود کششِ کافِ کرم

ساقیِ محوِ تغافل تجھے کچھ ہوش نہیں — خود نما جلوہ ہے خود جلوہ نمائے عالم

یہ دمِ چند جو صحبت ہے غنیمت گن اسے — دیکھ لے شوق سے تو بھی رخِ زیبائے صنم

بے ہمہ با ہمہ ہو تو بھی خود آرا بن کر — وسوسہ ہو نہ کوئی خطرہ نہ غرّہ نہ بھرم

رُباعی

آئی رمضاں کے بعد وہ عیدِ سعید
ہر قفلِ دہن کے واسطے جو ہے کلید
مل مل کے گلے منا رہے ہیں خوشیاں
احباب کو یارب ہو مبارک یہ عید

محوی لکھنوی

خود شناسی کی خدائی میں جدائی ہو کہاں   رنگ تسکیں میں ہو تمکیں مسرت ہو نہ غم

وصل عریاں جو ہوا پردہ پڑا ابر زرخ کا

طلب و طالب و مطلوب ہوئے ضم باہم

ساقی دہلوی

شمع

اے شمع کسقدر ہی سوز و گداز تجھ میں   عشاق کے دلوں کا ہی بند راز تجھ میں

فرقت کی آگ اونکے دل میں ہے جل رہی ہیں   تیرے بھی تن بدن سے شعلے نکل رہے ہیں

غمگیں ہیں اور انکا مطلوب جانگزا ہے   تو رو رہی ہی تیرا اسلوب جانگزا ہے

وہ کاٹتے ہیں راتیں اپنی جو تارے گن کر   تو کاٹتی ہے راتیں اپنے تن راے گنکر

اک شمع رو کی لو سے دل انکا جل رہا ہے   جسم اپنی لو سے تیرا جلکر پگھل رہا ہے

انکی نگاہ میں گر اک روے آتشی ہے   تیری نگاہ میں خود آتش بھری ہوئی ہے

کاکل کے عشق سے ہی نازل بلا جو ان پر   تو بھی گھری ہوئی ہی اپنے دھوئیں کے اندر

زخمی اگر دل انکا ہی ابرؤں کے خم سے   کھاتی ہی زخم تو بھی گلگیر کے ستم سے

بہتا ہی خون انکا آنکھوں سے ہو کے پانی   تیرا بدن پگھل کر دکھلاتا ہے روانی

تجھ پر بھی رات بھاری انپر بھی رات بھاری   تو اور گریۂ غم وہ اور آہ و زاری

لیکن ہی ان میں تجھ میں اے شمع فرق اتنا   دلسوز ان کے احباب اور تو کھڑی ہی تنہا

تنہا ہی تو سحر تک تنہا ہی تو رہے گی   ہے کون جس سے دلکا کچھ حال تو کہے گی

تونے زبان پائی لیکن نہیں وہ گویا   گویا ہو تو سنے کون افسانہ درد و غم کا

آہیں تری ہیں ظالم گو دل ہلانے والی   لیکن نہیں زباں تک ہرگز وہ آنے والی

پروانے جو ہو کر سب خون بہ گئی تو   یا داغ بن گئی تو اور جلکے رہ گئی تو

تیری لگی بجھائے کس کو پڑی ہے ایسی   آڑے کسی کے آئے ہمت کہاں کسی کی

جب تک خوشی کے دن ہیں احباب سب ہیں ساتھی   جب آپڑی مصیبت پھر آہ اکب ہیں ساتھی

لیکن ترے پتنگے ہیں شمع اتجھپہ شیدا   تساید دکھے دل انکا ہو ان کو درد تیرا

دیکھیں گے تجھکو مصروف آہ و فغاں ہیں وہ جب   دوڑیں گے بیخودانہ تیری مدد کو وہ سب

آئیں گے بھی پتنگے تو کیا مدد کریں گے   دیکھیں گے تجھکو جلتا تو خود بھی جل مریں گے

آکر بٹائیں گے کب غم میں وہ ہاتھ تیرا   اس سوز و ساز میں کیا دیں گے وہ ساتھ تیرا

گو دیں گے وہ پروں سے ٹھنڈی ہوائیں تجھکو   اس سوز اس جلن میں تخفیف تاکہ کچھ ہو

لیکن تری جلن کو کیا کم وہ کر سکیں گے   ہاں خود جلیں گے خود کو بیدم وہ کر سکیں گے

جل جائیں گے جو خود ہی تو غم کریں گے کسکا   وہ خود ہی خاک ہونگے ماتم کریں گے کسکا

روشن وفا کو اپنی کر جائیں گے وہ جلکر   لیکن یہ انکا جلنا ہی تیرے حق میں بدتر

خود وہ جلیں گے لیکن نکلے گا نام تیرا   مشہور ہی جلانا او شمع کام تیرا

الزام جسقدر ہیں سب تیرے سر رہیں گے   عشاق کش کہیں گے پروانہ کش کہیں گے

قصے ترے بنائیں دنیا میں لوگ کیا کیا   چرچے زباں پہ لائیں دنیا میں لوگ کیا کیا

ظالم بھی تو بنے گی بے مہر و پر دغا بھی   مشہور سب میں ہو گی تو شمع بیوفا بھی

قاتل تجھے کہیں گے سارے خدا کے بندے   منصف نہ ہوں گے ہرگز جو روجفا کے بندے

ہے رحم تجھ پہ واجب اے شمع زار ہی تو   پروانوں کے الم میں ہاں سوگوار ہی تو

دل سے ترے نہو گا یہ سوز یہ الم کم   ہو گی نہ یہ جلن کم ہو گا نہ داغ غم کم

جلتا ہی تھر دن کو اور شب کو تو اکیلی

ننھے سے جی کا تیرے اللہ ہی ہی بیلی

خورشید علی مہر دہلوی

رباعیات

معشوق کو بے قرار ہوتے دیکھا   بے رحم کو اشکبار ہوتے دیکھا

یہ تجربہ حاصل ہوا اس الفت میں   ہر چیز کو یادگار ہوتے دیکھا

اے نرگس مست یار میری توبہ   اے میکدۂ خمار میری توبہ

بے مانگے بہت پلائی تونے بس بس   اے لذت بادہ خوار میری توبہ

ضمیر دہلوی

بعد مدت کے فلک لایا دیار یار میں

کیا یہی ہے وہ مقام نغمہ ریز و عطر بار   جسکی صبح و شام پر قربان ہوتی تھی بہار
کیا یہی ہے وہ مقام دلربا و دلفریب   جس کا تھا ہر ایک ذرہ مایۂ صبر و شکیب
کیا یہی ہے وہ مقام غمزدا و راحت فزا   سبزی رنگین جسکی تھی مرقع عیش کا
ہاں یہی وہ خاک ہے جس سے برستی تھی خوشی   جس کا دن تھا نور آگیں عنبر آگیں رات تھی
ہاں یہی وہ خاک ہے سرمایۂ تسکین دل   حسن پرور تھی سرور آور تھی جسکی آب و گل
ہاں یہی وہ خاک ہے جس خاک پر تھا دلنواز   چشم گر نمناک تھی تو یہ بھی رہتا تھا گداز
یارب ایسی گلزمیں کو کھا گئی کسکی نظر   اب ہے سبزے کی وہ شادابی نہ وہ لطف سحر
اے فلک اے جور پرور ظلم کی کچھ انتہا   ہائے کیسے باغ کو برباد تو نے کر دیا
کیا سنوں بلبل کو اس کا آشیاں ملتا نہیں   گل کو کیا پاؤں کہ پتے کا نشاں ملتا نہیں
اے گل سیراب تیری عطر افشانی کہاں   عندلیب زار تیری مرثیہ خوانی کہاں
وے گلستان تمنا یوں تو تیرے برگ و بار   سرزمین صدق و خلت کے تھے زیبا یادگار
پھول تیرے سب کے سب تھے آرزو دیدار کی   جنکی رنگینی تھی سرخی آتشیں رخسار کی
لیکن ان پھولوں میں تھا اک پھول نازک خوشنما   جسکی بوئے خلق سے عالم تھا کل مہکا ہوا
تھا اجالا میرے گھر کا دل کی راحت اس سے تھی   اسکو مجھسے عشق تھا اور مجھکو الفت اس سے تھی
عصمت و عفت کی دیوی کوہ تمکین و حیا   چارہ ساز اہل حاجت ما داوج انقیا
دلربائی میں تبسم رشک موج سلسبیل   جانفزائی میں تکلم دارو ے طبع علیل
تھا منور اس رخ روشن سے کاشانہ مرا   بادۂ عشرت سے تھا لبریز پیمانہ مرا
تھا سفر یا تھا حضر اسکی جدائی شاق تھی   فرقت اسکی آفت جان و دل مشتاق تھی
خوف تھا جس بات کا آخر کو پیش آئی وہی   گردش تقدیر اپنے سامنے لائی وہی
آہ خاک نالوہ نے میرا دُرِ بے بہا   چھین کر مجھسے خدا جانے کہاں پر کھو دیا
کیا کہوں کس سے کہوں ڈھونڈوں کہاں پاؤں کہاں   کچھ نشاں ملتا نہیں حیران ہوں جاؤں کہاں
اس کے مرجانے سے جینے کا مزا جاتا رہا   بلکہ تھا جو زندگی کا مدعا جاتا رہا
اے اجل اے ہادم لذات برباد نشاں   تو بتا مجھکو کہ وہ ہے شاہد رعنا کہاں
حال پر ہم دردمندوں کے نظر ہے یا نہیں   اسکو میرے روز ہجراں کی خبر ہے یا نہیں
اسکو میرے روز ہجراں کی خبر ہے یا نہیں   آہ آتشبار میں یارب اثر ہے یا نہیں
آہ آتشبار میں یارب اثر ہے یا نہیں   مائل بیدار پھر وہ فتنہ گر ہے یا نہیں
کون بتلائے کہ وہ فرخندہ صورت کیا ہوئی   دل ہے کیوں ویران، وہ الفت کی مورت کیا ہوئی
عیش کے دن کیا ہوئے عشرت کی راتیں کیا ہوئیں   برہمی وہ کیا ہوئی چاہت کی باتیں کیا ہوئیں
اے گل تر کیا محبت کا یہی تھا اقتضا   چھوڑ کر تنہا مجھے آباد ویرانہ کیا
کیا خطا مجھسے ہوئی آزردگی کا کیا سبب؟   یا وہ صحبت روز و شب کی یا یہ غفلت ہے عجب
تیری دوری دیکھئے کیا کیا دکھائے گی مجھے   ہر گھڑی کی یاد دیوانہ بنائے گی مجھے
ہجر میں جز آہ و زاری جی بہلتا ہی نہیں   گریۂ پیہم پہ اپنا زور چلتا ہی نہیں
نالۂ ناشاد لب سے دور ہو سکتا نہیں   زندگی جب تک ہے دل مجبور ہو سکتا نہیں

موت آجائے تو ثاقب رنج فرقت دور ہو
اسکی صورت دیکھکر جان حزیں مسرور ہو

العبد الحزین ثاقب (مدیر قند پارسی)

انتظار دوست

نہیں تاب صبر باقی، بس اب انتظار کب تک؟   کوئی حد بھی ہے کروں میں ترا اعتبار کب تک؟
ترے "آج، کل" کے وعدے نہ وفا ہوئے نہ ہونگے   یونہی دل کو دے تسلی کوئی بیقرار کب تک؟
نہ مہینے دو مہینے، کیا انتظار برسوں   دل مضطرب پہ آخر ہے اختیار کب تک؟
ذرا تو بھی سوچ دل میں کہیں تھم کوئی نادان   ترے لطف کا رہوں اب میں امیدوار کب تک؟
میں بغیر تیرے اب تک ہاں زندہ ہوں تعجب   ہنوز زندگی یہ اپنی مجھے ناگوار کب تک؟

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم تو
پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد؟

محمد یحییٰ تنہا بی۔اے

سچّی بیوی

تنہائی کی مونس ہے تُو — سازِ محبت کی ہے لَے تُو
جامِ عنایت کی ہے مے تُو — حق میں ہے اک پاکیزہ شے تُو
رونقِ بزمِ الفت تُو ہے — لطف فزائے صحبت تُو ہے
ترے وجود سے گھر ہے جنّت — بن تیرے جنت قعرِ مذلّت
تیری لطافت تیری نزاکت — اک عالم پر چھائے ہے حیرت
سچّی خلقت حق کی پری ہے — پر تجھے اس سے بے خبری ہے
بات تری ہے شہد سے شیریں — کام ترا ہے گل سے بھی رنگیں
حُسن ہے تیرا عزّت و تمکیں لو — شرم تری ہے خود تیری تزئیں
تو ہی محبت کا ہے پُتلا — تو ہی مروّت کا ہے پُتلا
گھر باہر کی عزّت تجھ سے — سارے گھرانے کی حشمت تجھ سے
ماں اور باپ کی غیرت تجھ سے — نام و نمود کی شہرت تجھ سے
تجھ بن انساں کب ہے انساں — تُو جو نہ ہو تو گھر ہے ویراں
باہر جب ہوں مرد اکیلے — ہوں بیچارے غربت جھیلے
کوئی نہیں آرام جو دے لے — بھائیں نہ دل کو باغ اور میلے
تیرا تصوّر پر ہو خوش کن — دل پر تیرا اثر ہو خوش کن
ہے اولاد کی اپنی دائی — پال اور پوس کے راہ پہ لائی
اچھی پڑھائی اُس کو بتائی — اچھی لکھائی اُسکو سکھائی
کھیل کود میں گُر بتلائے — جیسے کوئی مرشد گر جتلائے
تُونے جنے دارا و سکندر — تونے بنائے کرشن، مہیشر
تیرے نمونے پیر و پیمبر — تیرے کرشمے گھر گھر، در در
تیرے ہی باعث کون و مکاں ہے — تو جو نہیں تو ہیچ جہاں ہے
جب جنّت میں آدم آئے — تنہائی سے بہت گھبرائے
رو رو کے ایسے آنسو بہائے — آنکھوں سے بہکر گود تک آئے
حق نے کیا دنیا کو پیدا — آدم کو، حوّا کو پیدا
پس ہوئی بیوی موجب راحت — درد و الم میں باعثِ فرحت
گھر میں سرور بادۂ عشرت — اور سفر میں حسنِ مسرّت
رازوں کی رکھوالی تو ہے — گلشن دل کی لالی تو ہے
شرم و حیا کی زندہ پری ہے — غیرت کوٹ کے تجھ میں بھری ہے
کھیتی گھر کی تجھی سے ہری ہے — تیری ہی چاندی سب کھری ہے
تیرا وجود مسرت افزا — تری نمود محبّت افزا
تُو ہے اندھیرے گھر کا اجالا — تیرا ہی سب سے بول ہے بالا
تو ہی شرافت کی ہے مالا — سب سے بہتر، سب سے بالا
عفّت و عصمت تیرا زیور — ہے یہی سب سے اچھا زیور
ایسی تھی عصمت تجھ کو پیاری — زندہ جل کے مری بے چاری
جان کی بازی دیکھے نہ ہاری — عصمت قرباں، عفت واری
عشق کا شوہر کے دم بھر کے — زندہ ہوگئی گویا مر کے
گرچہ وہ دن ہے آنکھوں سے اوجھل — تیرا وہی ہے لیکن کس بل
صبر کی شاخ کا چُنتی ہی تو پھل — کاٹتی آنکھوں میں ہے پل پل
ستی کے ست کی جان یہی ہے — عشق کی سچّی شان یہی ہے
تجھ سا سچّا دوست کہاں ہے — تیرا ہی طالب سارا جہاں ہے
ہمسایوں کی راحتِ جاں ہے — فقر فقیری شانِ شہاں ہے
تیرا ابر کرم ہے چھایا — جنگل جنگل، دریا دریا
شانِ امارت میں بھی جلی ہے — ناز میں، نعمت میں، تو پلی ہے
باغِ کرم کی ہنستی کلی ہے — بات تری مصری کی ڈلی ہے
تیرے ہی حسن سے ہر سو چمکا — چپّا چپّا، ذرّہ ذرّہ
پر ہیں بہت سے تجھکو بھولے — اپنی آن اور بان پہ پھولے
خود ہیں جھلاتے عیش کے جھولے — اور تیرے دل کو دے کے ہولے

بیخبری کی نیند میں سوتے — دین ہیں دنیا کے لئے کھوتے
بے شک انھیں کی بدولت پہنچا — دل پر تیرے صدمہ گہرا
پر اس کا بھی کچھ نہیں شکوا — واہ ری ہمت! بل بے بوتا!
صبر کی سل چھاتی پر رکھی — عیش ابد کی نعمت چکھی
شرم و حیا کی سچّی دیوی — صبر و رضا کی سچّی دیوی!
جود و سخا کی سچّی دیوی — لطف و عطا کی سچّی دیوی
کتنی دنیا جلتی ہے تجھ سے — آس کی کھیتی پھلتی ہے تجھ سے
محرم خلوت تجھ پر صدقے! — مونس جلوت تجھ پر صدقے!
منبعِ رحمت تجھ پر صدقے! — مصدرِ عشرت تجھ پر صدقے!
کانِ مروت! تجھ پر قرباں!! — جانِ محبت! تجھ پر قرباں!!

نصیر (حسین آبادی)

نوحہ وفات

سر سریندر بکرم پرکاش بہادر والیٔ سرمور ناہن

گھٹا چھائی ہے کالی ہر طرف ناہن میں ماتم کی
گری ہیں خرمن تاب و تواں پر بجلیاں غم کی
وفورِ غم سے حالت ہے دگرگوں چشمِ پُر نم کی
نہیں ہے صبر کی طاقت کسی میں رنج پیہم کی
رواں ہے سیلِ اشکِ خوں ہر اک کی چشمِ گریاں سے
نکلتی ہے صدائے نالہ ہر قلبِ پُر ارماں سے

قلم روتا ہے لکھنے سے، ہے موتِ ناگہاں کس کی
ہوا کاغذ سیہ، آئی اجل یہ ناگہاں کس کی
گئی گلگشت باغِ خلد کو پاکیزہ جاں کس کی
مٹی ہے خاک میں جلدی مبارک عزّ و شاں کس کی
جسے سرمور میں دیکھو نشانہ تیرِ غم کا ہے
تڑپنے میں ہر انساں آئینہ نخچیرِ غم کا ہے

عدم میں لے گیا ہیہات! مرگِ ناگہاں کس کو
رہے اس صدمۂ جانکاہ پر ضبطِ فغاں کس کو
بھلا ایسی مصیبت پر رہے تاب و تواں کس کو
ابھی تو نوجواں تھا لے گیا تو آسماں کس کو
اُٹھا واحسرتا! دنیا سے جو مشہور راجا تھا
بہت ہی نیک سیرت نیک دل دانا تھا یکتا تھا

خبر کیا تھی کہ سوئے خلد راہی شادماں ہوگا
خبر کیا تھی کہ استسقا سے عاجز جانِ جاں ہوگا
وہ عازم چوتھی جولائی کو سوئے آں جہاں ہوگا
روانہ دارِ فانی سے بملکِ جاوداں ہوگا
ہیں اب سر پیٹتے غم میں شکیب و حسرت و ارماں
رعایا کی نہ کیونکر زندگانی ہو بلائے جاں

عقیل و عادل و منصف مزاج و بندہ پرور تھا
وہ علم و فن کا شایق قدر دانِ ہر ہنرور تھا
خلیق و خوش سیر تھا نیک عادت نیک محضر تھا
ذکی فہم و فراست میں سخن سنج و سخنور تھا
الم ہو نالہ و آہ و بکا جتنا ہو تھوڑا ہے
ہر اک دلبر ملالِ جاں گزا جتنا ہو تھوڑا ہے

خبر تھی کس کو ہوں گے راہیٔ ملکِ بقا جلدی
نہ ہو گی اس مرض سے اب انھیں حاصل شفا جلدی
چمن میں آکے رخصت ہو گئی یوں بادِ صبا جلدی
اٹھائیگا وہ سایہ فرقِ ناہن سے خدا جلدی
مگر تسکیں ہے اب ناظر ہوا خواہانِ دولت کو
کہ اس کے جانشیں سے شان ہو گی شانِ دولت کو

چندو لال ناظر
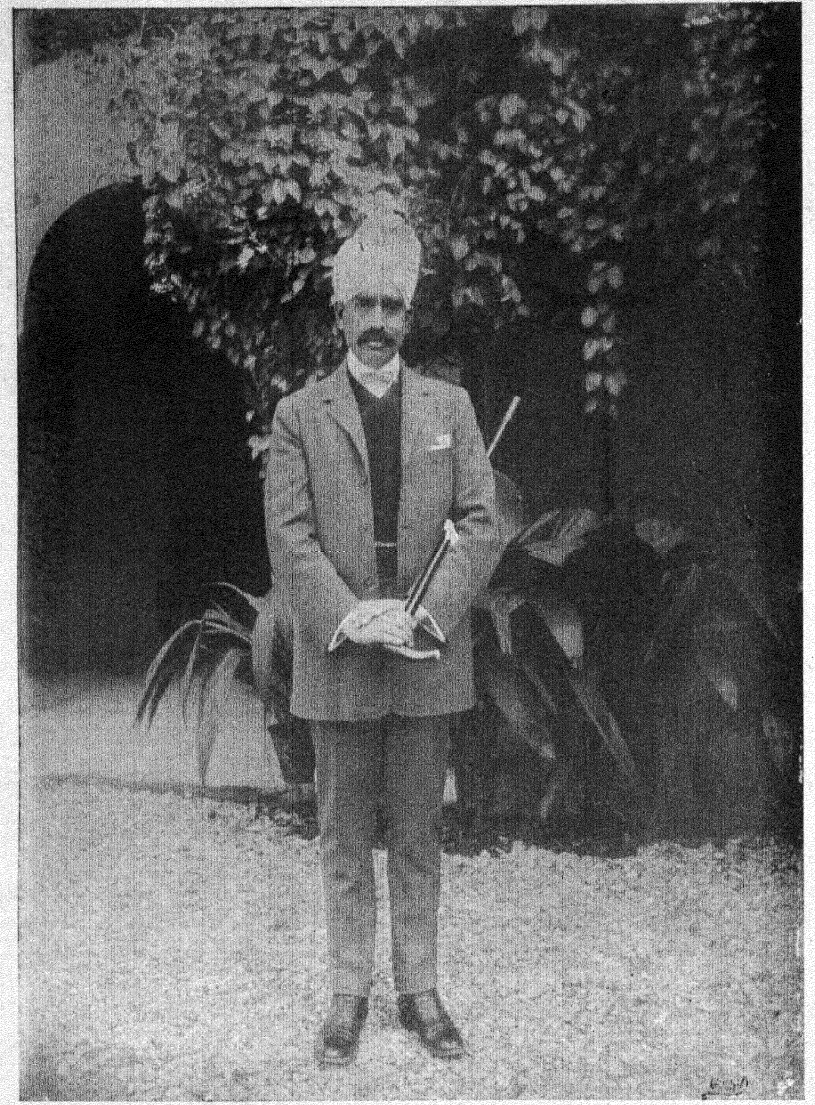
آنریبل راجہ سر سراندر بکرم پرکاش صاحب بہادر والئی ریاست سر مور ناہن(مرحوم)

جی بٹھایا مرا اندوہِ فنا نے پیہم   سر اٹھایا [illegible]
ہجرِ ساقی میں سرِ بادہ کشاں ناکام   ایک چکر میں

میری ہستی میں بھی اک ننگِ عدم ہے توفیق
میرے ہونے نے کیا گم مجھے عنقا کی طرح

توفیق مہدوی

تازہ غزلیں

بہار نام کی ہے، کام کی بہار نہیں   کہ دستِ شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں
جو آج وصل میں اسطرح چوسے جاتے ہیں   انھیں لبوں سے سُنی ہی ہزار بار نہیں
بتانِ ماہ جبیں سیر گاہ سمجھے ہیں   یہ داغ داغ۔ جگر کوئی لالہ زار نہیں
حرم کی طرح نہیں میکدے میں بیداری   سوا ہمارے یہاں کوئی ہوشیار نہیں
یہ کس نے ناقۂ لیلےٰ کو نجد میں گھیرا   بگولے دشت کے ہیں قیس کا غبار نہیں
رہے گی یاد انھیں بھی مجھے بھی وصل کی رات   کہ اُن سا شوخ نہیں، مجھ سا بیقرار نہیں
حباب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا   مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں
سحر بھی ہوتی ہی، چلتے ہیں اے اجل ہم بھی   اب اُنکے آنے کا ہم کو بھی انتظار نہیں
اذیت اِس دلِ مردہ کو کیوں ہی پہلو میں   عذاب گور نہیں، گور کا فشار نہیں
مجھے یہ ڈر ہی نہ ہو اور طول محشر کو   مرے گناہوں کا مالک کوئی شمار نہیں
یہی چراغ لحد تھے یہی تھے قبر کے پھول   اب اُن کے نقش قدم بھی سر مزار نہیں

جفا لگا کے پہنچتے ہیں گُل رُخوں میں ریاضؔ
کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

ریاض خیرآبادی

خدا توفیق دے قاتل کہیں تیغ دو سر باندھے   کہ سر دینے پہ ہم تیار ہیں کبسے کمر باندھے
کھُلا کب بابِ خلوت پاے درباں پر گرے برسوں   عدو کے سامنے بھی ہاتھ اپنے بخیہ گر باندھے
یونہی ستوا رہے سارا زمانہ روزِ محشر تک   جو وہ بکھرے ہوئے گیسو نہ ہنگام سحر باندھے
بہار زخم سے ہی یادگاری اُسکے خنجر کی   تڑپ کر تو زدوں انگور گر زخم جگر باندھے
سنا ہے وادیِ ایمن کا جبسے ماجرا میں نے   کھڑا رہتا ہوں پہروں ہاتھ زیر سر شجر باندھے
حسینانِ چمن کے حُسن پر کب محو ہوتے ہیں   تجھی کو دیکھتے ہیں ٹکٹکی اہل نظر باندھے
ادب سے دور ہی خلوت میں اسکی پاؤں پھیلانا   کھڑے رہتے ہیں عاشق ہاتھ اپنے تا سحر باندھے
نہ ہو نیرنگیِ باغِ جہاں سے ایکدم غافل   بسانِ لالہ رہ سر پر یہاں رخت سفر باندھے

زمیں پر گر پڑے آبادؔ خوشہ عقد پرویں کا
قیامت ہو ابھی طرّہ جو وہ دستار پر باندھے

آباد عظیم آبادی

میری ہستی سے ہے مرے جوش تمنا کی طرح   میں عدم ہو کے بھی موجود ہوں عنقا کیطرح
بس کر اے جوشِ ہوس ہائے کدورت بس کر   مل گئے خاک میں ہم نقش کفِ پا کیطرح
پھُک گیا شعلۂ بیتاب ہوس سے دل بھی   جگرِ سوختہ داغ تمنا کی طرح
دیکھ اے گرمیِ رفتار کہ دل بھی میرا   ٹوٹ جائے نہ کہیں آبلۂ پا کیطرح
لذتِ جوشِ تپشہائے تمنا مت پوچھ   داغ ہے دل ہمہ تن داغ تمنا کیطرح
ہوں وہ لاشئے کہ ازل ہی میں مرا دل بنکر   مٹ گیا نقطۂ موہوم تمنا کیطرح
روک رکھا ہی مری گردش قسمت نے مجھے   قید ہوں نقطۂ پرکار تمنا کیطرح

کوئی بھی ہم کو باوفا نہ مِلا   یوں تو ملنے کو اِک زمانہ مِلا تو
اُن سے مِلکر بھی کچھ مزا نہ مِلا   وہ ملے دل مگر ذرا نہ مِلا تو
راہ الفت میں وہ بھی گم ہوتے   خضر کو کوئی رہنما نہ مِلا تو
تونے دل لے کے آنکھ پھیری ہے   اب نظر مجھ سے بے وفا نہ مِلا۔
ایک لے دے کے دل مِلا تھا ہمیں   وہ بھی کمبخت کام کا نہ مِلا تو
تھک گیا شیخ کر کے طوفِ حرم   کسی جانب مگر خدا نہ مِلا
بےخودی میں انھیں تو کیا پاتے   ہم کو اپنا ہی خود پتا نہ مِلا

سے میری نبھی نبھی نہ نبھی　دل ہی تو ہے ملا ملا نہ ملا
جب سے سیدھا ہوا ہے دل لیکر　آج تک بھی وہ کج ادا نہ ملا
مٹ گئے رہروانِ راہِ طلب　مگر اُن کا ہی نقش پا نہ ملا
دل دیا یادِ چشمِ یار ملی　کعبہ بیچا شراب خانہ ملا
پی چکے سب مگر مجھے ساقی　کوئی قطرہ بچا کچا نہ ملا
بن گیا درد دل مرا ہمدرد　جب کوئی درد آشنا نہ ملا
اڑ گیا طائرِ حِنا بن کر　اُن کی مٹھی میں دل مرا نہ ملا

آتے ہی ہائے چل دئے وہ حمید
آرزو پا کے مدعا نہ ملا

حمید میرٹھی

جہاں میں ڈھونڈنے والے کو کیا نہیں ملتا　مگر ہمیں دلِ بے مدعا نہیں ملتا
کہاں ہیں وقتِ مصیبت قرار و صبر و شکیب　رفیق کوئی مزاج آشنا نہیں ملتا
بنا رہے ہیں وہ دل میں ہمارے گھر اپنا　کہ اس سے بڑھ کے مکان دوسرا نہیں ملتا
غرورِ زندگیٔ مستعار بے جا ہے　کسی کو مرہمِ زخمِ قضا نہیں ملتا
فراغ و صحبتِ احباب و یادِ عہدِ شباب　کہاں گئے کہ کسی کا پتا نہیں ملتا
بشر کو عاقبتِ کار کا خیال رہے　بغیر نیک عمل کے خدا نہیں ملتا
ہجومِ غم سے مرے دل میں کیا خوشی آئے　یہ بھیڑ ہے کہ کہیں راستا نہیں ملتا
تمام کوچۂ جاناں کی خاک چھان آئے　کہیں غریب دلِ مبتلا نہیں ملتا

ہوا ہے سرد زمانے سے دل یہ اے عشرت
خوشی میں غم میں کسی میں مزا نہیں ملتا۔

عشرت لکھنوی

گذرے ہوئے ملال فراہم نہ کیجئے　اچھے بھلے مزاج کو برہم نہ کیجئے
پھر کاہشِ ہوس سے تبہ ہوگی زندگی　دشمن پہ رحم کیجئے اب دم نہ کیجئے

الفت کو گر فروغ نہ دیجے نہ دیجئے　جو رہ گئی ہے اس کو تو اب کم نہ کیجیے
روشن ہیں مجھ پہ حسن کی سب کارسازیاں　اپنے ستم کو لطف سے مدغم نہ کیجئے

مصروف منعِ گریہ رہے آستینِ غیر
بسمل کا اس طریق سے ماتم نہ کیجئے

ریاض الحسن بسمل

رہی فراق میں بھی شکل روبرو تیری　شبیہ کھینچی تصور نے ہو بہو تیری
معاف رکھ! جو ہے گلہائے تر سے پیار مجھے　کہ ان میں رنگ ترا کچھ ہے کچھ ہے بو تیری
نسیمِ صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا!　رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری
یہ فخر کم نہیں ہم قابلِ خطاب تو ہیں　عزیز اور کے القاب ہیں "تو" تیری
دہانِ غنچہ تر سے، زبانِ سوسن سے　چمن چمن میں سنی میں نے گفتگو تیری
دل و جگر پھکے جاتے ہیں سوزِ ہجراں سے　لگن عذاب ہوئی مجھکو شمع رو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو بقول سُرورؔ
"کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری"

محروم

میری آنکھوں میں ہے عکسِ رُخِ زیبا اُنکا　میری نظروں سے ٹپکتا ہے تماشا اُنکا
ہائے یہ دیدۂ مشتاق ہے کسکا، میرا　ہائے وہ وعدۂ دیدار ہے کسکا، اُنکا
دلِ آزار طلب کو ہو نویدِ حرماں　بنگیا راحتِ جاں دردِ تمنا اُنکا
کاش ملجائیں دو عالم مجھے آنکھیں بنکر　دیکھ لوں ایک نظر میں بھی تماشا اُنکا
مفت بربادیٔ ناموسِ وفا ہوتی ہے　یا مرا ہو کے رہے یا دلِ شیدا اُنکا
شمع و پروانہ کہو یا گل و بلبل سمجھو　نام روشن ہے زمانہ میں ہمارا اُنکا
اسطرف پاسِ وفا اور انھیں پاسِ اعدا　ہوگیا رنج اسی بات پہ میرا اُنکا

مجھکو بیدلؔ ابھی مرجانیکی فرصت کب تھی
دیکھنا تھا اسی پہلو سے کلیجا اُنکا

بیدل جھنجھانوی

مجمع آل انڈیا اردو کانفرنس' منعقدۂ پونہ

انڈین پریس الہ آباد

اڈیٹوریل

آل انڈیا اُردو کانفرنس

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جب دنیا بھر کے تفکرات سے آزادی ہوتی ہے، تو ماہران علم اللسان مل جل کے اُن چند مسائل و تجاویز پر غور کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں جو ماضی کے تجربہ سے مستقبل کے لئے مفید ثابت ہوں' ایسے موقع پر ان گنتی کے سند الوقت حضرات کی مجوزہ باتیں آئندہ کے لئے خضر طریقت کا کام دیتی ہیں۔ اس قسم کی کانفرنسیں مصر کے عروج کے وقت سب سے پہلے ان بادشاہوں کے زمانہ میں شروع ہوئیں، جنکا خاندان اعلیٰ کہلاتا ہے۔ اہل روما نے بھی اپنے یہاں، جولیس سیزر، اور قیصر آگسٹس کے دور میں کچھ علمی مجالس قائم کر کے خاص اجلاس کئے۔ یونانیوں کے "مشائین" میں تو اس قسم کی مجلسیں عام تھیں۔ یورپ میں' پندرہویں صدی کے آغاز شباب میں' قریباً ہر ایک ملک نے اپنی زبان اور لٹریچر کے متعلق چھان بین کر کے جس قسم کے قواعد تجویز کئے ہیں' وہی اس زبان کے اصولِ صرف و نحو کے علاوہ انشاپردازی کی جان ٹھہرے ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس دور انگلشیہ میں ریل و تار کے ذریعہ دور دور کے شہروں کا باہمی فاصلہ اسقدر قریب ہو گیا ہے کہ یہاں کے تجارتی تعلقات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور تبادلۂ خیالات نے ثابت کر کے دکھا دیا ہے کہ اُردو کے بولنے والے ہندوستان تو ہندوستان' اس کے پرے افغانستان' ادھر عربستان، اور لنکا تک جہاں چلے جائیں' بغیر اس کے کہ انھیں اپنے اظہارِ خیالات کے لئے ٹامس کک اینڈ سن کے کسی ترجمان سے مدد لینی پڑے' اپنے آپ ہی سب کچھ کر سکتے ہیں، ہندوستان میں ۱۴۴ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان سب میں کیا بلحاظ طرز تحریر، اور کیا بلحاظ اظہار خیالات اُردو ہی کو وہ فخر حاصل ہے، جو کسی اور زبان کو نہیں ہو سکتا۔ جب ہمارے یہاں کے چند بزرگوں کو اُردو کی مزید ترقی کا خیال پیدا ہوا' تو آل انڈیا اُردو کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی' تاکہ اُردو کو خاص ملکی زبان تصور کر کے ایک مجتمعی کوشش سے آئندہ کے لئے کچھ ایسے اصول بنائے جائیں جن کی رُو سے ہر حصہ ملک کے لئے ریل کی ایسی سیدھی سڑکیں قائم ہو جائیں۔

خوشی کا مقام ہے کہ آل انڈیا اردو کانفرنس کی ضرورت محسوس کر کے بہاخواہان ملک نے سالانہ جلسے تجویز کئے چنانچہ پچھلے برس اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ اُسوقت دلی۔ لکھنؤ، آگرہ کے بجائے بدایوں کو جلسہ کے لئے انتخاب کیا گیا تھا، اور مولوی عزیز مرزا صاحب۔ بی اے۔ اس کے پریسیڈنٹ چنے گئے تھے۔ آپنے جو تقریر فرمائی تھی' وہ ایسی اعلیٰ تھی کہ اُس سے ہندو الگ خوش تھے اور مسلمان الگ محظوظ۔ اس کانفرنس میں جو تجاویز پیش ہوئی تھیں' وہ مجموعی طور پر ترقی زبان کے لئے نہایت ہی موزوں تھیں۔ اور ملک نے انھیں پسند کیا۔ گو اُس وقت بعض اہل الرائے نے اتنا ضرور کہا کہ جس شہر کو جلسہ گاہ کے لئے انتخاب کیا گیا ہے' موزوں نہیں، مگر بعد میں جواب مل گیا کہ ہندوستان کی کسی ایسی زبان کے متعلق جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت سمجھی جاتی ہو ہندوستان کے کسی شہر کو انتخاب کرنا برابر ہے' تو کوئی وجہ نہیں کہ بدایوں کو محروم الارث قرار دیا جائے حالانکہ بدایوں ایک زمانہ میں ایسا نام پا چکا ہے کہ اُس کے مورخ، مصنف، مؤلف، شاعر' ناظم' ناثر "منتخب التواریخ" تھے۔

عام خیال تھا کہ بدایونی جلسہ کے بعد دوسرے سالانہ جلسے کے واسطے کوئی اور بڑا شہر انتخاب ہو گا' جلسہ پہلے سے کہیں وسیع پیمانہ پر کیا جائے گا' جو فرو گزاشتیں' عدیم الفرصتی کی وجہ سے' پہلے ہو چکی تھیں انکی خاص اصلاح ہو گی۔ مگر اہل الرائے کی امیدوں کے خلاف بدایوں کے بعد دوسرے سال کے لئے مولوی رفیع الدین صاحب نے اپنے پریکٹس والے شہر "پونہ" کو تجویز کیا اور بجائے اس کے کہ اس علمی جلسہ کی صدارت کے لئے

راجہ سرکشن پرشاد صاحب مدار المہام حیدرآباد دکن، شمس العلما مولانا امداد امام صاحب اثر

شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی — شمس العلما مولانا عبد الحکیم صاحب

شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب حالی — ابوادریس مولانا احمد حسن صاحب شوکت

شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب — خان بہادر مرزا سلطان احمد خان صاحب

شمس العلما مولانا محمد یوسف صاحب — آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما

مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ شمس العلماء مولوی عبداللہ صاحب
مسٹر ایم ایل رلیا رام صاحب بی اے ایل ایل بی مولوی عبداللہ العمادی صاحب ایڈیٹوریل ہرتسر
نواب سعیدالدین خان صاحب طالب (دہلوی) مولوی سید احمد صاحب، مولف فرہنگ آصفیہ
میں سے کوئی صاحب انتخاب کئے جاتے، آنریبل خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب ممبر لیجس لیٹو کونسل پنجاب، کو نامزد کیا گیا۔ اسمیں کچھ شک نہیں کہ میاں صاحب اپنی قانون دانی اور قانون فہمی کے باعث اس وقت "زندہ دلان پنجاب" کے سربرآوردہ حضرات میں سے ہیں، اور لاہور کے خطۂ یونان موضع باغبان پورہ میں آنریبل خان بہادر میاں محمد شاہدین صاحب جج چیفکورٹ پنجاب کے دوسرے درجہ پر ہیں۔ مگر آپکا انتخاب اُس وقت نہایت ہی موزوں ہوتا، اگر یہ کوئی قانونی جلسہ ہوتا۔ لیکن ایک ایسے جلسہ کے لئے جسمیں محض علمی ہی باتیں ہوں۔ ایسا انتخاب قابل حرفگیری ہے، کیونکہ اس سے پہلے میاں صاحب نے لٹریری دنیا میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا جس سے اُنکا شمار زبان اُردو کے ہواخواہوں میں ہو سکتا۔

بہرحال جلسہ کو رفیع الشان بنانے کے لئے مولوی رفیع الدین احمد صاحب نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ اسپیشل ٹرین دوڑائی گئی۔ اور پونہ و بمبئی کے احاطہ کے قریباً ہر ایک شہر کے قایم مقام استقبال کو آئے۔ ۲۱ رجولائی کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ طمطراقی جلوس نکلا، اور دوسرے دن اسلامیہ اسکول میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جسمیں آنریبل میاں محمد شفیع صاحب خان بہادر نے اپنی پریسیڈنشیل تقریر فرمائی

آپ کی تقریر اگرچہ بیش بہا معلومات کا خزانہ تھی مگر اسمیں بعض ایسے چبھتے ہوئے فقرے پائے جاتے ہیں جن سے بحث کا ایک نیا میدان کھل گیا ہے۔ چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما لکھتے ہیں :-

"یہ کانفرنس محض علمی ہے، اور مجھکو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اپنے دوسرے اجلاس میں یہ کانفرنس دو عظیم قوموں کے درمیان برہمی کا باعث بنائی جائے گی، یا یہ کہ اس کے ذریعہ پولیٹکل اظہار ہوگا، اور دل کے بخارات نکالے جائیں گے"

حکیم برہم بھی اپنے اخبار "مشرق" میں تحریر فرماتے ہیں :-

ہم کو آنریبل میاں محمد شفیع صاحب کی دل آزار باتوں سے اتفاق نہیں۔ انھوں نے گول گول الفاظ میں ہندوؤں پر الزام لگایا ہے کہ وہ سواجیہ کی ترقی کے لئے ہندی کی ترقی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک فرضی قیاس ہے، کسی مسلمان کا یہ قیاس نہ ہونا چاہئے۔ ..... سواجیہ کے غلط معنی ملک میں پھیلائے گئے ہیں حالانکہ انسان کے دل و دماغ میں سوراجیہ کا مسکن ہے ...... میاں محمد شفیع صاحب کا یہ اعتراض بے موقع تھا۔ اور انکو بحیثیت ایک صدر انجمن کے اس بات کو نہ کہنا چاہئے تھا۔ اس واسطے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر ہندو اردو سے نفرت کرنے لگے ہیں تو انکو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے نہ یہ کہ ان کو بہ خیال دیگر اُردو سے نفرت بڑھانے کی کوشش کی جائے"

ان کے علاوہ اور بہت سے اہل الرّاے کو کچھ موافق کچھ مخالف خیالات کے اظہار کے لئے اس تقریر نے بے بس ہو کر مجبور کیا۔ کسی نے لگانے کی، اور کسی نے بجھانے کی کوشش کی۔ انصاف پسند طبائع صرف یہی چاہتے ہیں کہ زبان کی ترقی کے لئے پولیٹکل مذاق کا نام نہ ہونا چاہئے کیونکہ اہل قلم کو اہل سیف سے کیا کام ؟

آل انڈیا اُردو کانفرنس میں جو ریزولیوشن پیش ہو کر پاس ہوئے "مسلم" نے اُن کو حسب ذیل لکھا ہے :-

۱- صوبہ بمبئی کے مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہے، اور اس کانفرنس کی رائے میں گورنمنٹ کا وہ خیال کہ اُردو محض آرائشی زبان ہے، اور دنیوی کاروبار میں مفید نہیں محض غلطی پر مبنی ہے۔ لہٰذا یہ کانفرنس مودبانہ عرض کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے دینی اور دنیاوی معاملات میں اُردو کی بیحد ضرورت ہے، اور بجز اُردو کے انکی تعلیم ناممکن ہے۔

۲- صوبہ بمبئی میں اُردو مدارس کی تعلیم ہرگز درست نہیں ہو سکتی، اور نہ کافی تعداد اُردو مدرسین کی دستیاب ہو سکتی ہے تاوقتیکہ اس صوبہ میں ایک اُردو ٹریننگ کالج نہ قائم کیا جائے۔

۳- اس صوبہ کے ہر ڈویژن میں ایک مسلمان ڈپٹی انسپکٹر خاص اُردو مدارس کے لئے مقرر کیا جائے۔ جیسا کہ جنوبی ڈویژنوں میں گورنمنٹ نے مقرر کیا ہے اور ان افسروں کو پورے عملی اختیارات عطا فرمائے جائیں۔ اور نیز اُن کے نائبوں کی سالانہ رپورٹیں اُردو مدارس کے بارے میں براہ راست سب انسپکٹروں کو بھیجی جائیں۔

۴- حسب سفارش ایجوکیشنل کمیشن اس صوبہ میں اینگلو ورنیکلر مدارس زیادہ کھولے جائیں۔ اور پونہ کیمپ کا اینگلو اردو اسکول، جہاں فی الحال پانچویں جماعت تک

انگریزی پڑھائی ہوتی ہے، ہائی اسکول کردیا جائے۔

۵۔ اوّل درجہ کے اُردو اسکولوں میں، مدرسۂ ناسک کی طرح، تیسری جماعت تک انگریزی پڑھائی جائے۔

۶۔ مڈل اور ہائی اسکولوں میں، اُردو کورس نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان طلبا کو بیحد نقصان پہنچتا ہے، لہٰذا مڈل اور ہائی اسکولوں میں، اُردو کورس پڑھائے جائیں۔ اور اُردو مدرّس مقرر کئے جائیں۔

۷۔ جن سرکاری ہائی اسکولوں میں فیس بڑھائی جائے، وہاں مسلمان طلبا کے ساتھ حسب سفارش ایجوکیشنل کمیشن، رعایت کی جائے۔

۸۔ مسلمانوں کی تعلیم میں جو نقصان عظیم اس صوبہ کے اندر ہو رہا ہے، اسکی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ایجوکیشنل کمیشن نے جو سفارشیں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کی ہیں اُن کی پوری تعمیل نہیں ہوتی۔

۹۔ اُردو کی ترقی کے واسطے اُردو زبان میں انواع و اقسام کے علوم و فنون کی کتابیں بکثرت تصنیف و تالیف ہوں، اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کی جائیں۔

۱۰۔ صوبۂ بمبئی کی دیسی زبانوں کی درسی کتابوں میں بزرگان و سلاطین اسلام کے متعلق توہین آمیز الفاظ اور بے بنیاد روایات موجود ہیں جن سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ یہ کانفرنس درخواست کرتی ہے کہ ایسے مضامین کتابوں سے نکالدئے جائیں اور ٹیکسٹ بک کمیٹی میں مسلمانوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ نیز ہر ایک دیسی زبان کی ٹیکسٹ بک کمیٹی میں مسلمانوں کے قائم مقام ہوں۔

۱۱۔ مردم شماری میں مسلمانوں کی زبان، اردو کے کم دکھانے کی وجہ سے زبان کی خانہ پُری میں غلط اعداد دتبائے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ کانفرنس اظہار افسوس کرتی ہے اور گورنمنٹ کی توجہ بغرض تحقیقات اس پر مبذول کرتی ہے۔

۱۲۔ اس صوبہ کے چند اُردو نصاب کی ترمیم کے لئے اور نیز اُن تعلیمی سوالات پر جو آجکل گورنمنٹ بمبئی کے زیر تجویز ہیں اپنی رائے ظاہر کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس چند لائق اصحاب کی ایک کمیٹی مقرر کرتی ہے۔

اِن جملہ ریزولیوشنوں پر ایک نگاہ دوربیں سے دیکھنے والے فوراً معلوم کریں گے کہ

(۱) پہلا رزولیوشن کسی قدر خلاف واقعات ہے، کیونکہ مسلمانان بمبئی کی زبان مجموعی طور پر اُردو نہیں ہوسکتی۔ وہاں عموماً گجراتی زبان کا استعمال ہے۔

(۲) رزولیوشن نمبر ۲ و نمبر ۳ و نمبر ۴ و نمبر ۵ و نمبر ۱۰ و نمبر ۱۱ زیادہ تر اس قسم کے ہیں جنھیں آل انڈیا اُردو کانفرنس کے ساتھ کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تجاویز اگر "مسلم لیگ" میں پیش ہوتیں تو زیادہ موزوں تھیں۔

(۳) رزولیوشن نمبر ۶ لغایت نمبر ۸ اور نمبر ۱۲ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کیلئے زیبا تھے

(۴) رزولیوشن نمبر ۹ سے ہمیں کلی اتفاق ہے ہمارے خیال میں اتنا حصہ اور بھی ہونا چاہیئے تھا کہ جن لوکل گورنمنٹوں نے زندہ مصنّفین کی چند خاص تصانیف کے لئے قدر افزائی کی ہے، اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ استدعا کی جائے:۔

ا۔ ایک مستند، ستی، عمدہ، اُردو کی لغت بنائی جائے۔

ب۔ اصطلاحات علمی کے لئے مناسب ہم معنی الفاظ تجویز کئے جائیں، جن سے اُن کا مفہوم واضح ہو۔

آل انڈیا اُردو کانفرنس کے رزولیوشنوں میں مندرجہ ذیل ریزولیوشنوں کی بھی ضرورت تھی:۔

۱۔ اشہری، برق، سرور، تسلیم، ظہیر، ڈاکٹر بلگرامی، مولانا ذکاء اللہ اور دیگر بزرگوں کی وفات پر اظہار تاسف، جنکی بدولت اُردو لٹریچر نے ترقی حاصل کی۔

۲۔ لالہ سری رام صاحب ایم اے کی اُن خدمات کا اعتراف جو انھوں نے "خمخانۂ جاوید" ایسا تذکرہ لکھنے سے اُردو لٹریچر کی بھاری کمی کو پورا کیا ہے۔

۳۔ انشاپردازی کے لحاظ سے اس وقت کس قسم کی اردو کا رواج ہے کم از کم ہر ایک کے قواعد و اصول مرتّب کئے جائیں۔

۴۔ آئے دن نئے نئے علمی، ادبی، اخلاقی رسالے جاری ہوتے ہیں، جو ملکی لٹریچر کی مزید ترقی کا باعث ہیں۔ جس رسالہ کو اُس کے حسن خدمات کے لحاظ سے زیادہ ممتاز سمجھا جائے، اُسکی خاص عزّت افزائی کیجائے جس طرح کہ یورپ کی لٹریری

سوسائٹیاں اپنے ہاں کے میگزینوں کو اعزازی تمغات عطا فرماکر ان کی خدمات کا اعتراف کرتی ہیں۔ نیز ایسے رسائل کے ایڈیٹروں کو بھی خاص اعزاز سے ممتاز کیا جائے، اور اُن کے لٹریچر کو مفید سمجھ کر گورنمنٹ سے سفارش کی جائے کہ ان کی چند کاپیاں مدارس کے لئے خریدی جائیں۔

۵۔ کم بضاعت مترجم بعض وقت اچھی کتابوں کو ترجمہ کے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ اور اسیطرح اپنی کم بضاعتی کی وجہ سے بہت غلط ترجمہ چھاپتے ہیں لہذا لٹریچر کے خاص مذاق کو مدِنظر رکھ کے ایسے اصول مرتب کئے جائیں جن سے تجاوز کرنے والے کی کتاب اشاعت پذیر نہ ہو۔

۶۔ دربار تاجپوشی کے موقع پر جو مشاعرہ "تاجِ سخن" کے نام سے زیرِ اہتمام نواب احمد سعید خاں صاحب طالب دہلی میں ہونے والا ہے، اس کو بھی اس کانفرنس کی ایک شاخ قرار دیکر جس قسم کے تمغے تجویز کئے جائیں، اس کانفرنس کی وساطت سے تقسیم ہوں۔

اس قدر اظہار خیالات کے بعد ہم ایک اور بات ظاہر کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ جب آل انڈیا اُردو کانفرنس والے کانفرنس کو کوئی مذہبی کانفرنس نہیں سمجھتے، تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسکی صدارت کے لئے یکے بعد دیگرے ہر مذہب کے لٹریری اصحاب انتخاب کئے جایا کریں۔ اور اس لحاظ سے آئندہ سال کے جلسے کے لئے ہم آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کا نام پیش کرتے ہیں، جن کے انتخاب سے ساری غلطیوں کا دفعیہ ہو جائے گا۔

جنت آرامگاہ آصف

ملک میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی گئی ہوگی کہ ۲۹ ؍اگست کی دوپہر کو سلطان دکن نظام الملک میر محبوب علی خان بہادر المتخلص بہ آصف کی روح پرفتوح اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف پرواز کر گئی۔ آپ کی ناگہانی وفات سے سیاسی اور ملکی معاملات کو جو ناقابل برداشت احساس ہوا ہے اس کو تو مدبرانِ ملک ہی خوب جان سکتے ہیں۔ مگر آہ! دنیاے شاعری کو جو ناگزیر نقصان پہنچا ہے، وہ ہمارے احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ یہ ایک ایسا دل خراش اور جگر کاہ حادثہ ہے، جسکی تلافی مادر گیتی سے ممکن نہیں۔ اعلیٰ پایہ کے شاعر ہونے کے علاوہ آپ بڑے زبردست علمی سرپرست تھے۔ آپ کے مبارک عہد میں جسقدر ترقی زبان اُردو کو حیدرآباد میں ہوئی ہے اس کی کوئی اور نظیر نہیں مل سکتی۔ رعایا پروری آپ کا خاص شیوہ تھا۔ ایسے ہمدرد اور صاحب دل حکمراں شاذونادر ہی ہوتے ہیں، جو کہہ سکیں کہ

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے میری رعایا کے واسطے

غرض ایسے رعایا پرور فرمانروا کی جدائی کا جسقدر غم کیا جائے، کم ہے۔

آئندہ نمبر میں ہم آپ کے بالتصویر حالات ہدیہ ناظرین کریں گے۔ آپ کی وفات کے متعلق جو نظمیں اور قطعات تاریخ دفتر ادیب میں آئے ہیں وہ بھی اُسی پرچے میں شائع ہوں گے۔

شکریہ

ہم اپنے اُن قدردانوں کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے ہماری ناچیز خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر اُن اہل اخبارات کا بھی شکریہ واجب ہے، جنھوں نے اپنے اپنے صحائف میں ادیب اور ادیب کے لٹریچر کی تعریف کی۔

خریداران ادیب سے اپیل

اب تک یہ شکایت کی جاتی تھی کہ ادیب کے قلمی معاونین میں زیادہ تر وہی اصحاب ہیں جو اُردو کے دیگر رسائل میں بھی لکھتے ہیں۔ معاونین ادیب ملاحظہ فرمائیں گے کہ اب اس شکایت کی مطلق جگہ نہیں رہی۔ ہر پرچے میں آپ کو دوچار ایسے حضرات کے نام نامی نظر آئیں گے، جنھوں نے اب تک ادیب کے سوا کسی اور رسالہ کے لئے قلم نہیں اٹھایا۔ اسی نمبر کو دیکھئے۔ اس میں کئی نئے نام ہیں۔ ابتدائی مضمون کے مصنف ہمارے ملک کے ایک نہایت معزز و ممتاز اہل قلم ہیں۔

(آئندہ نمبر میں ہم آپ کی تصویر بھی ہدیہ ناظرین کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں)
جناب ”آنند“ کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس نمبر میں آپ کے مضامین کی اول قسط درج کی جاتی ہے۔ آئندہ بھی آپ کے محققانہ مضامین ادیب میں شائع ہوتے رہیں گے۔ حضرت ریاض کا نام محتاج تعریف نہیں۔ آپ اپنے زمانہ کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے آپ کا نام نہ سُنا ہو۔ عرصہ سے آپ خاموش تھے خوشی کی بات ہے کہ نیاز مند ایڈیٹر کی زبانی درخواست کو آپ نے اپنے حسن اخلاق سے قبول فرمایا اور مسلسل طور پر اپنا کلام عنایت فرمانے کا وعدہ کیا ہے جس کا سلسلہ اس نمبر سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی نئے نام آپ کو نظر آئیں گے۔

معاونین ادیب اس سے تو ہرگز انکار نہیں کر سکتے، کہ ہم ادیب کو اسم بامسمیٰ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، اس میں کوتاہی نہ ہوگی۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ معاونین ادیب بھی اس علمی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ مولانا شوکت مدظلہ نے اپنے مضمون (فرانس کے اخبارات) میں دو دو خریدار پیدا کرنے کی اپیل کی ہے۔ اگر ناظرین اپنے ادیب کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ اس کے سرپرستوں کا دائرہ وسیع کیا جائے، تو ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ وہ جلد ہمیں شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ اُن کی سہولت کے لئے اس نمبر کے ساتھ مطبوعہ کارڈ ارسال کیا جاتا ہے تاکہ وہ اسکی خانہ پُری کرا کے بھیج سکیں۔ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں آپ اپنا فرض ادا کیجئے!

مزارِ غالب

ہم نہایت خوش ہیں کہ ”مزارِ غالب“ کے عنوان سے جو نوٹ گذشتہ نمبر میں درج کیا گیا تھا، اور یادگارِ غالب کے قائم کرنے کے باب میں جو اپیل کی گئی تھی، اس کا اچھا اثر ہوا ہے ہم نہایت شکریہ کے ساتھ ذیل میں اُس رقم کی رسید دیتے ہیں، جو اس وقت تک اس سلسلہ میں وصول ہوئی ہے۔ معاونین ادیب سے درخواست ہے کہ وہ اس طرف خاص توجہ مبذول فرمائیں۔ اور اس عالی تحریک میں نہ صرف خود عملی حصہ لیں، بلکہ اپنے احباب کو بھی اس طرف متوجہ کریں:-

انڈین پریس، الہ آباد	عـہ۵
مولانا مرزا ابوالفضل صاحب بی اے	عـہ۵
پادری جان ٹلکم صاحب	عـہ
مولوی اعلان صفی صاحب شہیر (فتنی عالم) ..	عـہ
منشی عبداللہ خان صاحب	عـہ
منشی کندن لال صاحب شرر سہارنپوری قسط اول	عـہ
ایک ہندو	عـہ
منشی لاڈلی پرشاد صاحب	عـہ
منشی گیا پرشاد صاحب	عـہ
منشی اشتیاق حسن صاحب	عـہ
منشی سمیع اللہ صاحب	عـہ
ایک پردہ نشین خاتون	عـہ
مولوی حبیب احسن صاحب بہلی ..	عـہ
نیاز مند ایڈیٹر ادیب	عـہ۵
میزان	عـہ۵

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویر ایک مشہور بنگالی مصوّر، بابو سُمر یندر ناتھ گپتا، کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کے واقعات کا تعلق مہابھارت سے ہے۔ جب پانڈو اپنا تمام مال و اسباب قمار بازی میں ہار گئے تو اُس وقت یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اگر تم پانچوں بارہ برس کا بن باس اور ایک سال اگیات باس (اسطرح رہنا کہ کوئی شخص پہچان نہ سکے) کر آؤ تو پھر سلطنت کے حقدار ہو سکو گے۔ اس تصویر میں ارجن کو دکھایا گیا ہے جسنے اپنے اگیات باس کے لئے زنانہ صورت اختیار

کرکے برہن نلا نام رکھ لیا تھا۔ اگیات باس کی میعاد پوری ہو چکی تو ارجن اب بیراٹ کے لڑکے اتر کو ساتھ لیکر کوروں سے لڑنے کو جا رہا ہے۔ اتر لڑائی سے ڈرتا ہے، مگر ارجن (برہن نلا) اس کو سمجھا رہا ہے کہ "چھتری کو لڑائی سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہئے"۔

سلطان عبدالحمید خاں اور پرنس بسمارک (۱۸۱۵ء لغایت ۱۸۹۸ء) کی تصویریں انگریزی مصوّری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بادی النظر میں یہ عام تصویریں ہیں، لیکن ذرا غور سے ملاحظہ فرمائے تو واضح ہوگا کہ دونوں تصویریں بجاے خود مرقع ہیں۔ ممالک یورپ میں ایسی تصویروں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

اس پرچہ میں ایک اور تصویر شائع کی جاتی ہے جسمیں "سری کرشن کا بچپن" دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی اسی مصور کی کھینچی ہوئی ہے جسکی ایک تصویر جولائی نمبر میں "جسوداجی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے ہندوستانی فن تصویر کا یہ ایک نادر نمونہ ہے۔

مرحوم مہاراجہ ناہن کی تصویر کے لئے ہم بابو چندولال صاحب رما ناظر کا شکریہ ادا کرتے ہیں، تصویر کے ساتھ آپ نے مہاراجہ صاحب کے مختصر حالات بھی ارسال فرمائے ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

ریاست سرمور ناہن انبالہ کے جانب شمال و مشرق بفاصلہ ۔ہ میل واقع ہے۔ ریاست کے حکمراں جناب آنریبل سر سراندر بکرم پرکاش بہادر۔ ایک عالی دماغ، وسیع الخیال بیدار مغز، سنجیدہ، خلیق، عالی حوصلہ، دلیر، عادل، وجیہہ۔ خوشخصال، نیک طینت سادہ مزاج رئیس تھے۔ آپ نومبر ۱۸۶۶ء کو کتم عدم سے عالم شہود میں جلوہ آرا ہوے تھے۔ بچپن ہی سے خداداد ذہن اور دماغ اور اقبال ساتھ لائے تھے۔ اپنے والد مہاراجہ سر شمشیر پرکاش صاحب بہادر جی سی۔ ایس۔ آئی کے زیر نظر رہکر تربیت و تعلیم پائی، علم تمدن و سیاست میں، جیسا کہ ایک رئیس کے لئے زیبا ہے دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ آپ نے اکتوبر ۱۸۹۸ء میں مسند نشین ہوکر زمام حکومت ہاتھ میں لی مسند نشین ہوتے ہی بڑے استقلال سے ریاست کے کاروبار کو انصرام دینا شروع کیا۔ دسمبر ۱۹۰۲ء میں آپ ممبر کونسل بنائے گئے اور جنوری ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کی طرف سے کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب عنایت ہوا۔ ۱۲ سال تک بڑی دانائی اور فراست متانت سے ریاست کے کاموں کو بنفس نفیس انجام دیا۔ عدل و انصاف میں یکتا اور معقول پسندی کے شیدا تھے۔ آپنے ریاست کو ہر طرح رونق دی۔ پلیگ کے انسداد کے لئے آپ نے سالانہ کثیر خرچ سے ایک محکمہ "پلیگ ڈیپارٹمنٹ" قایم کیا۔ آپ نے ناہن میں پانی کی قلت کو محسوس فرماکر واٹر ورکس کا کام اعلیٰ پیمانہ پر جاری فرمایا جسکے لئے تین لاکھ روپیہ کے قریب منظوری ہکر ایک مشہور فرم ہیور کمپنی کو دی گئی۔ آپ نے اپنے اہلکاروں کے لئے بصرف کثیر ایک بلڈنگ عطا فرمائی جس میں اپنے نام نامی پر "سراندر کلب" قائم فرمایا۔ حسب معمول آپ بماہ چیت دہرہ دون تشریف لے گئے تھے راستہ میں معمولی شکایت سلسل بول پیدا ہو گئی۔ دہرہ دون جاکر استسقا کا مرض ہو گیا۔ دل، جگر، پھیپھڑہ پر خراب اثر پڑا اور آخر ۴ جولائی ۱۹۱۱ء کی شب کو ½ ۱۲ بجے اپنی رعایا کو داغ مفارقت دے گئے۔ اثنائے بیماری میں ولیعہد صاحب بہادر امر سنگھ جی کو جو بڑے سنجیدہ اور فہمیدہ ہیں، کل نظم و نسق ریاست سپرد فرمایا۔ جنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے زمام حکومت ریاست ہاتھ میں لی۔ اور اب کل ریاست کا انتظام نہایت حوصلہ اور بیدار مغزی سے اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چلکر انجام دے رہے ہیں۔

آل انڈیا اُردو کانفرنس کے مجمع کی تصویر محض اس لحاظ سے شائع کی جاتی ہے کہ اس کا نام "مجمع اُردو کانفرنس" ہے مگر سخت افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اسکو "اُردو" سے کوئی تعلق نہیں۔ اِس مجمع میں مولوی محبوب عالم صاحب (ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور) کے سوا کوئی اور حضرت ہمیں ایسے نظر نہیں آئے جنھوں نے اردو لٹریچر کی کچھ خدمت کی ہو۔ علاوہ بریں جو کارروائی کانفرنس میں ہوئی اس کے لحاظ سے بھی یہ کانفرنس "اُردو کانفرنس" نہ تھی۔ برعکس نہند نام زنگی کافور والی مشہور مثل غالباً ایسے ہی مواقع پر استعمال ہوتی ہوگی!

مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کی تصویر اس دلی شکر گزاری کیساتھ شائع کیجاتی ہے جو آپ کی قلمی اعانت سے ادیب پر فرض ہے۔ آپ کی شیوا بیانیاں عام شہرت رکھتی ہیں اور ناظرین ادیب ہمیشہ آپکے کلام سے محظوظ ہوتے رہے ہیں۔

"دمینتی اور ہنس"

از بابو ابنیندرو ناتھہ ٹیگور

"DAMYANTI AND HANS"—*By Sjt. Abanindro Nath Tagore.*

انڈین پریس الہ آباد

اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء

جلد ۴ — نمبر ۴

اقوامِ ہند کی اصل اور اُن کی تقسیم[۱]

۱۔ قوم کیونکر پیدا ہوتی ہے، اور اس میں تغیرات کیونکر ہوتے ہیں۔

قوم و ملت

قبل اس کے کہ ہندوستان کی اقوام کا بیان کیا جائے، ہم اس امر کی تصریح کرنا چاہتے ہیں کہ قوم کیا چیز ہے؛ یہ کیونکر پیدا ہوتی ہے، اور اس میں تغیرات کیونکر وقوع میں آتے ہیں اور وہ کون سے خصائص ہیں جن کی بنا پر اقوام کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے ہم نے اپنی دوسری تصانیف میں اس مضمون پر تفصیلی بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ علمی تحقیقات کی رو سے عام خیالات کیا ہیں، اور خود ہماری ذاتی تحقیقات اس مسئلہ میں کیا ہیں۔ پس اس مقام پر اُس پرانی تحقیقات کا ایک خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ بنی نوع انسان کے مختلف گروہ جو تمام صفحۂ عالم پر پھیلے ہوئے ہیں اُن کی چند تقسیمیں کی گئی ہیں۔ جن کو نام اقوام کا دیا گیا ہے۔ یہ قوم کا لفظ گویا انسان کے لئے وہی معنی رکھتا ہے جو لفظ "جنس" حیوان کے لئے۔ نوع انسان کی مختلف اقوام اُسی طرح ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور اُن کے خصائص ویسے ہی صاف اور بیّن ہیں۔ جیسے اجناس حیوانی کی۔ ان کے خصائص میں ایک اصولی امر یہ ہے کہ یہ بذریعہ وراثت کے اباً عن جدٍ پہنچتی ہے، لفظ "قوم" کا مفہوم جنس کا تو ہے لیکن یہ لفظ "ملّت" سے بالکل علیحدہ ہے یعنی قوم و ملّت مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ ملّت کا اطلاق اقوام مختلفہ کے اُن گروہوں پر ہوتا ہے جو خاص وجوہات سے خواہ وہ وجوہات سیاسی ہوں یا جغرافی کسی ایک حکومت کے تحت میں آجاتے ہیں، مثلاً ہندو، فرانسیسی، نمسوی۔ ان الفاظ سے مراد ایسی اقوام کے گروہ ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ایک ہی ملک میں رہتی ہیں، اور اسی وجہ سے اُنکے اغراض بھی متحد ہیں۔

خصائص موروثی و خصائص اکتسابی

اجناس حیوانی کی طرح اقوام انسانی میں بھی دو قسم کے خصائص ہیں جن کا اثر اور جن کی عظمت نمایاں ہے۔ ان میں سے اوّلاً وہ خصائص ہیں جو وراثت کے ذریعہ

۱؎ یہ مضمون "تمدن ہند" سے لیا گیا ہے جو زیر طبع ہے اس کے اشاعت کے لئے ہم پادری جان ملکم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آبا و اجداد سے پہنچی ہیں اور پیدا ہونے کے ساتھ ہی اشخاص میں فطرتاً موجود ہو جاتی ہیں۔ ثانیاً وہ خصائص جو کسی مخصوص فرد قوم میں مرز بوم، تعلیم و تربیت، اور دوسرے اسباب سے پیدا ہو جاتی ہیں، گویا یہ وہ گٹھری ہے جسے قوم زمانہ دراز سے اپنے سر پر لئے آتی ہے۔ ہر فرد قوم پیدائش کے وقت انھیں اپنے ساتھ لاتا ہے۔ وہ خصائص جو افراد قوم کے ایام زندگی میں پیدا ہو جاتی ہیں، بمقابل موروثی خصائص کے نہایت ہی کمزور ہیں۔ اور ہرگز خصائص موروثی کا جو صدیوں میں پیدا ہوئی ہیں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ اکتسابی خصائص بہ مرور زمان، اور اثر مرز بوم کسی قوم میں زمانۂ دراز تک رہ جاتی ہیں تو پھر بہ تدریج اس قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر کے بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دیتی ہیں۔

اتصال قومی اُن تصانیف میں جن کا ذکر اوپر ہوا ہم نے دکھایا ہے کہ وہ مختلف اقوام جنھیں اسباب خارجی نے کسی ایک ملت میں شامل کر دیا ہے، آگے چلکر کسی روز ایک قوم بن جائیں گی، اور جو چیز انھیں ایک قوم بنائے گی وہ یہ ہے کہ اثر مرز بوم، ازدواج باہمی، اور وراثت، یہ تینوں مل کر مدت ہائے دراز میں ایسی جسمانی، اخلاقی، اور دماغی، خصائص پیدا کر دیں گی جو ہر فرد قوم میں عام ہو جائے گی

اتصال قومی کے شرائط مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اتصال قومی کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں اولاً جو تغیرات پیدا ہوں وہ بتدریج وراثت کے ذریعہ سے پیدا ہوئے ہوں، اور ثانیاً اُن مختلف اقوام میں جو کسی ایک ملت کے اجزا ہیں حد سے زیادہ نامساوات نہ ہو۔ شرط ثانی بھی نہایت ضروری ہے۔ مثلاً اگر کسی سفید رنگ قوم کا چھوٹا سا گروہ حبشیوں کے بڑے گروہ میں شامل کیا جائے تو وہ چند روز میں مفقود ہو جائے گا، بہت سی اقوام فاتح کا جنہوں نے کثیر التعداد اقوام کو فتح کیا انجام یہی ہوا یعنی قوم مفتوح میں مٹ گئیں جیسے عرب مصر میں، اس زمانہ کے مصری جو زبان مذہب اور نظامات کے لحاظ سے بالکل عرب ہیں، فی الواقع انھیں اقوام کی اولاد ہیں جو فراعنہ کے وقت میں اس ملک میں تھیں، اور اس کا ثبوت اُن مورتوں سے ہوتا ہے، جو مندروں اور قدیم سلاطین مصر کی قبروں پر کندہ ہیں۔

اثر مرز بوم مرز بوم کا اثر جو کسی زمانہ میں بہت بڑا سبب اقوام کے تغیر کا سمجھا جاتا تھا، فی الواقع نہایت خفیف اور کمزور سبب ہے۔ اس کا اثر اُسی وقت ہوتا ہے جب کوئی قوم کسی مرز بوم میں ہزارہا صدی رہی ہو۔ جس سے اتنا طویل زمانہ مراد ہے جو تاریخ انسانی کے شروع ہونے سے ماقبل تک پہنچ جاتا ہے۔ فی زماننا منجملہ اُن اسباب کے جو خصائص موروثی میں تغیر پیدا کرتے ہیں، مرز بوم کا اثر بہت خفیف سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً قوم یہود نے جو تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ اپنی موروثی خصائص کو نہایت مضبوطی سے قائم رکھا ہے۔ خصائص موروثی اس درجہ مضبوط اور مستحکم ہیں کہ اگر کوئی قوم ایسے مرز بوم میں جا بسے، جہاں بلا اپنی حالت بدلے ہوئے اور اپنے میں تغیرات عظیم پیدا کئے ہوئے، قائم نہ رہ سکتی ہو تو وہ مر مٹے گی لیکن بدلے گی نہیں۔ مرز بوم کا عادی ہو جانا محض خیالی امر ہے۔ مثلاً باوجود اس باقاعدہ زندگی کے جو انگریز ہندوستان میں بسر کرتے ہیں، اور جس میں اصول صحت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے وہ ہرگز اس ملک کی آب و ہوا کے عادی نہیں ہو سکتے۔ اور اگر وہ اپنے بچوں کو تربیت کے لئے یورپ نہ بھیجیں تو اس بر اعظم کے اندر تیسری ہی پشت میں ایک یوروپی بھی باقی نہ رہ جائے۔ مرز بوم کا اثر خفیف تو ہے مگر موجود ضرور ہے۔ گو یہ اثر محسوس

اسی وقت ہوتا ہے جب وراثت اس کی پوری اعانت کرے، مثلاً اگر اقوام مختلفہ میں جو ایک ہی ملت کے اجزا ہیں اتصال پیدا کرنے کی دوسری شرط جس کا ذکر اوپر کیا گیا موجود ہو، یعنی ان میں زیادہ نامساوات نہ ہو تو اس صورت میں موروثی خصائص قدیم کا وزن خصائص جدید کے وزن سے مساوی ہو جاتا ہے، اور اس وقت مرزبوم اپنا بین اثر دکھانے لگتی ہے۔ پس ہم اُسی پہلے نتیجہ پر آ گئے، یعنی نئی اقوام ازدواج باہمی اور میل جول سے پیدا ہوتی ہیں، نہ صرف اثر مرزبوم سے۔

اس نئی قوم کا درجہ

لیکن یہاں ایک نیا مسئلہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کے حل ہونے پر بڑے بڑے عملی نتائج کا دار و مدار ہے یعنی تمدن انسانی میں اس نئی قوم کا درجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اگر یہ نئی قوم اقوام ممزوجہ کے بہترین قوم سے بہتر یا اُس کے مساوی بھی ہو، تو یہ کہیں گے کہ یہ نتیجہ عمدہ ہوا۔ اور اگر بالفرض اس کا عکس ہوا اور نئی قوم درجہ میں گھٹ گئی تو نتیجہ بُرا ہوا۔ اعلیٰ قوم ممزوجہ میں سے وہ قوم جو امتزاج سے پہلے اعلیٰ درجہ رکھتی تھی گھاٹے میں رہے گی ہم نے اپنی مذکورۃ الصدر تصنیفات میں اس اصولی مسئلہ پہ تفصیلی بحث کی ہے، اور یہاں صرف نتائج کا لکھ دینا کافی ہوگا۔ جس مقام پر ہم نے ان نتائج کو بیان کیا ہے جو عالم کے مختلف حصوں میں اس قسم کے امتزاج اور میل سے پیدا ہوئے ہیں وہاں یہ بتا دیا گیا ہے کہ میل جول کا نتیجہ مخصوص حالات کے لحاظ سے یا تو بہت ہی مفید ہوا ہے یا سخت مُضر۔ میل جول مفید اُسی وقت ہوتا ہے جب کہ اُن اجزا مختلفہ میں جن کے ملنے سے ایک نئی قوم پیدا ہوتی ہے تباین نہ ہو بلکہ مماثلت ہو، مثلاً قوم انگریز کے مختلف اجزا یعنی قدیم برٹن، ڈین، اینگلوسیکسن، اسکاٹ، اور نارمن، فرنچ، آئرش وغیرہ میں مماثلت موجود تھی، اور اس وجہ سے ان کے میل کے نتیجہ سے ایک اعلیٰ درجہ کی قوم تیار ہوگئی۔ برخلاف اس کے اگر مختلف اجزا میں زیادہ تباین ہو اور اتصال کی صلاحیت کم ہے تو نتیجہ یقینی مضر ہوتا ہے مثلاً اقوام سفید رنگ اور اقوام سیاہ فام کا میل۔ یا ہندو اور یوروپی کا میل۔ ہنود اور یورپیوں کے میل کے متعلق اس تصنیف کے اس حصّہ میں پھر رجوع کیا جائے گا جس میں ذات کا بیان ہے اور دکھایا جائے گا کہ فی الواقع اس میل جول سے کس قدر بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ہم دکھائیں گے کہ ہند کے قدیم فاتحین یعنی قوم آریا ان بُرے نتائج سے بخوبی واقف تھے، اور اُن کا یہی علم غالباً ذات کی تقسیم اور اس کے متعلق کل نظامات کے قرار دینے کا باعث ہوا۔ اس قسم کے امتزاج اور میل کے سیاسی اور اخلاقی نتائج پر بھی جو مختلف صورتوں میں واقع ہوئے ہیں، بحث کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ اقوام کے تنزل اور حکومتوں کی ترقی اور انحطاط کے اسباب میں یہ بہت باوقعت سبب ہیں۔ ہم نے یہ بھی دکھایا ہے کہ جس وقت دو قومیں ایسی ہوں کہ ان میں سے ایک دوسرے کی محکوم ہو تو میل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ جب ان اقوام میں زیادہ فرق ہو تو ایک قوم دوسرے کی حکومت کو بآسانی قبول کر لیتی ہے مثلاً مسلمانوں کی حکومت ہند میں جہاں تقریباً پانچ کروڑ ہندؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ برخلاف اس کے جب فاتح و مفتوح میں فرق زیادہ ہے تو محکوم قوم اس آسانی سے غلامی قبول نہیں کرتی، یہ حال ہند میں انگریزی حکومت کا ہے۔ باوجود ڈیڑھ سو سال کے تسلط کے انگریزوں نے اس ملک کے باشندوں کو اپنی زبان اور اپنا مذہب سکھانے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ حالانکہ اتصال قومی کے پیدا کرنے میں یہ دو بہت بڑے جز ہیں۔

اس مقام پر ہم ان عام اصول کا جو اقوام عالم پر صادق آتے ہیں اور جن کا ذکر ہم اپنی ایک دوسری تصنیف میں تفصیل سے

کر چکے ہیں، اعادہ نہیں کریں گے۔ اقوام جدید کے پیدا ہونے کے مسلئہ کو چھوڑ کر اب ایک نظر ان خصائص پر ڈالیں گے جن کے ذریعہ سے اقوام انسانی کی تقسیم اور تفریق ہو سکتی ہے۔

۲۔ تقسیم اقوام کے اصول خصائص جسمانی و اخلاقی و دماغی کی وقعت تقسیم اقوام میں

تقسیم اقوام کے اصول بہ نظر سرسری تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقوام کی تقسیم میں سب سے باوقعت خصائص وہ ہیں جن کو خصائص جسمانی کہنا چاہیئے۔ مثلاً جلد اور بالوں کا رنگ یا کھوپڑی کی ساخت وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ وہ خصائص ہیں جو سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لیکن تھوڑے سے غور کے بعد معلوم ہوگا کہ فی الواقع ایسا نہیں ہے، اور اُن خصائص کے ذریعہ سے صرف سطحی تقسیم ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر صرف جلد اور بالوں کے رنگ کی بنا پر اقوام کی تقسیم کی جائے تو کل اقوام عالم چار یا پانچ سے زیادہ قسموں میں تقسیم نہ ہو سکیں اگر اس کے ساتھ کھوپڑی کی ساخت بھی شامل کر لی جائے تو اِن چار یا پانچ قسموں سے ہر ایک کی دو یا تین قسمیں بن سکیں گی لیکن اس سے آگے بڑھنا محال ہوگا۔ اگر ہم اقوام سفید رنگ کی تقسیم عریض الراس یا طویل الراس میں کریں اور پھر ان میں نہایت سفید اور کم سفید کی تفریق کریں تو اس تقسیم سے ہمیں فائدہ نہ ہوگا! کیونکہ اس تقسیم میں ایسی مختلف الاصل اقوام شامل ہو جائیں گی جیسے فرانیسی انگریزی۔ رومی۔ اور المانی وغیرہ۔ پس معلوم ہوا کہ صرف جسمانی خصائص کی بنا پر اقوام انسانی کی تقسیم نہیں کی جا سکتی اور ایک ملت میں مختلف اقوام کے مجتمع ہونے کے بارہ میں جو کچھ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اُس سے معلوم ہوگا کہ زبان و مذہب و تقاسیم سیاسی بھی بنائے تقسیم نہیں قرار دیجا سکتیں۔

خصائص اخلاقی و دماغی پس بنائے تقسیم نہ تو خصائص جسمانی ہیں اور نہ زبان و مذہب و تقاسیم سیاسی لیکن خصائص اخلاقی و دماغی البتہ بنائے تقسیم قرار دی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ پرتو ہیں ہر قوم کے خاص قوائے دماغی کے جو مادہ دماغی کی ساخت پر موقوف ہیں اور ان کا فرق اس درجہ باریک ہے کہ ہمارے آلات سے پیمائش نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہمیں خواہ مخواہ اس کی ضرورت ہے کہ مادۂ دماغی کے اس فرق کو ہم معلوم ہی کر لیں۔ ہمارے لئے اسی قدر کافی ہے کہ اس فرق کی وجہ سے جو دماغی اور اخلاقی صلاحیتیں کسی قوم میں پیدا ہو جاتی ہیں اُن سے ہم مطلع ہوں۔ یہی خصائص اخلاقی و دماغی پر قوم کی ترقی تدریجی کا دار و مدار ہے۔ اور یہی خصائص اس قوم کا حِصّہ تاریخ عالم میں مقرر اور معیّن کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان خصائص کی بہت بڑی وقعت ہے اور جو شخص کسی قوم کی اصلی حالت کو دریافت کرنا چاہے اسے لازم ہے کہ اِن خصائص کا مطالعہ کرے نہ کہ خصائص جسمانی کا۔ ایک بہادر راجپوت اور بزدل بنگالی کے درمیان میں فرق کرنے کے لئے نہ تو کھوپڑی کی ساخت کام آ سکتی ہے اور نہ کھوپڑی کا زاویہ بلکہ ہمیں صرف انکی خصائص روحانی اور وجدانیات کے ذریعہ سے اس اختلاف عظیم کا پتہ لگے گا۔ جو ان دونوں میں واقع ہوا ہے۔ مثلاً ہم انگریزوں اور ہندوؤں کی ہزار کھوپڑیوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں لیکن اس مقابلہ سے ہمیں ہرگز یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن سے تیس۳۰ کروڑ ہندو کئی ہزار انگریزوں کے تابع حکومت ہیں۔ یہ راز ہم پر جب ہی کھلیگا جب ہم ان دونوں اقوام کی اخلاقی اور دماغی حالتوں کا مقابلہ کریں۔ اس مقابلہ سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ایک میں کس اعلیٰ درجہ کا استقلال اور قوت عملی ہے اور دوسرے میں کس درجہ کا ضعف اور کمزوری ہے۔ کسی قوم کی دماغی اور اخلاقی صلاحیتیں اس قوم کا ارث ہیں جسے ہم نے کسی مقام پر مردوں کی آواز سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ خصائص اُن کے کردار و رفتار میں بہت بڑا دخل رکھتی ہیں۔ یہی خصائص قوم کے نظامات کو

جوان ترک

انڈین پریس الٰہ آباد

قرار دیتی ہیں۔ نظامات انھیں نہیں پیدا کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ افراد کے اندر ان خصائص میں تھوڑا بہت فرق واقع ہوتا ہے جیسا شکل وصورت میں فرق ہے لیکن قوم کے کثیر التعداد افراد میں ان میں سے بہت سی خصائص اسی طرح مستحکم ہوتی ہیں جیسے حیوانات کے اجناس میں خصائص جسمانی۔

قوم ایک جاندار ہے ہمارے زمانہ کے علم تشریح وعلم حیات نے ہمیں بتایا ہے کہ اشیائے جاندار کے جسم لاکھوں ذرّوں سے بنے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک بطور خود زندہ ہے اور اپنی تجدید کرتا ہے، اور اسی وجہ سے ہر ایک ذرّہ کی زندگی کی مدّت اُس عضو بدن سے کم ہے جس کا وہ ایک جزو ہے۔ اسی طرح قوم کو بھی ایک جاندار سمجھنا چاہیے، جو ہزارہا منفرد اجزا سے بنا ہوا ہے جس میں تجدید ہوتی جاتی ہے۔ ہر فرد قوم کی ایک ذاتی زندگی ہے جو مثل ذرّہ کے زندگی تھوڑی ہوتی ہے۔ لیکن قوم بہ حیثیت مجموعی ایک علیحدہ زندگی رکھتی ہے اور اس میں وہ مجموعی خصائص ہوتی ہیں جن پر تاریخ کے مطالعہ کے وقت ہمیں نظر رکھنی چاہیے۔ جب کسی زمانہ میں مختلف اقوام عالم کے علم النفس کا باہمی مقابلہ کیا جائے گا اور اس سے ایک نیا علم استخراج ہوگا تو اس علم کے محقق کا کام یہ ہوگا کہ اُن خصائص میں سے جو ہر ایک قوم میں مخصوص ہیں ایسے خصائص کو اخذ کرے جو تمام اقوام عالم میں مشترک ہوں اس خیالی قوم کے افراد نئی خصائص کے ذریعہ سے کسی قدر ایک سرے سے علیحدہ ہوتے جائیں گے لیکن پھر وہ ایک معین اور لازمی قانون قدرت کے مطابق ایک دوسرے سے قریب بھی ہوتے جائیں گے۔ انسان صرف اپنے والدین کا فرزند ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی اپنی قوم کا وارث بھی ہے

خصائص ملّی ظاہر ہے کہ وہ خصائص جو کسی ملت کے مختلف افراد میں بطور عام پائی جاتی ہیں تعداد میں اُسی قدر زیادہ ہوں گی جس قدر اس ملت کے اجزا میں مماثلت ہو اور اگر ان اجزا میں تباین ہو یا اتصال کم ہو تو اس وقت بے شک عام خصائص کی تعداد کم ہو جائے گی اگر ہم حیوانات کی تقسیم سے مقابلہ کریں تو یہ کہا جائے گا کہ کسی ملت کے وہ گروہ جن میں مماثلت ہو بجائے کسی جنس حیوانی کے اقسام کے ہیں یعنی ان میں باہمی فرق اس قدر نہیں ہو کہ انھیں سے ہر ایک کو ایک علیحدہ جنس قرار دیا جائے۔ برخلاف اس کے جو گروہ غیر مماثل ہوں اُنکی حیثیت علیحدہ علیحدہ اجناس کی ہوگی۔ وہ تمام خصائص جو کسی ملت کے افراد میں زیادہ تر پائی جائیں۔ انھیں اس ملت کے خصائص سمجھنا چاہیے۔ مثلاً اگر ایک ہزار فرانسیسی اور ایک ہزار انگریز لیے جائیں تو انکے افراد میں بہت کچھ فرق محسوس ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان ہزار ہزار آدمیوں میں بعض خصائص ایسی عام ہوں گی جن سے ہم ایک خیالی فرانسیسی اور خیالی انگریز اپنے ذہن میں بنا سکتے ہیں جس سے فرانسیسی اور انگریز کی تعریف ہو سکے گی۔ اسی طرح علم حیوانات کے ماہرین نے مثلاً گھوڑے یا کتّے کی تعریف کی ہے جب اس تعریف کو گھوڑوں اور کتّوں سے تطبیق دیں تو اُس میں بہت سے افراد شامل ہو جائیں گے اور شاید تھوڑے سے ایسے بھی ملیں گے جن میں خفیف سا فرق ہوگا، اور ان پر یہ مجموعی تعریف پوری طرح صادق نہیں آئیگی۔

اقوام ہند کی تقسیم اصول تقسیم کو قرار دینے کے بعد اب ہم ان اصول کو اقوام ہند کی تقسیم میں استعمال کر سکیں گے۔ ان اقوام کے بیان میں ہم پہلے ہر ایک کا مقام جغرافی بتائیں گے اس کے بعد ہم ہر ایک قوم کا علیحدہ علیحدہ بیان لکھیں گے اور پھر ایک خاص فصل میں اُن کی اُن عام خصائص کا ذکر کریں گے جو امتزاج باہمی اتحاد مرز بوم ونظامات واعتقادات کی وجہ سے ان مختلف اقوام میں پیدا ہوئی ہیں۔

(باقی آئندہ)

سیّد علی بلگرامی

سیف وقلم

خوش تر آں باشد کہ سرِّ اہل ملک
گفتہ آید در بیان سیف وقلم

دنیا کی ترقیات اقبال اور ادبار کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہی ہے اگر ہم دنیا کی تاریخ کے متفرق اوراق پر طمانیت اور امعان سے نظر ڈالیں گے تو ہمیں پتہ لگ جائے گا کہ شروع ہی سے یہ ٹرین کبھی بھی ایک رفتار پر نہیں چلی ہے بلکہ کبھی کسی رفتار پر اور کبھی کسی پر

گاہے چنیں گاہے چناں

اگر کبھی تیز چلی ہے تو کبھی دھیمی چال سے بھی۔ اگر کبھی فل سپیڈ سے منزلیں طے کر گئی ہے تو کبھی صرف ایک ہی منزل پر رہ گئی ہے۔

گاہ گرمی گاہ سردی مے شود
ہیچ پیمانہ نمیدارد قرار

اگر گزشتہ صدی کے مردے قبروں سے نکلکر اس صدی کا نظارہ کریں تو وہ موجودہ کیفیات اور حالات کا تماشا کر کے حیرت زدہ ہو جائیں گے۔ ؎

میری گردش کو دیکھکر پرکار
چال بھی اپنی بھول جاتی ہے

قدرت سے یہ کون پوچھے کہ اس قدر تغیرات اور تبدلات کیوں رکھے اس بوقلمونی سے فائدہ ہی کیا۔ یہ روش اور یہ چال قدامت اور استقلال کے خلاف ہی۔ یکرنگی میں جو لطف ہی وہ دو رنگی میں کہاں۔ یہ معمًا ایسا نہیں کہ قدرت پر اس کا حل چھوڑ دیا جائے لطف یہی اس میں تھا کہ ہر ایک قسم کے تغیرات اور تبدلات کی ہستی بھی وجود پذیر رہی

جب انسان بذاتہٖ خود بھی ایک رنگ میں نہیں رہتا تو پھر دیگر مولود اور خود اس کے افعال اور تصرفات کیوں ایک ہی نقش قدم لیں۔ یہ تغیّر اور تبدل بھی ایک ضروری مرحلہ ہے۔ یہ کسی شخص اور کسی قوم کا اجارہ نہیں کہ ایک ہی با اقبال حالت میں ہمیشہ رہے۔ یا کوئی قوم ہمیشہ ادبار اور فلاکت ہی میں دبی رہے۔ کبھی کوئی قوم ادبار میں ہوتی ہے اور کبھی با اقبال۔ کبھی مہذب اور کبھی غیر مہذب! کبھی حوادث مار مار کر سیدھا کرتے ہیں اور کبھی راہ پر لا کر اقبال اور احترام کا وارث بھی بناتے ہیں ؎

نفس سیدھا ہو نہ سکتا عیش میں کٹتی اگر
آئے دن کی سختیاں تادیب ہی استاد کی

حکمت اور دانائی کیا ہی؟ یہ کہ زمانہ کی رفتار سمجھ میں آجائے۔ جدھر زمانہ انگلی اٹھائے آپ بھی اودھر ہو جائیں جدھر وہ جائے آپ بھی وہی راہ لیں۔ بے وقوفی اور جہالت یہ ہی کہ زمانہ کا مقابلہ کریں منہ کی کھائیں اور تباہ ہو کر رہ جائیں۔ اور ایسے گڑھے میں گریں کہ خبر سے نباشد ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔

دنیا کی شروع شروع میں وہ چال نہ تھی جو اس کے مابعد حصوں میں رفتہ رفتہ ہوتی گئی۔ زمانہ بھی گرگٹ کی طرح کبھی کوئی رنگ بدلتا ہے اور کبھی کوئی۔

ایک زمانہ سیف یا شمشیر کا یا یوں کہئے کہ زور یا کسی حد تک جبر یا جہالت کا تھا۔ یہ زمانہ مدتوں زوروں پر رہا۔ اس کے حصے میں وہ شوکت وہ اقبال، وہ دبدبہ آیا کہ جس کی نظیر وہ آپ ہی تھا اس وقت میں سب فتوحات اور سب تعلیات اسی کو زیبا تھیں اور اُسی کا موروثی حصّہ کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ تھا۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک اُسی کے نام لیوا اور اُسی کے حوالی موالی تھے

ہمیں بود فخر و مباہاتِ دنیا

زمانۂ سیف و شمشیر نے اپنے عہد حکومت میں مختلف روپ اور مختلف سوانگ بدلے۔ کبھی دیو کی صورت میں نکلا اور کبھی جن کے روپ میں کبھی پری بن کر آیا اور کبھی چڑیل کے قالب میں جلوہ افزا ہوا۔ کبھی آسمان سے نازل ہوا اور کبھی زمین سے سر نکالا کبھی قومی رنگ میں للکارا اور کبھی مذہبی لے میں پکارا۔ کبھی دیوانہ وار آیا اور کبھی فرزانہ بن کر۔ کبھی سیدھا چلا اور کبھی اُلٹا۔ کبھی چمکا اور کبھی دمکا۔ کبھی جلا اور کبھی جلایا۔ کبھی ہنسا اور کبھی رویا۔ کبھی ہنسایا اور کبھی رلایا ؎

مختلف رنگوں میں آئے مہرباں

وضع اپنی کا بھی کیا کچھ پاس ہے

نہ کوئی پرساں تھا اور نہ کوئی نگراں جس رنگ میں چاہا آئے جس لے میں چاہا بولے اور الاپے۔ کبھی کمان میں حلول ہوئے اور کبھی تیر و تفنگ میں۔ کبھی توپ میں اور کبھی خنجر و سیف میں۔ جہاں گئے جدا ہی بستی بسائی۔ اور جہاں بیٹھے اپنی ہی دھونی رمائی۔

اس دور میں ساری ترقیوں ساری کامیابیوں کا مدار سیف و خنجر ہی پر تھا۔ خوبی تھی تو یہ تھی۔ کمال تھا تو یہ تھا۔ خواب میں بھی اسی کی یاد تھی اور بیداری میں بھی یہی خونخوار مشغلہ۔

کب خواب میں خنجر کی رگڑ یاد نہ آئی کب روح سوے کوچۂ جلاد نہ آئی

بادشاہوں کی بادشاہت، امیروں کی امارت رئیسوں کی ریاست فوجوں کی شجاعت اہل کاروں کی لیاقت کا سرمایہ ہی گویا سیف و خنجر تھے۔ جہاں دیکھو تیر و کمان کا تذکرہ، سیف و شمشیر کی کہانی۔ کوئی مرتا ہے تو کوئی مارتا ہے، اِدھر تلواروں پر زمردی حاشیہ چڑھتا ہے، تو اُدھر خون میں قبضۂ شمشیر رنگا جاتا ہے ایک طرف نشۂ نصرت سے جان ڈالتی ہے اور دوسری جانب جان لیتی ہے۔ ایک کے حق میں فتح و کامیابی کا فتویٰ دیا جاتا ہے تو دوسرے کے دامن پر خون کا دھبہ لگایا جاتا ہے۔ جب سیف و شمشیر کا زور و شور تھا تو اس وقت نہ تو امن و امان کی کچھ قدر و منزلت تھی اور نہ آزادی کی کوئی قیمت۔ بزدل سا بزدل بھی خنجر و تیغ سے مسلح ہو کر نکلتا تھا

موج ہوا کے ہاتھ میں کرچیں پی ہوئیں غنچوں کی رفلیں لیس پڑاتے چڑھے ہوئے

تاریخیں دیکھو تو انھیں خونخواریوں سے بھری ہیں۔ داستانیں پڑھو تو اسی کشت و خون سے لبریز۔ شاعری کا سارا دفتر انھیں خوں ریزیوں کی نذر ہوتا تھا، اور مجموعہ نثر انھیں خون خرابیوں کا طومار لا تحصیٰ۔

یہ حالت کب تک باقی رہتی۔ بدلی اور آخر بدلی۔ قلم نے علمِ علم کے زور پر اپنے آپ کو سنبھالا اور سیف و شمشیر کے مقابلہ پر میدان تدبیر اور عرصہ تفکر میں کھڑا ہو گیا اگرچہ شروع شروع میں نوکِ خنجر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ دبکا۔ جھجکا۔ پینترے بدلے۔ قدم اُکھڑ اُکھڑ گئے۔ کئی دفعہ خوف زدہ ہو کر حوصلہ ہارا۔ لیکن رفتہ رفتہ مضبوط ہو گیا اور ہاتھ سے گیا ہوا میدان مار لیا۔ اگرچہ زخمی اور لہولہان بھی ہو گیا مگر مقابلہ سے اخیر تک جی نہ چرایا۔

جگر پھٹ گیا اور اندر سے کھوکھلا بھی ہو گیا۔ لیکن ثابت قدمی آخر مرتے مرتے کچھ نہ کچھ بنا ہی گئی گو سوائے پرِ کاہ کے اور کوئی ہستی نہ تھی مگر آخر بازی لے ہی گیا۔

یہ مقابلہ آرا کبھی کلکِ رنگیں بن کر آیا اور کبھی جوش میں جوشن بے مثال۔ یہاں تک کہ شمشیر و سیف نے ہار مانی اور تابع فرمانِ قلم ہو کر چلی۔ توبہ کی۔ نادم ہوئی۔ سر جھکایا، اور پشیمانی سے خون روئی۔ زمانہ نے ثابت کر دیا کہ وہ کبھی ایک ہی چال پر نہیں رہا اور کبھی ایک ہی جانب نہیں جھکا۔

زمانا نہیں ایک حالت پہ رہتا — بدلتا ہے گرگٹ کے مانند رنگت
کبھی سیف و شمشیر کی جنبہ داری — کبھی کلکِ رنگیں کی کرنا حمایت
کبھی ہندیں بن کے اقبال آیا — کبھی ساتھ لایا ہے ادبار و شامت
کبھی کرتے ہیں لوگ تعریف اسکی — کبھی کھولتے ہیں زبانِ شکایت

سیف و شمشیر نے اپنے زمانہ میں ہزاروں گھر برباد کئے اور لاکھوں جانیں لیں۔ آخر سیفِ قلم نے جوشِ غیرت میں آ کر وہ سبق دیا کہ مدتوں سے اپنی جان کو رو رہی ہے، نہ وہ طاقت، نہ وہ قدرت، نہ وہ بُرّش نہ وہ کاٹ۔ جب تک زبانِ قلم سے کوئی لفظ نہ نکلے تب تک کیا مجال کہ اب سیف و شمشیر نیام سے نکلے۔ ہر طرف قلم کا ہی لوہا مانا جاتا ہے اور قلم ہی کی شہرت ہی۔ اب دنیا میں کونسی قوم فاتح اور ناصر ہے جس کے ہاتھ میں خنجرِ قلم اور شمشیرِ کلک ہی۔ جو سیفِ قلم کا قبضہ اپنے قابو میں رکھے گا وہی خاندان عظمت پائے گا۔ جس کے گھر میں سیفِ قلم کا لائسنس ہو گا وہی کینہ عزّت دار ہے۔

اب قلم کا راج ہے اور قلم کا اقبال، قلم کی حکومت اور قلم کی سلطنت۔ پہلے قلم اور پیچھے تلوار۔ جب قلم حکم دیتا ہے تو تلوار نیام سے ادب کے ساتھ نکلتی ہے۔ جب قلم صفحۂ قرطاس پر حرکت کرتا ہی تو شمشیر میدانِ قتال و جدال میں مُنھ کھولتی ہے۔ سپاہی قلم کے تابع ہے اور کمان افسر قلم کا مطیع۔ شمشیر دنیا میں خون بہاتی ہے اور قلم آبِ صلاحیت سے خون کے دھبّے دھوتا ہے۔

بُرّش کب تیغِ ابرو کی ملی تیغِ عدو کو — کہاں شمشیرِ لوہے کی کہاں شمشیرِ ابرو کی

سیف و شمشیر کی بُرّش اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ سب کچھ اب قلم کے تابع ہو چکا ہے اس زمانہ میں شمشیر و خنجر اُسی وقت کام دیتا ہے جب قلم قابو میں ہو سیف و خنجر لڑائی سے فتح کرتا ہے لیکن قلم آشتی اور محبت سے اپنی فتوحات کا ثبوت دیتا ہے۔

کیا حقیقت خنجر و شمشیر کی باقی رہی — نوکِ کلکِ فکر سے عقدہ کشائی ہو گئی

اب قوموں کی لڑائی اور جنگ و فساد کے دن باقی نہیں ہے جو قومیں شومیٔ طالع سے اب تک زورِ قلم سے آگاہ نہیں رہی تھیں وہ فنِ قلم سے بہرہ ور ہو کر فتوحات تمدنی اور سوشیل سے متمتع ہوں۔ اقتصادی جنگوں میں زور آزمائی کریں اور جوہرِ سیفِ قلم دکھائیں، تہذیبی لڑائیوں میں سامانِ قلم سے کام لیں، تمام بُرائیوں، تمام دشمنیوں، تمام نحوستوں، تمام بدخواہیوں کا نوکِ قلم سے سینہ چھید کر حسد و بغض کا خون بہائیں قومی اصلاحات کے واسطے ایسی قلمی جنگ کریں کہ دنیا عش عش کر اُٹھے۔

اب گزشتہ زمانہ کی طرح شمشیرِ قلم سے قومی زندگیوں کا خون نہ کریں میدانِ خلوص میں جم کر زورِ قلم سے اعدائے بغض و کینہ کا خاتمہ کر دیں۔ گورنمنٹ انگریزی نے اپنی ذاتی فیاضی سے قلمی خزانے کھول دئے ہیں۔ علوم و فنون کا ذخیرہ نسبتاً سستا کر دیا ہی۔ زورِ قلم سے اُسے حاصل کرو ذاتی کدورتوں اور قومی رنجشوں سے روگرداں ہو کر اشہبِ قلم کے ذریعہ سے اُس منزل پر پہنچ جاؤ جہاں پہنچنے کی زمانہ تاکید کر رہا ہے تمام منتشر اور پریشان اجزا ایک ہی رُخ ہو کر علمِ قلم کے نیچے اغراضِ مشترکہ کے تہیّہ میں لگ جائیں اور اپنے اور اپنی گورنمنٹ کے لئے ایک برکت ثابت ہوں۔ قلم کی جے۔ قلم کا بول بالا۔

بہت لڑ چکے اور بہت مر چکے اب تو کوئی دن قلم کی بدولت صلح و آشتی سے گزرے۔

جاہ سے بات کرو پیار سے دیکھو واللہ
ہائے اتنی بھی نہیں تم میں مروّت باقی

سلطان احمد

گنگا اور شانتنو

انڈین پریس الہ آباد

عالم ومافی العالم

(۵)

کیا سیارے آباد ہیں؟

یہ مسئلہ بڑا دلچسپ، مگر ساتھ ہی بڑا دقت خیز ہے، وجہ یہ ہے کہ محض استدلال تمثیلی اور تشابہ سے کام لینا پڑتا ہے اور خیالی گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں۔ یوں کہنا بجا ہوگا کہ مسئلہ ہذا الیقینیات[1] کے طبقہ سے نہیں بلکہ ظنیات سے متعلق ہے۔ اس مضمون کے پہلے نمبر کے خاتمہ میں سورج میں انسانی آبادی کے امکان سے بحث کی گئی تھی اور علمائے فلکیات کے خیالات کا اقتباس دیا گیا تھا اس جگہ صرف ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ انکے آرا کا اعادہ نامناسب ہے۔ فیوگی اے نے اپنی کتاب[1] میں یہ لکھا ہے کہ جب انسان اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ تو کسی اور سیارہ پر جاکر پیدا ہوجاتا ہے پھر وہاں سے آگے جاکر کسی اور دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اس طرح چند مرتبہ مختلف سیاروں میں پیدا ہونے اور مرنے سے اسکی روح کثیف اجزا سے پاک ہوکر اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ سورج کے خطۂ نور میں داخل ہو۔ وہ نری پاکیزگی اور خالص عقل رہ جاتی ہے پھر سورج کے ایک خاص حصہ میں مستقل سکونت اختیار کرلیتی ہے

سائنس کی شہادت مگر سیاروں کی آبادی[2] کے بارہ میں سائنس کیا شہادت دیتا ہے۔ اس پر تھوڑی دیر غور کرنا چاہئے۔ سب سے ضروری اور قابل غور امر یہ ہے کہ اس دنیا میں حیوانی زیست کے قیام کے واسطے کونسی باتیں ضروری ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں سے مختلف حالات میں ذی روح و ذی عقل ہستیوں کا ہونا محال نہیں ہوسکتا۔ اسی دنیا میں بعض جاندار ایک نرالی حالت میں زندہ پائے جاتے ہیں گو تاریکی میں زندہ رہنا امر محال ہے مگر کنٹکی - (امریکہ) کے غاروں کے اندر ایک قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو کبھی کسی قسم کی روشنی دیکھتی ہی نہیں ہیں۔ بعض گہرے سمندروں کے نیچے مچھلیاں پائی جاتی ہیں جن کے اوپر دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ پڑتا ہے اور وہ ہوا کی بھی محتاج نہیں ہیں۔ حالاں کہ اور جاندار اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ قطبوں کی بے انتہا سردی اور ابلتے پانی کے چشموں کے اندر بھی جاندار پائے گئے ہیں۔ مگر پانی کے بغیر جانداروں کا رہنا امر محال ہے۔

چاند کی حالت سب سے پہلے چاند کی حالت پر غور کرنا چاہئے۔ آیا وہاں جاندار اور نباتات ہے یا نہیں۔ بڑی دوربینوں سے وہ بخوبی نظر آتا ہے۔ وہاں ہوا نہیں ہے خشک بنجر میدان اور ننگے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ روئیدگی نام کو بھی نہیں ہے اور وہاں کسی جاندار کے وجود کے علامات نہیں پائے جاتے۔

سیارگان کلاں کی حالت بھی ناموافق ہے۔ اب ذرا سیاروں کے طبعی حالات دیکھنا چاہئے آیا وہاں جاندار ہیں یا نہیں۔ نیپچون۔ یورے نس۔ سنیچر۔ برہسپت۔ سیارگان خورد۔ منگل زمین کی گردش کے دائرہ سے باہر۔ اور بدھ۔ وشکر اس کے حلقہ گردش کے اندر ہیں نیپچون اور یورے نس بہت دور افتادہ ہیں۔ اس واسطے دوربین سے سوائے کرۂ ہوا کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا

---

[1] "ڈے آفٹر ڈیتھ" - [2] گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک پروفیسر نے ایک لیکچر اس مسئلہ پر لاہور کونسیلیل میں ماہ فروری ۱۹۱۱ء میں دیا تھا جس سے راقم نے چند امور مستنبط کئے جو یہاں لئے گئے ہیں۔

سیارگان خورد مشاہدہ کے ناقابل ہیں۔ برہسپت اور شنیچر سیاروں میں سب سے بڑے ہیں۔ اِن میں ہوا مع بخارات ہے مگر دیگر حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حرارت کے سبب سے سُرخ ہیں اور جاندار و نباتات ان کے اوپر وجود پذیر نہیں ہو سکتے۔ بدھ۔ بہت چھوٹا اور سورج کے بہت نزدیک ہے۔ دوربین وہاں بھی بیکار ہے۔

منگل کئی اعتبار سے کرۂ ارض کے مشابہ ہے مگر یہ کہنا دشوار ہے آیا وہاں جاندار ہیں یا نہیں ہیں

مریخ میں آبادی کے آثار — اب باقی منگل ہے۔ گذشتہ تیس چالیس سال میں اسکے متعلق بہت تحقیق ہوئی ہے (منگل کے بیان میں بعض امور بیان ہو چکے ہیں جنکی بنا پر وہاں انسانی ہستیوں کا وجود مانا گیا ہے) دوربین کے ذریعہ سے اسکی سطح پر خطوط دکھائی دیتے ہیں۔ اٹلی کے نامور فلکی۔ شیاپریلی مرحوم نے ان کی بابت یہ گمان ظاہر کیا تھا کہ وہ نہریں ہیں۔ لوئل اور پکرنگ۔ امریکن عالم کے مشاہدوں سے انکی تصدیق ہو گئی ہے۔ ان میں سے کئی متوازی خطوط میں کھودی گئی ہیں۔ مگر ان کا بعد فیما بین ۵، اور چار سو میلوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بعض نہریں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں جیسے جال کی رسیاں۔ ایک نہر ساڑھے چونتیس سو میل لمبی ہے۔ یعنی لاہور سے قاہرہ تک لمبی ہے پھر کہیں انہیں نہروں کے اتصال یا مقام انقطاع پر "نخلستان" سے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر

آبادی کی علامات — بعض خطے ایک موسم میں زرد۔ اور دوسرے میں خشک اور میدان دکھائی دیتے ہیں۔ جسے فصلوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر وہاں نباتات ہے تو جاندار کیوں نہیں۔ اگر جاندار ہیں تو انسان کے ہونے میں کیا بُرائی ہے۔ یہ علامات انسانوں کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ منگل میں پانی گھٹتا چلا جاتا ہے۔ قطبوں میں برف پڑتی ہے جھیلیں اور سمندر بھی خشک ہو گئے ہیں۔ اہل مریخ بہت دانا اور عقلمند ہیں انہوں نے سیکڑوں میل لمبی نہریں کھود لی ہیں جب برف پگھلتی ہے تو اس کے پانی کو نہروں میں کھینچ لیا جاتا ہے اور اس سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ اور دیگر کام بھی اس سے چلتے ہیں مگر اہل مریخ کی شکل وصورت کیسی ہے اس کے بارہ میں اندازہ کرنا دشوار ہے۔ سر آلیور لاج ان کے منہ انگریزی حرف وی V کی طرح قرار دیتے ہیں۔ اور انہیں بڑے دیو قد اور شہزور سمجھتے ہیں کیونکہ انکی کشش ثقل کرۂ ارض کا ایک تہائی حصّہ ہے ویلز نے اپنی کتاب[1] میں بھی اہل مریخ کی یہی شکل بتائی ہے بعض انہیں بن مانسوں کی اور بعض ریچھوں کی شکل کے بتلاتے ہیں انسان کو یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ میں ہی تمام عالم میں اکیلا اشرف المخلوقات ہوں۔ اسکی ہمسری اور رقابت کے لئے مریخ اپنی آبادی پیش کرتا ہے۔ اگر وہ اس دنیا پر حملہ آور ہوں تو یہاں کے لوگوں کا ستیاناس کر دیں۔ مگر وہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکیں گے وہ آب وہوا کی عدم موافقت سے دم گھٹ کر مر جائیں گے۔

مسئلہ تخم ذی جان

مسئلہ پن سپرمیا بہت عجیب وغریب ہے اسکے رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ ایسے ننھے ننھے تخم اڑتے پھرتے ہیں۔ جہاں موقع ملتا ہے اور تمام حالات انکی نمو کے موافق ہوتے ہیں۔ وہ تھوڑے عرصہ کے بعد وجود پکڑ لیتے ہیں۔ اس مسئلہ کے حامی سیاروں میں

---

[1] "وار آف دی ورلڈس" (دنیاؤں کی جنگ آرائی۔) مریخ سے چند آدمی دھات کے کھوکھلے لمبے گولوں کے اندر بند ہو کر آئے اور انگلستان پر حملہ کیا ان چند آدمیوں کا مقابلہ نہ ہو سکا کیونکہ انکے پاس ایک ایسا آلہ تھا جس سے وہ چند منٹ میں میلوں تک آگ لگا دیتے تھے۔ آخر کار آب وہوا کی ناموافقت کے سبب سے مر گئے۔ جے آر۔ آر

نباتات وحیوانات کا امکان سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ وہاں کے طبعی حالات نباتی وحیوانی زیست کی نشو نما کے موافق ہوں۔ یہ بہت پرانا نظریہ ہے۔ حیات خود رو کی توجیہ بھی اسی سے کی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جاندار آپ سے آپ پیدا ہوئے ہیں۔ اور جس کی رو سے ڈارون کے مسئلہ انتخاب طبعی۔ تغیر انواع اور ارتقا سے انکار کیا جاتا ہے۔ اسکی بنا ایک لاطینی علمی ضرب المثل پر ہے کہ "تمام جاندار جانداروں ہی سے پیدا ہوتے ہیں"[1] فرانس کے ایک عالم۔ سالس گیون منتلی وال نے ۱۸۲۱ء میں اپنی ایک کتاب میں اس قسم کا خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ چاند سے حیات بخش تخم زمین پر آگرے تھے جس سے نباتی وحیوانی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ جرمنی کے ڈاکٹر[2] ایچ۔ ای۔ اکٹر نے موسیو فلے مریان کی کتاب سے جسمیں آباد ستاروں کا ذکر تھا۔ یہ خیال اخذ کیا اور اسے ڈارون کے مسئلہ کے ساتھ شامل کر دیا۔ کہ کسی آباد دنیا سے جان دار تخم اڑ کر اس دنیا میں آئے تھے جس سے پودوں اور جانوروں کی ابتدا ہوئی۔

شہاب ثاقبوں میں ذی جان تخم

ڈاکٹر موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ شہاب ثاقبوں میں کاربن (کوئلہ) پایا گیا ہے (جو خلا میں گھومتے رہتے ہیں) اور اس کے اندر جان دار تخم ہوتے ہیں۔ دوسرا عجیب خیال انکا یہ ہے کہ ہماری کرۂ ہوا میں جو ننھے ننھے جانور اڑتے پھرتے ہیں، وہ شہاب ثاقبوں کے ملے ساتھ اڑتے ہوئے عالم بالا کے دیگر حصّوں میں پہنچتے ہیں، اور وہاں جب آب و ہوا اپنے موافق پاتے ہیں تو وجود پذیر ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں کہ "خلائے غیر محدود میں ایسی دنیائیں ہیں جن کچھ عالم شباب میں کچھ ادھیڑ حالتیں اور کچھ اپنی حیات کا زمانہ معینہ ختم کر چکی ہیں۔ ادھیڑ دنیاؤں میں جانداروں کے موافق حالات ہیں ہم عالم کے اندر جانداروں کا وجود قدیم مانتے ہیں۔ وہ وہاں موجود ہے اور اس سے نئے جاندار پیدا ہوتے رہتے ہیں" ان خیالات کی جرمنی کے نامی عالم نباتات فرڈیننڈ کون نے ۱۸۷۲ء میں تائید کی۔ مگر سر ولیم ٹامسن (لارڈ کیلون) مرحوم نے اپنے پریسیڈنشل ایڈریس میں ۱۸۷۱ء میں برٹش اسوسی ایشن کے سامنے دیا گیا تھا رکٹر کے خیالات کی حمایت وتائید کی تھی۔

نہایت ہی ننھے جراثیم کا وجود

ایسے ننھے ننھے جراثیم پائے گئے ہیں جو خوردبین جنکے انکشاف میں قاصر ہے۔ جیسے زرد بخار مویشی کے منہ اور پاؤں کی بیماری کے جرم ہوتے ہیں۔ بعض کا سائز (۰.۰۰۲) ملیمیٹر ہوتا ہے یہ ہوا میں اڑتے رہتے ہیں۔ سورج کی شعاعوں کے زور سے وہ خلا میں دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور جاندار پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ اگر زمین سے ایسا ننھا جرم اٹھکر اوپر جائے تو وہ منگل کا دائرہ گردش ۱۲ روز میں۔ برہسپت کا اسی روز میں۔ نپچون کا چودہ ماہ میں طے کر کے جائیگا اور ہمارے نظام شمسی کا قریب ترین ہمسایہ نظام شمسی الفہ سنتاوری کا ہے وہاں یہ جرم نو ہزار سال میں پہنچیگا یہ حساب روشنی کی رفتار کی شرح کے مطابق لگایا جاتا ہے جرم کا وزن مخصوص پانی کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔[3]

جرم کی زندگی کے قیام کی میعاد

اب دوسرا سوال اس کے ساتھ یہ پیدا ہوگا کہ یہ جاندار تخم یا جرم کتنی مدت تک قائم رہ سکتا ہے۔ خلا میں کہیں سخت حرارت ہے اور کہیں سخت سردی جس سے عمل حیات زائل ہو جاتا ہے۔ مصر کی کسی ممی میں سے گیہوں کے چند دانے نکلے تھے جو کئی ہزار برس تک پڑے رہنے کے بعد بھی اگنے کے قابل پائے گئے۔ فرنچ عالم بادون کہتا ہے کہ رومی قبر میں اٹھارہ سو سال کے بعد جرم پائے گئے تھے جو نشو ونما کی قوت سے معرا نہ تھے مارشل وارڈ اور روکس کے تجربات سے جراثیم کی مدت قیام

[1] ماخوذ از "ورلڈس ان میکنگ" (ارتقائے عالمین) صفحہ ۲۱۷ مطبوعہ لندن [illegible] [2] ماخوذ از "ورلڈس ان میکنگ" صفحہ ۲۱۸-۲۱۹
[3] ماخوذ "ورلڈس ان میکنگ" صفحہ ۲۲۰-۲۲۲-۲۲۳-

ثابت ہوگئی ہے یعنی ان کے پیدا کردہ جراثیم بہت دیر تک زندہ رہنے کے قابل تھے۔ ایک شرط اس کے ساتھ یہ پائی گئی کہ ہوا نہ لگے۔ خلا میں ہوا کہاں۔

اس قسم کے خیالات ہیں عالموں کے جانداروں کی تولید و تقسیم کے بارہ میں۔ مگر زندگی کا مادّہ کہاں سے پیدا ہوتا ہے سائنس نے اس کا ہنوز کوئی تسلّی بخش جواب نہیں دیا ہے۔ بعض ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ "پروٹوپلازم" "زندگی کا تخم" اور "آرگنِک سل" وغیرہ سے رفتہ رفتہ نباتات اور حیوانات وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ ایک سربستہ راز ہے۔ جسے انسان کبھی افشا نہیں کرسکتا۔ یہ خدا کی شان یزدانی سے پیدا ہوتا ہے۔

عالم کی بربادی

(کون و فساد کا تسلسل)

عالمِ بالا کے ان مختصر مگر دلچسپ حالات کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی بربادی کے بارہ میں بھی کچھ بیان کیا جائے عالم کس طرح وجود میں آیا۔ اسکا مجمل ذکر پیچھے ہوچکا ہے۔ مگر یہاں اسکی تباہی کا ذکر ہوگا۔ چونکہ ہم نظام شمسی سے بہت واقف ہیں اس واسطے اسی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مرجع آفتاب ہے۔ حرارت و روشنی دو چیزیں جانداروں کے لئے لازم ہیں اس وجہ سے سورج منبع حیات ہے۔ جب سورج کی گرمی اور روشنی ختم ہوجائیگی تو اس کے متعلقین بھی ختم ہوجائیں گے گو ان کا طبعی مادی وجود قائم رہ سکتا ہے

آفتاب کی تباہی اخراج حرارت سے | سورج کی حرارت دن بدن گھٹتی جاتی ہے۔ مگر کروروں سالوں کے بعد زمین کی موجودہ صورت اختیار کرے گا۔ اس وقت جتنی حرارت و روشنی کرۂ ارض پر آتی ہے اس سے ۲۲۶۰۰ ملین یعنی بائیس ارب ساٹھ کرور گنا زیادہ حرارت خارج ہوتی ہے۔ اگر سورج کی موٹائی اس کے نصف قطر کا ۱/۲ حصّہ ہو تو ساڑھے چوہتر ہزار ملین یعنی ساڑھے چوہتر ارب سالوں کے بعد اس سے زیادہ حرارت خارج نہ ہوگی۔ جتنی اب سالانہ ہوتی ہے یعنی شرح اخراج اتنی مدت کثیر کے بعد بھی وہی رہے گی۔ مگر اس عرصہ میں اس کا ایک حصّہ سرد ہوجائے گا اس واسطے ساٹھ ارب سال زمانہ قرار دینا چاہیئے۔ لیکن پانی کو جمانے والی خنکی ڈیڑھ لاکھ بلین Billion سالوں کے بعد پیدا ہوگی اور یہ میعاد بے قیاس ہے اِسے عداد میں ظاہر کرنا دشوار ہے مگر کسی شخص کو یہ کیفیت دیکھنا نصیب نہ ہوگی جب سطح آفتاب سرد ہوکر اس پر ایک قسم کا چھلکا چڑھ آئے گا تو وہ گیسوں کے نکلنے سے پھٹ جائے گا اور اندر سے کھولتا ہوا لاوا نکلے گا۔ وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد جم جائے گا اور شگاف مٹ جائیں گے ۔ اندرونی گیسیں گاہے بہ گاہے آتش فشانوں کے راستہ سے نکلا کریں گی۔ خنکی کی ترقی کے ساتھ ساتھ بخارات اور کاربانک ایسڈ گیس نکلے گی پھر پانی منجمد ہوجائے گا اور سطح آفتاب پر سمندر بن جائیں گے۔ جیسے ہمارے ہاں ہیں۔ پھر سمندر بھی جم جائیں گے۔ سورج کو شہاب ثاقبوں کے گرنے سے اور خلا کی طرف سے کچھ گرمی ملے گی۔ مگر ٹمپریچر دن بدن گرتا جائیگا۔ کاربانک ایسڈ گیس جمنے لگے گی۔ اور کرۂ ہوائے شمسی میں برف کی طرح نمودار ہوگی۔ پھر (۲۰۰-) سنٹی گریڈ پر کرۂ ہوا کی گیسیں منجمد ہونگی نائٹروجن کا نیا سمندر پیدا ہوجائے گا۔ صرف ہیلیم اور ہیڈروجن باقی رہ جائیں گے۔ اخیر میں سورج چاند کی طرح ایک عظیم کالا کرہ نظر آئے گا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اس حالت کو پہنچنے سے پہلے ہی یہ کسی اور ستارہ سے ٹکرا جائے ۔ اور اس کا خاتمہ ہوجائے عالموں

---

[1] ماخوذ از "ورلڈس ان میکنگ" صفحہ ۱۴۸-۱۴۹-۱۵۱-

کا یہ گمان ہے کہ آفتاب مع متعلقین نکشتر ویگا (Vega) کی طرف تیرہ میل فی سکنڈ کے حساب سے بڑھ رہا ہے۔ راستہ میں کسی نا معلوم تارہ یا نظام شمسی سے تصادم ہونا ناممکنات سے نہیں ہے۔

"بننا اور بگڑنا بگڑنا اور بننا" یہ سلسلۂ نامتناہی ہے

سورجوں اور سیاروں کے تصادم باہمی سے وہ مادہ پیدا ہوتا ہے جس سے عالم بنتے ہیں اور اسے کاسمک ڈسٹ (خاک سماوی) یا نیو بلہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک طرف سیارے بنتے ہیں اور دوسری طرف بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ قانونِ حرکت اور قانونِ قوت اپنے ابدی کام میں مصروف ہیں۔ ایک بنتا ہے اور دوسرا بگڑتا ہے۔ مادہ سے بقائے حیات اور انتقال صورت بدلنا منسوب کیا جاتا ہے۔ جرمنی کیا بلکہ تمام مہذب دنیا کے نہایت مشہور سائنٹسٹ پروفیسر ارنسٹ ہیکل آف جینا یونیورسٹی جرمنی (مگر اب علیحدہ ہو گئے ہیں) نے جرمان ازم یعنی وحدت الوجود (مگر وہ صرف مادۂ عالم کو مانتے ہیں) کے نہایت پرجوش پجاری ہیں۔ کون و فساد کے سلسلہ کے بارہ میں حسب ذیل اصول مفروضہ وضع کئے ہیں

(۱) خلا کی وسعت غیر محدود اور غیر معین ہے اسکا ایک انچ بھی خالی نہیں ہے۔ ہر جگہ ہیولی ہے۔

(۲) اسیطرح دنیا کا قیام بھی بے حد و حساب ہے۔ اسکی نہ کبھی ابتدا ہوئی اور نہ کبھی انتہا ہوگی۔ یہ قدیم ہے۔

(۳) ہیولی ہر جگہ ہے۔ اسکی نقل و حرکت مسلسل جاری ہے اور اس میں کوئی رخنہ واقع نہیں ہوتا ہے۔ اسے کامل سکون لاحق نہیں ہوتا ہے۔ مادہ اور انقلاب انگیز قوت کے عمل کا تسلسل جاری ہے۔

(۴) ہیولائے خلا کی یہ عالمگیر نقل و حرکت ایک گرداب قدیم کی صورت میں جاری ہے۔ اور کبھی کبھی عمل ارتقا میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

(۵) اس ارتقا کا پہلا عمل یہ ہوتا ہے کہ ایتھر محسوس اور ٹھوس صورت پکڑتی ہے۔

(۶) مادہ بتدریج حجم و ضخامت میں بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے ڈھیر بنتے چلے جاتے ہیں۔ حرکت اور کشش دو زبردست اسباب ہیں جو انھیں نئے نئے کرے بنانے میں مصروف رکھتے ہیں۔

(۷) خلا کے ایک حصہ میں ایتھرین ارتقا پیدا ہو کر نئے نئے کرے وجود میں آتے ہیں۔ دوسری طرف عمل فساد جاری ہے۔ کرے ایک دوسرے سے ٹکرا کر برباد ہوتے جاتے ہیں۔ اور نیا نیو بلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۸) انکے تصادم باہمی سے جو حرارت پیدا ہوتی ہے وہ قوت بن جاتی ہے۔ جو اس بربادی کے ڈھیر یعنی نیو بلہ کے اندر گرداب پیدا کر کے نئے نئے کرے بناتی ہے اور یہ دائمی کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ کرۂ ارض کروڑ ہا سال ہوئے اسی طرح بنی تھی چند کروڑ سالوں کے بعد جب اسکا محور سکڑ جائیگا تو سورج[۱] میں گر کر بھسم ہو جائیگی۔ عالم کے اندر عمل ارتقا اسیطرح جاری چلا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا ہوتی ہے۔

یہ تازہ ترین خیال ہے علما کے ایک گروہ کا۔ اسپر اضافہ کرنا مشکل ہے۔ نہ اسکی تردید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اہل نظر اپنے واسطے خود نتیجہ اخذ کر لیں گے۔

تمام شد

جے۔ آر۔ راے

---

۱ منقول از "رڈل آف دی یونیورس" صفحہ ۸۶ دوسرا کالم۔

مالک الدولہ صولت

(۲)

مالک الدولہ کی تین غزلوں کے کچھ شعر میں لکھ چکا ہوں جن میں سے ایک کو اہل عروض بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں اور دوسری کو متقارب شانزدہ رکنی کہتے ہیں۔ اور تیسری مضارع میں ہے کچھ شعر اور اُن کے دیوان میں سے انتخاب کرکے لکھتا ہوں۔ گو بمقتضائے محبت مجھے انکا سارا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بہ نظر اختصار بہت سی غزلوں کو چھوڑ دیا۔ دیوان کی یہ حیثیت ہے کہ حاشیہ پر بھی اکثر غزلیں ہیں۔ اور بوسیدہ ہونے کے سبب سے ہر مصرع کا ایک آدھ لفظ شروع کا یا آخر کا تلف ہو گیا ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ وہ غزلیں سب بیکار ہو گئیں۔ میرے اس انتخاب پر نکتہ چینی کی نظر نہ کرنا چاہئے۔ کہ صولت مرحوم میرے احباب اخلاص مندیں سے ہیں۔ ان کی ہر ادا مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر بھی میں نے آداب تذکرہ نگاری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ تحسین کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا ہے۔ اس کے ضمن میں اکثر نکات فن کی بحثیں اور شعرائے معاصرین کے مشاعرہ و مطارحہ کا حال جو کچھ مجھے یاد آجائے گا لکھوں گا۔ ان مرحوم کا طرز سخن کوئی جدت کا پہلو لئے ہوئے نہیں ہے۔ لیکن سارا کلام مطبوع و مانوس ہے۔ لکھنؤ کا خاص رنگ اور لکھنؤ کی خاص زبان ہے۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ صائب و حافظ کا تتبع کرتے رہے اور فارسی کے خلط کو بارشاد شیخ ناسخ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی زمانہ میں دہلی میں مرزا بیدل و مرزا جلال اسیر کا رنگ پھیلا اور اردو میں فارسی ترکیبوں کے خلط نے ایسا مزہ دیا کہ طرز سخن کچھ سے کچھ ہو گیا۔ گو بیدل کی ترکیبیں اہل زبان کی نظر میں اعتبار سے ساقط ہیں۔ لیکن مرزا داغ مرحوم کے سوا اکثر شعرائے دہلی نے اس سے احتیاط نہیں کی۔ مرزا غالب مرحوم کی نازک خیالی شعر و سخن کی جان ہے۔ اردوئی معلےٰ کی تحریریں اُن کے افصح الفصحا ہونے کی سندیں ہیں لیکن طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کا انجام یہ ہوا کہ ایک ضخیم دیوان میں سے چند جزو انتخاب کئے گئے اور اس میں بھی زبان کے لحاظ سے اکثر شعر آدھا تیتر آدھا بٹیر ہیں۔ نہ انھیں فارسی کہہ سکتے ہیں نہ اُردو۔ عنایت فرما شمس العلما مولوی حالی صاحب کے اس قول کی میں بھی تائید کرتا ہوں کہ "بیدل کا شعر سمجھ میں نہ آنے پر بھی اچھا معلوم ہوتا ہے" اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ لفظ و ترکیب میں فقط ایک سحر ہے معنی کو اسکی دلاویزی میں چنداں دخل نہیں اور یہ ایک ایسا عقدہ دشوار ہے جس کے حل کرنے کی طرف شعرا کو ضرور توجہ کرنا چاہئے۔ اور شعر کے راز سربستہ کو کھولنا چاہئے۔ چند اشعار صولت کے جو میں لکھنا چاہتا ہوں یہ ہیں ؎

واقف تری خلوت سے بشر ہو نہیں سکتا ۔۔۔ میں کیا ہوں فرشتہ کا گزر ہو نہیں سکتا

موسیٰ کو تصوّر ہی فقط دل میں ہی کافی ۔۔۔ وہ پردہ نشیں پیش نظر ہو نہیں سکتا

اے دست جنوں شاق ہے طول شب ہجراں ۔۔۔ کیا چاک گریبان سحر ہو نہیں سکتا

فرماتے ہیں آسان نہیں جی سے گذرنا ۔۔۔ مرجانے کو سب کہتے ہیں پر ہو نہیں سکتا

میں کہتا ہوں نالے مرے لے آئیں گے تمکو ۔۔۔ وہ کہتے ہیں ایسا تو اثر ہو نہیں سکتا

اٹھیں گی نہ غیروں سے مری طرح جفائیں ۔۔۔ یہ حوصلہ یہ دل یہ جگر ہو نہیں سکتا

صولت رہِ الفت میں رکھا قدم اب تک ۔۔۔ کرتے ہو بہت حوصلہ پر ہو نہیں سکتا

گریبان سحر کا ہاتھ سے چاک ہونا یا چاک ہونے کی تمنا کرنا

کچھ معنی نہیں رکھتا - مگر لفظ جنوں نے معنی پیدا کردئے کہ جو مبتلائے جنون ہوتا ہے اُس کو ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔

تیر کا استعمال تمگر کے معنی پر اب چھوٹ گیا۔ آخر میں مرزا داغ مرحوم نے بھی اسے ترک کیا اور کہا کہ واقع میں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

جگر والے شعر کے اگر یہ معنی لئے جائیں کہ ایک معشوق بازاری سے خطاب ہے جس کے بہت سے عاشق ہیں تو نہایت رکیک و قبیح ہے - اگر یہ سمجھئے کہ ایک عزیز کسی دوسرے عزیز سے شکایت کر رہا ہے جیسے بیگانوں پر زیادہ بھروسا ہے یا ایک رفیق قدیم کسی امیر کی نا قدرشناسی کا شکوہ کر رہا ہے جیسے نئے ملازموں کی طرف زیادہ تر توجہ ہے تو یہی شعر نہایت حسین ہے،

ان آنکھوں سے بچشم غور ہم نے اک جہاں دیکھا — ترا جلوہ نظر آیا جدھر گذرے جہاں دیکھا

بنا یا طور سینا دلکو ہمنے تیرے جلوہ سے — جو ان آنکھوں نے دیکھا چشم موسیٰ نے کہاں دیکھا

دم جاں کندنی حسرت یہی لیس شہیدوں کے — نہ پھر کر اک نظر قاتل نے سوئے کشتگاں دیکھا

بُرا ہو خواب راحت کا کھلی جب آنکھ غفلت سے — نہ پھر ہمنے نشانِ نقش پائے کارواں دیکھا

مرا شانہ ہلا کر لوگ تُربت میں، یہ کہتے ہیں — تبا اے سونے والے آخری اپنا مکاں دیکھا

آنکھوں سے بچشم غور دیکھنا جھگڑے سے خالی نہیں ہے مگر بہ نگاہ غور دیکھنا مقصود ہے اور اس قسم کی مجازات شعرا کے کلام میں ہوتے ہیں۔ مجازاً نگاہ کے معنی میں چشم کو لے سکتے ہیں۔

نقش پا، نشان یا و نشان نقش پا سب طرح سے درست ہے۔

شعر کی کرامات کو دیکھئے کہ جو شخص مر گیا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ میرا شانہ ہلا کر الخ - لیکن بے ہوشی مرگ میں یہ امتیاز نہیں باقی رہا کہ ایک شخص شانہ ہلا رہا ہے یا بہت سے لوگ ہیں

مکان فارسی میں گھر کے معنی پر نہیں آیا - ان معنی پر مکان لفظ ہندی ہے اور ہندی ہونے کی وجہ سے اس میں اعلان نون کا ترک کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا - جیسے پرستان میں نون غنہ کا استعمال غلط سمجھا جاتا ہے - ویسا ہی اُس میں بھی بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن ان باتوں کو کوئی سمجھتا نہیں - اور شاعر کے لئے بہت کچھ توسعہ بھی ہے ؎

مجھکو سودے نے دکھایا ہے بیاباں کیسا — کوئی وحشی نظر آتا نہیں انساں کیسا

ہوگئی عمر بسر اپنی غمِ ہجراں میں — چین کتے ہیں کسے عیش کا ساماں کیسا

چاہ بابل کا فسانہ تو ہے مشہورِ جہاں — دل فرشتوں کا پھنسا عشق میں انساں کیسا

عشق بازی سے تجھے منع کیا تھا صولت — پہلے مطلق نہ سنا اب ہے پشیماں کیسا

ان اشعار میں "کیسا" کا محل استعمال دیکھئے "کوئی وحشی نظر آتا نہیں انساں کیسا" یعنی انسان تو بڑی چیز ہے - اور "دل فرشتوں کا پھنسا عشق میں انساں کیسا" یعنی انسان تو ادنیٰ چیز ہے -

حافظ کہتا ہے من آن نیم کہ ازیں عشقبازی آیم باز - غزل گو کا کلام مبہم اور کثیر المعنی ہوتا ہے خصوصیات اور تخصیصات سے اُسے بحث نہیں - شعر بقول کلی اگر ہے تو غزل ہی ہے اور اسی سبب سے غزل کا مطلب سمجھنے کے لئے نظر دقیق چاہئے - جو لوگ فہم متوسط رکھتے ہیں وہ غزل کے ظاہری معنی سمجھ لیتے ہیں - باطنی اشارے اسکے گو سمجھ میں نہ آئیں مگر اپنا کام کر جاتے ہیں - اور یہ کلیہ ہے کہ غزل کا جو شعر اچھا معلوم ہوتا ہے اُس کے معنی بہت دور ہوتے ہیں یہاں عشق بازی کا لفظ اختیار کر لیا ہے اور مراد اُس سے ہر قسم کے جذبات ہیں جنکے اتباع سے پشیمانی حاصل ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ عشق بازی جیسی ذلیل چیز ہے تمام جذبات ایسے ہی رکیک و ذلیل ہیں۔

جب کہ میں بزم سیہ مستاں سے ساغر لیچلا — شور تھا ظلمات* سے پانی سکندر لے چلا

آنکھ دکھلاتے ہیں وہ مستِ خرامِ نازکو — رہ گیا تھا ہوش کچھ باقی وہ ساغر لے چلا

سبحہ میں زنار کو زاہد نے پوشیدہ کیا — آستیں میں رکھ کے بت کعبہ کے اندر لے چلا

کاندھا دینے والے جبکو راہ میں تھک تھک گئے — بارِ عصیاں کا خدا جانے وہ کیونکر لے چلا

---

* ظلمات کو بسکون لام باندھنا فارسی گویوں کی تقلید سے جائز ہو گیا ہے۔

میں یہ سمجھا جانب میخانہ آتا ہے یہ ابر   وائے قسمت آسماں اوپر ہی اوپر سے چلا

یہ غزل جس مشاعرہ کی ہے مرزا داغ بھی اس میں شریک تھے اور بڑا مجمع تھا حافظ علی نجف رام پوری بانی مشاعرہ تھے - اور شیخ عبدالرزاق شاد دہلوی شاگرد حکیم محمد سجاد موہانی کے مکان پر بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی - دونوں صاحبوں نے اہتمام میں بہت سرگرمی کی تھی شہر میں جا بجا اشتہار لگا دئے تھے شعرا کے مکان پر جا جا کے وعدے لئے تھے - اس سبب سے کہنے والوں کے علاوہ تماشائیوں کا زیادہ تر ہجوم تھا - آخر شب میں کہیں مٹیا برج کے شعرا کی نوبت آئی - مالک الدولہ نے غزل پڑھی - پھر شیخ امداد علی یاور جو برق کے شاگردوں میں خوش فکر شاعر تھے انہوں نے غیر طرح کچھ شعر پڑھنا شروع کئے تھے - کہ مرزا داغ نے کہا "حضرت طرح میں کچھ کہا ہو تو پڑھئے" انھوں نے کہا طرح میں تو میں نے کچھ نہیں کہا اور یہ کہکر غزل جیب میں رکھ لی - ان کے بعد میرے پڑھنے کی باری تھی - اور میرے بعد مرزا داغ پڑھنے والے تھے - میں نے عذر کیا کہ نماز کا وقت قریب ہے غزل کیا پڑھوں لوگوں نے کہا کہ ابھی عرصہ ہے آپ پڑھئے تو سہی - خیر میں نے غزل پڑھ دی یہ سوء اتفاق دیکھئے کہ اُس کے بعد مشاعرہ میں کوئی نہ ٹھہرا اصل حقیقت یہ تھی کہ تمام رات کی خستگی اور بے خوابی پھر نماز جماعت کے فوت ہو جانے کا اندیشہ - اکثر تماشائیوں میں دہلی کے اہل حرفہ و کارخانہ دار تھے جو کوٹھو ٹولہ میں بسے ہوئے تھے یہ وجہ تھی برہمی مشاعرہ کی مگر مرزا داغ مرحوم کو بدگمانی اہل مٹیا برج کی طرف سے پیدا ہوئی کہ انھوں نے صحبت کو درہم و برہم کر دیا - اور میرے اشتیاق میں جو لوگ جمع ہوے تھے وہ مجھے نہ سن سکے - اس مشاعرہ کے دس برس بعد کا ذکر ہے کہ حیدرآباد میں مرزا داغ کے شاگردوں میں سے ایک صاحب نے مشاعرہ کیا جن کا نام مجھے یاد نہیں - مگر طرح تھی صیاد کا اور جلاد کا - او ایک بجے دن سے مشاعرہ شروع ہو گیا تھا - میں نے دیکھا کہ مرزا داغ تو بیچ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور غزل خوانی کبھی دہنی طرف ہونے لگتی ہے اور کبھی بائیں جانب اُس صف میں ایک نے غزل تمام کی اور اس صف میں دوسرے نے پڑھنا شروع کر دیا - اس بے ترتیبی میں شام ہو گئی کہ مرزا داغ نے کہا آخر میرے پڑھنے کی بھی باری آئے گی یا نہیں - یہ سن کر جن جن لوگوں نے اپنی اپنی غزلیں نکالی تھیں جیبوں میں رکھ لیں مرزا داغ صاحب نے غزل پڑھی اور مقطع پڑھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اب نماز کا وقت ہے بس ہو چکا مشاعرہ - حیدرآباد کے ایک اور مشاعرہ کا برہم ہو جانا مجھے یاد آیا - مرحوم میر باقر حسن ضیا لکھنوی بانی مشاعرہ تھے - طرح کچھ نہ تھی سر آسماں جاہ بہادر مرحوم کی وزارت کا زمانہ تھا شمس العلما مولوی حالی صاحب کے سننے کے لئے یہ صحبت منعقد ہوئی تھی مگر یہاں کے سب چیدہ شاعروں کو میر باقر حسن نے بہت اہتمام سے بلایا تھا - سامعین میں ایسے ایسے لوگ تھے جو بہت کم شعر و سخن کی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں - نواب عماد الملک بہادر نواب وقار الملک - مولوی مشتاق حسین صاحب - مولوی عزیز مرزا صاحب میر باقر حسن نے حیدرآباد کے لنگر کا حال نظم کیا تھا وہ پڑھا - مولوی حالی صاحب نے ہندوستان کی پھوٹ پر اور کالے گورے کے مقابلہ پر دو ایک نظمیں پڑھیں - اُن کے بعد مرزا داغ مرحوم نے دو غزلیں پڑھیں پھر میری باری آئی دو غزلیں میں نے بھی پڑھیں اسکے بعد مشاعرہ برہم ہو گیا مولوی مشتاق حسین صاحب کے اٹھتے ہی سب اُٹھ کھڑے ہوئے اکثر لوگوں نے صاحب مشاعرہ سے شکوہ کیا - انہوں نے کہا میں تو سننے کو موجود ہوں مگر سامعین پر میرا کیا بس ہے - سب لوگ کیا خاطر

نمونۂ خوش خطی

انڈین پریس الٰہ آباد

اٹھے جن میں گرامی و عرشی دربار شاہی کے فارسی گو خوش فکر شاعروں میں تھے۔

گرم اسطرح شبِ ہجر میں پہلو ہوتا　　داغ ہوتا مرے دلپر نہ اگر تو ہوتا
آہ کرنے پہ تو محفل سے نکالا اُسنے　　قہر ہوتا جو مری آنکھ میں آنسو ہوتا
جھوٹی مہندی مجھے یوسف کی جو ہاتھ آجاتی　　کیا زلیخا کے لئے وسمۂ ابرو ہوتا
ہوتا زاہد نہ کبھی ضد سے مرا ہم مشرب　　میں مسلمان جو ہوتا تو وہ ہندو ہوتا

یہ مصرع کس قدر شوخ ہے "میں مسلمان جو ہوتا تو وہ ہندو ہوتا" گویا اب یہ ہندو ہیں اور اس ضد سے وہ مسلمان ہے۔ اگر یہ مسلمان ہو جاتے تو وہ ہندو ہو جاتا۔ ہندو ہو جانا بھی لطف سے خالی نہیں۔ نیا مضمون ہے جسے شاعر نے تراشا اور آریہ سماج نے پھیلایا۔

قدیم شاعری پر ایک یہ اعتراض ہے کہ زاہد و واعظ و شیخ سے مقدس فرقہ پر یہ لوگ زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اصل امر یہ ہے کہ رندی ہمہ و پارسائی می کن۔ ان لوگوں کو جو ریاکار و طالب دنیا نہ سمجھے وہ شاعر نہیں۔ دلا لکنز حکماء الکل مرزا صائب جن کا شمار مقدس شعرا میں ہے کہتے ہیں ؎

زمکر سبحہ شماراں خدا نگہدارد　　کہ صد سرشتہ بیک حلقۂ کمند ایں جا
مگس را بے تردد عنکبوت آرد بدام خود　　ید طولی است در تحصیل روزی گوشہ گیراں را

حافظ کہتے ہیں اور یہ تو شاعر رند مشرب ہیں ؎

مرید پیر مغانم ز من مرنج اے شیخ　　چرا کہ وعدہ تو کردی و او بجا آورد
گرچہ بر واعظِ شہر ایں سخن آساں نشود　　تا ریا ورزد و سالوس مسلماں نشود
مبوس جز لب معشوق و جام مے حافظ　　کہ دست زہد فروشاں خطاست بوسیدن
رنگِ تزویر پیش ما نبود　　شیر سرخیم و افعئ سیہ ایم

جرأت کا مجھے ایک شعر یاد ہے ؎

شیخ جی کیوں بنے ہو تم فانوس　　بھلا دامن کا یہ بھی گھیر ہے کچھ

ہر زبان کی شاعری میں تقلید قدما شرط ہے۔

نہ کیوں ہم خفتہ بختوں کی دعا میں ہو اثر اُلٹا　　سنا ہے خواب کا ہوتا ہے مضموں بیشتر اُلٹا
ازل سے مرتبہ پایا ہے اعلیٰ راستبازوں نے　　نہیں ممکن شرف بجائے سینے ہاتھ پر اُلٹا
بھلا ظاہر و باطن ہے یکساں جسطرح دیکھو　　نہیں آئینہ کی صورت ادھر سیدھا ادھر اُلٹا

اس مصرع پر "سنا ہے خواب کا ہوتا ہے مضموں بیشتر اُلٹا" مرحوم نے جو مصرع لگایا ہے وہ نکتہ شناسان فن سے داد طلب ہے۔ یہ مصرع ان کے مبلغ شعر کی معیار ہے۔ اور ان کے کامل عیار ہونے کی دلیل ہے۔ اچھا شعر تو اتفاق سے کبھی نکل آتا ہے جس کے لئے کوئی قاعدہ ہی نہیں بن سکتا۔ لیکن مصرع لگانے میں جسے اتنی مہارت ہو ضرور وہ کچھ پیدا کرہی لیتا ہے۔ تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں ذکر ہے کہ نور العین واقف نے ایک مصرع کہا ع اے چراغت بکف از رنگ حنا زود بیا۔ کئی مہینے تک اسپر مصرع نہ لگا یعنی جلد چراغ لے کر دوڑ اس مضمون کا ربط دوسرے مضمون سے اسکی سمجھ میں نہ آیا مدت کے بعد یہ بات خیال میں آئی کہ شبستان غم میں دل گم ہو گیا ہے اس کے ڈھونڈنے کے لئے چراغ کی ضرورت ہے۔ دیکھئے غزل کہنے میں کیا کد و کوشش یہ لوگ کرتے تھے۔

ہجر میں آنسو بہاتا ہی رہا ہو　　زخم دل پانی چراتا ہی رہا ہو
دے گیا پیک اجل پیغام موت　　نامہ بر خط لے کے آتا ہی رہا ہو
جان دے دی ہم نے اُسکے بے کہے　　وہ ستمگر آزماتا ہی رہا ہو

بہانے اور چرانے میں ایطا نہیں ہے۔ اس سبب سے کہ چرانے کا الف جزو کلمہ ہو گیا ہے اور بہانے کا الف زاید ہے۔ اگر دونوں جگہ الف زاید تعدیہ کا ہوتا تو ایطا تھا جیسے ستانا بجانا، ہٹانا مٹانا بجانا اُٹھانا ہنسانا۔ گرانا بجھانا۔ اڑانا۔ بچھانا۔ گھلانا۔ بسانا۔ چکھانا۔ گھٹانا بڑھانا پڑھانا۔ ترانا۔ پھرانا۔ کھپانا تپانا۔ چرانا۔ پھنسانا۔ گلانا

منانا۔ بگنا نا۔ جبانا۔ جھکانا۔ پکانا۔ سڑانا۔ چپانا۔ بچانا۔ چڑھانا۔ ڈرانا بنانا۔ لگانا۔ ملانا۔ ہلانا۔ چلانا۔ جلانا۔ سوبانا وغیرہ کہ ان سب لفظوں میں الف تعدیہ ہے اور جزو کلمہ نہیں ہوا ہے۔ یعنی الف نکال ڈالو تو کلمہ بامعنی باقی رہتا ہے۔ برخلاف چرانا۔ بٹھانا۔ رلانا کھلانا۔ پلانا۔ نہانا۔ اٹھانا۔ دکھانا۔ سکھانا۔ سُکھانا۔ رجھانا۔ سوجھانا چڑانا۔ سلانا۔ جگانا۔ گھمانا۔ بھلانا۔ دُھلانا وغیرہ کے کہ ان لفظوں میں بھی وہی الف ہے، مگر جزو کلمہ ہو گیا ہے۔ میں نے یہاں بہت سے الفاظ جتنے اس وقت یاد آئے اس لئے لکھ دیئے کہ ان قافیوں میں کوئی ایطا سے بچنا چاہے تو اُسے آسانی ہو۔ ورنہ اصل امر یہ ہے کہ ان قافیوں میں تو بہت کم لوگ ایطا سے پرہیز کرتے ہیں گویا کہ جائز سمجھ لیا ہے۔ مندرجہ بالا تینوں شعروں میں ردیف کیا مزہ دے رہی ہے۔ غزل کے سوا اور کسی صنف شعر میں یہ مزہ نہیں آتا۔

بزم پُر نور رکھے آٹھ پہر جامِ شراب — دن کو خورشید بنے شب کو قمر جامِ شراب

ساقیا سیر ہوں میں اب تو نہ بھر جامِ شراب — کیوں چھلکتا ہوا آتا ہے ادھر جامِ شراب

سجدہ م گردشِ پیمانہ غنیمت سمجھو — آخری دور ہی کرتا ہے سفر جامِ شراب

موجِ مے جھونکے ہوئے بادِ بہاری کے مجھے — پھول کھلتا ہے تو آتا ہے نظر جامِ شراب

خیر کو دیتے ہیں ساغر وہ مری قسمت فقط — آج ہے تشنہ لب خونِ جگر جامِ شراب

قدیم شاعری کا ایک مضمون معرکہ آرائے شعرا جامِ شراب ہے، ابتدا اس کی عربی سے ہوئی۔ فارسی گویوں میں پھر اسکا دور شروع ہوا۔ سکندر نامہ کی کوئی داستان ذکر شراب سے اور حافظ کی کوئی غزل خالی نہیں۔ اردو گویوں میں یہاں تک ذکر شراب نے ترقی کی کہ اب مرثیوں میں بیس بیس بند فقط ساقی نامہ کے ہوتے ہیں۔ کسی نے شراب سے شراب معرفت مراد لی ہے۔ اور کسی نے شراب محبت۔ مگر اصل امر یہ ہے کہ رندانہ مضامین شعر کا وہ میدان ہے جو چھوٹ نہیں سکتا۔ ؎

سبو نہادہ بدوش و قدح گرفتہ بدستم — فدائے چشم تو ساقی بہوش باش کہ مستم

آتش کہتے ہیں ؎

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو — آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

غرض یہ مضمون بھی مورد اعتراض ہے۔ کہ جو لوگ شراب کو ام الخبائث اور نجس العین سمجھتے ہوں وہ کیا سمجھ کے اُسی شراب کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ اور عرفاں و تولاً کا استعارہ شراب سے کرتے ہیں۔ وہ نور، یہ نار، وہ خیر، یہ شر، وہ مقدس، یہ نجس۔ یہ اعتراض آجکل کا نہیں ہے بلکہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض اسی بنا پر ہے کہ حقیقت شعر کو سمجھتے نہیں۔ ہر زبان میں شعر کے جو میدان بندھے ہوئے ہیں شاعر انھیں چھوڑ نہیں سکتا۔ یورپ کے لوگ دو ہزار برس سے تقریباً بت پرستی کو ترک کر چکے ہیں۔ مگر آج تک جو شاعر ہوتا ہے وہ ضرور پہلے بتوں کو پکارتا ہے کہ اُن کے یہاں معرکہ شعر کا میدان یہی ہے زہیر بن ابی سلمی نے ہرم بن سنان و حارث بن عوف کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اُسکی تشبیب میں ام اوفی کے کھنڈر اور اسکی محمل و ناقہ و سفر کا رونا دس پندرہ شعر تک چلا گیا ہے۔ اہل مدرسہ سے کوئی پوچھے کہ مدح کو اس تشبیب سے کیا علاقہ ہے۔ کیا یہ شخص دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہے ابھی ایک کھنڈر سے باتیں کر رہا تھا ابھی سادات عرب کی مدح اور عبس و ذبیان کی صلح کا تذکرہ کرنے لگا۔

نہیں معلوم کہ وہ کون گھڑی تھی یارب — نکلے جس روز سے دیکھی نہ وطن کی صورت

رونا آیا مجھے غنچوں کی ہنسی پر صولت — پھر گئی سامنے اُس غنچہ دہن کی صورت

وطن کا رونا حسب حال اور واقع کے مطابق ہے۔ یہ لوگ لکھنؤ سے نکل کر پھر کبھی نہ گئے۔ اسی امید میں رہے کہ بادشاہ کے ساتھ ہی لکھنؤ جائیں گے۔ لیکن بہت ایسے ہیں کہ کبھی وطن سے نہیں نکلے۔ اور شعر میں اپنی آوارہ وطنی کا ذکر اور وادیٔ غربت کی

مصیبتیں باندھا کرتے ہیں۔ جو لوگ شعر کو سمجھتے ہی نہیں وہ ان باتوں پر ہنستے ہوں گے۔ لیکن جو لوگ وطن کے معنی اور وادیٔ غربت کے استعارہ سے ناواقف نہیں ہیں اور اُن مُصیبتوں سے آگاہ ہیں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے ان کو اسی شعر پر وجد ہوتا ہے اسیطرح غنچہ دہن کے لفظ کو بھی اگر آپ بنظر تعمیم دیکھیں تو شعر کے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ غنچہ دہن ہونا معشوق ہی کے لئے خاص نہیں ہے۔ کیا فرزند و عزیز و دوست میں نہیں یہ وصف ہوا کرتا۔

کیجئے خونِ تمنا آرزوے دل سمیت | توڑئیے دستِ طلب بھی کاسۂ سائل سمیت
ہوگا فریادی خدا سے سر تنِ بسمل سمیت | حشر میں تلوار بھی کھیچ آئے گی قاتل سمیت
یاس و حسرت کہتی ہیں قبرِ بیاباں مرگ پر | یہ مسافر کارواں گم کردہ ہی منزل سمیت
کون اب دلسوز باقی ہی بجز داغِ جگر | شمع بھی ٹھنڈی ہوئی پروانۂ محفل سمیت

دونوں مطلعوں کی برجستگی اور دونوں شعروں کا درد قدر شناسانِ سخن کے دل سے پوچھئے۔ مجھے یہ چاروں شعر ان کی بندش و ترکیب ان کی برجستگی و جدّت ان کا طرز بیان ان کا رنگ دل سے پسند ہے۔ بس غزل میں یہ شان ہونا چاہئے۔ اگر ایسے ہی مضامین دل آویز ہر زمین میں نکل آیا کریں تو کیا پوچھنا۔

یہ غصّہ یہ جفا یہ ستم مہرباں عبث | بھڑکائے سے رقیب کے یہ گرمیاں عبث

اس مطلع میں ہے یا ہیں کا حذف کر دینا ایک لطف رکھتا ہے

نرگسی چشم میں سرمہ کی ہی تحریر عبث | تم نے بیمار کو پہنائی ہی زنجیر عبث
کیا کروں گا میں یہ اترا ہوا نقشہ لیکر | آپ جب پاس رہیں گے تو ہی تصویر عبث
حق کے آگے بھی وہ بت حق پہ تھا میں ناحق پر | اسکی تقریر بجا ہے مری تقریر عبث

اس مطلع پر مجھے ایک شعر یاد آیا جو عرصہ ہوا لکھنؤ میں سنا تھا جب سے مجھے یاد ہے ؎

کفِ رنگیں سے انکھیں بند کی ہیں شرم آئی ہی | عصائے نرگسِ بیمار اب اُنکی کلائی ہی۔

مطلع بھی خوب کہا اور دونوں شعر بھی خوبی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اُترے ہوئے نقشہ میں ایہام ہے۔ آزادؔ مرحوم کی تقریر سے متوہم ہوتا ہے کہ ایہام گوئی ختم ہوگئی یہ رنگ متقدمین کے لئے مخصوص تھا لیکن اصل امر یہ ہے کہ اس صنعت کو اُردو کے کسی شاعر نے آج تک تو نہیں ترک کیا سب کے کلام میں یہ بھری ہوئی ہے

قفس میں گھٹ کے، تمنّا ہے دم نکلنے کی | چمن سے چھٹ کے، یہ باقی ہے آرزو صیّاد
جفا و صبر کا باقی رہے گا افسانہ | ہمیشہ زندہ رہیں گے نہ ہم نہ تو صیّاد

دیکھئے مصرعوں کے درمیان جو سجع پیدا ہو جاتا ہی کیا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قافیہ مزہ کی چیز ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ عیب بھی ہے کہ قافیہ کی پابندی جن جن زبانوں میں ہے اس کے سبب سے صدہا مضامین عالی کا اور محاورات برجستہ کا خون کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ شعر کہتے ہیں اُنکے دل سے پوچھئے کہ زمین و قافیہ کے لحاظ سے کیسے کیسے مضامین سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں قافئے بکثرت دستیاب ہیں۔ انگریزی کی طرح یہاں قافیہ کی تنگی نہیں۔ اس پر بھی جو بے تکلفی نظم بے قافیہ میں ہوتی ہے وہ پابندی قافیہ میں ناممکن ہے انگریزی میں نظم بے قافیہ کے لئے ایک ہی وزن مخصوص ہے۔ ہر وزن میں ایسی نظم نہیں کہی جاتی اُردو میں کوئی وزن ابھی تک ایسا نہیں مشخص ہوا جس میں اس نظم کا نمونہ پیش کیا جائے۔ ہماری زبان میں تو جتنے اوزان ہیں ان کی بنا قافیہ پر رکھی گئی ہے۔ اسی غزل کے دوسرے شعر میں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ جس مصرع میں یا فقرہ میں کوئی ایسا لفظ ہو کہ اس کے نکال ڈالنے سے بھی معنی وہی باقی رہیں ایسے لفظ کے نکال ڈالنے سے کس قدر برجستگی اس کلام میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی شعر کے دوسرے مصرع میں سے پہلے

لفظ زندہ کو حذف کرکے اسکی برجستگی پر غور کیجئے اور پھر لفظ ہمیشہ کو بھی حذف کرکے دیکھئے کہ اور زیادہ خوبی پیدا ہوجاتی ہے فقط مصرع پورا کرنے کے لئے ایسے الفاظ کے بڑھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میری صلاح یہ ہے کہ ایسے الفاظ کے بڑھانے سے بہتر یہ ہو کہ مضمون اور بڑھا دیں اور اس ترکیب سے مصرع کو پورا کریں مثلاً

۶ - یہ یاد رکھ کہ رہیں گے نہ ہم نہ تو صیاد۔ مضمون کے بڑھانے سے کلام کثیر المعنی ہوجاتا ہے۔ اور الفاظ زائد سے گویا معنی میں اور کمی پیدا ہوتی ہے

تم ہنسی میں رو دئے کیسا ہی کھسیانا مزاج   مدّتوں صحبت رہی اب تک نہ پہچانا مزاج

بول چال اور روزمرّہ کا بعینہ نظم ہوجانا عجب لطف رکھتا ہے

شمع آئے جو ترے سامنے روشن ہوکر   جھلملا جائے چراغِ تہِ دامن ہوکر

ہم محبّت کی نگاہوں کے تو قابل نہ رہے   دیکھ لو قہر ہی کی آنکھ سے دشمن ہوکر

گل ہوے سیکڑوں پروانوں کی ہستی کے چراغ   شمع اندھیر مچا کر گئی روشن ہوکر

تیغ ابرو کی جو لکھی ہے صفت خامہ نے   کبھی سر ہو کے جھکا ہے کبھی گردن ہوکر

مطلع کا مضمون زبان سے ماخوذ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے حسن کے سامنے شمع شرماتی ہے۔ قہر ہی کی آنکھ میں ہی کی ی گرگئی ہے اگر قہر کی ہی آنکھ باندھتے تو یہ ثقل دفع ہوجاتا۔ کی میں سے ی کا گرجانا ایسا ثقیل نہیں ہے۔ مگر لکھنؤ کی خاص زبان یہ ہے کہ ہی کو کی پر مقدم رکھیں گے۔ مالک الدولہ کے قلم سے قہر کی ہی آنکھ نکلنا محال تھا۔ سیکڑوں پروانوں میں دو جمعوں کا جمع ہوجانا تنافر سے خالی نہیں۔ اُس پر دونوں لفظوں میں سے واو بھی گر گیا ہے کسی شاعر کا کلام ان باتوں سے خالی نہیں دیکھا لیکن اسما و افعال میں سے حروف علت بہ تخصیص وہ حروف جو معروف ہیں نہ گریں تو بندش میں صفائی پیدا ہوجاتی ہے۔

آیا ہے دل اپنا جو کسی رشک پری پر   شک ہو پرِطاؤس کا داغِ جگری پر

جلوہ نظر آئے دمِ آخر جو تمہارا   پھر طور کا عالم ہو چراغِ سحری پر

جس دل میں نہو درد وہ کیا درد کو سمجھے   بے جا نہیں ہنستے ہو مری نوحہ گری پر

داغ جگر میں پری کے نقش و نگارِ حسن کا جلوہ نظر آرہا ہے اس سبب سے وہ پرطاؤس بن گیا ہے یہ مطلع تو بہت اچھا ہے لیکن اس قسم کے مضمون اکثر بے معنی ہوجاتے ہیں۔ مثلاً آنکھوں کے عشق میں بیمار ہوا تو طبیب نے روغن بادام نسخہ میں لکھا اور اگر مرگیا تو قبر سے نرگس بجائے سبزہ پیدا ہوئی اور اگر سبزہ اُگ آیا تو ہرن آکر اُسے چر گئے اور اگر ان سب آفتوں سے بچے تو خواب میں بہار نرگستان و حلقۂ غزالاں ضرور دکھائی دے گا۔ ایسے تخیلوں سے احتراز چاہئے دوسرے شعر میں جلوہ سے تجلّی آلہی اور چراغ سحری سے اپنا نفس واپسیں مراد ہے۔ یعنی تمہارے جلوہ سے اس چراغ سحری میں تجلّی طور کی روشنی پیدا ہوجائے گی۔

سودا بڑھا ہے قید کی تدبیر دیکھکر   پھر زلف یاد آگئی زنجیر دیکھکر

غارت پہ نوجوانوں کے باندھے ہے تو کمر   انکا شباب اے فلک پیر دیکھکر

محشر میں چھپ سکے گا نہ قاتل شہید وفا سے   پہچان لیں گے کشتہ شمشیر دیکھکر

زاہد ہوا کرامتِ ساقی کا معتقد   شیشہ میں آفتاب کو تسخیر دیکھکر

باندھے ہے تو کمر یعنی باندھے ہوے ہے۔ محاورہ میں ہوے کو اکثر ترک کردیتے ہیں۔ جناب نفیس مرحوم نے حضرت امیرؔ کی مدح میں کہا تھا کہ ع غزوہ ذات سلاسل کی بھی کڑیاں جھیلے۔ اس کا چرچا حیدرآباد میں بہت ہوا کہ میر صاحب نے یہ کیا پڑھا۔ کڑیاں جھیلیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ ذکر اس ہیچمدان تک بھی پہنچا۔ اور لوگ مستفسر ہوے۔ میں نے سمجھا دیا کہ ہوئے یہاں سے محذوف ہے اور یہ حذف فصحا کے محاورہ میں ہے۔ اس شعر میں اُن کی ضمیر نوجوانوں کی طرف پھرتی ہے۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام الملک نواب میر محبوب علی خاں
آصف جاہ جنت آرام گاہ

دنیا کو غم و الم کا منظر دیکھا * ہر ایک کوشش جہت میں ششدر دیکھا
وہ ماہ تمام آج ہے زیر زمیں * تاباں جسے کل فلک نما پر دیکھا — امجد

انڈین پریس الہ آباد

کم کیجئے نہ ظلم وستم اور چند روز سہتے ہیں ہم بھی رنج والم اور چند روز
اکثر خلافِ عہد کیا ہے حضور نے پھر دیکھتے ہیں قول وقسم اور چند روز
تھا دل میں قصد ہم بھی چلے جاتے ساتھ ساتھ رکتے جو رہروانِ عدم اور چند روز
ہم جان دیں گے پھوڑ کے سر مثلِ کوہکن مجنوں کے ہیں قدم بہ قدم اور چند روز

مطلع میں اپنی زیست سے مایوس ہونے کو بکنایہ ظاہر کیا ہے۔ اور کنایہ صنائع شعریہ میں بہت لطیف صنعت ہے۔ یہ مطلع اور اس کے بعد والا شعر جفاکاری و بدعہدی کی شکایت میں ہے۔ کچھ یہ ضرور نہیں کہ یہ خطاب معشوق ہی سے ہو۔

(باقی آیندہ)

علی حیدر طباطبائی

تذکرۂ

اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ
نواب میر محبوب علی خاں غفران مآب

۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء سہ شنبہ کو دن کے ایک بجے رؤسائے ہند کے سرتاج، حیدرآباد کے محبوب خلایق ہردلعزیز فرمانروا حضور سر میر محبوب علی خاں بہادر مظفر الممالک نظام الدولہ نظام الملک فتح جنگ آصف جاہ سادس کے رہگرائے عالم جاودانی ہونے کی روح فرسا خبر قصر فلک نما سے جب مشتہر ہوئی تو کون ایسا شخص تھا جسکو اس کے سننے سے سکتہ سا نہ ہوگیا۔ لوگ اس جانکاہ خبر کے سننے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ جب دوشنبہ کی رات کو حسب معمول اہل حیدرآباد اپنے روزانہ کاروبار کی تکان کے بعد خواب استراحت کا لطف حاصل کر رہے تھے تو اُن کو اسکی مطلق خبر نہ تھی کہ وہ عزیز جان جوان کی ذرا ذرا سی بے آرامی اور خفیف خفیف سی بے اطمینانی سے بے انتہا متاثر و بے چین ہوجاتی ہے اور جو شفقت محبت اور درد سے معمور ہے موت کے سنگدل فرشتہ کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہے۔ اور جب اپنے محبوب بادشاہ کی مختصر دو روزہ علالت کی خبر سے بے خبر رعایا سہ شنبہ کی صبح کو تازہ دم ہوکر بیدار ہوئی ہے تو اسکو خواب میں بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ آج نصف النہار کو ہمارا سرتاج ہمارا والی، ہم پر ہمارے ماں باپ سے زیادہ شفیق۔ ہمارے رنج وغم میں شریک۔ رحم وکرم کا فرشتہ فیاضی وسیرچشمی کا نمونہ رعایا پر

معدلت گستر۔ فیاض اور خداترس بادشاہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو جائے گا دن کے نو دس بجے البتہ یہ خبر کسی قدر مشہور ہونے لگی کہ حضور اقدس و اعلیٰ کی طبیعت دوایک روز سے ناساز ہے اتوار کی شام تک تو مزاج معلیٰ بالکل اچھا تھا۔ یہاں تک کہ آپ مہام سلطنت کے انجام دینے میں مصروف تھے۔ لیکن کام ہی کی حالت میں دفعۃً چکر آیا اور آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی حالت اس وقت چنداں خطرناک نہ تھی۔ لیکن دوشنبہ کی شام سے بیہوشی زیادہ ہونے لگی اور دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے وقفہ سے بیہوشی کے دورے پڑنے لگے اور تشنج کے آثار شروع ہو گئے۔ آدھی رات کو مرض کے اشتداد کی خبر سنکر صاحب رزیڈنٹ حیدرآباد مع رزیڈنسی ڈاکٹر کے قصر فلک نما پر حاضر ہوئے اور کئی گھنٹہ وہاں حاضر رہے۔ رزیڈنسی سرجن نے حالت تشویشناک پائی۔ شاہی اطبا اپنے اس آقائے ولی نعمت کے علاج کی فکر میں جس کی مسیحانفسی کا ایک زمانہ قائل ہے اپنی جانیں لڑا رہے تھے مگر افسوس! صد ہزار افسوس!! مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی۔ ان ہی کوششوں میں دن کے بارہ اور ایک کے درمیان وہ رحم و کرم سے معمور فیاض اور دردمند دل جو اپنی عزیز از جان رعایا کے ایک ایک فرد کی ادنےٰ ترین مصیبت پر بھی بیقرار ہو جاتا تھا' ہمیشہ کے لئے اپنی حرکت کو بند کر کے خاموش ہو گیا۔ یہ تمام باتیں ایسی دفعتہً ہوئیں کہ علالت کا حال معلوم ہونے کے پہلے وفات حسرت آیات کی خبر مشہور ہوئی۔ اکثر لوگوں کو باور نہ آتا تھا کہ کارکنان قضا و قدر نے ایسے عزیز خلائق۔ خیر مجسم۔ رحمدل۔ فدائے رعیت بادشاہ کو جو نہ صرف ان کے جان و مال ہی کا مالک تھا بلکہ جن کے دل بھی اسی کے قبضۂ اقتدار میں تھے۔ اتنے بے وقت ان سے چھین لینا گوارا کیا ہو گا۔ مگر فوراً ہی تمام کاروبار کے بند ہو جانے اور سارے شہر پر ایک عام سکوت غم کے طاری ہو جانے نے جسکی تائید آسمان بھی اپنی ماتمی گھٹاؤں سے کر رہا تھا یہ ثابت کر دیا واقعی شاہ دکن نے اپنی ڈیڑھ کرور رعایا کو تڑپتا اور اپنے بے شمار وابستگان و بہی خواہان کو انتہا درجہ کے رنج و غم میں مبتلا چھوڑ کر عالم جاودانی کی راہ لی۔ تین بجے کے قریب نواب شہاب جنگ افتخار الملک بہادر نے چارمینار کے پاس قدیم دستور کے مطابق حضور نواب میر محبوب علی خان بہادر کے انتقال پر ملال اور شہزادہ ولیعہد نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی تخت نشینی کا اعلان کیا جس سے بیم و رجا کی کیفیت بھی باقی نہ رہی۔ لوگ ایوان شاہی کی طرف دوڑنے لگے۔ قصر فلک نما پر خلقت کے ازدحام کی کوئی انتہا نہ تھی لوگوں کے ہجوم سے راستہ ملنا دشوار ہو گیا تھا ہر شخص زار و قطار رو رہا تھا۔ کوئی آنکھ نہ تھی جس سے آنسوؤں کا دریا نہ بہ رہا ہو۔ ہر عمر' ہر درجہ' ہر طبقہ اور ہر رتبہ کا انسان اشک حسرت بہا رہا تھا اور ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ کوئی ان ترقیوں اور برکتوں کو یاد کر رہا تھا جو حضور اقدس کے عہد حکومت میں حیدرآباد کو نصیب ہوئیں اور کوئی ان خوبیوں اور نیکیوں کو یاد کر کے جو حضور ممدوح کی ذات میں خصوصیت کے ساتھ موجود تھیں اور جن کے سبب سے وہ اپنی ریاست ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی دور دور بہت ہر دلعزیز تھے۔ اور ان سے دلی محبت کی جاتی تھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ رات کے ایک بجے کے قریب مکہ مسجد کے صحن میں سلاطین آصفیہ کے مقبروں میں اپنے محترم دادا نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع غفران منزل کے پہلو میں بصد ہزار حسرت و یاس کروڑہا مخلوق کے اس امیدگاہ اور پشت و پناہ کو سپرد خاک کیا گیا۔ ہائے وہ پیارا جسم جس کے ایک ایک رونگٹے پر حیدرآباد کی لاکھوں جانیں قربان تھیں زمانہ کی چشم رحم سے

پینتالیس سال تک محفوظ رہنے کے بعد آخر کار اب ایوان
شاہی کی آسائشوں کو چھوڑ کر مکہ مسجد کے صحن میں ہزاروں
من مٹی کے نیچے دفن ہے ۔ آہ !

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر   آیا شب فراق ترا کے بود سحر
اے بادشاہ عالم و دے قبلہ جہان   بکشاے چشم رحمت و برحال من نگر
نالم چنیں ز غصہ دما دم بود بدست   سوزم چو شمع در غم و دود دم رود بسر

اس قیامت خیز اور عالم آشوب حادثہ نے حلقہ بگوشان
دولت آصفیہ کی کثیر تعداد میں ہی نہیں بلکہ حیدر آباد کے
باہر بھی ہل چل ڈالدی ۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے
شہروں میں اظہار رنج کے مختلف رسوم ادا کئے جارہے
ہیں ۔ میسور ۔ اور پٹیالہ وغیرہ دیسی ریاستیں ہندوستان کی
سب سے بڑی ریاست کے عالی منزلت ہر دلعزیز فرماں روا
کی وفات پر ماتم کرنے میں حیدر آباد کی شریک ہیں ۔ برہما
اور انگلستان تک نے اشک حسرت بہانے میں حیدر آباد
کا ساتھ دیا ۔ اس سانحہ جانگداز کی سوگواری میں اگر حیدرآباد
نے تمام دفاتر سات روز اور ساری دوکانیں تین دن بند
اور کاروبار موقوف رکھنے سے اپنا فرض ادا کیا تو شملہ پرونشل
لاج کے جلسہ رقص کو ملتوی اور گورنمنٹ انگریزی کے تمام
دفاتر ایک روز کے بند کرنے سے حضور ویسرائے نے یہ ثابت
کیا کہ مرحوم اپنے دائرہ حکومت کے باہر بھی کس درجہ ہر دلعزیز
تھے اب تک برابر ہندوستان کے ہر حصہ سے ماتم کی آوازیں
آرہی ہیں ۔ ہر رنگ ۔ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ اس رنج
میں شریک ہیں ۔ اور ہر شخص اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ
والیسرائے ہند کے قول کے مطابق اعلیحضرت حضور میر محبوب علیخاں
کی بے وقت وفات کے سانحہ سے حیدر آباد ہی کا نقصان نہیں
ہوا بلکہ خود سلطنت عظمیٰ ہند کو صدمہ عظیم برداشت کرنا پڑا ۔ اسکی
وجہ سوا اسکے اور کیا ہو سکتی ہے کہ حضور خلد آشیاں صرف حیدرآباد
ہی پر حکومت نہیں فرماتے تھے اور اہل حیدر آباد کے دلوں
پر ہی حکمراں نہ تھے بلکہ سارے ہندوستان کے باشندے
حضور کیساتھ عقیدت مندانہ تعلق رکھنا اپنے لئے موجب فخر اور
باعث ناز سمجھتے تھے ۔ اعلیحضرت غفران مکاں کے ذاتی جوہر
اور حمیدہ اوصاف بیشک اس بات کے مقتضی تھے کہ یگانہ و
بیگانہ ہر شخص کا دل و نور عقیدت سے مامور رہے ۔

اعلیحضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر ۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ
م ۱۸ ۔ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کی شب کو کتم عدم سے عالم وجود میں آئے ۔
ابھی ڈھائی سال کا سن بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نواب میر تہنیت علی
خاں بہادر افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی ناگہانی موت سے بتاریخ
۱۳ ۔ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ م ۲۶ ۔ فروری سنہ ۱۸۶۹ء آپ کو یتیمی کا داغ
اور سلطنت کا چھتر ملا ۔ آپ خاندان آصفیہ کے نویں فرمانروا تھے ۔
آپ کا سلسلہ نسب شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے ہوتا
ہوا خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق تک پہنچتا ہے ۔ آپ کے
جد امجد خواجہ عابد خان نے جو سمرقند میں اپنے علمی تبحر اور تقدس
کی بدولت بہت مشہور تھے ترک وطن کر کے ہندوستان کا
قصد فرمایا ۔ اس وقت شاہجہاں سریر آرائے سلطنت تھا ۔
شاہجہاں نے خواجہ عابد خاں کی بہت قدر کی اور اُن کو بڑی
آؤ بھگت کے ساتھ اپنے دربار میں جگہ دی ۔ شاہجہاں کے بعد جب
اورنگ زیب عالمگیر نے تخت شاہی پر قدم رکھا تو خواجہ عابد خاں
کی اور بھی قدر و منزلت بڑھ گئی ۔ محکمہ صدارت کی صدر نشینی
پنج ہزاری منصب اور چین قلیچ خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۔
سنہ ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب کے ہمراہ رکاب قلعہ گول کنڈہ پر حملہ کرتے

ہوئے گولے سے زخمی ہوکر انتقال کیا - اور نواح گول کنڈہ میں دفن کیے گئے - اس طرح اس سرزمین میں پیوندخاک ہوکر خواجہ عابد خاں نے اپنی اولاد کے لئے سلطنت کا حق قایم کیا - ان کے فرزند شہاب الدین خاں بھی اپنے باپ کی طرح شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی عنایات کے مورد رہے۔ "غازی الدین خاں فیروز جنگ" اور "فرزند ارجمند بے ریو رنگ" کے معزز خطابوں اور ہفت ہزاری منصب و سات ہزار سوار سے مفتخر تھے - مالوہ وغیرہ کی صوبہ داری بھی کی ۱۱۲۲ھ میں انتقال کیا - اور دہلی میں اجمیری دروازہ کے قریب دفن ہوئے - نواب میر قمرالدین خاں فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ اعظم آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے اور خاندان آصفیہ کے بانی - اس سلسلہ میں حیدرآباد کے پہلے فرماں روا اور اولین نظام دکن ہوئے ہیں - نواب میر قمرالدین خاں آصف جاہ کی والدہ ماجدہ شاہجہاں کے نامی گرامی وزیر اعظم عمدۃ الملک سعد اللہ خاں کی دختر نیک اختر تھیں - نواب میر قمرالدین خاں سلطنت مغلیہ کی مختلف خدمات جلیلہ پر سرفراز تھے - دکن - مالوہ - اکبرآباد اور گجرات کی صوبہ داری کی خدمتیں یکے بعد دیگرے اور بعض اوقات اکھٹی انجام دیں - کئی سال تک شہنشاہ دہلی کے وزیر اعظم بھی رہے جب کوئی سخت مہم پیش ہوتی یا کوئی اہم معاملہ ہوتا تو شہنشاہ دہلی نواب آصف جاہ نظام الملک کو خواہ وہ دہلی سے اس وقت کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں ضرور طلب کر لیتے - سارے ہندوستان میں نواب آصفجاہ کی شجاعت - دانشمندی اور فراست کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی - کوئی انکا نظیر نہ تھا - نادر شاہ نے جو وقت اپنی فوج کی ایک خفیف سی بے عزتی سے آگ بگولہ ہوکر دہلی میں قتل عام کا حکم دیا ہے اور اہل ہند کی نرم و نازک جانیں افغانی اور ایرانی دیو قامتوں کے فولادی ہاتھوں سے عجب بے دردی کے ساتھ تلوار کے گھاٹ اتاری جانے لگی ہیں تو یہی نظام الملک آصفجاہ تھے جو زلازل ہند کے سامنے یہ کہتے ہوے جا کھڑے ہوئے تھے۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اور نادر شاہ جیسے صاحب جلال و جبروت بادشاہ سے اسکے انتہا درجہ کے غیظ و غضب اور قہر کے عالم میں "بریش سفید بخشیدم" کا جاں بخش خلعت حاصل کیا تھا۔

جب سلطنت مغلیہ زوال و انحطاط کے اخیر زینہ پر پہنچ گئی اور شیرازہ سلطنت بکھرنے لگا تو نظام الملک آصف جاہ نے جو اول ہی سے تمام جزو کل کے مالک تھے شہنشاہ دہلی سے برائے نام تعلق رکھنے کی بھی ضرورت نہ دیکھی اور دکن کے خود مختار فرماں روا ہوگئے - آصف جاہ نظام الملک اول کے بعد مملکت آصفیہ کے حسب ذیل فرماں روا ہوئے:-

۱- نواب میر احمد خاں ناصر جنگ شہید حکومت از ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۰ء
۲- نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ ۱۷۵۰ء تا ۱۷۵۱ء
۳- نواب سید محمد خاں صلابت جنگ آصف الدولہ ۱۷۵۱ء تا ۱۷۶۱ء
۴- نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء
۵- نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصفجاہ ثالث ۱۸۰۳ء تا ۱۸۲۹ء
۶- نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصفجاہ رابع ۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء
۷- نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصفجاہ خامس ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء
۸- نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصفجاہ سادس ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء

اسطرح نواب میر محبوب علی خاں مرحوم اس سلسلہ کے نویں حکمراں تھے - ڈھائی سال کی نہایت کمسنی میں آپ مسند نشین ہوئے

مسند نشینی کے مراسم ادا کرنے کی غرض سے آپ کو اناکی گود
میں محلسرا سے لانا پڑا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر تک آپکی جانب
سے سر سالار جنگ اعظم اور نواب شمس الامرا امیر کبیر امور سلطنت
انجام دیتے رہے۔ اِس عرصہ میں آپ کا وقت زیادہ تر تعلیم
اور شہسواری. نشانہ بازی. شمشیر زنی وغیرہ فنون کی مشق
میں بسر ہوتا تھا۔ آپ نے ان فنون میں اتنی مہارت پیدا کی
کہ آپ ہندوستان بھر میں اوّل درجہ کے شہسوار اور نشانہ باز
شمار کئے جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اپنی ریاست کے
اکثر حصوں کا دورہ فرمایا اور کلکتہ. دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی ۱۸۷۷ء
کے دربار قیصری میں جبکہ آپ کی گیارہ برس کی عمر تھی آپ شریک
تھے۔ سر سالار جنگ اعظم کی آرزو تھی کہ تکمیل تعلیم کی غرض سے
آپ کو یورپ کی سیر کرائیں۔ اس کا انتظام بھی اس عالی پایہ
شخص نے کر دیا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے اس ارادہ کو ملتوی
کرنا پڑا۔ اور اس کے چند ہی روز بعد ۸ رفروری ۱۸۸۳ء کو
سر سالار جنگ اعظم کا انتقال ہوگیا جس کے باعث یہ ارادہ
کبھی پورا نہ ہوسکا۔ جب آپ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ۵ فروری
۱۸۸۴ء کو ویسرائے ہند لارڈ رپن نے حیدرآباد پہنچکر سرکار
عظمت مدار کی جانب سے ریاست کے پورے اقتدارات
واختیارات حضور خلد آشیاں کے سپرد کئے۔ لارڈ رپن نے اس
خوش گوار فریضہ کو ادا کرتے ہوئے ایک بہت معنی خیز اور نصیحت
آمیز دلچسپ تقریر کی تھی جس کے بعض فقروں کا اعادہ اس موقع
پر بے محل نہ ہوگا۔ دوران تقریر میں خوش تدبیر پیرانہ سال
والیسرائے نے کہا:۔

حضور والا کے ذمہ ایک اہم ترین عظیم الشان خدمت ہے۔ آپ
تقریباً ایک کرور انسانوں کے حاکم ہیں۔ انکی فلاح وبہبودی
اب آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور انکی بھلائی برائی آج سے
آپ کی عقل وفراست، آپ کی محنت وجفاکشی اور آپ کی حظائظ
دنیوی سے نفرت پر منحصر ہے۔ میں آپسے نہایت تاکید کے ساتھ
درخواست کرتا ہوں کہ آپ ظاہری شان وشوکت اور طمطراق
کے بے معنی غرور کو مت پسند کیجئے۔ مال ودولت پر جو ہر طرف سے
آپ کو گھیرے ہوئے ہوں گے گھمنڈ نہ فرمائیے۔ اور خوشامد جا بیجا بیجا
تعریف وتوصیف کی جسکا چاروں طرف آپکو جلوہ نظر آئے گا
پروا نہ کیجئے۔ آپ کا ملک نہایت وسیع۔ آپ کی آمدنی بہت
زیادہ۔ اور آپ کی رعایا کثیر التعداد ہے۔ لیکن انہیں سے کسی
ایک چیز پر بھی آپ کو ناز کرنا زیبا نہیں۔ آپ ہنوز نوجوان ہیں
اس لئے آپ پر اُن تمام خواہشات اور ترغیب وتحریص کے
اسباب کا چاروں طرف سے حملہ آور ہونا ضروری ہی جو شباب
کا اقتضا ہیں۔ لیکن آپ کبھی انکو غالب ہونے کی نوبت نہ آنے
دیجئے۔ آپ کے اغراض اعلیٰ۔ مقاصد بلند اور ذمہ داریاں عظیم الشان
ہیں۔ اگر آپ ہندوستان کے رئیسوں میں نام کرنا چاہیں تو
یہ بات آجکل محض آپ کی حکومت کے مبنی بر انصاف اور آپکی
رعایا کے آسودہ حال ہونے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ رعایا کی
وفاداری اور عقیدت مندی آپ کے خاندان اور آپ کی ذات
کے ساتھ مسلم اور قابل تعریف ہی۔ اب یہ آپکا کام ہے کہ آپ
اسکو بر قرار رکھیں۔ اور جیسا جیسا زمانہ گزرتا جائے اس میں اور
ترقی پیدا کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ جو چیز کسی بادشاہ کے لئے سب سے
زیادہ قابل قدر اور مایۂ ناز ہوسکتی ہے یعنی رعایا کی بلا تصنع خالص
دلی محبّت وہ آپ کو بدرجۂ اتم حاصل ہوجائے۔ خداوند تعالےٰ نے
رعیت اس لئے آپ کے تفویض نہیں فرمائی ہے کہ آپ اُسکو اپنے
حظوظ کا آلہ یا فخر وناز کا ذریعہ بنائیں۔ بلکہ اُن لوگوں کی حفاظت

نگرانی اس لئے آپ کے سپرد ہوئی ہو کہ آپ اُن پر اس انداز سے حکمراں ہوں ۔ اور ان کی ہدایت و رہنمائی کریں جس سے خدا کی عظمت و شان نمایاں ہو ۔ اور انکو بہبودی و فلاح نصیب ہو ۔ ان ہی کی فلاح و بہبودی سے آپکو اطمینان و خوشی حاصل ہوگی ۔ اور ان ہی کی خوشنودی رضامندی و خوشحالی سے آپ کو سلامتی و امن و امان کا لطف ملے گا ۔

آپ کے اغراض و مقاصد ہمیشہ بہت بلند اور اعلیٰ ہونے چاہئیں ۔ خلاف شان لہو لعب سے محترز رہئے ۔ اور اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو ہمیشہ پیش نظر رکھئے ۔ ہمیشہ آپ کی یہ دلی تمنا اور کوشش ہونی چاہئے کہ جب آپ اپنے آبا و اجداد سے متصل ہو جائیں تو لوگ آپ کی نسبت یہی کہیں کہ :-

"انکی حکومت رعایا کے حق میں رحمت تھی اور انہوں نے اپنی رعایا کو بہترین حالت میں نہایت آسودہ حال چھوڑا"

.... خدا آپ پر مہربان اور آپ کا مددگار و معاون رہے آپ کے عہد کو سرسبز ۔ آپ کی حکومت کو کامیاب اور آپ کی فرمانروائی کو انصاف پرور اور معزز و ممتاز فرمائے آج کے دن کی تمام امیدیں اور خوشیاں بار آور ہوں اور آپکی مرہون منت رعایا کی آئندہ نسلیں آپ کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے دن کو ریاست کی تاریخ میں ایک بہت روشن ۔ مبارک ۔ نامی ۔ گرامی با فروغ زمانہ کا آغاز سمجھیں"

لارڈ رپن کی یہ مشفقانہ نصیحتیں اور امیدیں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ حضور خلد مکاں نے ان کے ایک ایک لفظ کو ہمیشہ اپنا نصب العین رکھا ۔ اختیارات حاصل ہونے کے بعد سے داعی اجل کو لبیک کہنے تک حضور مرحوم نے اپنی زندگی بالکل اسی نمونہ پر بسر کی جس کی لارڈ رپن نے تمنا کی تھی ۔ حیدر آباد کو آپ کے ظل عاطفت میں بیالیس سال چھ مہینے بسر کرنے کا فخر حاصل ہوا ۔ اس زمانہ میں ریاست کو انواع و اقسام کی ترقیاں ہوئیں ۔ کوئی صیغہ ترقی کے اثر سے خالی نہ رہا ۔ اس مبارک عہد میں حیدر آباد کو جو ترقی نصیب ہوئی ۔ اس کی نظیر ملک کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ ان تمام ترقیوں اور برکتوں کا ٹھیک اندازہ اسطرح ہو سکتا ہے کہ حیدر آباد کی پچھلی تاریخ کو بیالیس سال کے متعدد و مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ہر بیالیس سال کی میعاد میں ملک کو کیا کیا ترقیاں نصیب ہوئی ہیں ۔ پھر تو بہ آسانی معلوم ہو جائیگا کہ حضور خلد مکاں کا عہد حکومت ملک کے لئے ہر طرح موجب برکت رہا ہے ۔ اُس وقت اس مبارک عہد کی اصلی عظمت سمجھ میں آئے گی ۔ اور معلوم ہوگا کہ یہ امن و اماں جو ہمیں آج نصیب ہے ہمارے بزرگوں کو خواب میں بھی میسر نہ تھا ۔ ریاست کے مختلف صیغوں اور شعبوں کی درستی اور باقاعدہ حالت جو آج پائی جاتی ہے ۔ پہلے اسکا پتہ تک نہ تھا ۔ عامۂ خلایق کے فائدہ کے لئے یہ محکمے پولیس ۔ صفائی ۔ تعلیمات ۔ طبابت وغیرہ کے کہاں تھے ۔ اخبار رسائل ۔ مطابع ۔ ریل ۔ تار ۔ ڈاک وغیرہ کو کون جانتا تھا غرض خلق اللہ کی آسائش اور ملک کی ترقی کے اس وقت جو جو سامان نظر آتے ہیں وہ سب اسی مبارک عہد کی یادگار ہیں ۔ ریاست کی انتظامی حالت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے ۔ مالگزاری ۔ فنانس ۔ عدالت وغیرہ کے تمام انتظامات بالکل جدید اصول کے مطابق ہوتے ہیں ۔ مدار المہام یا وزیر اعظم تمام کاروبار ریاست کے اعلےٰ ترین افسر ہیں ۔ مدار المہام کے چار معین المہام ہیں ۔ جن کے سپرد مختلف صیغہ جات ہیں ۔ ہر صیغہ اور ہر علاقہ کی نگرانی کے لئے الگ الگ معتمد (سکریٹری) مقرر ہیں ۔ فنانس ۔ مالگزاری ۔ عدالت و کوتوالی و امور عامہ ۔

دربار نورتن اکبری

تعمیرات اور فوج یہ پانچوں صیغے پانچ معتمدین (سکریٹریوں) کے تفویض ہیں۔ ہر معتمد کے ماتحت متعدد ناظم (ڈائرکٹر) اور مددگار وغیرہ ہوتے ہیں۔ جن کی وساطت سے اس صیغہ کا کام چلتا ہے معتمدین اپنے اپنے کاغذات اپنے معین المہاموں کے پاس پیش کرتے ہیں۔ جن کی تجویزیں پھر مدار المہام کے پاس پیش ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد وہ تمام کاغذات مدار المہام کی شرح کے ساتھ اخیر فیصلہ کی غرض سے خود حضور نظام کے ملاحظہ میں گذرانے جاتے ہیں۔ حضور خلد مکاں نے ۱۸۹۳ء میں چند قوانین مرتب فرما دیئے تھے جن کی رو سے معتمد معین المہام اور مدار المہام کے اقتدارات مقرر ہو گئے ہیں۔ ان احکام کو "قانونچہ مبارک" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اور ان ہی کے مطابق ریاست کا کاروبار انجام پاتا ہے۔ ایک مجلس وضع قوانین (لیجسلیٹو کونسل) بھی حضور فردوس آشیاں نے ۱۸۹۳ء سے قایم فرما دی ہے جسمیں چند اراکین رعایا کے مختلف طبقوں کی جانب سے بھی منتخب ہوتے ہیں۔ ایک کبنٹ کونسل بھی قایم ہے جس کے اراکین دولت آصفیہ کے صرف موروثی امرائے عظام ہی ہوتے ہیں غرض موجودہ ترقیات کے لحاظ سے جسقدر انتظامی اصلاحیں ممکن ہو سکتی تھیں۔ ان میں سے کوئی بات حضور خلد مکاں نے اپنی ریاست کے لئے باقی نہ چھوڑی۔

ممالک محروسہ سرکار نظام کی جملہ آمدنی تقریباً سات کرور سے زیادہ ہی ہے۔ اگر جاگیروں وغیرہ کی آمدنی کو الگ رکھا جائے تو صرف ریاست کی خالص آمدنی جو اس سال کے موازنہ میں شریک تھی۔ ۵۱۰۵۴۸۴۴ ہے۔ یہ آمدنی بہت زیادہ ہے بمقابل اس وقت کی آمدنی کے جبکہ حضور غفراں مکاں نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ اس موقعہ پر یہ معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ریاست کی جانب سے بعض عام ابواب پر کیا خرچ کیا جاتا ہے۔ لہذا ہم اس سال کے موازنہ کی بعض رقمیں یہاں درج کرتے ہیں :-

تعلیمات - دس لاکھ اکہتر ہزار سات سو روپیہ - طبابت - آٹھ لاکھ تینتیس ہزار روپیہ - مذہبی اور خیراتی وظایف و معمول چھ لاکھ تراسی ہزار چار سو روپیہ - عدالت - چودہ لاکھ چھہتر ہزار ایک سو - وظایف حسن خدمت - چودہ لاکھ روپیہ - رعایتی وظایف تین لاکھ دو ہزار تین سو ایک روپیہ - رعایتی ماہوارین منصبین وغیرہ جملہ - پنتالیس لاکھ چھیاسٹھ ہزار تین سو۔

ان تمام اصلاحوں اور اس ساری خوش نظمی کا سہرا حضور خلد مکاں ہی کے سر ہے۔ کیوں کہ ایک ایسے ملک میں جو ایشیائی اور شخصی حکومت کی باقیات الصالحات ہو جو کچھ ہوتا ہے محض اس کے تاجدار کی بدولت ہوتا ہے۔ اسی لئے اس عہد کی ساری ترقیوں کا ظہور حضور مرحوم ہی کی عنایت خسروانہ سے ہوا۔ اور ان ترقیوں نے اہل حیدر آباد کو اپنے محبوب بادشاہ کا والہ و شیدا بنا دیا۔ مگر یہ سب تو ریاست کے اندرونی انتظامات تھے جن کا اثر زیادہ تر ان ۱۳۳۷۵۴۶۹ نفوس تک محدود ہے جو ریاست کے ۸۲۶۹۸ مربع میل رقبہ میں حضور نظام کے ظل عاطفت کے نیچے بستے ہیں۔ اور جنکی قسمتیں اپنے فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں اسلئے محض ان اصلاحوں اور انتظاموں کی بدولت ایسی عام ہر دلعزیزی نہیں حاصل ہو سکتی جو حضور میر محبوب علی خاں مرحوم کو تھی کہ حیدر آباد کے باہر والے بھی آپ کی ایک ایک ادا کے دل سے گرویدہ تھے ہندوستان کی سب سے زبردست ریاست کا حکمراں ہونا بھی عامہ خلایق کی اتنی غیر معمولی گرویدگی کا کوئی سبب نہیں ہو سکتا

بالمختصر یہ کہ اعلیحضرت خلد مکاں اپنی وجاہت و شوکت اور اپنے علو مرتبہ کے باعث اس درجہ ہر دلعزیز نہ تھے بلکہ وہ محض انکی ذاتی خوبیاں اور خدا داد طبعی جوہر تھے جن پر اپنے اور غیر سب جان دیتے تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں بہادر کی فطرت میں خوش اخلاقی انکسار۔ حلم۔ مروت۔ سادگی۔ فقیر منشی۔ بے تعصبی۔ فیاضی اور رحمدلی کے جوہر خلاق عالم نے کوٹ کوٹ کے بھرے تھے۔

وہ جس طرح ایک بڑی ریاست کے حکمران تھے اسی طرح ان تمام انسانی خوبیوں کے بھی مالک تھے۔ آسایش کے بے اندازہ سامان مہیا ہونے کے باوجود آپ کو ہمیشہ درویشانہ طرز پر زندگی بسر کرنے کا شوق تھا مشہور ہے کہ آپ بہت کم شاہی خوابگاہ کے نرم و نازک بستر پر آرام فرماتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات تو آپ نفس کشی اور ریاضت کے طور پر سخت اور بھدی کمل بچھا کر بغیر تکیہ کے استراحت فرماتے تھے۔ دھوپ اور بارش کی صعوبتوں کو بھی آپ بہ کشادہ پیشانی برداشت فرمانے کو اپنی کسر شان نہ سمجھتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ آپ عین دھوپ میں باہر نکل آئے۔ اور کسی کام میں مصروف ہو گئے۔ صبح سے شام ہو گئی۔ مصاحبین مارے دھوپ کی شدت کے بیتاب ہیں۔ مگر وہ جواں مرد عالی ہمت بالکل ان تمام اثرات سے بے پروا اپنے کام میں مشغول ہے۔ کبھی آپ کسی سے باتیں کرتے یا کچھ لکھتے یا کسی اور کام میں کھڑے ہو جاتے تو چوبیس چوبیس گھنٹہ ایک پہلو پر گذار دیتے ساتھیوں کا بُرا حال ہو جاتا مگر آپ پر تکان یا کوفت کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کی طبیعت میں اس قدر پاس و لحاظ تھا کہ ان موقعوں پر ان مصاحبوں کو جو اس مشقت کے برداشت کرنے کے ناقابل ہوتے بیٹھ جانے کا حکم دیدیا کرتے تھے۔ چنانچہ فصیح الملک داغ مرحوم کو جو آپ کی استادی کے فخر سے ممتاز تھے بوجہ ان کی کبرسنی کے آپنے عام حکم دے رکھا تھا کہ وہ بلا تکلف ان مواقع پر بیٹھ جایا کریں۔ نمایش نام کو نہ تھی۔ سادگی اتنی کہ لباس وغیرہ تک میں تکلف پسند نہ کرتے تھے۔ دہلی دربار کے عظیم الشان موقع پر جبکہ سارے والیان ملک بے حساب زیورات اور بھڑکیلے لباس میں دبے جا رہے تھے۔ حضور خلد مکان حسب عادت وہی سادہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسٹر اسٹیفن وھیلر نے اپنی کتاب "تاریخ دربار تاجپوشی" میں خاص طور پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ:۔

"نظام ایک باوقار سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے"

آپ کو شان و شوکت سے جس درجہ نفرت تھی اور آپ کی طبیعت میں جو سادگی تھی اس کا کسی قدر اندازہ آپ کے فرمان مترشدہ ۲۷ صفر المظفر ۱۳۰۹ھ کے حسب ذیل فقرہ سے ہوتا ہے:۔

> آخر میں میں چاہتا ہوں کہ میری محبوب رعایا کا ہر طبقہ امراء و جاگیردار سپاہ اور دوسری عام رعایا جن کو میں اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں بخوبی سمجھ لیں اور ہمیشہ کے لئے سمجھ لیں کہ سابق میں گو کچھ ہی رسم و رواج رہا ہو۔ اور دوسرے فرمانرواؤں نے اپنے اختیارات سے اپنے واسطے گو کیسے ہی حقوق قرار دے لئے ہوں لیکن میں اپنی ذات خاص کے واسطے اس سے زیادہ کوئی حق قایم کرنا نہیں چاہتا جس کو خدا نے اور اس کے رسول نے میرے واسطے مقرر کر دیا ہے اور میں خدا کی درگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھکو میرے اس ارادہ پر آخر وقت تک ثابت قدم رکھے۔

درویشوں اور باخدا لوگوں سے آپ کو بے انتہا عقیدت اور ارادت تھی۔ اور ان سے حصول فیض کا بہت شوق تھا۔ آپ ہمیشہ فقرا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کا بہت ادب کرتے۔ توسیع ملک یا طلب جاہ کی خواہش آپ کو صاحبدل درویشوں کے

پاس نہیں لے جاتی تھی بلکہ محض دعائے مغفرت اور نیک کاموں کی توفیق کی آرزو میں آپ ان لوگوں کے پاس جایا کرتے۔ حضور خلد مکاں ہمیشہ اس بات کے بھی عادی تھے کہ راتوں کو بھیس بدلکر نکل جایا کرتے اور انتظامی حالت کو ملاحظہ فرمانے کے سوا غربا کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے آپ کو اپنی رعیت کے ساتھ بے انتہا محبت تھی۔ مختلف اوقات مختلف طریقوں سے آپ کی رعایا پروری اور رحمدلی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ ابھی تین سال قبل رودموسیٰ کی قیامت خیز طغیانی میں حیدر آباد کی حسرتناک تباہی کے موقع پر آپنے جس ہمدردی اور مسیحا نفسی کا اظہار کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ آپ نے رعایا کی تباہی و تاراجی کے غم میں دو روز تک ایک دانہ زبان پر نہ رکھا۔ حزن و ملال اور بے چینی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دمبدم طغیانی کی کیفیت دریافت فرماتے اور بار بار سیلاب کے مصائب کو جہاں تک ہو سکے گھٹانے اور آفت زدوں کی فوری مدد کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ اپنے خاص مصاحبین کو اسی غرض سے روانہ فرمایا۔ مصیبت زدہ بے خانمانوں کے لئے اپنے خاص شاہی محل کھلوا دئیے۔ اور حکم دیا کہ جس کا جی چاہے بلا کھٹکے انمیں ٹھہرے۔ بیچارے تباہ حال آفت زدوں کو فاقہ کشی کی موت سے بچانے کے لئے شہر کے مختلف حصوں میں فی الفور ہندو مسلمانوں کے واسطے جداگانہ کھانا پکاکر تقسیم کرنے کا حکم صادر کیا۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہ کیا کہ ایوان شاہی میں تشریف رکھکر ضروری احکام صادر فرما دیتے۔ بلکہ باوجود سڑکوں کے خراب واز کار رفتہ اور راستوں کے ناقابل گزر ہونے کے کہیں گھوڑے پر چڑھکر اور کہیں پاپیادہ مقامات متاثرہ کا بہ نفس نفیس معائنہ فرمایا۔ کہیں شہر کی تاراجی اور اپنی عزیز رعایا کی تباہی دیکھکر

اشکبار ہو ہو گئے۔ اور کہیں نہایت دلسوزی سے شفقت آمیز جاں بخش الفاظ میں مصیبت زدوں کی تسلی و تشفی فرمائی۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہر دل پر احسان مندی اور شکر و امتنان کے حروف میں منقوش ہیں۔ انکا گہرا اور دیرپا نقش ہمیشہ جوادث عالم سے محفوظ رہے گا۔ بلکہ جیسا جیسا زمانہ گذرتا جائے گا اسی قدر نمایاں ہوتا رہے گا۔ آپ کا قول تھا:۔

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آسے خلق کی راحت کے واسطے

اور یہی آپ کا فعل تھا۔ آپ کے رحم و کرم کا یہ حال تو مشہور ہے کہ جب آپ کسی پر اس کی کسی حرکت سے ناراض ہوکر اپنے پاس سے الگ بھی کر دیتے تھے تو اسکی تنخواہ وغیرہ برابر اس کے نام جاری رہتی۔ فیاضی کا یہ عالم کہ ہزاروں آدمی اپنے گھر بیٹھے تنخواہیں اور منصبیں پا رہے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں کے باشندوں میں حضور خلد مکاں کے نمکخوار اور وابستہ موجود نہوں۔ دہلی کی جامع مسجد ہو یا اجمیر کی درگاہ یا علی گڈھ کا مدرستہ العلوم یا بغداد وعرب کے معابد و زیارت گاہ سب کے لئے ریاست سے بڑی بڑی تنخواہیں مقرر ہیں۔ یہ مرحوم ہی کی توجہات خسروانہ کا ادنےٰ کرشمہ ہے کہ اس وقت مولانا حالی اور علامہ شبلی وغیرہ جیسے فاضلان عصر اپنا سارا وقت بے فکری کے ساتھ ملک کی خدمت میں بسر کر رہے ہیں۔ حضور غفران مکان کی صلح کل طبیعت اور بے تعصبی بھی اس میں شک نہیں کہ عدیم المثال تھی ہندوستان کے والیان ملک ہی نہیں بلکہ سارے جہان کے فرمانرواؤں میں اس بے تعصبی کی نظیر نہیں ملتی۔ تعصب کا ہیبت ناک دیو جس بری طرح دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ سلطنتوں تک پر

مسلّط ہے - اس کو سب جانتے ہیں - بڑے بڑے مدعیان تہذیب و شائستگی بھی اس مرض متعدی سے خالی نہیں ہوتے مگر حضور میر محبوب علی خاں مرحوم اپنی رعایا کے کل فرقوں سے یکساں سلوک کرتے تھے آپ نے کبھی عبداللہ اور رام داس میں کوئی فرق نہ کیا - ہندو مسلمان پارسی عیسائی وغیرہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ ویسا ہی تھا جیسا کہ خود اس مذہب کے فرمانروا کا ہو سکتا ہے - ریاست کے تمام عہدے بلا تخصیص ہر قوم کے لئے یکساں کھلے رکھے - آپ نے کبھی کوئی امتیاز خون یا رنگت یا مذہب کا روا نہ رکھا مسلمانوں کے مساجد و معابد کی طرح ہندوؤں کے مندر عیسائیوں کے کلیسا اور پارسیوں کی دیولوں کے لئے بھی بڑے بڑے وظایف و روزینے مقرر کئے - ہندوؤں کے اکثر مندروں کے واسطے تو بڑی بڑی جاگیریں اور نوبت نقارے تک مقرر ہیں - اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ حیدرآباد کے ہندو مسلمان بفضل خدا بلا کسی کانگریس یا کانفرنس کی کوششوں کے خود بخود باہم شیر و شکر ہیں ہندوستان کی موجودہ سیاسی بے چینی کے متعلق لارڈ منٹو کو مرحوم نے جو جواب لکھا تھا - اس کے ایک ایک لفظ سے حضور کی بے نظیر خدا داد بے تعصبی کی تشریح ہوتی ہے - حضور خلد مکاں کی اسی قابل تعریف اعلیٰ صفت کو فخر ہند شمس العلما مولانا حالی نے بہت جامع الفاظ میں نہایت عمدگی کے ساتھ بیان فرمایا ہے :-

ہر اک مذہب ہر اک ملت سے ہے یکساں سلوک اسکا — کوئی گر دیکھ لے اس سے جہاں کی پاسبانی کا
تعصب، اجنبیت، اختلافِ مذہب و ملت — نہیں کوئی مزاحم اس کی دریا کی روانی کا
رعیت شاد - ملک آباد - اور آزاد ہر ملت — ادا حق کر دیا شاہِ دکن نے حکمرانی کا

حضور جنت آشیاں کے انتہا درجہ کی بے تعصبی کی یہ عدیم النظیر مثال قابل ذکر ہے کہ جب آپ ۱۸۸۴ء میں با اختیار ہوئے اور اقتدارات فرماں روائی حاصل ہونے کی تقریب میں جشن ہونے لگے تو بعض اہل ہنود نے آپ کے پاس یہ معروضہ پیش کیا کہ جسطرح مسند نشینی اور جشن وغیرہ کے مراسم اسلامی طریقوں سے بجالائے گئے اسیطرح ان کی تمنائے دلی ہے کہ اپنے آقائے ولی نعمت بادشاہ عالی مرتبت کی تاجپوشی اور با اختیار ہونے کے مراسم ٹھیٹ ہندو طریقوں سے بھی ادا کئے جائیں - گو اکثر لوگ اس کے سخت خلاف تھے - لیکن حضور نواب میر محبوب علی خاں جنّت آشیاں نے اس مخالفت کی مطلق پرواہ نہ کی - اور بڑی ہی بے تعصّبی اور وسیع مشربی کے ساتھ اس بات کی اجازت دی کہ ہندو لوگ اپنے عقاید اور اپنے طریقوں کے مطابق ابھیشیک کے مراسم ادا کر کے اپنی آرزو پوری کریں - چنانچہ تمام رسوم برابر ادا کئے گئے اور حیدرآباد کی آبادی کا بہت بڑا حصّہ اپنے جواں سال بادشاہ کی اس دل دہی اور خاطر داری کا دیوانہ ہو گیا - ملے یہ چیزیں ہیں جن پر اپنے پرائے سب فدا تھے اور یہی باتیں ہیں جن کو یاد کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے - یہی تھے وہ صفات حمیدہ جن کی جادو بھری تاثیر نے کروروں انسانوں کو حضور غفران مکاں کا والہ و شیدا اور حلقہ بگوش بنا دیا تھا - اور یہی تھیں وہ طبعی خصوصیات جن کے اعجاز نے ہر کس و ناکس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا - لارڈ رپن نے تو صرف یہ توقع ظاہر کی تھی کہ حضور مرحوم اسطرح زندگی بسر کریں جو اُن کے بعد احسانمندی کے ساتھ یاد کی جاوے - اگر مرنے کے بعد انسان کو دنیا سے کوئی تعلق ہوتا ہے تو لارڈ رپن مرحوم دیکھتے ہوں گے کہ اِسوقت حیدرآباد کی ڈیڑھ کروڑ رعایا کا کیا حال ہے - حضور میر محبوب علی خاں کی مرقد پر ہر روز صبح کے پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک خلایق کا کیسا ہجوم رہتا ہے - ہندو مسلمان

ساوتری اور فرشتۂ موت
(از بابو نند لال بوس)

انڈین پریس، الہ آباد

پارسی۔ عیسائی۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ محبوب خلایق فرمانروا کے مقدس مزار کی زیارت کے لئے کس ولی شوق اور ارادت سے جاتے ہیں۔ دور دور کے اضلاع سے بیچارے غریب کسان اور مزدور پیشہ تک سفر کی صعوبتیں اور غربت کی زحمتیں برداشت کر کے محض اپنے محبوب بادشاہ کی قبر پر پھول چڑھانے کے لئے آتے ہیں۔ ہر وقت مزار پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع رہتا ہے۔ لحد پر پھولوں کا قدِ آدم سے زیادہ انبار لگ جاتا ہے اس سے زیادہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی کیا ہوگی۔ یہ وہ خداداد نعمت ہے جو بمشکل کسی کو نصیب ہو سکتی ہے۔

اے تیر غمت را دلِ عشاق نشانہ
خلقے بتو مشغول تو غایب ز میانہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا سرائے فانی ہے۔ یہاں جو شخص آتا ہے اس کے لئے جانا بھی ضرور ہے اسی اٹل قانون کے مطابق حضور نواب میر محبوب علی خاں ہمیں داغ مفارقت دے گئے اور اب وہ انسانی کمالات کا سرچشمہ اور ملکوتی صفات کا مجموعہ ہم میں باقی نہیں رہا لیکن اسکی نیکیاں اور اسکے کارنامے ہمارے پاس موجود ہیں اور دنیا میں یہی چیز ہے جس کو بقا ہے۔ اس سے بڑی خدمت مرحوم کی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم ان خوبیوں سے سبق حاصل کریں اور انپر کاربند ہوں۔ فقط

سیّد خورشید علی

بچّے کی تندرستی یہ چھوٹی تقطیع کا رسالہ ایک مصری ڈاکٹر، عبدالعزیز نظمی کی عربی تصنیف "صحۃ المولود" کا ترجمہ ہے، جسکو منشی محمد حلیم صاحب انصاری نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ایک نہایت ضروری اور مفید کتاب ہے۔ ہندوستان میں، مستورات کی جہالت کی وجہ سے، ہر سال ہزاروں معصوموں کی جانیں محض غفلت و بے احتیاطی سے تلف ہو جاتی ہیں، اور اگر بچے تندرست بھی رہتے ہیں تو کمزور و نحیف، قومی و اقتصادی پہلو سے کسی نسل کا ناقص ہونا بڑی مصیبت ہے۔ پس ہر ایک ماں باپ کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اپنے گھر میں رکھے۔ اور جو قواعد پرورش اسمیں لکھے ہیں۔ ان پر اپنے ملک و مقام کی آب و ہوا کے لحاظ سے عملدرآمد کرے۔ نسل کی عمدگی و خوبی پر انفرادی و قومی زندگی کا انحصار ہے۔ قدیم یونانیوں میں تو نسل کی مضبوطی و خوبصورتی کا اسقدر خیال تھا کہ کمزور و ناقص بچّے تلف کر دئے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ قدیم یونانیوں کے دل و دماغ ظاہری حُسن و جمال اور جدّت و اخلاق کے لحاظ سے آج تک بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۱۰؍ ہے، جو اس کے فائدہ کے لحاظ سے کچھ نہیں ملنے کا پتہ:۔

منشی محمد حلیم انصاری۔ گوشہ چھتر منزل کوچہ پیسہ اخبار۔ لاہور۔

صرف ایک پیسہ

کا کارڈ لکھکر اگر آپ پچاس صفحہ کا ایک نہایت دلچسپ، اچھوتا، اور دل کو بے قرار کرنے والا ناول پڑھنا چاہتے ہیں تو جنرل منیجر فسانہ ایجنسی لاہور کو اپنا پتہ ارسال کر دیں۔ وہ زبردست اخلاقی ناول جسے بچّے اور مستورات بھی بلاتکلف مطالعہ کر سکتی ہیں آپکی خدمت میں مفت ارسال ہوگا۔ اسکے ساتھ ہی آپکو ایک جدید لٹریری اسکیم کا حال بھی معلوم ہوگا جو لاہور کے چند معزز اور لٹریری آدمیوں کے اہتمام میں معقول سرمایہ سے قائم ہوئی ہے۔ یہ رعایت صرف ۱۵ ر نومبر ۱۹۱۱ء تک ہے۔

دمینتی اور ہنس

مرحبا خوبیٔ صناعیٔ صورت آفریں — ہے فسون تاثیر دمینتی کا حسنِ دل نشیں
وہ حیا پرور نگاہیں وہ ادائے شرمگیں — عصمت و عفت کی دیوی ہے مقدس نازنیں
جس کا نقشِ پا زیارت گاہِ اہلِ دید ہے
جسکی خاکِ پا کا ذرہ ہمسرِ خورشید ہے

شوخیوں کی اضطرابی ماہ سیما میں نہیں — خود نمائی کی ادا طرزِ دل آرا میں نہیں
سرکشی سروِ بستاں قدِ رعنا میں نہیں — حشر آرائی خرامِ ناز پیما میں نہیں
ہے حسینوں کا مگر حسنِ دمن سرتاجِ حسن
قدرتی حاصل ہے رشکِ ماہ کو معراجِ حسن

یہ حسیں کاشانۂ نل کی تھی شمعِ دلفروز — رکھتی تھی پروانہ سال سینہ میں الفت کا سوز
عالمِ نسواں میں تھی مانندِ مہرِ نیمروز — ہے فروغِ بزمِ الفت ذکرِ خیر اسکا ہنوز
دلگدازِ اہلِ دل اسکا بیانِ عشق ہے
اک طلسمِ رنج و راحت داستانِ عشق ہے

اس ستی کا ہے مہابھارت میں ذکر عزت کیساتھ — فخر ہے بھارت کو اس خاتون کی عظمت کیساتھ
نامور گذری ہے پتی ورتاؤں میں حرمت کیساتھ — الفتِ نل میں اٹھائیں سختیاں شدت کیساتھ
اس قدر ثابت قدم تھی مرحلاتِ عشق میں
نام روشن آج تک ہے شش جہاتِ عشق میں

سامنے اک ہنس ہے مرغوبِ طبعِ نازنیں — جسکی ہیں حرکاتِ شیریں دلپسندِ مہ جبیں
طائرِ نازک ادا ہے محوِ نازِ دل نشیں — یعنی یہ زیبا طرازِ خامۂ جاں آفریں
اُڑ رہا ہے بال و پر کھولے ادائے ناز سے
دلستانی کر رہا ہے شوخیٔ پرواز سے

شرر سہارنپوری

مصوری وشاعری

سخن مرقعِ ارژنگِ فکر ہے بہزاد — مصوری کو کہوں شاعری کا اک خاکا
مگر ہے صورت و معنی کا فرق دونوں میں — اس اعتبار سے پایہ سخن کا ہے اونچا
نہ موقلم کی نہ پرکار کی یہاں حاجت — دکھایا جاتا ہے لفظوں میں کھینچکر نقشا
وہاں تو صفحۂ عارض کی نیمرخ ہی شبیہ — یہاں اُتارتے ہیں ہر ادا کا اک چربا
یہ بات اور ہے ایسے بھی ہم میں ہیں نقاش — کہ جنکے نقشے علیحدہ ہیں خط و خال جدا
یہ کہد و اُن سے جو ہیں محوِ رنگ آمیزی — کہ شوخیوں میں رہے سادگی کا رنگ بھرا
صفائے بندشِ مضموں بنے وہ آئینہ — جمالِ شاہدِ معنی ہو صاف جلوہ نما
بجا نہیں کہیں بیجا رعایتِ لفظی — محل پر اپنے جو بیساختہ ہو کیا کہنا
مصوری میں جسے نقش سادہ کاری کہیں — کوئی نگینہ انگوٹھی پہ جسطرح ہو جڑا
بری ہو ہر غل و غش سے زبان ٹکسالی — کہ جوہری تو پرکھ لیتے ہیں کھرا کھوٹا
درست شعر ہو نک سک سے چست ہوں الفاظ — محاوروں میں تصرف ہے صرفۂ بے جا
وہ شرمناک نہوں شعر بے حیایانہ — کہ عیب کھولدے گہرا مجاز کا پردا
کھچے نہ یار کے جوبن کی اسطرح تصویر — کہ بھاگے دامنِ عصمت میں منہ چھپا کے حیا
بنائے طائرِ عنقا کو کیوں کوئی پر بند — پھنسائے جال میں انگیا کے کسلئے چڑیا
کوئی لکیر کا ایسا فقیر کیوں بن جائے — کہ جس سے چھوٹے نہ تقلید کا ذرا ڈھرا
نئے جو ہیں وہ چلیں ایسی کیوں انوکھی چال — کہ ڈھونڈھنا پڑے چلنے کو اک نیا رستا
اب ارغنوں ہو پُرانا کہ ہو نیا ارگن — مگر نہ لے سے ہو باہر کسی کا راگ نیا
وہی ہو تال۔ وہی سم۔ وہی سر اور الاپ
شفق پُرانا ترانہ ہو یا نیا نغما

شفق عمادپوری

عندلیب

جسطرح تو فراق میں ہی عندلیبِ زار اور عشقِ گل کا تیرے ہی ہردم گلے کا ہار
آوارہ گردیوں سے ہی جسطرح تجھکو کام بے لطف جب سے کٹ رہا ہی موسمِ بہار
ہے تیرے دم سے باغ میں ساری چہل پہل فکرِ خزاں میں نغموں سے ہی گاہ اختشار
اسکے سوا تجھے نہیں بھاتی ہی کوئی شے گر گل نہو تو خار ہے یہ سارا لالہ زار
جی ڈھونڈتا ہی جسکو نہیں جب وہ رنگ و بو کس کام کے چمن میں جو گل کھلتے ہوں ہزار
تو بے خبر یہ ہی کہ تجھے کچھ خبر نہیں آیا بھی اور چلا بھی گیا موسمِ بہار
جسطرح دخلِ غیر نہیں چاہتی ہی تو جسطرح تیرے دلمیں کھٹکتی ہی نوکِ خار
کسکو سنائے کس سے کہے حالِ زارِ دل جسطرح تیرا کوئی نہیں اپنا غمگسار
پوچھا کسی نے حال، تو خاموش رہگئی نکلا بھی کچھ زباں سے تو بس شکرِ کردگار
سنتے ہیں دونوں غنچہ و گل تیری گو صدا دیتے نہیں جواب پکارے جو تو ہزار
معشوق سے ہوئی ہیں صدا بیوفائیاں بے اختیار جیسے کہ تو گل پہ ہے نثار
مجھ دل جلے کا تجھ سے زیادہ ہی حالِ زار کرتا ہوں انتظارِ قضا میں بھی دلفگار
اک بیوفا پہ یونہیں مرا آگیا ہے دل اک گلعذار کے لئے میں بھی ہوں بیقرار
اچھا تو ہے جو ساتھ ہے میرا اور ترا تو مجھسے پوچھ اور میں سنوں تیرا حالِ زار

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو "ہائے گل" پکار میں چلاؤں "ہائے دل"

ماہ عظیم آبادی

دُنیا

کس سے کہیں پُردرد ہے افسانہ ہمارا دشمن ہی رہا یہ دلِ دیوانہ ہمارا
اکدن نہ ہوا سبزہ بیگانہ ہمارا کچھ کام نہ آیا کبھی یارانہ ہمارا
دنیا نہیں صد حیف یہ عبرت کی ہی تصویر
دلکش ہی مگر صانعِ قدرت کی ہی تصویر

ہر شام و سحر کیا کہیں کیا کیا نظر آیا نیرنگئی قدرت ... کیا کیا
ہر ذرہ میں اُس مہر کا جلوا نظر آیا ہر نقش میں ...

پھولوں میں وہی شان ہی کانٹوں میں وہی آن
عاشق ہی تو ہر رنگ کو ہر رنگ میں پہچان

القصہ نہیں چیز کوئی حسن سے خالی نرگس ہی کہ ہی مے کی یہ چھوٹی سی پیالی
مست آنکھ کے ڈورے ہیں کہ لالہ کی ہی لالی ہیں پھول چنبیلی کے کہ یہ سلکِ لآلی

پھولوں کی یہ ڈالی ہے کہ جنت کی ہی نعمت
تصویر نہالی ہے کہ سبزہ کی یہ صورت

یہ قند کا شربت ہی کہ ہے نہر کا پانی کلیاں ہیں کہ معشوق کی یہ غنچہ دہانی
یہ سرو ہے یا قامتِ نوخیزِ جوانی پتے ہیں درختوں پہ کہ پوشاک سہانی

یہ چاندنی کا پھول ہے یا چاند سی صورت
چنپا ہے کہ اک شوخ کی یہ چمپئی رنگت

جلوہ شفقِ شام کا وہ صبح سہانی وہ راگ پرندوں کے وہ پانی کی روانی
پنہاں ہے ہر اک شکل میں اک حسنِ معانی ہر شے ہے غرض خالقِ بیچوں کی نشانی

ہے عکس اُسی نور کا مرآۃِ صُوَر میں
کانٹوں میں وہی نوک جو نس ہی گلِ تر میں

ہے غنچۂ سربستہ کہ خلوت کدۂ راز ہے یہ گلِ بشگفتہ کہ عشرتکدۂ ناز
ہے نغمۂ بلبل کہ کسی ساز کی آواز پریوں کا یہ اڑنا کہ پرندوں کی ہی پرواز

ہیں خوب مہ و مہر و زمیں نجم و فلک بھی
پر سب میں نظر آتی ہے اک تیری جھلک بھی

ہیں اک الف اللہ کا پتوں کی لکیریں راجع ہیں اُسی سمت دونوں کی ہی ضمیریں
گاتی ہیں وہی راگ قلم کی بھی صریریں ہیں اُسکی نشانی کی یہ ادنیٰ سی نظیریں

گہری جو نظر ہو تو یہ تہ تک کی خبر لائے
ماہی تو ہے کیا چیز یہ مہ تک کی خبر لائے

قدرت کے مرقع میں عجب رنگ بھرے ہیں ہر شے ہے طلسمات وہ نیرنگ بھرے ہیں

ساحل کہیں اور کہیں سنگ بھرے ہیں   کچھ آئینے ہیں صاف تو کچھ زنگ لگے ہیں
دنیا میں غرض دیکھلو نیکی بھی بدی بھی
کس کام کی لیکن ہے حیاتِ ابدی بھی

سنتے ہیں فنا ہوگا کسی دن کرۂ خاک   بجھ جائے گا اک پھونک میں یہ شعلۂ ادراک
کہتے ہیں نجوم اور طبیعات کے دراک   مٹ جائیں گے اک روز یہ مہر و مہ و افلاک
نوری نہ رہیں گے نہ یہ ناری نہ یہ خاکی
باقی جو رہے گی تو بس اک ذات خدا کی

جو زندہ ہے اک روز اُسے موت ہے آنی   یہ یاد رہے خوب کہ یہ جان ہے جانی
جو چیز ہے اس دہر میں بیشک ہے وہ فانی   دنیا کے یہ قصے ہیں کہ پریوں کی کہانی
اک خواب ہے جو شہرۂ آفاق ہوا ہے
کچھ بھی نہیں یہ واہمہ خلّاق ہوا ہے

دنیا کے بکھیڑوں میں تو مصروف ہیں ہر دم   بھولے ہیں اُسے یاد ہے بس جسکی مقدم
ہاں جلد کریں کام کہ فرصت ہے بہت کم   غفلت کدۂ دہر میں غافل نہ رہیں ہم
اتنی تو رہے موت کی اے مشفقِ من یاد
پوشاک بھی بدلیں تو ہمیں آئے کفن یاد

دنیا میں ہیں یہ رنج و خوشی دیکھلو توام   ہنسنے کے لئے عید ہے رونے کو محرّم
ہونٹوں پہ تبسّم ہے کہیں چشم ہے پُرنم   شادی ہے کسی گھر میں کسی گھر میں ہے ماتم
سہرے میں تھے جو پھول وہ چڑھتے ہیں لحد پر
تھا بیاہ اور اب فاتحہ پڑھتے ہیں لحد پر

اک رنگ پہ رہتا نہیں یہ رنگِ زمانہ   کہتے ہیں جو کچھ آج وہ کل ہوگا فسانہ
اک روز مسافر کی طرح ہونگے روانہ   یہ پھول رہیں گے نہ یہ گلشن نہ ترانہ
دن عیش کے یکساں کبھی رہتے نہیں دیکھے
آنکھوں سے سدا اشک بھی بہتے نہیں دیکھے

مرتے ہوئے کیواسطے مرتا نہیں کوئی   پیمانہ جو خالی ہو تو بھرتا نہیں کوئی
وعدہ بھی وفا کرنے کا کرتا نہیں کوئی   گڑنے کے لئے ساتھ اُترتا نہیں کوئی
مٹی میں ملاتے ہی نکل آتے ہیں باہر
ہو جاتے ہیں رخصت لحدِ تنگ میں رکھکر

سچ ہے کہ بُرے وقت کا ہوتا نہیں کوئی   سینے میں پڑیں داغ تو دھوتا نہیں کوئی
آنکھوں سے بہیں اشک تو روتا نہیں کوئی   مرجائے مگر جان تو کھوتا نہیں کوئی
عاصی کو بھروسہ ہے فقط رحمتِ رب کا
پوچھیگا وہی پوچھنے والا ہے جو سب کا

ظاہر میں عروسِ شبِ اول ہے یہ مانا   دنیا سے کسی حال میں پر دل نہ لگانا
اس ظالم مکار کے کہنے میں نہ آنا   بچتے ہیں سدا دام سے اسکے جو ہیں دانا
دکھلاکے جھلک اپنی لُبھا لیتی ہے دل کو
پھندے میں ہر اک طرح پھنسا لیتی ہے دل کو

یہ پھول ہے وہ جسمیں نہاں خار ہیں لاکھوں   عشرت کی جگہ ہے، مگر آزار ہیں لاکھوں
یہ گنج ہے وہ جسمیں بھرے مار ہیں لاکھوں   کچھ بھی نہیں پر اسکے طلبگار ہیں لاکھوں
ناگن یہ ڈسے جسکو وہ پانی بھی نہ مانگے
جاتے ہوئے دنیا سے نشانی بھی نہ مانگے

وہ شہد ہے زہرابِ فنا جسمیں بھرا ہے   دو دن نہ رہے جسمیں مسافر وہ سرا ہے
وہ اسکی ہوا ہے کہ سدا زخم ہرا ہے   سنبھلا نہ وہ پھر جسنے قدم اسمیں دھرا ہے
گمراہ نہ ہوتے تو ہم اس راہ نہ چلتے
آبادیٔ دنیا سے ذرا بچ کے نکلتے

واصف اکبرآبادی

اسپ

اے سمندِ بادپا، آئینۂ صدق و صفا   اے مجسّم راستبازی نکتہ آموزِ وفا
تیرا یہ رنگِ خاکگوں رہے گا یادگار   محوِ نیرنگی ہے جب تک ابلقِ لیل و نہار
حبّذا تیری رفاقت اے رفیقِ راہِ رزم   مرحبا تیری چمک اے برقِ جولانگاہِ رزم
کھیت رہجانا لڑائی میں ترا انجام ہے   کام آنا جنگ میں دنیا میں ترا کام ہے

اپنے مالک کے لئے اپنے کو دیتا ہے مٹا
کلکِ قدرت نے بنایا ہی تجھے نقشِ وفا

شوق سے راہِ وفا میں تو کٹا دیتا ہی سر
زخم کھا کھا کے جگر پر رہتا ہی سینہ سپر

جان دیدیتا ہے راکب کی رضا کیواسطے
تو نہیں مرتا ہے اپنی واہ واکیواسطے

تیر سر ہی پایا ہی ہدفِ ضربتِ توپ و تفنگ
تیرا سینہ ہی کہ ہے آماجگاہِ تیرِ جنگ

مرہی جانے میں اصالت کی ترے توصیف ہے
کھیت پہ رہنے ہی میں تیرے کھیت کی تعریف ہے

بھاگتا ہی کب لڑائی سے تو ہمت ہار کے
سُرخرو دیکھا ہے تجھکو کھیت میں تلوار کے

خوش خرامی دیدنی ہی جب تُو چلتا ہی قدم
چوم لیتی ہے تری رفتار خود تیرے قدم

چلکے سرپٹ جب تو ہو جاتا ہی نظروں سے ہوا
گرد کو بھی تیرے کب پاتی ہی پھر بادِ صبا

تیری چالیں پویہ۔ رہوار۔ اور دوگام ہیں
تُرکی۔ تازی۔ عراقی۔ عربی تیرے نام ہیں

ابلق و مشکی۔ سمند و نقرہ۔ کمیت و سرنگ
سبزہ و شرغہ۔ یہ ہی مشہور ہیں تیرے رنگ

تجھکو سکھلاتے ہیں بچپن ہی میں آدابِ حرب
پالتے ہیں مثل لڑکوں کے تجھے اہلِ عرب

راستی ہے تیری یکساں مفلس و خوشحال سے
پائی ہے ہر دلعزیزی تو نے سیدھی چال سے

دم کے دم میں قطع کر دیتا ہی تو راہِ سفر
باگ اُٹھی اور اُڑ کے پہنچا منزلِ مقصود پر

جیت کر بازی بڑھا دیتا ہی تو مالک کی شان
پولو اور گھوڑ دوڑ میں رکھتا ہی اُسکی آن بان

چلتی ہیں تیرے ہی دم سے سب فٹن اور بگھیاں
نام روشن کر رہی ہیں تیرا "گھوڑے گاڑیاں"

حفیظ

مُرجھائی ہوئی کلیاں

ایکدن میرا دلِ زار جو گھبرایا بہت
جیکے بہلانیکو گھر سے میں چمن میں پہنچا

میں بیاں کرتا ہوں دیکھا ہوا سب حالِ چمن
لیکن اے اہلِ وطن چاہیے گوشِ شنوا

پودے پودے میں تھی ہر کیفیتِ شانِ نمود
سبزے سبزے میں تھی ہر حالتِ نشو و نما کیا کیا

آبیاری کا عجب نے ور یہ دیکھا میں نے
خود بخود دوڑی ہوئی آتی تھی موجِ دریا

پھول کھلتے تھے مہکتی تھیں چٹک کر کلیاں
تھا دل آویز بڑا اُنکا تبسم خندا

پھل تھے گدرائے ہوئے نخل تھے سب پھولے پھلے
نکلی تھی پھوٹ کے کوپل میں بھی کوپل کیا کیا

تھا کسی ننھے حسیں کی طرح بوٹا ہر اک
چھوٹے سے نازنیں کیطرح سے ہر گلبن تھا

نونہالانِ چمن دیکھے ہرے اور بھرے
بار آور تھے جوانانِ چمن بھی کیا کیا

اپنی جوشش سے غضب جھومتے تھے سب اشجار
اپنی اٹکھیلیوں سے مست تھی گلشن کی ہوا

مالنیں پھرتی تھیں ہر سو وہاں اترائی ہوئی
باغباں تھا وہاں ہر ایک ہی ترچھا بانکا

بلبلوں کا تھا چہکنا بصد انداز و روش
سیکڑوں طرز سے پھولوں کا تھا کھلنا ہنسنا

اتنے میں پیشِ نظر ہوگیا منظر یہ مرے
کتنے عشاق تھے، تھا کتنے حسینوں کا پرا

دستِ رنگیں پہ جھپا اور تھی کسی کے مہندی
دہن و رُخ پہ گُل و غنچہ کسی کے تھے فدا

چشمِ عشاق میں کیا کیا نہ نظر بازی تھی
اور کیا کیا نہ حسینوں میں تھی ہر شوخ ادا

سرو پر چلتی یہ کہتے تھے کہ ہی کاہِ چمن
جبکہ ہر سروِ رواں کو جو ٹہلتے دیکھا

ناگہاں اتنے میں پُر درد صدا یہ آئی
سانحہ کوئی نہ دیکھا تو یہاں کیوں آیا

سن کے یہ میں نے کسی گوشے میں ڈالی جو نظر
سانحہ میں نے حقیقت میں بلا کا دیکھا

تھیں اُسی گوشہ میں "مُرجھائی ہوئی کچھ کلیاں"
ہائے کیا کہئے جو کچھ اُن کا بُرا عالم تھا

میں نے اُن کلیوں سے پوچھا کہ بتا دو مجھکو
کسلئے جسم تمہارا ہی یہ مُرجھایا ہوا

تم میں نضرت ہی نہ نکہت ہے یہ کیا باعث ہی
دل ہی ٹھنڈا ہے تمہارا نہ کلیجا ٹھنڈا

بولیں مرجھائی ہوئی وہ ہی سی کلیاں مجھسے
نہ چمن اپنا ہی۔ ہے ہے نہ یہ گلشن اپنا

دیکھی تُو نے جو مہکتی ہوئی کلیاں ہونگی
ہاں اُنھی کلیوں نیں پھولوں کے ہی کھلنے کا مزا

اُنہی کلیوں میں ہی ہر حسنِ طلب کا عالم
انہی پھولوں میں ہے واللہ تقاضا کیا کیا

وہی کلیاں ہیں دلہن پھول ہیں دولہا اُنکے
نظر آتا ہے چمن ہمکو اُنہی دونوں کا

بہرِ شادابی ہے گلشن یہ اُنہی کا یکسر
بہرِ سیرابی ہی ایک ایک ہی تختہ اُنکا

اور ہم سب جو یہ "مرجھائی ہوئی ہیں کلیاں"
نہ دُلہن ہم ہیں نہ ہے کوئی ہمارا دُولہا

صاف لفظوں میں بتا دیں تجھے اس باغ میں ہم
ہم ہیں کیا۔ ایک مرقع ہیں ہمیں اندوہ کا

نہ ہنسی اب تو ہماری ہی نہ ہی کوئی خوشی
نہ تبسم ہی رہا ہے نہ خندہ ہی رہا

نہ تو بو باس ہی اپنی نہ بہار اپنی ہے اور پھولونکا نہیں ہم میں دم بھی تو پتا
کہ چکیں وہ تو جگر تھام کے یہیں نے کہا کتنا جانکاہ ہے صد حیف تمہارا دکھڑا
ہائے صد موسمی تمہارے مرادل ٹوٹ گیا ہائے کیا کیا نہیں ہو منہ کو کلیجا آتا

تم کو اے اہلِ وطن چاہیئے بس یہ اس پر
اُن کا زیبا نہیں مرجھایا ہوا یوں رہنا

اُنکی آہیں نہ سکھا دیں کہیں سب پھولونکو بند ہو جائے نہ کھلنا کہیں سب کلیوں کا
اُنکو چھاتی سے لگا لو اُنھیں تم پیار کرو ہو دل و دیدہ میں اُنکا بھی ٹھکانا اچھا
اُنکی سرسبزی کا باعث ہو تمہاری رقت اُنکی شادابی کا موجب ہو تمہارا رونا
جسقدر چاہو ابھی اپنے چھڑک دو پانی تازگی کے ابھی قابل ہیں وہ اُنکا ڈھانچا

ورنہ پریاں اُنہیں کلیوں کی دعائے بد سے
غنچہ و گل ہی نہیں سوکھے گا پتا پتا

پریاں جہان آبادی

سانچی*

کس قدر دلچسپ ہے یہ سبزہ زارِ کوہسار تازگی بخشِ دل و جاں ہی بہارِ کوہسار
کیا سہانی سبزی ہی کیا سوادِ پُر فضا کیا مزے کی سیر ہے منظر ہے کتنا خوشنما
دستِ قدرت کی نمایاں ہر طرف گلکاریاں حسنِ فطرت کی عیاں ہر سمت جلوہ ریزیاں
تو ہی او "سانچی" کے جنگل غیرتِ باغِ عدن دامنِ صحرا میں نظارے کو ہی لطفِ چمن
دلکشی کے اور بھی ساماں مہیا ہیں یہاں یعنی آثارِ قدیمہ یادگارِ رفتگاں
دستبردِ عہد سے جو ہو گئے بالکل کھنڈر کچھ برائے نام باقی رہ گئے دیوار و در
آج بھی اُن پر برستا ہے مگر جاہ و جلال اب بھی ظاہر ہو رہا ہے اگلے لوگوں کا کمال
ان عماراتِ شکستہ میں بہت کچھ ہیں نہاں بودھ مذہب کی ترقی کے زمانہ کے نشاں
یہ فرازِ کوہ پر گنبد جو قائم ہیں ہنوز دیکھنے آتے ہیں جنکو دور سے سیاح روز
دو مکاں ہیں چار دیواری کی تھوڑا انکی ہو بیچ میں ہیں ان کے گنبد جنکو کہتے ہیں بھیٹے
جو تصاریفِ زمانہ سے شکستہ حال ہیں مختلف ہیں۔ انکی نسبت جسقدر اقوال ہیں
لوگ کہتے ہیں، بڑا گنبد عبادتخانہ تھا اور چھوٹا اک مقدس شخص کا کاشانہ تھا
بعض کی تحقیق سے ثابت ہے کہ یہ مقبرے اصلیت سچ پوچھئے تو انکی تاریکی میں ہے
چند کتبے بھی ہیں ان پر جو پڑھے جاتے نہیں اگلے لوگوں کے نوشتے فہم میں آتے نہیں
سنتے ہیں پہلے یہاں سنکا نگر آباد تھا فارغ البالی سے جسمیں ہر بشر دل شاد تھا
اب نشاں تک بھی نہیں باقی کوئی اُس شہر کا کھچ رہا ہے ایک نقشہ انقلابِ دہر کا

یونہیں مٹ جائینگے سارے نقشِ ہستی ایک دن اور ویراں ہو گی کل دنیا کی بستی ایک دن
خاک میں مل جائیں گی یہ چلتی پھرتی مورتیں اور فنا ہو جائینگی اچھی بُری کل صورتیں
پھر نہ پیسے گی کسیکو گردشِ لیل و نہار رنگ لائیگا نہ پھر کچھ انقلابِ روزگار
شکوۂ جورِ فلک ہوگا نہ قسمت کا گلہ ٹوٹ جائیگا یہ گوناگونیوں کا سلسلہ
پھر نہ آئے گی گلستاں میں بہارِ جانفزا اور نہ ہونگے شاہدانِ گل کبھی جلوہ نما
یہ نسیمِ صبح کی ہونگی نہ عنبر بیزیاں اور نہ مرغانِ خوش الحاں کی ترانہ ریزیاں
پھر نہ ہوگا میکدوں میں بادہ نوشوں کا ہجوم مدرسوں میں بھی نہ ہوگا درس و تدریسِ علوم
منعقد ہوگی نہ پھر احباب کی بزمِ طرب قہقہے یاروں کے ہونگے اور نہ کچھ شور و شغب
شعر گو ہونگے نہ اُنکی محفلِ شعر و سخن کوئی سوسائٹی ہوگی اور نہ کوئی انجمن
پھر کمال اپنا دکھائینگے نہ اربابِ نشاط سب کے سب معدوم ہو جائینگے اسبابِ نشاط

الغرض مٹ جائیگا ہر چیز کا نام و نشاں
ہر طرف چھا جائیگا اک عالمِ ہو کا سماں

ارشد تھانوی

تصحیح۔ گذشتہ نمبر میں جو نظم بعنوان "سینس اینڈ ریلجن" شائع ہوئی ہے اُس کے چوتھے شعر میں ایک غلطی ہو گئی ہے صحیح شعر یوں ہے ؎

نظامِ عالمِ ہستی کو ہے درکار حکمت بھی
خرد، تدبیر، ارادہ، اختیار و علم و قدرت بھی

---

* ریاست بھوپال کے شمال و مشرقی گوشے کے ایک پُر فضا مقام کا نام "سانچی" ہی جسکو آثارِ قدیمہ کی تاریخی اہمیت نے بہت زیادہ مشہور کر دیا ہے۔
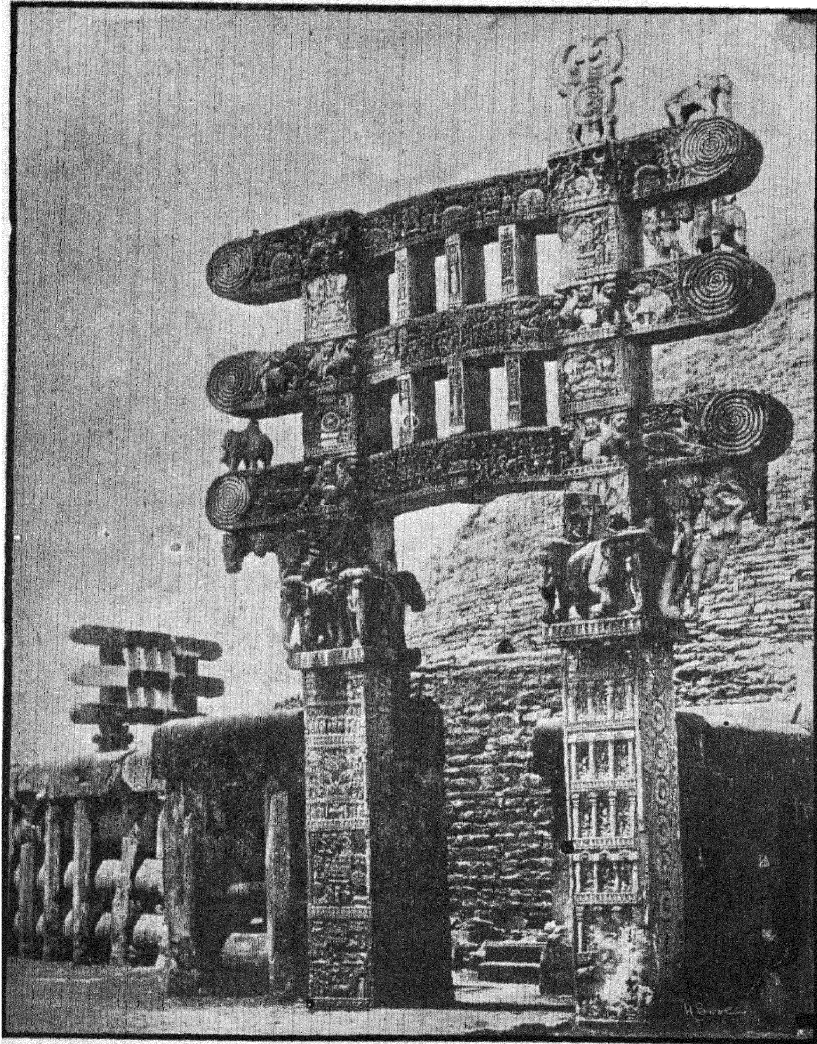
سانچی کا ایک نظارہ

انڈین پریس الہ آباد

نسیمِ برشگال

اے ہوائے روح پرور، اے نسیم برشگال — تیرے سرد و نرم جھونکے کیا طراوت ریز ہیں
نازشِ صحنِ گلستاں ہے تری خاموش چال — تیری مست اندازیاں کتنی مسرت خیز ہیں

تو ہوائے گلشنِ فردوس ہے کیا اے نسیم! — یہ ترا دامن ہے یا ہے جلوہ زارِ بوئے گل
چادرِ صبحِ عروسی، عکسِ لرزانِ شمیم، — موجِ نکہت بیز، یا رقصانِ غبارِ کوئے گل

رونقِ باراں ہے تیرا حسنِ تاخیر خرام — زینتِ گلہائے ہستی ترا انداز ہے
اے سبک رفتار! اے جادو تصویر خرام — تو پری ہے، یا کوئی نقشِ طلسمِ ناز ہے

ہلکے ہلکے تیرے جھونکے بھینی بھینی ہیں بو — اور ٹھنڈے ٹھنڈے تختے، چھوٹی چھوٹی کیاریاں
کوئی فتنہ ہے، ہوا ہے، یا فقط دھوکا ہے تو — ہیں فریبِ دستِ گلچیں تیری گل آزاریاں

آہ! لیکن ہے یہ شوخی صرف دم بھر کے لئے — گرم کر دے گی تجھے ظالم شعاعِ آفتاب
شاق ہو گی یہ جدائی جانِ مضطر کے لئے — پھر وہی افسردگی ہے تا وداعِ آفتاب

اے نسیمِ باغ، اے سرگشتۂ آب و ہوا۔ — مایۂ آوارگی، سرمایۂ رنگِ بہار
آہ! میرا اور تیرا ساتھ ہے کچھ دیر کا — تو بہارِ بازرس ہیں سایۂ رنگِ بہار

میں بھی ہوں تیری طرح مہمان میری نسیم — آمد و شدِ یک نفس، کی ہے مدارِ زندگی
ہے دلِ حسرت زدہ پامالِ صد امید و بیم — آہ! تا کے سرخوشیِ کیفِ بہارِ زندگی

میں بھی فانی، تو بھی فانی، فرق اتنا ہے مگر — گلشنِ ہستی میں ہے تجھکو امیدِ بازگشت
آہ! آسکتا نہیں میں مثلِ نکہت لوٹ کر — اور تجھے ہو گی میسر روز عیدِ بازگشت

تازگی تجھکو ملیگی صورتِ صبحِ چمن — اور مجھکو گوشۂ پُریاس و آلامِ لحد
تو قیامت تک رہیگی زینتِ صبحِ چمن — اور میں آفت کشِ تاریکیِ شامِ لحد

سیماب اکبرآبادی

موسمِ برشگال

پانی کھلا ہے اسدم برس کر — دیکھیں تو چل کر جنگل کا منظر
آتا نظر ہے قدرت کا جلوہ — چاروں طرف ہے سبزہ ہی سبزہ
کیسی ادا سے بہتے ہیں جھرنے — پانی کی موجیں نکلی ہیں پھرنے
ہٹ ہٹ کے آنا کٹ کٹ کے جانا — دے دے کے چھینٹے گل کو ہنسانا
پانی میں کیسی دولت بہا دی — قدرت نے سیروں چاندی گلا دی
گرنا چٹانوں سے کیسے اُچھل کر — گودی میں سبزہ کی جانا مچل کر
جانا تو یوں۔ کوئی سُن گن نہ پائے — سبزہ کی چادر سے مُنہ کو چھپائے

اونچے پہاڑوں سے اُٹھا وہ بادل — چوڑے فلک پر چھایا وہ بادل
جھونکے ہوا کے اُٹھنے لگے ہیں — پتّوں میں جاکر طائر چھپے ہیں
کیسی چمکتی ہیں بوندیں ڈھلک کے — موتی برستے ہیں سطحِ فلک سے
سبزہ پہ پانی کے قطرے پڑے ہیں — صحرا کے دامن میں موتی ٹکے ہیں
کیسے چٹیلے میدان دُھلے ہیں — پانی کے ہاتھوں اجلے بنے ہیں

پانی کے تھمنے سے پھیلا اُجالا — سورج نے پردہ سے مُنہ کو نکالا
اُٹھکر چلے ہیں پانی کے مارے — نالوں کو پھاندا پہنچے کنارے

کب تک نہ بھیگے خود کو سنبھالے
سر پر کھڑے ہیں بھادوں کے جھالے"

قیصر بھوپال

نوحۂ انتقال مہاراجہ نواب میر محبوب علیخاں

۱۳۲۹ھ

اُف رے غم زیرِ آستانِ نظام　　سر ٹپکتے ہیں خادمانِ نظام
رنج و غم کی گھٹائیں چھائی ہیں　　برق ہیں قلبِ شاعرانِ نظام
اب تھمیگی نہ چشمِ تر کی جھڑی　　پتلیاں بھی ہیں نوحہ خوانِ نظام
آج سونا پڑا ہے ملکِ سخن　　بند کیا ہوگئی زبانِ نظام
اب کہاں شہرۂ سخن سنجی　　اب کہاں لذّتِ بیانِ نظام
اب کہاں آبروے باغِ سخن　　گلفشاں اب کہاں زبانِ نظام
چہرۂ شاہدِ فصاحت پر تھا　　غازۂ حُسن تھا بیانِ نظام
ہر سو چھائی ہے اک اُداسی سی　　جانِ عالم تھی آہ جانِ نظام
کیسے کیسے نکلتے تھے مضموں　　موتیوں سے تھا پُر دہانِ نظام
ہم سے چور دلنے ہاے چھین لیا　　موجِ کوثر بنی زبانِ نظام
آہ دلبستی اجڑ گئی دل کی　　حسرتیں اب ہیں نوحہ خوانِ نظام
حوض و فوّارہ پر اُداسی ہے　　چشم پُر آب ہے مکانِ نظام
رنگِ رخ طائرِ پریدہ ہے　　غم سے فق روے میہمانِ نظام
کوئی پوچھے تو دستے شاعر کے　　جوہرِ خنجرِ زبانِ نظام
تھام دل کر سلام فکرِ سال　　ہے یہی کار خادمانِ نظام
لکھدے۔ سوچ اسقدر تجھے کیوں ہے　　صاف ظاہر ہے عزّ و شانِ نظام
تھا وہ محبوبِ حق خدا سے ملا　　یا جناں میں ہوا مکانِ نظام

۱۳۲۹ھ　　۱۳۲۹ھ

قطعۂ دعائیہ

بہرِ عالم ہو سایۂ عثمان　　کہ ہیں یہ شمعِ دودمانِ نظام
تا ابد حکمراں دکن میں رہیں　　ہو عیاں جلوۂ زمانِ نظام
ان کے جود و کرم کے ہاتھ سے　　سرپرستیٔ خادمانِ نظام

معین الدین سلام

نوحہ وفات نظام

کیا غضب ہے اے اجل دنیا میں کوئی ذی حیات　　تیرے دستِ ظلم سے زندہ نہ رہنے پائے ہائے
”چشم بد دور“ اپنے حق میں ترے آگے جو کہے　　دیدہ و دانستہ اُسکو ہی نظر کھا جائے ہائے
کیسے کیسے خاندانوں کو کیا تونے تباہ　　کیسے کیسے گھر بنے تونے اجاڑ ڈالے ہائے
نامیوں کے کھوج تک باقی نہ رکھے نام کو　　صفحۂ ہستی سے وہ نام و نشاں مٹوائے ہائے
بے گنہ ناداں جواں سب پر پھری تیغِ جفا　　یہ ستم یہ ظلم تیرا کس سے دیکھا جائے ہائے
تھا جو گلدستہ میں اے بادِ فنا چوٹی کا پھول　　کیا غضب ہے کیا ستم ہے وہ ہی گل مرجھائے ہائے
جس کے لکھتے تھے قصیدے شاعرانِ ذی شعور　　اُن سے نوحے مرثیے اب اُسکے تو لکھوائے ہائے
جسکے آنکھوں میں رکھیں آہ وہ ہر دلعزیز　　کارواں سے مثلِ یوسف یوں بچھڑ کر جائے ہائے
شادیانے جسکے بجتے اُسکی نوبت ہے یہ آج　　پیچھے میّت آگے ماتم اس کا ہو تا جائے ہائے
بین کے نغموں کی بجائے بین کا ہے شور و غل　　دھوم سے اسکا جنازا یوں اجل اٹھوائے ہائے
جھاڑتے تھے روز و شب جو اسکی پاپوشوں کی گرد　　اسکی میّت پر انھیں سے مٹی اب ڈلوائے ہائے
فرشِ دیبا کی بھی جسکو سلوٹیں تھیں ناگوار　　اُس تنِ نازک کو تو یوں خاک میں ملوائے ہائے
ہاتھ جو بہرِ سلام اُٹھتے تھے جسکے روبرو　　آج اُسکی فاتحہ کو ہاتھ وہ اٹھوائے ہائے
چھا گئی ہے کیا غم و اندوہ کی دلگیر گھٹا　　ہے سیہ پوش اسکے ماتم میں کعبہ ہائے ہائے
قیصری دربار میں جو شوق سے آنے کو تھا　　اے اجل اسکو ہی تو ملکِ عدم پہنچائے ہائے
حشر تک ماتم رہیگا اس غمِ جانکاہ کا　　شاہِ آصف جاہ جیسا شخص یوں مرجائے ہائے
حضرتِ شاہِ نصیر و حضرتِ داغ و امیر　　تجھ میں اے خاکِ دکن یہ سب سمائے ہائے ہائے
رہ گئے تھے ایک نکے قدرداں شاہِ دکن　　وہ بھی پہلو میں انھیں کے سوے جا کر ہائے ہائے
مر گئے شاہِ دکن کیا مٹ گئی قدرِ سخن　　مٹ گئی قدرِ سخن۔ کیا لکھ کے کوئی لائے ہائے
اب نہ ایسا قدرداں کوئی نہ ایسا باکمال　　کہنے سننے والے دونوں ہی سدھارے ہائے ہائے
ہو چکی بس نوحہ خوانی اے دلِ اندوہ گیں　　کب تک اس پردردِ قصّہ کو کوئی دہرائے ہائے
یادِ مرحوم اے دلِ مضطر ہے نشتر سے سوا　　دکھتا پھوڑا کس سے دانستہ یہ چھیڑا جائے ہائے
مانگنے دے حق تعالیٰ سے دعاے مغفرت　　تا بکے یہ واویلا تا کجا یہ ہائے ہائے

وے نظامِ حال کے اقبال و دولت کو دعا | جز دعائے خیر لب پر اب نہ ہرگز آنے ملے
دوستوں پر تو ہو نازل حق تعالیٰ کا کرم | دشمنانِ شاہ والا جاہ پر پڑ جانے ملے
جز شکیبائی کوئی چارہ نہیں یہ دل سمجھ کر | سنکے دل بولا۔ خلیق۔ اب صبر کیونکر آنے ملے
زخم بھرتے ہی ہی بھر لگا تازہ گھاؤ ہو | ایک چٹکی بھر نمک کو کس لئے ترسانے ملے
یعنی کہدے مصرعہ تاریخ بھی باقی جو ہو | بس زباں اتنی ہلا دینے سے کیوں ترسانے ملے

دل سے سنکر مصرعۂ غم یہ کہا میں نے خلیق
زندہ دل شاہِ دکن محبوب علیخاں جانے ملے
۲۹ ہجری قدسی ۱۳

خلیق دہلوی

یادِ محبوب

رُباعیات

رخصت اسوقت ہر اک کے اوسان کی تھی | سُدھ بُدھ نہ کسیکو بھی مگر جان کی تھی
محبوب علی خاں جو گئے جنّت میں | منگل کا روز چوتھی رمضان کی تھی

محبوب علی خاں شہ فردوس مقام | جسکے باعث ہوا ترقی کو قیام
کل تک تو فلک نما پہ تھا جلوہ فگن | مکہ مسجد ہے آج جائے آرام

جو بات ہوئی اسکی بہت خوب ہوئی | ہر آن طبیعتوں کو مرغوب ہوئی
بے چین نگاہوں کی تسلّی کے لئے | محبوب کی قبر بھی تو محبوب ہوئی

اتنا طالب ہوا کہ مطلوب بنا | عالم کے لئے یوسفِ یعقوب بنا
اس سے بڑھکر قبولیت کیا ہوگی[1] | اللہ کے محبوبؒ کا محبوب بنا

اللہ کے آگے سر کو خم کرتا تھا | دشواریوں کی راہ عدم کرتا تھا
کافی ہے سمجھنے کے لئے۔ وہ آصف | ساری دنیا پہ جو کرم کرتا تھا

محبوب نہو پاس تو چاہیں کس کو | سامع ہی نہیں سنائیں آہیں کس کو
اوجھل جب ہو گیا ہمیشہ کے لئے | پھر ڈھونڈھتی پھرتی ہیں نگاہیں کس کو

صبر دہلوی

قطعاتِ تاریخ وفات حسرت آیات

اعلیٰ حضرت حضور نظام الملک نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ جنّت آرام گاہ

از سید حسن رضا صاحب ماہر کنتوری

زرشکِ حاتم، فخرِ شاہانِ جہاں، ہمدردِ خلق | جس کے در سے لوگ پھرتے تھے ہمیشہ بامراد
آگیا تھا وقت، فالج کا بہانہ ہو گیا | صبر اُن کے غم میں دے تو سب کو اے رب العباد
نورِ رُخ سے قبر بھی دم بھر میں روشن ہو گئی | غم میں سارا ملک ہے اور روحِ حضرت شاد
سالِ رحلت ہاتفِ غیبی نے یہ ماہر کہا | قربِ احمد اور محبوبِ علی پاک اعتقاد
۲۹ ۱۳

از حکیم غلام قادر صاحب اخگر انصاری

چوں نظام الملک خامس والیِ ملکِ دکن | میر محبوب علی خاں آصفِ غفراں مآب
شد ز دنیا در سہ شنبہ رابعِ ماہِ صیام | ملک را از سوزِ مرگش سینہ و دل شد کباب
گفت تاریخِ وفاتِ حسرت آیاتش اخگر | وائے شد ز آفاق آصف جاہ و دین شد خراب
۲۹ ۱۳ھ

دیگر

چوں از جہاں رحیل نظامِ دکن نمود | صد بابِ رنج بر دلِ اسلامیاں کشود
تاریخِ پر ملال وفاتش اخگر نوشت | سہ شنبہ چہارم شہرِ صیام بود
۲۹ ۱۳ھ

---

[1] مولانا مولوی محمد عمر صاحب قادری مشہور واعظ نے اپنے خواب کو اسطرح بیان فرمایا کہ میں حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضر ہوں اور اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفراں منزل بھی حاضر ہیں۔ حضرت موصوف نے اعلیٰ حضرت مرحوم کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ میں اللہ کا محبوب ہوں اور تو میرا محبوب ہے۔ واقعی غفراں منزل کا عقیدہ اسی قابل تھا ایسا معاملہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

از منشی ضمیر الدین صاحب اشکؔ بلند شہری

ہوے جب میر محبوبِ علی خاں شہِ ملکِ دکن جنت کے جویا
ہوا یہ فرطِ غم سے اشکؔ کا حال کہ اک دریائے خوں آنکھوں نے رویا
سروشِ فکر یہ بولا کہ ہے سے نظام الملک آصف جاہ گویا
۱۳۲۹ھ

دیگر

وفاتِ حضرتِ شاہِ دکن نے کیا یک لخت اک عالم کو حیراں
ہوئی اے اشکؔ مجھکو فکرِ تاریخ کہ ناممکن ہے ایسے غم کا درماں
ندا آئی کہ پہنچے خلد میں وہ نظام الملک محبوبِ علی خاں
۱۹۱۱

از منشی فضل ستار صاحب لااُبالیؔ امروہوی

وہ شہِ در باغِ جناں رفت از یں دارِ فنا والیِ ملکِ دکن خسروِ ذی شاں آصف
بدکن بود ز افزونیِ جاہ و اقبال رشکِ جمجاہی جمشید و سلیماں آصف
قدر دانِ ہمہ اربابِ فن و اہلِ کمال نکتہ سنج و سخن آرا و زباندان آصف
بشکلِ یوسف بجہاں بود عزیزِ دلہا بکرم بود اگر حاتمِ دوراں آصف
زینتِ گور کنونست کہ دیشب بُدِ دم زیبِ اورنگِ شہی بود بہ ایواں آصف
لااُبالی سنِ رحلت بطرازم ہجری ہاے ایوا شہِ محبوب علی خاں آصف
۱۳۲۹ھ

از پنڈت سکھدیو پرشاد صاحب مہرؔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس بھرت پور

قضا حیف کی شاہِ ملکِ دکن نے ہے ماتم کدہ بر محن حیدرآباد
کدھر رم گیا بلبلِ باغِ معنی کہ تھا جس کے دم سے چمن حیدرآباد
یہ ذرہ نوازی اسی مہر کی تھی کہ تھا مخزنِ اہلِ فن حیدرآباد
سرِ آہ سے مہرؔ لکھ سالِ رحلت غمِ مرگِ شاہِ دکن حیدرآباد
۱۹۱۱ء

از منشی نادر علی خاں نادرؔ کاکوروی لکھنوی

شدہ عہدِ محبوب علی خاں چو ختم بشد دورِ عثمان علیخاں شروع
سرِ مطلعِ آسمانِ دکن رقم کرد نادرؔ غروب و طلوع
۱۳۲۹ھ

قطعاتِ تاریخ جُلوس

اعلیٰحضرت قدر قدرت مظفر الممالک نظام الدولہ نظام الملک آصفجاہ نواب میر عثمان علیخاں
فتح جنگ بہادر نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ

از مولوی سید عبد الغفور صاحب ضرغامؔ جعفری

مہرِ مضموں سے نمودار ہے ماہِ تاریخ دیکھ لیں سب یہ شعراے مشاہیرِ زمن
خوب ممدوحِ جمیل اور مبارک ہے ماہ اور واصف بھی ہے مشہور یہ ضرغامِ دکن
قدرِ تاریخ کا اس وجہ سے ہوتا ہے خیال شاہی تاریخ میں زیبا ہے شہنشاہی سن
جلوہ افروز حضوری ہے مہِ مہرِ کمال میر عثمان علی خاں کا جلوسِ احسن

از سید حسن رضا صاحب ماہرؔ کنتوری

ہوے زیبِ مسند جو عثمان علی زمیں سے فلک تک تھی اک واہ واہ
رئیس اس طرح سب تھے گھیرے ہوے ستاروں میں ہوتا ہی جس طرح ماہ
کہا ہاتفِ غیب نے سال یہ نظامِ دہم عاقلِ عہدِ شاہ
۱۳۲۹ف

از منشی فضل ستار صاحب لااُبالیؔ امروہوی

اگرچہ صرفِ سمائم شدہ پامالِ خزاں بہار باز رسیدہ بہ گلستانِ دکن
گلے ربود ازیں باغ چو گلچینِ قضا قدر بکردِ عیاں نو گلِ خندانِ دکن
بُدند دوش ز دستِ تو اجل و قفِ بکا چہ محو نغمہ کنوں زمزمہ سنجانِ دکن
بُدوش بود گو تاریک زد و وہمِ دل کنوں ز شمعِ طرب روز شبستانِ دکن
کسوفِ مہرے اگرچہ بمہِ مہر شدہ فروغِ مہرے بشد در مہ تابانِ دکن
درخشِ جشنِ مجلّیٰ غمامِ غمِ جاں منور است چہ بام و درِ ایوانِ دکن
فزوں بگشت ز محبوب چہ نعمائے جلال فزوں ز عثمان علیخاں شرف و شانِ دکن
فسردہ شامِ الم صبحِ طرب شاد بداں منم قدیم غلامِ درِ خاقانِ دکن
بہ لااُبالی گفتا چہ سنِ جشنِ مسیح "جلوسِ شاہیِ عثمان علیخانِ دکن"

تازہ غزلیں

شمس العلماء مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی

جانِ من بوسہ شمردن نہ ز آئیں باشد
زاں کہ رسم ست کہ ایں کار بتخمیں باشد

ورقِ بختِ من، امروز شگفتہا دارد
ایں ہماں است کہ در جبہۂ تو چیں باشد

تاکدامیں چمنِ حسن گذشت از نظرم
کہ ہنوزم ورقِ دیدہ، نگاریں باشد

وعدۂ قتل بمن کرد، وز کم حوصلگی
باورم نیست کہ ایں ہم پئے تسکیں باشد

خود تو دانی کہ مرا روئے سخن با کہ بود؟
گر حدیث از گل و از لالہ و نسریں باشد

ما ہما بر توفّقِ شرعِ مسلّم داریم
کارِ عشق ار بگذاری کہ بہ آئیں باشد

بزم ہر چند کہ برہم شد و چیدند بساط
ہم چناں مستیم از بادۂ دوشیں باشد

نکتۂ شرع کہ از دل بہ زباں می ناید
وائے اگر دستخوشِ زاہدِ بد بیں باشد

شیخِ ما، توبہ ز مے کردہ تحسیں طلب است
ویں نہ کارے است کہ شائستہ تحسیں باشد

می گذشتی و بہ انگشت نشاں می دادند
"آں کہ دین و دلِ شبلی بربود" ایں باشد

ڈاکٹر ٹی۔ ریمل صاحب لطیف

نگاہِ چشمِ شوقم لمعۂ نورِ جمالِ تو
سویدائے دلم آئینۂ عکسِ جمالِ تو

ز دیدارت عیاں گردید حسنِ بیمثالِ تو
ز گفتارت شدہ معلوم اسرارِ کمالِ تو

سرِ شوریدہ غافل نیست از ذوقِ خیالِ تو
نگاہِ چشمِ حیراں دائماً محوِ جمالِ تو

الٰہی وسعتِ ارض و سما ہم تنگ شد لیکن
بچشم و دل عیاں شد جلوۂ نورِ جلالِ تو

بوقتِ امتحانم درجۂ عشقم فزوں گشتہ
چہ از عجز و نیازِ من چہ از حسن و جمالِ تو

دلم آزار می داند سرم بے ہوش می ماند
چہ از دردِ فراقِ تو چہ از لطفِ وصالِ تو

نہاں داری چرا از چشمِ عاشق روئے انور را
من از روزِ ازل دانستہ ام حسن و جمالِ تو

نہ رنجوریم از بیتابیِ دردِ فراقِ تو
خوشا بگذشت عمرِ ما بہ امیدِ وصالِ تو

لطیفِ ناتواں آہ و بکا سعئے نمی دارد
کہ یارب بے نیازت آگہی دارد ز حالِ تو

سیّد ریاض احمد صاحب ریاضؔ

وہ تیرے سایۂ دیوار سے اب دور رہتا ہے
ارے دیوانہ تیرا زیرِ نخلِ طور رہتا ہے

برابر جلوۂ پیہم سے ہر سو نور رہتا ہے
ہمارے دم سے روشن اب چراغِ طور رہتا ہے

نہیں ملتا کوئی مجھکو شریکِ بزمِ تنہائی
یہ آفت ہے مرا سایہ بھی مجھسے دور رہتا ہے

نیا فتنہ ضرور اُٹھتا ہے جب کوئی وہاں جائے
ہمیشہ انکی محفل کا یہی دستور رہتا ہے

مرا دل نازپروردہ تھا کیسا۔ کیا ہوا اُسکو
بہت غمگیں بہت محزوں بہت رنجور رہتا ہے

یہ آئینہ سکھاتا ہے اُسے کیا آگے خود بینی
وہ کافر یوں نہیں اپنے حسن پر مغرور رہتا ہے

نہ اُس کافر کے گیسو میں نہ مجھ بیکس کے پہلو میں
خدا جانے کہاں میرا دلِ مہجور رہتا ہے

سنی ہے بیستوں پر بارہا آواز تیشے کی
یہاں کوئی نہ کوئی کام پر مزدور رہتا ہے

زمانے میں بہت اللہ کے بندے ہیں ایسے بھی
کہ جن کے پاؤں پر تاجِ سرِ فغفور رہتا ہے

ادب سے وعظ کی صحبت میں ہم وہ شے نہیں پیتے
ہمارے جام میں افشردۂ انگور رہتا ہے

ریاضؔ احباب اگر رکھیں اکثر یاد کرتے ہیں
زباں پر میری اکثر ذکرِ گور رکھیو رہتا ہے

دیگر

لباسِ نور میں فانوسِ شمعِ طور رہتا ہے
تہِ دامان برقِ انکا رخِ پُر نور رہتا ہے

لحد پر شمع سے بڑھکر ہے دودِ شمع کا جوبن
وہ بنکر حور تو یہ بن کے زلفِ حور رہتا ہے

اثر بجلی کا ہے صیّاد کیا تیری نگاہوں میں
کہ ہر مرغِ چمن پرواز سے مجبور رہتا ہے

خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے صدقے
وہ کافر بے پئے بھی رات دن مخمور رہتا ہے

کشیدہ بھی ہو ناوک تو بھی رہتی ہے جگہ دل میں
کہ زخم اچھا بھی ہو جاتا ہے تو ناسور رہتا ہے

شبِ فرقت نے دھڑکا کھو دیا ہے روزِ محشر کا
سپیدہ صبح کا گھر سے مرے کافور رہتا ہے

حسینوں کے حنا آلودہ ہاتھ ایسے کہیں اچھے
کہ موقع پاکے بھی دستِ ادب معذور رہتا ہے

سپاسِ لطف بن جاتا ہے شکوہ بے نیازی کا
کہ میرے دل میں رہتا ہے جو مجھسے دور رہتا ہے

ترے صدقے ترے ہاتھوں سے اتنی پی ہے اے ساقی
کہ اب تو بے پئے منہ پر ہمارے نور رہتا ہے

ہزاروں مستِ مے دیکھے حسیں دیکھے جواں دیکھے
کوئی انکی طرح نشہ میں اتنا چور رہتا ہے

قیامت تک پھلے پھولے قلم ساقی کے ہاتھوں کی
ہماری قبر پر اب سایۂ انگور رہتا ہے

فرشتے پر سے مس کرتے ہیں شاید اے ریاضؔ اسکو
کہ ابرِ ریشِ مبارک پر بہت ہی نور رہتا ہے۔۔

ایڈیٹوریل

حضور نظام

اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر، نظام دکن، ۲۹ رجمادی الثانی ۱۳۰۳ھ سہ شنبہ کو رات کے ۷ بجے حیدر آباد کے مشہور شاہی محل حویلی قدیم میں پیدا ہوئے سنہ ہجری کے حساب سے اس وقت آپ کا سن چھبیس ۲۶ برس کا ہے۔ آپ انیس ۱۹ بھائی بہن تھے۔ جنمیں صرف تین بھائی اور تین بہنیں اسوقت موجود ہیں۔ آپ ان سب میں بڑے ہیں حضور نظام خلد آشیاں کو آپ کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا ' چنانچہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر آپ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ اُردو، فارسی۔ عربی ، اور انگریزی کی تعلیم کے لئے نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی، مولوی انوار اللہ خاں، سلطان العلما سناد الملک مولوی سید علی۔ مسٹر ایجرٹن، مسٹر اشٹین اور مسٹر برنٹ وغیرہ علما، و فضلا ر مقرر تھے۔ اور نظام مرحوم خود بہ نفس نفیس آپ کی تعلیم کی نگرانی فرماتے تھے۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ ابتک برابر جاری تھا۔ آپ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین نمونہ ہیں مسائل ملکی میں ہوشیار، اصول حکمرانی میں آزمودہ کار مہماتِ ریاست سے واقف، اور رموزِ سلطنت سے آگاہ بنانے کی غرض سے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ جمیع دفاتر کے کاغذات متعلقہ عہدہ داروں کے ذریعے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔ فوجی تعلیم بھی آپ کو نہایت اعلیٰ درجہ کی دلائی گئی ہے حضور نظام مرحوم کو آپ کی تربیت کا اسدرجہ خیال تھا کہ ۱۳۱۸ھ کی یکم صفر کو پندرہ سال کی عمر میں آپ کو محلات شاہی سے بالکل علیحدہ کر کے محلسرا سے بہت دور، نظام کالج کے پاس، کنگ کوٹھی میں منتقل فرما دیا تھا جہاں آپ اسوقت تک قیام فرما ہیں۔ اپنے والد محترم کے ساتھ کلکتہ اور دہلی وغیرہ کی سیاحت بھی کی ہے اور قلمرو آصفیہ کے اکثر حصّوں کو بھی آپ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف و ممتاز ہونے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ آپ کی بیدار مغزی' اصول کی پابندی اور دانشمندی کی دھوم ہے۔ اور آپکی لیاقت و قابلیت بہت امید افزا ہے۔ نظام مرحوم میں رحم و عفو و فیاضی کا مادہ بتدریج بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن جدید نظام میں کل اوصاف حسنہ کا پہلو برابر پایا جاتا ہے۔

۱۹ صفر المظفر ۱۳۲۴ھ کو خاندان شاہی کے معزز رکن نواب جہانگیر جنگ بہادر کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا جن کے بطن سے اسوقت آپ کے دو شہزادہ نواب میر حمایت علی خان اور نواب میر شجاعت علی خاں' پانچ اور چار برس کے ہیں۔

۱۴ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ سہ شنبہ کو اپنے نامور باپ کی وفات حسرت آیات کے باعث آپ نے زمام حکومت ہاتھ میں لی اور اسوقت آپ اتنی آبائی اور موروثی سلطنت کے حکمراں ہیں آپ کی مسند نشینی کی تہنیت میں بے شمار تاریخیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں جنمیں مولوی محمد اختر صاحب کا قرآن شریف کی ایک آیتہ سے نکالا ہوا مادۂ تاریخ

انا مکنا لہ فی الارض

اور حضرت جلیل کا مصرعۂ تاریخ

میر عثمان علی خاں ہوئے سلطانِ دکن

اور مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ کی تاریخ

مبارک ہو سرکار مسند نشینی

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اب سب کی آنکھیں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے اس جواں سال اور جدید فرمانروا کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اسبات کا تو یقین ہے کہ وہ تمام توقعات جو آپ کی ذات ستودہ صفات سے وابستہ ہیں، ضرور پوری ہو کر رہیں گی خصوصاً آپکے وہ الفاظ جن میں آپ نے مسند شاہی پر قدم رکھتے ہوئے صاحب رزیڈنٹ اور نیز حضور والیسرائے کی مبارک باد کا شکریہ ادا فرمایا ہے۔ اس یقین میں اور بھی جان ڈالتے ہیں :۔

"آپ نے بڑی مہربانی کی جو مع اپنے اسٹاف کے مجھکو میری مسند نشینی کی مبارک باد دینے کی غرض سے آئے جس منصب پر میں متمکن ہوا ہوں وہ بڑی ذمہ داری کا منصب ہے، اور مجھے معلوم ہے جیسا کہ میں نے کل کہا ہے۔ کہ جب تک میں اپنے جلیل القدر محترم الملک نقشِ قدم پر چلنے کی پوری پوری کوشش نہ کرونگا۔ اسوقت تک اس کے

فرائض پورے طور پر ہرگز انجام نہ دے سکوں گا اور نہ اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ
ہوسکونگا۔ لہذا میرے والد بزرگوار کی مثال معاملات ملکی کی انجام دہی میں
رہبری کرنے کے لئے، مینار روشنی کی طرح میری نظر کے سامنے رہے گی۔ آپ نے
والیسرائے ہند کی طرف سے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ میرے ہر دلعزیز والد
نے میرے خاندان کے متعلق ہز امپیریل مجسٹی کی گورنمنٹ کے "مخلص حلیف"
ہونے کی دیرینہ روایات کو کس خوبی کے ساتھ برقرار رکھا۔ میں آپ کو اور آپ کی
وساطت سے جناب وائسرائے کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ میری کوشش
بھی ہمیشہ ان روایات کو مستحکم کرنے کی جانب مبذول رہے گی جسکے یہ معنی ہیں کہ ایک
طرف تو میں اپنے ملک اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہوں گا اور
دوسری طرف مملکت ہند کی عام فلاح و بہبود کی ترقی میں ساعی رہوں گا جسکا
میری ریاست ایک جزو لاینفک ہے ۔ ...."

ہمیں پورا یقین ہے کہ جدید نوجوان نظام سلطنت حیدرآباد کے دیرینہ بیش قدر
روایات کو ضرور قائم رکھیں گے مثلاً اس پر آشوب زمانہ میں حیدرآباد ہی وہ
ملک ہے جہاں ہندو اور مسلمان مثل بھائی کے رہتے ہیں۔ اور نظام مرحوم
دونوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتے تھے۔ محکمہ امورات مذہبی کی رپورٹ سے
معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے منادر کو مسلمانوں کی مساجد سے تقریباً پچیس ہزار
روپیہ زیادہ ملتا ہے۔ اسیطرح حیدرآباد ہی وہ ملک ہے جہاں ہمیشہ سے
ایسے لائق باکمال اور باہنر لوگوں کی قدر افزائی ہوتی رہی۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ
درجہ کے عہدوں پر لائق دیسی مامور ہوتے آئے ہیں۔

* * * * *

نظام مرحوم رعایا کی خوشحالی و فارغ البالی کی شب و روز نگرانی رکھتے تھے چنانچہ
آپ نے ٹیکس کی زیادتی کو ہمیشہ روکا حیدرآباد میں ٹیکس کا معیار بمقابلہ
ہندوستان کی تمام دوسری دیسی ریاستوں کے، بہت ہلکا ہے۔ اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ
وہاں کی رعایا بہت آسودہ ہے۔

تمام وابستگان و بہی خواہان دولت آصفیہ کی یہ دلی تمنا ہے کہ آپ اپنے
نامور، اولوالعزم، اور محترم باپ کے قابل فخر جانشین ثابت ہوں۔ اور آپکا
عہد دکن اور کل ہندوستان کے حق میں امید اور توقع سے بڑھکر روشن اور
بابرکت ہو، اور یہ "عثمانیہ دور" امور خیر، علم و فضل کی اشاعت و معاونت
میں "محبوبیہ دور" سے بڑھ چڑھ کر رہے۔ آمین۔

(اس نمبر میں ہم آپ کی ولیعہدی کے زمانہ کی تصویر ہدیہ ناظرین کرتے
ہیں۔ کسی آئندہ اشاعت میں تازہ تصویر پیش کریں گے ۔)

رباعیات عمر خیام کا ایک بیش بہا ایڈیشن

اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ پانچویں صدی ہجری میں یاران قدح نوش کی
بزم کا نقشہ کچھ ایسا جم گیا تھا کہ مولانا روم، سعدی، حافظ کے کلام میں اسکی
چاشنی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ شعراء نے بھی بادۂ شیراز اور میخانۂ حجاز کی
ترنم نوازیاں اس خوش اسلوبی سے کیں کہ خداشناس اور خدارس بھی بھول
گئے۔ زمانہ کا مذاق دیکھ کر اہل الرائے کو بھی اسی شراب و کباب کی محفل
کے ملازمات کا استعمال کرنا آیت اور حدیث سے بھی جائز ثابت ہوتا تھا
حافظ کے بعد جس شخص نے بے ثباتی عالم کی سادہ شوخ، اور دلکش تصویر جام و
شراب کے پیرایہ میں دکھائی ہے وہ عمر خیام ہے۔ اسکی رباعیاں عرفانی
خیالات اور راز آفرینش کا لب لباب ہیں جسطرح ان سے ایک دیندار مسلمان
فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسیطرح ایک دھرمی ہندو اور سچا مسیحی بھی فائدہ اٹھا سکتا
ہے کوئی رباعی ایسی نہیں جو معرفت اور گیان کا مخزن نہو۔ عمر خیام تھا تو ایک
ایرانی، اور اس کی قدر بھی اسی کے ملک کی ایک خاص جماعت میں ہوئی۔ مگر جب
سے فٹز جیرلڈ نے اسکی چند رباعیات انگریزی میں ترجمہ کرکے پبلک کے سامنے
پیش کی ہیں، اسوقت سے زمانہ جو پہلے ایک جان سے اسکا طلبگار تھا۔ اب
ہزار جان سے عاشق زار ہے فٹز جیرلڈ کے علاوہ اور بھی چند بزرگوں نے عمر خیام
کی کچھ رباعیاں انگریزی میں ترجمہ کی ہیں۔ مگر جو قبولیت فٹز جیرلڈ کے ترجمہ کو
حاصل ہوئی۔ وہ کسی اور ترجمہ کو نہیں ہوئی۔ ایک ایڈیشن کے بعد دوسرا

ایڈیشن نئے رنگ میں نکلا اور ہاتھوں ہاتھ اُٹھ گیا۔یہی نہیں بلکہ عمر خیام کے کلام اور خیال کے شیدائیوں نے جداگانہ کلب اور ہال تجویز کئے، جہاں گئے سال اس کی رباعیات پر لیکچر ہوتے ہیں۔

کتابوں میں نفسِ مضمون کے مطابق تصاویر شامل کرنا خاص اہلِ ہند کا ایجاد ہے۔چنانچہ سب سے پہلے ایک بزرگ نے ویدک طب کے متعلق ایک رسالہ میں چند تصاویر بھی کھینچیں۔راجہ بکرماجیت کے بزرگوں میں سے کسی نے رامائن اور مہابھارت کے متعلق تصویریں بنوائیں۔اگرچہ اُس زمانہ میں تصویر بنانے یا بنوانے والے نے کسی خاص جدّت سے کام نہیں لیا۔مگر اب انھیں تصویروں سے اُس وقت کے طرزِ معاشرت پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ہندوستان قدیم سے اپنی مصوّری اور نقاشی کے لئے مشہور تھا۔ماہرانِ آثار الصنادید کے خیال میں جسقدر پرانے زمانے کی سنگتراشی کے نمونے یا موقلم کی مدد سے بنائی ہوئی سورتیں ہندوستان میں مل سکتی ہیں، کہیں اور نہیں مل سکتیں چنانچہ وہ پنچ تنتر جو ہندوستان سے ایران پہنچکر کلیلہ دمنہ کے لباس میں ظاہر ہوئی تھی باتصویر تھی۔محمود غزنوی نے سومنات کے مندر سے رامائن کا ایک نسخہ حاصل کیا تھا جسکا کوئی صفحہ تصویر سے خالی نہ تھا۔کہتے ہیں کہ امیر تیمور کے کتب خانہ میں شاہنامہ کی بھی ایک جلد باتصویر تھی، اور کسی زندہ دل نے امیر علی شیر کے حکم سے نظامی کے سکندر نامہ کے چند ایک سین فنِ تصویر کے ذریعہ اس خوش اسلوبی سے دکھائے تھے کہ دیکھنے والے ایک نظر میں داستان کا سارا مضمون سمجھ لیتے تھے۔بیتال پچیسی کی تصویریں باوا کرت جی نے سب سے پہلے بنا کے اور ہی خیالات پیدا کر دئے تھے۔بنگال کے ایک عالی خیال مصوّر نے کالیداس کے میگھدوت شکنتلا، اور دیگر ناٹکوں کے مختلف سین ایسے وقت میں تصویر کے ذریعہ دکھائے تھے جبکہ کسی کو اس امر کا شان و گمان بھی نہ تھا، کہ اس سے کتاب کی زینت دوبالا ہوتی ہے۔اہلِ یورپ نے اس سے ایک گونہ اور بھی جدّت کا کام لیا ہے، یعنی کتاب مقدّس کے مختلف سین مختلف پہلوؤں سے دکھائے ہیں۔ اُنکے خیال میں اس سے بچے بغیر اُستاد کی مدد کے بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔چنانچہ اسی بات کو مدِّ نظر رکھکر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ولایت سے آتے ہی یہ بھی ایک خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کے لئے قرآن شریف کے بعض قصص کے متعلق رنگین۔سادہ۔روغنی تصویریں بنا کے بے انتہا تعداد میں اگر تقسیم کی جائیں تو نہایت ہی مفید ہوگا۔مطبع نولکشور کا خاص ایڈیشن "گلستاں باتصویر" بھی نہایت پر لطف اور دیکھنے کی چیز ہے۔

جسطرح یورپ کے بامذاق آجکل مصوّری کے فنِ لطیف میں نام پیدا کر رہے ہیں۔اسیطرح کسی زمانہ میں ہندوستان کے مصوّر مشہور تھے۔اس وقت بھی ہمارے ہاں کی پُرانی تصویروں کی اس قدر عزت ہے کہ ایک تصویر پانچ سے پانچ ہزار تک بکتی ہے۔کسی مصور کی وہ تصویر جو راجہ جے چند والئی قنوج کی بیٹی کے سوئمبر کی تھی، اور جسمیں فتح چند کی فتح دکھائی گئی ہے۔دس ہزار کو اٹھی تھی۔الغرض ہندوستان فنِ تصویر میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔لیکن کچھ برس پیشتر وہ بات جاتی رہی تھی، جو پہلے حاصل تھی۔مگر راجہ راوی ورما نے از سرِ نو اسمیں جان ڈالی اور کافی نام پیدا کیا۔اِدھر بنگال کے چند ایک بزرگوں نے بھی اپنی قلمکاری کے خوب خوب جوہر دکھائے مثلاً بابو نندلال بوس نے "ساوتری اور فرشتۂ موت" کی تصویر مشرقی خیالات کے مطابق پیش کی کہ لندن والوں نے اسکی خاص قدر کی۔بابو سمریندر ناتھ ٹیگور کی "ستی" والی تصویر نے امیّد سے بڑھکر عزت حاصل کی۔بابو ابنیدرو ناتھ ٹیگور کی "چراغاں" والی تصویر ایک قیامت کا نمونہ ہے۔غرض ان دنوں پھر ہندوستانی فنِ تصویر نے اس قدر ترقی حاصل کر لی ہے کہ یورپ کے نقادانِ فن کو داد دیتے ہی بن پڑتی ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ تصویروں سے کتاب کی خوبصورتی و خوبی دوبالا ہو جاتی ہے چنانچہ اس خیال کو مدِّ نظر رکھکر لندن کے رسالہ **The Studio** کے کارپردازان نے جب رباعیات عمر خیام انگریزی کا ایک ایڈیشن نکالنے کا خیال ظاہر کیا تو بے شمار ترجموں کے مقابلہ میں فٹز جیرلڈ کے ترجمہ کو ترجیح دی گئی، اور پھر انتخاب پر انتخاب یہ کہ مصنّف کی ۵۰ رباعیاں ایسی لیں، جو قریباً مذاق عام کی دلچسپی کا سامان ہیں۔چھپائی میں بھی

خاص جدت سے کام لیا گیا ہے، یعنی

ہر ایک رباعی پر سلسلہ وار نمبر شمار ہے۔

رباعی کے چاروں مصرعے چار چار سطور میں ہیں۔

کاغذ اعلیٰ قسم کا بہت دبیز۔ اور چھپائی نہایت صاف۔

اور ان سب سے بڑھکر مشرقی تہذیب، وضعداری، اور اصلیت کو ایک نئے رنگ میں ظاہر کرنے کے لئے کلکتہ کے مشہور و معروف مصوّر، بابو ابنیندرو ناتھ ٹیگور کے ہاتھ کی ایک درجن دلکش تصویریں دی گئی ہیں جو علیحدہ علیحدہ بارہ کارڈوں پر چھاپی ہیں۔ ان کو دیکھکر بے اختیار باچھیں کھل جاتی ہیں۔ ہر ایک تصویر اپنے کارڈ کے کاغذی چوکھٹے میں نگینہ کے مانند جڑی ہے لیکن مزید احتیاط کی غرض سے اس پر ایک باریک کاغذ لگا یا گیا ہے جسپر سُرخ رنگ میں وہ رباعی بھی چھاپ دی گئی ہے، جسکا مضمون اس تصویر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ مجموعۂ رباعیات اور ایک درجن دستی قلمکاری کا نمونہ تصویریں، مشرقی طرز کی مقوّہ کی جلد میں ہے۔

ہر ایک چیز نورٌ علیٰ نور اور اعلیٰ کاریگری کا نمونہ ہے۔

بابو ابنیندر و ناتھ ٹیگور کا درجہ بحیثیت فن تصویر کے ماہر ہونے کے کیا ہے، یہ امر ہمارے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ اس نمبر میں ہم آپکی ایک مشہور تصویر " دمینتی اور ہنس " ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس سے آپ کی مصوّری کا رنگ اور جدت طرازی واضح ہوسکتی ہے۔ حاجتِ مشاطہ نیست روے دلارام را۔

رباعیات عمر خیام کے اس نادر انگریزی ایڈیشن کی قیمت صرف ۵؎ ہے۔ جو محنت اور لاگت کو دیکھتے ہوئے کچھ چیز نہیں۔ جو صاحبان منگانا چاہیں پتہ ذیل پر درخواست بھیجیں:۔

The Studio Office,

44, Leicester Square,

LONDON, W. C.

برقابی یا واٹر وائرلیس ٹیلیگرافی

یورپ کی تاریخ سولزیشن پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے ایجادات و اختراعات نے کس قدر ترقی کی، اور ایجاد کنندوں کے حوصلہ افزائی، ہمت اور استقلال کو بام ترقی تک پہنچانے کے لئے فرمانروایانِ وقت نے کہاں تک ہاتھ بٹایا۔ مسٹر لوئس رڈ ائرکٹر محکمہ تعلیم ممالک مغربی و شمالی) کی کتاب "ہیروز آف دی سائنس" کے مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سے موجدوں نے محض سرکاری اعانت کے باعث کیا سے کیا کرکے دکھا دیا۔ انہیں ایجادات کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے پہلے کھمبوں یا ستونوں کی مدد سے سلسلۂ تار کو قائم کیا۔ وہ کس درجہ کامیاب ہوا کہ اگلے زمانہ والے باوجود اچھّے فہم و فراست کے اسکو انجام دینے میں کامیاب نہ ہوے تھے اس ایجاد کی روز افزوں ترقی دیکھ کے سوئیڈن کے مسٹر جے۔ پی۔ آرم سٹرانگ اور مسٹر اے۔ آرلنگ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور جب ان کی متحدہ کوشش نے کامیابی کا سہرا پہنا تو اس ایجاد کا نام دونوں کے نام پر " آرمورل " رکھا گیا۔ مگر بعد کی دور اندیش نگاہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ " آرمورل سسٹم دورانِ جنگ میں ازحد مفید سہی، مگر دور کے فاصلہ میں اس سے کام نہیں چل سکتا "۔ اس خیال کو صوبجات متحدہ کے محکمۂ تار کے سپرنٹنڈنٹ بہادر، پروفیسر مورس، نے عملی صورت میں لانے کے لئے جس طریق کو استعمال کیا ہے وہ مخفی نہیں چنانچہ جہاں، بحر۔ بحیرہ۔ ندی نالہ دریا آتے تھے وہاں تک تو کسی قسم کی تکلیف نہ تھی اور جہاں کچھ بھی نہ تھا وہاں کنوؤں سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ اگر سرکاری اعانت ساتھ نہ ہوتی تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ مسٹر مورس کے بعد پروفیسر ملاسن نے خیال ظاہر کیا کہ " اگر کافی سرمایہ ہو تو لندن اور کیمپ کالونی کو تار کے سلسلہ سے ملحق کرسکتے ہیں "۔ چنانچہ حکام نے اسکی سرپرستی کی اور وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد دو اور اشخاص نے اپنی دماغی محنتوں کا نتیجہ عملی صورت میں دکھلانے کا اعلان کیا یعنی پروفیسر ٹروبرج نے چلتے جہاز اور اسٹیمر میں " اور مسٹر ایڈیسن اور گل لی لینڈ نے چلتی ریل گاڑی میں " تار دینے کا اعلان کیا۔ ابھی ان دونوں کے خیالات عمل میں نہ آئے تھے کہ سر ولیم پریس نے اپنے نائب کیساتھ ایک نیا طریقہ ایجاد کرکے دنیا کو اور بھی

متحیر کردیا، اور اپنے طریق نو ایجاد کی مثال دکھانے کے لئے پہلے ۱۰۰ لفظ کا عام تار دیا اور بعد ازاں ایک اخبار کے کارسپانڈنٹ کی حیثیت سے ۱۰۰ لفظ کی ایک خبر بھیجی لوگ کہنے لگ گئے کہ سر ولیم کی ایجاد بے نظیر ہے۔ کون جانتا تھا کہ ۱۸۹۶ء میں جو بات مارکونی نکالنے والا ہے وہ اور بھی ہل چل ڈالیگی اور قومی اور تجارتی ترقی کی جان ٹھہرے گی۔ مارکونی جس کا نام آج کل دنیا کے پردہ پر شہرت عام کا تمغہ حاصل کرچکا ہے، جب بون یونیورسٹی میں پروفیسر ہنریچ ہرٹز کی "نوٹ بک ۱۸۸۰ء" دیکھ چکا تو اس نے سخت کوشش و کشش سے ۱۸۹۵ء میں کامیابی حاصل کی اور مئی ۱۸۹۶ء میں انگلستان پہنچکر اپنے خیالات کی عام طور پر اشاعت کی وہ اپنی کوششوں میں اسقدر کامیاب ہوا کہ دو ماہ بعد اس نے اپنے اس طریقہ پیغام رسانی کو رجسٹرڈ کرانے کی درخواست دیدی۔ رجسٹری ہونے سے پہلے امتحان لازمی تھا چنانچہ قرار پایا کہ صدر ڈاکخانہ اور دریائے ٹیمز کی چوکی کو ملا کے کام کیا جائے۔ بات پوری تھی۔ کسوٹی پر کھری نکلی۔ ادھر کی کامیابی دیکھکر صیغہ جنگ نے بھی امتحان کا قصد کیا۔ پہلے تو صرف سو گز کی بات تھی مگر اب کے میدان سالسبری کو انتخاب کیا گیا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ رنگ دکھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کی زبان پر مارکونی سسٹم" چڑھ گیا۔ سوداگروں نے ایک لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے کمپنی کھڑی کی اور بعد میں اس سرمایہ کو سہ چند کردیا۔ کام شروع کرنے کے لئے آبنائے انگلستان کا وہ حصہ تجویز کیا گیا جسکے ایک طرف ڈوور (واقعہ انگلستان) اور دوسری طرف ولن کرو (واقعہ فرانس) ہے۔ جب اس تیس میل کے فاصلہ میں کامیابی ہوئی تو صیغہ بحریات نے بھی اس کا اجرا منظور کیا۔ بعد ازاں مارچ ۱۹۰۱ء میں عام تجارت کو ترقی دینے کے لئے خاص کارروائی کی گئی۔ الغرض مارکونی کی ہمت بڑھانے میں جسقدر گورنمنٹ انگریزی اور انگریزی رعایا نے کام لیا وہ امید سے بڑھکر تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ امریکہ اور یورپ کے موجدوں کو ہمیشہ سرکار کی طرف سے مدد ملتی رہی ہے۔ اور جب کسی موجد کو تخت نے اپنے سایۂ اقبال میں لیا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ساعی ہوا۔ اسوقت ہندوستان میں مسٹر حبیب الرحمان خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ محکمۂ تار نے اپنی سعی بلیغ سے ایک نیا طریقہ پیغام رسانی ایجاد کیا ہے، جسکی ضرورت، فوائد، اور تجربات کے متعلق آپ نے ایک رسالہ انگریزی اور ایک اردو میں شائع کیا ہے اس رسالہ میں اگرچہ لفظی تصویر ان تجربات کی ہے جن کو مدنظر رکھکر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد کی تجویز اور مسٹر ظہور احمد بیرسٹر کی تائید سے ایک رزولیوشن پاس ہوا جسمیں موجد کو ایجاد کی مبارکباد کے بعد اسکی آئندہ کامیابی کی ہزار جان سے خواہش کی گئی ہے۔ ہم بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ کانفرنس کے اس رزولیوشن سے جو کچھ بھی قوم یا ملک کی طرف سے اُن کی عزت ہونی چاہیئے تھی ہو چکی۔ گویا ابتدائی مرحلہ طے ہوگیا۔ مگر اس قسم کی علمی اختراعات کی جبتک گورنمنٹ سرپرستی نہ کرے بارسبزی معلوم۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اگر مارکونی کی طرح مسٹر حبیب الرحمٰن خاں کو سرکار دولتمدار سے

ا۔ تجربات کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔

ب۔ تجربات کو وسیع تر پیمانہ پر سرانجام دینے کی آزادی ہو۔

ج۔ ہر طرح کی مناسب مدد کا وعدہ ہو۔

د۔ پٹینٹ کرنے کرانے کی سہولت ہو۔

تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ "رحمانی سسٹم" ضرور ترقی کرے گا۔ بلکہ اس سے دوسرے موجدوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اب کے برس جو حضور ملک معظم ہندوستان تشریف لاتے ہیں، کیا ہی عمدہ بات ہو، کہ جہاں اس موقع پر دوسری ہندوستانی چیزوں کو دکھایا جائے وہاں اس "رحمانی سسٹم" کا بھی ملاحظہ کرایا جائے۔

مسٹر حبیب الرحمٰن خاں کے سسٹم میں بہت کچھ سہولتیں اور آسانیاں نمایاں ہیں جسکا فائدہ ایک ہی نظر میں وہ لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جنکو ٹیلیگراف کی ماہیت پر کماحقہ تصرف ہو۔ اگر سرکار نے موجدوں کو اپنے ظل حمایت میں لیا تو دیکھ لیگی کہ امریکہ والے جس ایک ایڈیسن پر نازاں ہیں اس سے کئی درجہ بڑھ چڑھکر اس بھارت ورش میں موجود ہیں۔ جو اس وقت اگرچہ بے سروسامانی یا اپنی غفلت کے باعث "نیم وحشی" کہلاتے ہیں، مگر کسی وقت آسمان ایجاد

داختراع پر چاند اور سورج سے بھی زیادہ چمکیں گے ۔ کمی ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ سرکاری مدد نہیں ۔ یہ ہو جائے تو پر پرزے نکل آئیں گے اور پھر پرواز کرنے میں کوئی بات نہ رہے گی ۔ جس طرح انگلستان کے نئے نئے اختراعات کرنے والے اپنے ایجاد کردہ اسکیم کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے مختصر سے پمفلٹ میں شائع کرتے ہیں ، اسیطرح مسٹر حبیب الرحمان خاں نے اپنی اسکیم مفصل طور پر ایک رسالہ میں لکھی ہے اور اُردو داں حضرات کی مزید واقفیت کے لئے اسکا ترجمہ بھی اپنی نگرانی میں شائع کیا ہے ۔ شائقین کو چاہئے کہ ان رسائل کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور پھر اس امر کی داد دیں کہ ایک ہندستانی دماغ نے کیا کچھ کر کے دکھایا ہے ۔ اور ابھی اس سے کیا کیا امیدیں ہو سکتی ہیں ۔

چندہ یادگارِ غالب

افسوس ہے کہ معاونین ادیب نے ابھی تک اسطرف کامل توجہ نہیں فرمائی ۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس علمی تحریک میں نہ صرف خود عملی حصہ لیا جائے بلکہ اپنے احباب کو بھی اس طرف متوجہ کیا جائے ۔

اس ماہ میں مندرجہ ذیل رقم اس سلسلہ میں وصول ہوئی ہے :-

ڈاکٹر ٹی ۔ ریل صاحب لطیف ، اجمیر — صہ/

بالو امراؤ سنگھ صاحب توسط ڈاکٹر ریل صاحب — صہ/

خان بہادر ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ صاحب طالب " — عہ/

ڈاکٹر یوسف تاسائن صاحب " — عہ/

ڈاکٹر مہابیر پرشاد صاحب " — عہ/

ڈاکٹر محمد ظفریاب خاں صاحب " — عہ/

ڈاکٹر کشوری لال صاحب " — عہ/

ڈاکٹر گنگا رام صاحب " — عہ/

پنڈت بشن نراین صاحب طرب " — عہ/

مسٹر جے لال شاہ ۔ وکیل ہائیکورٹ نینی تال — عا/

[illegible]

مشتہرہ سابق ۔ [illegible]

میزان [illegible]

تصریح تصاویر

دمینتی اور ہنس (رنگین) اور ساوتری و فرشتۂ موت کا ذکر ہم "رباعیات عمر خیام" کے انگریزی ایڈیشن کے ریویو میں کر چکے ہیں ۔ سال گزشتہ میں دیگر مصوروں کی ہم آواز ہی مضمون کی تصویریں ادیب میں شائع ہو چکی ہیں جنکے ساتھ مفصل نوٹ بھی درج تھے لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں ۔

گنگا اور شانتنو کی تصویر ایک بنگالی مصور مسٹر بی پی بنرجی کے کمالِ مصوری کا نمونہ ہے ۔ ذکر ہے کہ ایک دفعہ مہاراجہ شانتنو ساحل گنگا پر ہوا خوری کے لئے گئے ۔ گنگا جی اسوقت ایک حسین عورت کی شکل میں پھر رہی تھیں شانتنو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئے ۔ اس تصویر میں یہی منظر دکھایا گیا ہے ۔

نورتن اکبری کی دھوم تمام عالم میں مچی ہوئی ہے ۔ اس نمبر میں اس دربار کی تصویر بھی شائع کی جاتی ہے جو ایک قدیم مرقع کی نقل ہے نمبروں سے ہر شخص کی شناخت ہو سکتی ہے (۱) حکیم ہمام (۲) راجہ ٹوڈرمل (۳) راجہ مان سنگھ (۴) راجہ بیربل (۵) ملا دوپیازہ (۶) ابوالفیض فیضی فیاضی (۷) شیخ ابوالفضل (۸) مرزا تانسین (۹) نواب خانخاناں ۔

اس نمبر میں نوجوان ترک کی نئی پود کی ایک تصویر شائع کیجاتی ہے ۔ گہوارہ ہی سے اُن کو حریت ، اخوت ، مساوات اور عدالت کے اصول کی تعلیم ہوتی ہے ۔ اس اصول کی حفاظت اس زمانہ میں بغیر سر بکف اور شمشیر بدست رہنے کے ناممکن ہے ۔ یورپ نے اس سپاہی بچے کے تیور تاڑ لئے ۔ خدا چشم بد سے بچائے اور ایشیا کی اس بہادر قوم کو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے ۔

نمونہ خوشخطی زمانہ قدیم کے کسی خوشنویس کی تحریر کا نمونہ ہے جسمیں اس نے ہر قسم کا طرز تحریر دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ افسوس کہ کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا ۔

توسیع اشاعت

ذیل کے علم دوست اصحاب کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنہوں نے اس ماہ میں ادیب کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لی اور اپنے احباب کو اسکی خریداری پر مائل کیا۔

(۱) پادری جان ملکم صاحب (۲) سید محمد صابر علی شاہ صاحب تحصیلدار (۳) منشی عبد اللہ خاں صاحب سب انسپکٹر پولیس۔ (۴) ابو محمد سید حسن امام صاحب وارثی۔ (۵) مرزا محمد ہادی صاحب عزیز (۶) پنڈت بنواری لال صاحب سیاح ہند۔ (۷) پنڈت جواہر ناتھ صاحب کول ساقی (۸) حکیم سید ولی الدین صاحب۔ (۹) بابو شوبھا رام صاحب کلرک ڈاک خانہ (۱۰) بابو موتی سرن صاحب پلیڈر (۱۱) بابو رام کشن صاحب امپورٹ ایجنٹ (۱۲) مولوی ریاست حسین صاحب (۱۳) مولانا احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی۔ (۱۴) بابو جگل کشور صاحب ضبط۔ (۱۵) ڈاکٹر ٹی ریل صاحب لطیف (۱۶) حاجی عنایت اللہ صاحب نقل نویس (۱۷) مسٹر ڈی-پی درما (۱۸) منشی نثار علی خاں صاحب اوورسیر (۱۹) منشی محمد عین العزیز خاں صاحب (۲۰) مولوی خواجہ امیر الدین صاحب منصف (۲۱) نواب سید ابو القاسم خاں صاحب (۲۲) بابو کاشی پرشاد صاحب تحصیلدار (۲۳) مولوی تدبیر الدین صاحب (۲۴) بابو چندو لال صاحب اوورسیر ملٹری ورکس (۲۵) مولوی محمد نمیر الدین صاحب ٹیلیگراف انسپکٹر (۲۶) بابو چندو لال صاحب ناظر (۲۷) سید ابو الخیر محمد شمس الرحمن صاحب (۲۸) منشی امیر علی صاحب صیغہ دار (۲۹) حافظ فیاض احمد صاحب پانی پتی۔

(قیمت سالانہ للعہ) **ادیب** (فی پرچہ ۶ آنہ)

ادیب کے قواعد

یہ باتصویر ماہوار رسالہ جو اردو علم ادب کی ترقی کا نمونہ ہے ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخوں میں شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم مسلم الثبوت اساتذہ اور بہترین انشا پرداز اسے وقیع، دلچسپ اور مفید بنانے میں سرگرم ہیں۔ مضامین کی نوعیت ایسی ہے جو ہر طبقہ کے لئے دلچسپ ہو۔ کوشش کی گئی ہے کہ اسکے مضامین نثر ہوں خواہ نظم تعلیم یافتہ مستورات کے لئے بھی اسیقدر دلچسپ اور مفید اور خوشگوار ثابت ہوں جس قدر تعلیم یافتہ اصحاب و ارباب نظر اصحاب کے لئے

اسکی ضخامت ۴۸ صفحات یا اس سے زیادہ ہوتی ہے اور صفحہ میں دو کالم ہونے کی وجہ سے اسمیں معمولی تقطیع کے ایک سو صفحات کے قریب گنجایش رکھی گئی ہے۔ اسکے علاوہ ہر ماہ التزاما کم از کم ایک رنگین اور ساتھ عکسی تصاویر دیجاتی ہیں جنمیں مشہور مصوروں کی صناعیوں کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہیں بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعروں کی نظمیں بھی حاصل کیجاتی ہیں جو تصویر کی دلکشی کو دو بالا کر دیتی ہیں قدردانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہیگا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی میں بھی اعلی درجہ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھپا کر اسمیں اضافہ کی جاتی ہیں۔ جو اسکی مقررہ ضخامت سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ بہرنوع قدردانان علم ادب کے لئے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہے جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینوں سے مشابہ ہے۔

اسکی سالانہ قیمت چار روپیہ مع محصول ہے۔ اس قیمت میں ان خصوصیات کیساتھ کوئی پرچہ نہیں ملسکتا۔ بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی جنکی سالانہ تعداد کم از کم یک صد ہوتی ہے کہیں دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ نظر برین معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہے کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہوں تو علاوہ ذاتی قدردانی کے اسکی توسیع اشاعت میں بھی حتی الامکان امداد فرمائیں۔

خریداری کے لئے پیشگی قیمت آنا ضروری ہے۔ نمونہ مفت نہیں بھیجا جائیگا بلکہ چھ آنہ وصول ہونے یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا نام اور پتہ صاف و خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہنچنے میں دقت نہو اگر ایک دو ماہ کے لئے پتہ تبدیل کرانا ہو تو مقامی ڈاکخانہ سے انتظام کر لینا چاہئے۔ اور اگر ہمیشہ یا زیادہ عرصہ کے لئے ضرورت ہو تو منیجر ادیب کو اطلاع دیجائے

اس رسالہ میں مذہبی مباحث اور موجودہ پالیٹکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا۔ ناتمام مضامین بھی نہ لئے جائیں گے۔ جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اسکا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائیں۔ اگر مضمون اور تصویر ساتھ نہ آئینگی تو مضمون شائع نہو گا خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے ورنہ تعمیل ارشاد نہو سکے گی تمام خط و کتابت اس پتہ سے ہونا چاہئے۔ منیجر "ادیب" انڈین پریس الہ آباد

میگھہ ناد کا یگیہ
(از بابو اپندرو کمار مترا)

انڈین پریس الہ آباد

نومبر ۱۹۱۱ء

جلد ۴ نمبر ۵

فلسفۂ سیاست (۲)

حکومتوں کی مشترک خصوصیات

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بنی نوع انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے گروہ بنا کر رہتے ہیں یا بالفاظ دیگر حکومتوں میں منقسم ہیں لیکن کیا سب حکومتیں ایک ہی قسم کی ہیں؟ اور کیا آدمیوں کے ہر مجموعہ کو ہم حکومت کہہ سکتے ہیں؟ یورپ کے بعض علما حکومت کا اطلاق صرف اُنھیں حکومتوں کے لئے جائز اور مناسب سمجھتے ہیں جو یورپ میں اس وقت پائی جاتی ہیں یا یوروپی وضع کی اُن حکومتوں کے لئے جو دیگر حصص دنیا میں مثلاً امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے نزدیک ایشیا کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو مثل یورپ کی حکومتوں کے متمدّن اور ترقی یافتہ نہیں ہیں حکومت کے پرمعنی اور موقر لفظ سے تعبیر کئے جانے کے لایق نہیں سمجھی جاتیں۔ یہ انسانی خاصہ ہے کہ جب وہ کسی بات پر غور کرتا ہے تو مقابلہ کے لئے ہمیشہ ایسی چیز اختیار کرتا ہے جو خود اُس کے گرد وپیش ہو۔ قدما کا بھی یہی حال تھا۔ ارسطو نے حکومت کا صحیح اور بہترین نمونہ شہری حکومت کو قرار دیا ہے۔ اُسکے زمانہ میں یونان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر شہر گویا کہ بطور خود ایک حکومت اور سلطنت کا درجہ رکھتا تھا۔ ایتھنس کو اسپارٹا سے وہی تعلق تھا جو آج جرمنی کو انگلستان سے ہے۔ ہر ایک شہر کی مجلس شوریٰ جدا تھی۔ فوجی انتظام علیحدہ، حکمراں بالکل مختلف، ایک شہر کی رعایا اپنے آپ کو دوسرے شہر کی رعایا سے علیحدہ اور اُن کے اغراض ومقاصد جُدا سمجھتی تھی۔ اور جسطرح آج بڑی بڑی سلطنتوں میں مقابلہ اور رقابت کی گرم بازاری ہے اُس زمانہ میں شہروں کے درمیان یہی کیفیت تھی۔ اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کا خیال ہر شہری حکومت کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ پس ارسطو نے شہری حکومت کو معیار مقرر کر کے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کیا اور اسی لحاظ سے اُنکی تقسیم کی۔ ارسطو کا یہ بھی

خیال تھا کہ اعلیٰ ترین حکومت کو بہت بڑا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ کسی جمہوری حکومت میں صرف اسی قدر آدمی ہونے چاہئیں کہ مجلس شوریٰ میں سب کے سب ایک وقت میں جمع ہوسکیں تاکہ براہ راست تبادلۂ خیالات اور مباحثہ ہوسکے۔ لیکن یہ طریقہ استدلال صحیح نہیں ہے جب کوئی ماہر نباتات، عالم نباتات کو مختلف حصّوں میں تقسیم کرتا ہے تو وہ مجاز نہیں ہے کہ صرف خوشنما پودھوں اور پھولوں کے درختوں ہی کو اپنی توجّہ کا محتاج بنائے۔ برخلاف اس کے اُسے لازم ہے کہ جنگلی اور زہریلی گھاس تک جو نباتات کی تعریف میں آتی ہو تقسیم کرتے وقت پیش نظر رکھے۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ اور امریکہ کی متمدن حکومتوں کے سامنے ایشیا کی ریاستیں کیا بلحاظ قوت وعظمت کے اور کیا بلحاظ علمی، تمدنی، ومعاشرتی ترقی کے ایسا ہی درجہ رکھتی ہیں جیسا ذرہ سورج کے سامنے، لیکن پھر بھی ان سب میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو متمدن یورپ کی بڑی سے بڑی حکومت میں۔ یہ صحیح ہے کہ مشترک خصوصیات نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں تاہم جس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ سب آدمی ایک جنس ہیں حالانکہ دُنیا میں کوئی دو آدمی ایک قسم کے نہیں ہوتے۔ اسیطرح یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ایک متمدن اور غیر ترقی یافتہ حکومت ایک ہی جنس میں داخل ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ جسطرح انسان باوجود ایک جنس ہونے کے جسمانی ساخت، آنکھ ناک کان، اعضا کی قوت اور اخلاقی حالتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسیطرح حکومتیں بھی باوجود خصوصیات مشترک رکھنے کے، اپنے قوانین، معیارِ ترقی، تہذیب وتمدن اقتصادی، علمی، اور اخلاقی ترقی، فوجی قوت وغیرہ کے لحاظ سے آپس میں فرق رکھتی ہیں۔

اگر ہم تاریخ کی صفحہ گردانی کریں اور مختلف حکومتوں کے حالات پر غور کریں تو ہماری نظر معاً ایسی خصوصیات پر جا پڑتی ہے جو تمام حکومتوں میں بلا استثناء مشترک پائی جاتی ہیں۔ بعض خصوصیات مثلاً رعایا کی اخلاقی مدارج ترقی وغیرہ پوشیدہ بھی رہ جاتی ہیں لیکن کسیقدر غور وتعمق کے بعد یہ مشکل بھی آسان ہوجاتی ہے۔ اور ہم مختلف نتائج پر غور کرکے اسباب کا پتہ لگالیتے ہیں۔ مجملاً حکومتوں کی مشترک خصوصیات حسب ذیل قرار دی جاسکتی ہیں:۔

(۱) جماعت۔ ظاہر ہے کہ سب سے بڑی ضرورت حکومت کے لئے افراد قوم کی ہے۔ ہر حکومت آدمیوں کی کسی جماعت پر مشتمل ہوتی ہر جماعت کی تعداد کی البتہ کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ مختلف حکومتوں میں مختلف ہوتی ہے۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ لیکن جب تک کوئی جماعت خاندان کے محدود دائرہ میں رہتی ہے اُس پر حکومت کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ خاندانی رشتہ ٹوٹ کر فرقہ بندی اور قوم پرستی کی صورت پیدا ہوگئی ہو۔ ایک چھوٹا سا خاندان یا فرقہ مثل حضرت یعقوب کے خاندان کے جو یہودیوں کے مورث اعلیٰ ہیں کسی بڑی حکومت کا سنگ بنیادی ہوسکتا۔ لیکن اصل حکومت کا اطلاق اُسیوقت ہوسکے گا جب انسان رشتہ اور ناتہ کے تار پود سے بالکل آزاد ہوجائیں اور چھوٹے چھوٹے مختلف جرگوں اور فرقوں کی ایک برادری اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہوجائے بغیر کسی انسانی جماعت کے جو ایک خاص درجۂ ترقی وتہذیب پر پہنچکر نیشن یا قوم کہلاتا ہے کسی حکومت یا سلطنت کا وجود نہیں ہوسکتا۔

حکومت کی جماعت کی کوئی خاص تعداد معیّن نہیں ہے۔ ارسطو کا بیان ہے کہ " نہ تو حکومت میں صرف دس آدمی ہوسکتے ہیں اور

نہ ایک لاکھ"۔ موسیو راسو مشہور فرانسیسی عالم کی تعیینہ تعداد دس ہزار آدمیوں کی آج کل کسی طرح کافی نہیں ہو سکتی۔ از منۂ متوسطہ میں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قیام اطمینان و استحکام کے ساتھ ممکن تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ کا تقاضہ ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ فی زماننا ملکی فرائض کا دائرہ اسقدر وسیع ہو گیا ہے کہ اُن کی انجام دہی کے لئے بہت زیادہ بلکہ بے اندازہ قومی قوّت و طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ اسوجہ سے کہ بڑی حکومتوں کی زبردست قوت چھوٹی حکومتوں کے لئے نہایت خطرہ و بے اطمینانی کا باعث ہو گئی ہے۔ چنانچہ اسوقت متمدّن دنیا کی کوئی قوم تنہا رہنا خطرہ سے خالی نہیں سمجھتی دو دو بلکہ تین تین اقوام از روے معاہدہ ایک دوسرے کی امداد پر مجبور ہیں۔ روس و فرانس جرمنی کی بڑھتی ہوئی قوت سے مشوش ہو کر آپس میں متحد ہو گئے۔ جرمنی نے اسٹریا سے رشتہ اتحاد قائم کیا ہے۔ ٹرکی چھوٹی حکومت ہونے کی وجہ سے بڑی سلطنتوں کے طمع او بغض و عداوت کا شکار بن رہا ہے۔ ابھی دو برس کی بات ہے کہ اسٹریا نے ٹرکی کے دو زرخیز صوبے ہڑپ کر لئے اور کمزور ٹرکی انگشت نارضامندی تک نہ اُٹھا سکا۔ اب اٹلی جو جرمنی اور اسٹریا کے ساتھ متحد ہے سلطنت عثمانیہ کے صوبہ طرابلس کو ہضم کئے لیتا ہے۔

۲۔ معین حصّہ ملک | کوئی حکومت محض جماعتِ انسانی سے حکومت نہیں کہلا سکتی۔ جب تک کہ کسی معیّن حصّہ ملک پر اُسکا قبضہ مستقل طور پر نہ ہو۔ قوم اور ملک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خانہ بدوش قومیں جو گروہ بنا کر دیس دیس پھرتی ہیں اگرچہ کسی سردار یا سرغنہ کی ماتحتی میں ہوتی ہیں اور بہ لحاظ رسم و رواج اور زبان آپسمیں متحد ہوتی ہیں۔ لیکن اُنکے نظام پر حکومت کا اطلاق نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کسی حصّہ زمین پر قابض نہ ہوں۔ یہودی اگرچہ باعتبار قوم اور زبان متحد تھے اور حضرت موسیٰ کے زیر نگیں ان میں ایک حد تک پولٹیکل خیالات سرایت کر گئے تھے لیکن جب تک یشوع نے فلسطین پر قبضہ نہ کیا اُن کی حکومت قائم نہ ہوئی۔ آج یہودی کثیر تعداد میں اقطاع عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اُنکے پاس دولت ہے، وجاہت ہے، اُنکا مذہبی اور قومی شعار بدستور قائم ہے لیکن بوجہ اس کے کہ اُنکے قبضہ میں زمین و ملک نہیں ہے، اُنکی کوئی علٰحدہ حکومت نہیں ہے حالانکہ مانٹینگرو یا سرویا جنھیں دولتمند یہودی کھڑے کھڑے خرید سکتے ہیں۔ حکومت کہلانے کا امتیاز رکھتی ہیں۔

۳۔ عصبیت | جماعت اور قبضہ ملک کے علاوہ حکومت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جملہ افراد قوم آپسمیں متحد اور متفق ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ انتظامی آسانیوں یا پولٹیکل خیالات کے لحاظ سے باشندگان ملک ایک دوسرے سے علٰحدہ ہوں۔ مثلاً امریکہ چھوٹی چھوٹی بکثرت ریاستوں کا مجموعہ ہے۔ اندرونی نظم و نسق کے لحاظ سے یہ ریاستیں بالکل آزاد ہیں۔ یا انگلستان کی لبرل اور کنسرویٹیو پارٹیاں پولٹیکل خیالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علٰحدہ ہیں۔ لیکن یہ علٰحدگی اندرونی نظم و نسق تک محدود ہے۔ بیرونی تعلقات کے لحاظ سے انگلستان ایک ہی حکومت متصوّر ہوتی ہے۔ پس جب تک کہ ملک کے مختلف حصّے اور پارٹیاں بیرونی تعلقات کے لئے ایک قوت نہ بن جائیں کوئی قوم حکومت نہیں رکھ سکتی۔

۴۔ تفریق مابین حاکم و محکوم | ہر حکومت میں خواہ کسی قسم کی ہو حاکم و محکوم میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا وجود حکومت کے بقا اور قیام کے لئے لازمی ہے۔ جمہوری حکومتوں میں مثلاً فرانس و امریکہ میں

پریسیڈنٹ اور مجلس شوریٰ کو حاکم اور عام رعایا کو محکوم سمجھنا چاہئے کیونکہ جو احکام و قوانین پریسیڈنٹ یا مجالس کی منظوری سے جاری ہوتے ہیں اُنکی تعمیل ہر فرد بشر کو کرنا پڑتی ہے اسیطرح یونان کی جمہوری حکومت کے زمانہ میں ایتھنس کے باشندے مجموعۃً حکمران تھے ۔ لیکن فرداً فرداً ہر باشندہ محکوم سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی ملک میں یہ نوبت پہنچ جاتی ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کو اپنے افعال کا مختار سمجھنے لگے اور حاکم و محکوم کا فرق اُٹھ جاتا ہے تو وہاں بدامنی اور غدر کی حالت ہوجاتی ہے ۔ لیکن بہت جلد اس حالت کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور کوئی نہ کوئی قوت ایسی کھڑی ہوجاتی ہے جو حاکم کا درجہ اختیار کرتی ہے۔ خواہ یہ قوت خارجی ہو یعنی غیر قوم یا بیرونی یعنی خود اہل ملک میں سے کوئی بادشاہ بن بیٹھے یا کوئی حکمران جماعت پیدا ہوجائے جس سے حاکم و محکوم کا فرق پھر قائم ہوجاتا ہے ۔ کیونکہ نظام سلطنت کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ تمام افراد ملک کسی حاکم اور کسی قانون کی پابندی کریں ۔

ظفر عمر (علیگ)

ہکسلے کے خیالات

پروفیسر ٹامس ہنری ہکسلے انگلستان کا ایک نہایت مشہور سائنس داں اور چارلس ڈارون کا شاگرد رشید تھا۔ اصل یہ ہے کہ اس کے خیالات کی حمایت اور اُنکی اشاعت جتنی ہکسلے کی تحقیق لیکچروں اور کتابوں سے ہوئی تھی، شاید ہی کسی کی کوششوں سے ہوئی ہوگی ۔ وہ ایک بڑا تیز فہم ۔ ظریف طبع اور باریک بین محقق تھا۔ اگناسٹی سزم (Agnosticism) یعنی لاادریت کا موجد تھا ۔ بلکہ اس لفظ کو پہلے پہل اسی نے استعمال کیا تھا اور پھر اسے اسقدر اشاعت نصیب ہوئی کہ یہ ایک علمی اصطلاح مقرر پاگیا ۔ راقم کا ارادہ ہے کہ اس کے بیش قیمت خیالات کا انتخاب رسالہ ہذا کے معاونین کی نذر کیا جائے جس سے اُنکی دلچسپی میں اضافہ معقول ہونے کی امید لگانا فضول نہوگا۔

معرکۃ الآراء مسائل کے سلجھاؤ کے لوازم

جو لوگ اُن عظیم مسائل کے سمجھنے یا حل کرنے کے خواہاں ہیں، جو چارلس ڈارون صاحب نے پہلے پہل ہمارے پیش نظر کئے ۔ اُنکے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اُن حقائق اور واقعات پر عبور حاصل کریں جو صاحب موصوف نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں بیان کئے ہیں ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ وہ اُس طریقۂ تحقیق سے کام لیں جس کا انہوں نے اپنی زندگی کے دوران میں ایسا شاندار نمونہ قائم کیا تھا ۔ ڈارون صاحب میں کون کون سی خوبیاں تھیں ۔ وہ بڑے تیز فہم تھے ۔ وہ حقائق کے علم کی تلاش میں رات دن غلطاں پیچاں رہتے تھے اور اُن کے کھوج میں کبھی تکان یا سستی محسوس نہ کرتے تھے جب ایک امر کی صداقت آشکارا ہوجاتی تھی تو وہ اپنے پہلے خیال کو ترک کردیتے تھے ۔ جب تک یہ خواص آپ کے اندر موجود نہونگے آپ کسی اصول اور مسئلہ کو انتہا تک نہیں پہنچا سکتے ۔ اور جس صورت میں ڈارون صاحب ممدوح نے اِن مسائل کو پیش کیا ہے آیا وہ آخری ہے اور تمام حیص بیص اور تحقیق و تدقیق کے بعد بھی

مرحوم و مغفور مہاراجہ سر نرپندر نارائن بھوپ بہادر جی، سی، آئی، ای - سی، بی - والئے کوچ بہار

انڈین پریس الہ آباد

قائم رہے گی۔ سردست کوئی آدمی اسکی بابت کوئی خاص رائے صحت کے ساتھ نہیں دے سکتا۔ مگر ایک امر بیّن ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے طریقۂ تحقیق۔ اور عجیب وغریب استقلال عشق صداقت۔ علم معیّن کے حصول کے لئے سب خیالات ومقاصد قربان کرنے کی خواہش کی تقلید سے اُن سچّائیوں کے قریب تر پہنچ سکتے ہیں جن کے حصول اور تشریح اور اشاعت کے لئے اُنہوں نے اپنی جان لڑا دی تھی۔

انیسویں صدی کی خصوصیت

میں خیال کرتا ہوں۔ انیسویں صدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ علم کا اشتیاق بہت جلد پھیل گیا ہے۔ اور اسکا انجام یہ ہوا ہے کہ تمام مسائل کی چھان بین اور تحقیق وتدقیق میں جن سے عقل انسانی کو دوچار ہونا پڑتا ہے علمی طریقۂ تحقیق سے کام لیا جانے لگا ہے اور اس کے ساتھ ہی موروثی اور قومی عقائد اور خیالات جو جدید طریقۂ تحقیق کی تاب نہیں لا سکتے فرسودہ اور لغو ٹھہر کر مسترد اور نسیان سپرد[1] ہو گئے ہیں۔

علم المعاشرت کا مفہوم اصلی

علم المعاشرت بھی ایک علم ہے اگر جائز و ناجائز استعمال سے یہ لفظ اسقدر ذلیل نہو گیا ہوتا تو اسے سیاسیات (Politics) کہنا بجا ہوتا۔ انسان خاص قسم کی ہستیاں ہیں وہ خاص خاص حالتوں میں ویسی ہی حرکتیں کرتے ہیں جیسے بے سہارے پتھر لڑھکتے اور بکھر جاتے ہیں۔ ان کی فطرت جن قوانین کے تابع کام کرتی ہے وہ ایسے ہی لازوال اور بے بدل ہیں جیسے قانون کشش۔

پولیٹکل اکانومی کے ماہروں اور محققوں نے محقّق طبعیات کی طرح سیدھا راستہ پکڑ لیا ہے۔ یعنی وہ انسان کی حرکت کی علت اولیٰ کے نتائج کا کھوج کرنے کے درپے رہتے ہیں اسکی بنا پر اجتماع زر کی خواہش بے روک اور سرکش معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ یا اور لوگ یہ امر بھول جائیں کہ اور زبردست اسباب بھی اس خواہش کے پورا کرنے میں مانع آ سکتے ہیں۔ تو یہ جدید طریقۂ تحقیق کا قصور نہیں ہے بلکہ انکی اپنی کوتاہ بینی اور بیوقوفی اسکی ذمہ وار ہے۔

ہائیڈرواسٹے ٹکس (Hydrostatics) یعنی علم المائعات اس وجہ سے "چھوٹا علم" نہیں ٹھہر سکتا کہ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف نہیں بہتا ہے۔ مثلاً آدمی بوتل میں پانی بھر کے اُسے اوندھا کر دے اگر ڈاٹ ہوگا تو وہ کبھی نہیں گرے گا۔

جو کچھ پولیٹکل اکانومی والے کر رہے ہیں ویسے ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک گروہ اہل تحقیق کا اخلاق کی طرف بھی رجوع ہو۔ سب سے پہلے اس مسئلہ کو سلجھا وے کہ خاص اغراض کے بے روک ٹوک اظہار کے وقت کیا ہوگا۔ اور "فرض" یا "واجب" کا مسئلہ بعد ازاں حل ہو جائے گا۔ کیونکہ جو کچھ کرنا واجب ہے عوام کی ایک کثیر تعداد اسیطرح کرے گی گویا کہ بعض منفی اور مثبت یعنی مفید ومضر خوشیاں طرز عمل کی علت غائی بنجاتی ہیں

ہم علم یوبیوٹکس (Eubiotics) سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہم کو صاف صاف بتائے کہ اگر تمام انسانوں کی طرز عمل فلاح یا نفع ذاتی (جیسا عامیانہ معنی میں سمجھا جاتا ہے) کی غرض سے تحریک پائے تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ یوٹے لیٹیرین[2] (Utilitarian) فرقہ کے عالموں نے ایک ایسے علم کی بنیاد ڈالدی ہے[3] فلاح کی خواہش اجتماع زر کی خواہش سے کسی طرح

---

[1] "لائف اینڈ لیٹرس" جلد سوم صفحہ ۳۵۶ [2] ایضاً صفحہ ۳۲۲ [3] بہ مارتھ یا فلاح عامۂ خلائق کا اخلاقی اصول یعنی اس عقیدہ کے حامی کہتے ہیں کہ بنی آدم کی خدمت گزاری انسان کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہونا چاہئے۔

بہتر نہیں ہے۔ لیکن اگر اس عجیب دنیا اور اس زندگی کا مقصد اسی کا حصول ہو تو اسے آزمانا چاہیئے اور اس کے لئے کوشش کرنا واجب ہے۔[1]

لشکر آرائی کی ترقی کا سبب

یورپین سلطنتیں دن بدن لشکر اور فوجی سامان بڑھاتی چلی جاتی ہیں اس سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں اُن کے بارے میں مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے۔ میری رائے میں اسکی وجہ اصلی تمدنی قوتوں کا اظہار ہے جنکا عمل اور ظہور رہ سلطنتوں کی قرارد اد باہمی سے خاطر خواہ اثر نہیں حاصل کرسکتا میں خیال کرتا ہوں لشکر آرائی کی ترقی کو "جنگ طلبی اور جنگجوئی کے میلان" روز افزوں سے منسوب کرنا غلطی ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ بین الاقوام تجارت وصنعت کے سبب سے فوجیں بڑھانا پڑتی ہیں تو قدرے درست اور راستی کے قریب ہوگا۔ اس میں اہل فرانس کی انتقام خواہی۔ اور اہل جرمنی و اہل اٹلی کی قومی اتحاد و قوت کے اظہار کی مبنی برحق خواہش بھی شامل کرنا چاہیئے روسیوں کے سر پر یہ بھوت سوار ہے کہ سلیو (Slav) نسل کے جہاز مغربی سمندروں میں بے روک ٹوک چلتے رہیں۔ اور تقدس مآب حضرت پوپ اپنا دینی اور دنیاوی رسُوخ و اقتدار بحال کرنے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ اور "مریض یورپ" (ترکی) اسوجہ سے زندہ ہے کہ اس کے معالج یہ سمجھ رہے ہیں کہ کہیں دوسرا ڈاکٹر اسکی جائداد کا وارث نہ بن جائے۔ یہ اسباب ہیں یورپ کی قوموں کے ہر سال جنگ آزمائی کی تیاری کرنے کے جب میں ان فتنہ خیز اور شر انگیز اسباب پر غور کرتا ہوں جو فی زمانہ یورپ کے تمدن کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے میں لگے رہتے ہیں تو مجھے صاف صاف سوجھتا ہے کہ سلطنتوں کے فوجی اخراجات کے تعین کی تجویز بالکل لچر اور بے سود ہے۔ کیونکہ اس سے جمہور کے دلوں میں یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومتوں کی خواہش پر یورپ کا امن اور جنگ[2] منحصر ہے۔

تحقیق سائنس میں کامیاب ہونے کی شرط

سائنس کا جو شعبہ چاہو تحقیق کے واسطے منتخب کرلو۔ مگر اس میں کامیاب ہونے کے لئے تین[3] چیزوں کی اشد ضرورت ہے یعنی غیر معمولی تربیت۔ محنت پسندی اور اشتیاق تجسس۔ اگر شوق ہے تو دن بھر کے کاروبار کے بعد تمہیں کافی مہلت مل سکتی ہے جسے تم سائنس کی تحقیق میں صرف کرسکتے ہو اگر اس جوش دماغی کی کوتاہی ہے تو تمہارے لئے بہتر ہے کہ لین دین اور خرید و فروخت میں لگے رہو۔ تم قوم اور ملک کی اس حالت ہی میں عمدہ خدمت انجام دے سکتے ہو جب تم اپنی قابلیت اور اپنی میلان طبیعت کے مطابق جوش اور سرگرمی سے کوئی علم حاصل کرنے کے درپے ہو جاتے ہو۔

قدیم و جدید طریقۂ تعلیم

قرون وسطیٰ اور زمانۂ حال کی تعلیم اعلیٰ میں جو یہ تفاوت معلوم ہوتا ہے کہ اوّل الذکر کی نگاہ ماضی کی طرف رہتی اور کتابوں سے علم سکھایا جاتا تھا آج کل اس کے برعکس ہے۔ یعنی آگے کا خیال رہتا ہے اور موجودات کا علم بتایا جاتا ہے ازمنۂ وسطیٰ کے اہل الرّاے کا یہ خیال تھا کہ جتنا علم ہے وہ قدما ہی کی تصانیف میں بھرا پڑا ہے۔ یعنی دینی کتب بڑے بڑے یونانی حکما اور ابتدائی صدیوں کے مسیحی علما کی کتابوں ہی تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اتنی خصوصیت ان کے طریقۂ تعلیم میں ضرور تھی کہ اہل سلف کی کتابوں سے واقعات اور معلومات اخذ کرکے اُن پر استدلال کرتے اور انوکھے ڈھنگ سے استخراج نتایج کیا جاتا تھا۔

مگر طریقۂ جدید یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کی تصدیق علمی طریق تحقیق سے کیجاتی ہے اور اسیطرح علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اسکے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ دوسرے اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ تحقیق طلب واقعات حقائق کو مصدقہ اور

---

[1] جلد سوم صفحہ ۲۳۷ [2] جلد سوم صفحہ ۳۴۳ [3] ایضاً صفحہ ۴۵۲۔

معلوم سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور اُستاد کا فرض ہی کہ وہ اپنے طلبا میں اپنے طور پر تحقیق کرکے نئی بات پیدا کرنے کا مادّہ پیدا کرے۔ اس اعتبار سے یونیورسٹی کا کام اور رتبہ اُن علوم گاہوں سے بالکل جُدا اور علیحدہ ہے جن میں ٹیکنکل تعلیم مثلاً الہیات قانون اور طبیّات دی جاتی ہے اور یونیورسٹی کا مقصود اولی یہ نہیں ہے کہ اُستادوں کے کام کی خوبی کا موازنہ کرے۔ یا یہ قرار دے کہ کون کون سے طلبا پادری اور ڈاکٹر اور وکیل بننے کے قابل ہیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ سائینس یا فنون کے شائقین کی تعلیم کا ایسے اُستادوں کے ذریعہ سے بندوبست کرے جو یہ سکھائیں کہ موجودات میں کیا معلوم ہوچکا ہے اور انہیں نامعلوم باتوں کے دریافت کرنے کا ڈھنگ بتایا جائے۔

قادر علی الاطلاق کا مسئلہ | اگر قادر علی الاطلاق کا یہ مفہوم لیا جائے کہ کائنات کا ادنیٰ ترین گوشہ بھی اتفاق کے تابع نہیں ہے۔ یا اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ علّ عالم یعنی قانون قدرت عقل کی تحریک سے معرّا نہیں ہے۔ یا اگر اس کا یہ مطلب ہو کہ ابتدا آفرینش سے عالم کے اندر قاعدہ کی مسلسل حکومت قائم چلی جاتی ہے تو میری رائے میں یہ مسئلہ نہ صرف قبول کرنے ہی کے قابل ہے بلکہ میرے نزدیک صداقتوں کی سرتاج سچائی ہے جیسے ہر شہری کے واسطے تمام قوانین مروّجہ سے واقف ہونا اہل انصاف اور اہل عمل کی شکل وصورت کی واقفیت سے زیادہ ضروری ہے اسیطرح واجب الوجود کا مسئلہ جیسا میں نے بیان کیا ہے تھیالوجی (الہیات قیاسی) کے تمام مسائل سے کہیں بڑھکر ضروری ہے علاوہ بریں اگر قادر علی الاطلاق کے مسئلہ سے یہ مراد لی جائے کہ نہایت ہی دور افتادہ زمانہ یعنی ابتدائے زمان میں ایک وجود ذی عقل نے علّ عالم یا سنسار گتی (Cosmic Process) کو تحریک دی تھی یعنی جس میں ہماری ایسی عقل اور دوربینی تھی اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی مانا جائے کہ اسے نہ صرف ہماری ننھی سی دُنیا ہی کے ہر واقعہ کا علم ہے بلکہ عالم بالا کی بیشمار دنیاؤں کے ذرا ذرا حالات سے اُن کے وجود میں آنے سے سینکڑوں سال پیشتر واقف تھا تو سائینس جہانتک مجھے معلوم ہے اس مسئلہ کے برخلاف کچھ بھی کہنے کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ مسئلہ ارتقا کو شخصیت دی گئی ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو۔ لیکن جو واقعات معلوم ہوچکے ہیں انکی بنا پر میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ نہ تو قادر علی الاطلاق کو تسلیم کیا جا سکتا ہی اور نہ اُس سے انکار ہوسکتا ہی۔

جے۔ آر۔ رائے

میگھ ناد کا یگیہ۔ اس ماہ کی رنگین تصویر جو انڈین پریس کے ایک مصوّر کی صنّاعی کا نمونہ ہی بالمیکی راماین سے تعلّق رکھتی ہی۔ میگھ ناد آتش پرست شخص تھا۔ ذکر ہے کہ فتح کی خواہش سے وہ رات کے وقت یگیہ کرنے لگا تاکہ اُس کا دیوتا اُس سے خوش ہوجاے وہ یگیہ کرہی رہا تھا کہ بھبیشن کو یہ راز معلوم ہوگیا۔ بھبیشن واقف تھا کہ اگر یہ یگیہ بغیر شر و فساد کے پورا ہوگیا تو میگھ ناد کسی کے مارے نہ مرسکے گا۔ لہذا لکشمن جی کو ہمراہ لیکر وہ وہاں پہنچا۔ بھبیشن خود تو دروازے پر کھڑا رہا اور لکشمن جی اندر میگھ ناد کے پاس پہنچے۔ میگھ ناد نے دریافت کیا تم کون ہو؟ کیا تم میرے اگنی دیوتا ہو؟ لکشمن جی نے جواب دیا "نہیں۔ میں تیرے حق میں ملک الموت ہوں" اور تیری روح قبض کرنے آیا ہوں۔ میگھ ناد نے غضب میں آکر ارگھا پھینک مارا جس کے لگتے ہی لکشمن جی بیہوش ہوکر گر پڑے۔ اس کے بعد وہ بھبیشن کی طرف مخاطب ہوا اور بہت سخت سست کہا۔ جب لکشمن جی کے ہوش و حواس درست ہوئے تو انہوں نے میگھ ناد کو مار ڈالا۔ یہ اس تصویر کی مختصر کیفیت ہی۔

لازوال خوشی

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ہر شخص اسی بات کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے نت نئی خوشی حاصل ہو۔ لیکن ہنسی کی بات یہ ہے کہ خوشی اُن لوگوں سے دور بھاگتی ہے جو اس کے دل وجان سے طالب ہیں۔ غریب سمجھتا ہے کہ خوشی دولت مند ہونے میں ہے دولتمند کا گمان ہی کہ خوشی خطابوں کے حاصل کرنے میں ہے۔ خوشی نہ یہ ہے اور نہ وہ - اگر یہ کلیہ قاعدہ ہو کہ خوش وہی ہوگا جو دولتمند ہو - تو لازمی امر یہی ہے کہ ہر دولت مند خوش نظر آئے لیکن ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر بہتیرے دولت مند ہمیشہ رنجیدہ نظر آتے ہیں اگر بیرونی اشیاء کے حاصل ہونے میں خوشی ہوتی اور بیرونی اشیاء سے محروم رہنا رنج وکلفت کا باعث ہوتا تو ہمیشہ غریب مسکین لوگ مصیبت زدہ دکھائی دیتے اور امیر خوشی و بہجت سے بھرپور نظر آتے لیکن عام طور پر معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ نہایت ہی مغموم آفت کے مارے بعض وہی لوگ ہیں جو چاروں طرف سے دولت ثروت اور عیش وعشرت کے سامانوں سے گھرے ہوئے ہیں - اور بعض خوشی سے منور چہرے وہی نظر آتے ہیں جنکو ضروریات زندگی بھی نصیب نہیں۔ بعض امیروں نے ہمسے کہا ہے کہ دولت مند ہوکر خودغرضانہ سکھ بھوگتے بھوگتے وہ دُکھی ہوگئے ہیں۔ زندگی اُن کے لئے مزے کی نہیں رہی ہے اور اب وہ ایسے خوش نہیں ہیں جیسے وہ غریبی کی حالت میں تھے۔

تو پھر خوشی مسرت اور انبساط کیا ہے؟ یہ کیونکر حاصل ہوسکتی ہے؟ کیا خوشی محض خیال ہی خیال ہے؟ کیا خوشی دنیا میں کوئی چیز نہیں؟ کیا دُنیا میں تکلیفیں اور مصیبتیں ہی ہیں؟

اس باب میں دانا لوگوں کا کیا خیال ہے؟ اُس کے ذکر کرنے سے اس جگہ کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ بتانا یہ ہے کہ عام لوگ مسرت وشادمانی کا معیار کس کو قرار دیتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ مسرت اُسکو نصیب ہوتی ہے جس کی خواہش پوری ہوجائے۔ دلی مراد بر آئے۔ یہ گمان ہے جسکا بیج نادانی کی زمین میں بویا گیا ہے اور خودغرضی کے پانی سے شاداب کیا گیا ہے۔ پھل کیا ہوگا؟ مصیبت!! تم خواہش کے قلعہ کو تباہ کرو خودغرضی کی بودی عمارت کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ پھینکو دولت اپنے آرام کے لئے اکٹھی نہ کرو بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے کماؤ۔ اس لئے نہیں کہ خود کھاؤ بلکہ اس لئے کہ اوروں کو کھلاؤ پھر دیکھو کہ تم خوش ہو یا رنجیدہ۔ پھر غور کرو کہ دراصل تمہیں خوشی نصیب ہوئی ہے یا نہیں۔ بعض لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خودغرضی مصیبت کا باعث ہے لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ اُن کی اپنی خودغرضی مصیبت کا باعث ہے بلکہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دوسروں کی خودغرضی ہمارے لئے آفت کا سبب ہوئی ہے۔ اگر تم یہ مانو کہ تمہاری ہی خودغرضی تمہارے لئے تباہی کا سبب ہوئی ہے تو تم حقیقی خوشی کے دروازے کے قریب پہنچ جاؤ گے لیکن جب تک تمہارے دماغ میں یہ سمائی ہوئی ہے اور تمہارے دل میں یہ بسی ہوئی ہے کہ دوسروں کی خودغرضی نے تمہاری خوشی کو پامال کیا ہے اس وقت تک تم کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھ سکتے بلکہ روز بروز تمہاری مصیبتوں کے بادل گھرے ہوتے جائیں گے۔

خوشی دل کی شانتی میں ہے۔ آنند من کے سُتھر (قائم) رکھنے میں ہے۔ جو شخص خواہشوں کا شکار ہے وہ ہرگز خوش نہیں رہ سکتا۔

مہارانی کوچ بہار (دختر مہاتما کیشب چندر سین)

انڈین پریس آلہ آباد

اُس کا سدا یہی حال رہتا ہے کہ جب اُسکی ایک خواہش پوری ہو جاتی ہے تو وہ دوسری خواہش کی تکمیل کی فکر میں ہوتا ہے جب دوسری بھی پوری ہو جاتی ہے تو تیسری کی فکر میں ہوتا ہے اسیطرح خواہشوں کا تانتا ختم نہیں ہونے پاتا اور بیچارے خواہشات کے مغلوب شخص کی پریشانی روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ وہ باولے کتے کی طرح مختلف خواہشوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ رستے میں جو کوئی حائل ہوتا ہے وہ اس کو مار گراتا ہے۔ خواہ دوست ہو یا رفیق۔ زن ہو یا فرزند۔ بھائی ہو یا بھتیجا۔ جو کوئی بھی اُسکی خودغرضانہ خواہش کے پورا ہونے میں رُکاوٹ پیدا کرتا ہے وہ اُسکو ہی دودھ کی مکھی کی طرح نکالکر پھینک دیتا ہے۔ خواہش ایک بے تھاہ سمندر ہے جسکی گہرائی کو کوئی نہ جانچ سکا۔ خواہش وہ بھوت ہے کہ ایک دفعہ جس کے سر چڑھا۔ بس چڑھا۔ پھر کبھی اترنے کا نام نہیں لیتا۔ خواہش نرک (دوزخ) ہے جس میں انواع و اقسام کی تکالیف کا ہجوم ہے۔ خواہش کو چھوڑ دو اور سورگ (بہشت) کو حاصل کرو۔ اصلی خوشی کا حظ اُٹھاؤ۔

نرک (دوزخ) بھی تمہارے دل ہی میں ہے۔ اور سُورگ (بہشت) بھی تمہارے دل ہی میں۔ اگر خودی اور خودغرضی کا خیال دل میں سمایا ہوا ہے تو سمجھ لو کہ تم نرک میں ڈوب گئے۔ خودی کو چھوڑ دو۔ خودغرضی سے کنارہ کش ہو۔ اپنے اوپر وہ حالت طاری کرو جسمیں انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے جب تک تمہیں اپنے ذاتی مفاد مدنظر ہیں۔ اُس وقت تک خوشی پر نہیں مار سکتی۔ بلکہ اسطرح تم اپنے لئے بدنصیبی کے بیج بوتے جاؤ گے۔ اگر تم اپنے آپ کو دوسروں کی خدمت میں غرق کر دو گے تو تمہیں اصلی خوشی نصیب ہوگی اور مسرت اور انبساط کا پھل چکھو گے۔ خوشی محبت کرنے میں ہے محبوب بننے میں نہیں۔ خوشی خیرات دینے میں ہے، خیرات لینے میں نہیں۔ خوشی پنکھے کے نیچے ٹھنڈی ہوا میں سونے میں نہیں ہے بلکہ ایک خانماں خراب یتیم بیچارے کی گریہ و زاری سُنکر مدد دینے اور سہاتیا کرنے میں ہے۔ خوشی مصیبت زدوں کی خاطر پسینہ بہانے میں ہے، آرام سے سونے میں نہیں۔

خودی میں پھنسے ہوئے ہو تو سمجھ لو کہ رنج کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہو۔ خودی کو چھوڑ دو، اور شانتی کو آغوش میں لو۔ اطمینان قلب اُسوقت ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ تمہاری خواہشیں تمہارے بس میں ہیں۔ خودغرضانہ خواہش نہ صرف خوشی کو ہی برباد کرتی ہے بلکہ خوشی کے تمام ذرائع کو بھی تباہ کر دیتی ہے دیکھو جو لوگ زبان کے ذائقے میں پھنسے ہوئے ہیں وہ نت نئے لذیذ کھانوں کی فکر کرتے ہیں۔ تاکہ لذیذ کھانوں کے لالچ میں بھوک خوب لگے۔ لیکن اصل میں نتیجہ برعکس ہوتا ہے۔ لذیذ کھانا کھانے والوں کی بھوک مر جاتی ہے۔ انجام کار لذیذ سے لذیذ کھانا بھی اُنکو اچھا نہیں لگتا۔ وہ اکثر روزمرہ ہی بیمار رہتے ہیں، اور بدہضمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ اچھا۔ اب اُن لوگوں کو دیکھو جو اپنی بھوک پر قابو رکھتے ہیں اور کبھی لذیذ کھانوں کا خیال تک دل میں پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اُن کو نہایت ادنیٰ درجہ کے کھانوں میں بھی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی تم نے اپنے نوکر کو جَو کی روٹی شوق سے کھاتے ہوئے دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہے تو ضرور تم میرے قول کی تصدیق کرو گے۔ سچ تو یہ ہے کہ جسکو اپنی جان کے بچانے کی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے وہ جان سے جاتا ہے، اور جس کو اپنی جان کا خوف نہیں وہ عمر دراز تک زندہ صحیح و سالم رہتا ہے۔

لازوال خوشی اُسکو نصیب ہوتی ہے جو خوشی کی خودغرضانہ خواہش کا پیچھا نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس چیز کو ایک دن ہاتھ سے جاتا ہے اُس کو تم ہی پہلے سے کیوں نہ چھوڑ بیٹھو۔

جس عزیز چیز کے زبردستی چھن جانے سے تمکو رنج ہوگا اُسکو اگر تم خود ہی دے دو تو خوشی ہوگی۔ اپنی عزیز چیزیں مستحقین کو دیدو خود نقصان اُٹھاؤ اوروں کو فائدہ پہنچاؤ۔ نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی کہ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ تم امر ہو جاؤ گے۔ تمہارا نام جہان میں ابدالآباد تک باقی رہے گا۔ تمہیں لازوال خوشی نصیب ہوگی۔

کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ اصلی خوشی نیکی کرنے میں ہے' یا اپنے ساتھ نیکی کرانے میں؟ نہیں سوچا ہو تو اب سوچو اور سوچو ہی نہیں بلکہ نیکی کر کے دیکھو۔ اب خود اپنے دل میں اندازہ لگاؤ کہ تمکو نیکی کر کے خوشی حاصل ہوئی ہے' یا اپنے ساتھ نیکی کرا کے خوشی ہوتی ہے؟ جواب یہی دینا پڑے گا کہ خوشی نیکی کرنے میں ہی۔ خوشی روپیہ لینے سے نہیں ہوتی بلکہ محتاجوں غریب مساکین کو روپیہ دینے سے ہوتی ہے۔ خوشی خدمت کرانے میں نہیں ہے بلکہ خدمت کرنے میں ہے۔ خوشی قربانی کرانے میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی قربانی کرنے میں ہی۔

تم خام خیالی سے لازوال خوشی اُن چیزوں میں ڈھونڈ رہے ہو جو خود لازوال نہیں۔ جو جلدی تباہ ہو جانے والی ہیں۔ جو سدا جلدی ہی خراب ہو جاتی ہیں۔ اِن خراب ہو جانے والی جلد مر جانے والی اشیاء پر مفتوں نہ ہو بلکہ شیدا بنو تو ایسی چیز کے جو لازوال ہو۔ پس زوال یافتہ چیزوں کا دھیان چھوڑ دو اور "لازوال" سے ناتہ جوڑو جیسے جیسے تم اپنی خودی کو کچلتے جاؤ گے اور پاکبازی ایثار نفسی اور عوام الناس کے ساتھ محبّت کا جذبہ بڑھاتے جاؤ گے ویسے ہی ویسے تم وہ خوشی حاصل کرتے چلے جاؤ گے جو لازوال ہی۔ اور جو کبھی تمسے جدا نہیں ہو سکتی۔

جس شخص کا دل دوسروں کی محبّت میں ایسا غرق ہے کہ اپنے آپے کو بھول گیا ہے اور اپنے فوائد کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ وہ مبارک شخص لازوال خوشی کا ہی بھاگی نہیں ہوتا بلکہ اُسکو ایشوریہ گیان (معرفت الٰہی) بھی ہو جاتا ہے۔ اپنی گذری ہوئی عمر کے واقعات پر ذرا لمحہ بھر غور کرو۔ تم دیکھو گے کہ تمہیں انتہا درجہ کی خوشی اُسوقت ہی ہوئی ہے جبکہ تم کسی کے ساتھ مہربانی سے بولے ہو یا تمنے کسی دُکھی شخص کو دیکھکر ترس کھا کر اُسکو دکھ سے نجات دی ہو۔

اگر تم اپنی غیر مستقل خودی کو چھوڑ دو جو تمسے ہر وقت یہی کہتی رہتی ہے کہ جا بیجا طور پر اپنے فائدے کے متلاشی رہو تو تم فرشتوں کی قطار میں جا کھڑے ہو گے۔

اگر سُورگ (بہشت) میں داخل ہونے کے خواہشمند ہو تو ہماری بات سنو۔ اور سنو ہی نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرو۔ تم سب سے پہلے دوسروں کی نسبت اپنے خیالات کو درست کرو۔ پھر اگر کسی سے بولو تو بڑی مہربانی سے بولو۔ اور کام کرو تو ہمیشہ بھلائی کا کرو۔ اسطرح تم ایک دن بہشت میں داخل ہو سکتے ہو۔ بہشت کسی اور جگہ نہیں ہی بلکہ اِسی جگہ ہے۔ یہ اُس شخص کی جاگیر ہے جو عادتاً خود فراموش ہے۔ یہ اُسکو ہی نصیب ہوتا ہے جسکا دل بغض کینے عداوت وغیرہ کی آلائش سے پاک ہی۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ دینے سے خوشی ہوتی ہے لینے سے نہیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اگر کوئی چیز دیکر تم اس بات پر آزردہ ہو کہ لینے والا تمہارا مشکور نہیں ہوا یا اُس نے تم سے چاپلوسی کی باتیں نہیں کیں یا تمہارا نام اخبار میں لکھوا کر چار دانگ عالم میں مشہور نہیں کیا۔ تو سمجھ لو کہ تم نے جو کچھ دیا تھا اُسکی تہ میں خود پسندی تھی' محبّت نہیں! تمنے اِسلئے دیا تھا کہ معاوضے میں کچھ لو۔ یہ دینا نہیں کہلاتا۔ بلکہ دوسرے سے چھیننا کہلاتا ہی!!!

یہ آخری الفاظ یاد رکھو اور دل پر نقش کر لو کہ تم اوروں کی خیر خواہی میں اپنے آپکو مٹا دو جو کچھ کرو کرتے ہوئے انانیت کا خیال نہ آنے دو لازوال اور اصلی خوشی کا پوشیدہ راز یہی ہے ہمیشہ محتاط رہو اور خودی کا دخل دل میں نہ ہونے دو۔ ایثار نفسی اپنا اصول بناؤ۔ پس تم اعلیٰ درجہ کی خوشی کی چوٹی پر پہنچ جاؤ گے۔ وہ خوشی ایسی ہوگی جسپر غم و اندوہ کا بادل نہیں چھا سکتا۔ اور تم ایسی خوشی میں رہ کر "لازوال آتما" بن سکتے ہو۔

ڈپٹی لال نگم

شاہنامہ فردوسی طوسی

مشہور بات ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے حکیم فردوسی سے شاہنامہ مرتب کرایا اور بوجوہات چند اُسکو دل شکستہ کر دیا۔ ان امور کی تفصیل یہاں بیان کرنا فضول ہے۔ ہمکو صرف شاہنامہ کی تاریخ لکھنی ہے۔

سلطان محمود کے انتقال کے بعد غزنی میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی اور ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ فردوسی کی جاں کاہی اور سلطان کے شوق کا نتیجہ شاہنامہ سلامت رہ جاتا۔ چنانچہ اسی بنا پر علامہ لطف علی خاں آذر نے اپنے آتشکدہ آذر میں لکھدیا:۔

"حالائی تواں گفت کہ دریں کتاب شعرے از فردوسی باقی ماندہ باز انچہ ماندہ بمقابل اشعار فصیح بلغاء و افکار بلیغ فصحاء دہر باب شعر خوب و سخن مرغوب دارد" علامہ ممدوح کی اس تحریر سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کے وقت میں شاہنامہ کے اشعار ایسے خلط مبحث ہو گئے تھے کہ اصل کو نقل سے جدا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

ایک وقت میں اہل ایران کو تدوین شاہنامہ کی جانب خیال ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سی جلدیں مرتب ہو گئیں۔ مگر کسی میں کچھ کم تھا اور کسی میں زیادہ۔ اب ہم بتلانا چاہتے ہیں کہ شاہنامہ کی کامل ترتیب کا سہرا کس کے سر رہا اور موجودہ شاہنامہ کی تدوین کیسے ہوئی۔

بعد شاہ عالم دہلی میں کوشش کی گئی تھی کہ جس قدر نسخے موجود ہیں سب کو جمع کر کے ایک عمدہ اور صحیح نسخہ مرتب کر دیا جائے مگر عبدالقادر خاں روہیلہ کی شورش اور چند اسباب سے یہ امر معرضِ التوا میں رہا۔ قسّام ازل نے اسکا شرف سلطان نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی قسمت میں لکھا تھا۔ اُس نے خود ہی ارادہ کیا اور وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا۔ ذیل میں اُن تمام نسخوں کی تفصیل درج ہے جو شاہ اودھ نے فراہم کر کے ایک نسخہ (موجودہ شاہنامہ) مرتب کیا۔

پہلا نسخہ مولانا عبدالرحیم بن مولانا عبداللہ القریشی کا لکھا ہوا سنہ ۱۰۲۱ھ کا دستیاب ہوا۔ یہ ایرانی خط میں تحریر تھا اور اس میں ۵۱۲۴۳ اشعار تھے۔ نہایت صحیح۔ عمدہ اور مطلّا تھا۔

دوسرا نسخہ۔ ایرانی خط میں نہایت عمدہ اور صحیح لکھا ہوا محمد حافظ رہتکی کے قلم کا۔ اس میں اشعار کی تعداد ۴۷۵۲۰ تھی اور سال رقم سنہ [illegible] ہجری تھا۔

تیسرا نسخہ نجد میں بخط نسخ لکھا گیا تھا۔ یہ بھی صحیح اور خوش خط تھا اشعار کی تعداد ۵۰۵۰۰ تھی اور سال رقم سنہ [illegible] ہجری۔

چوتھا نسخہ خطِ نستعلیق نسخ نما میں ایران کا لکھا ہوا تھا۔ صحت کے اعتبار سے غیر درست اور کل اشعار ۵۶۶۵۰ تھے۔ سال رقم سنہ [illegible] ہجری۔

یہ چاروں نسخے آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلطان نصیر الدین حیدر کو ارسال کئے تھے۔

ایک نسخہ سید التفات حسین خاں صاحب کا جمع کیا ہوا دستیاب ہوا۔ اس کا کاتب حاجی علی شیرازی المخاطب بہ کاتب مسجل تھا۔ یہ سب سے زیادہ صحیح اور مستند تھا۔ خط لاجواب اور نہایت عمدہ مینا کاری ہر صفحہ پر تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مہر تھی۔ اور اشعار تعداد میں ۵۲۱۳۳ و سال رقم سنہ ۱۰۹۹ھ تھا۔

ایک نسخہ مسٹر ریکس نے نذر کیا تھا۔ یہ بھی ایرانی خط میں تحریر تھا اور اسکا کاتب عبدالصمد بن علی محمد الحسینی ایک مشہور ایرانی تھا۔ ہر طرح صحیح اور قابل اعتبار تھا۔ اشعار کی تعداد ۴۹۰۸۲ اور سال رقم ۱۰۲۱ھ ۔

دو نسخے منتظم الدولہ نے بھیجے تھے۔ ایک اُن میں سے نہایت صحیح اور خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا۔ اور دوسرا متوسط درجہ کا تھا۔ پہلے میں ۵۵۰۹۲ اور دوسرے میں غالباً ۵۰۰۰۰ اشعار تھے۔

ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ سے آیا۔ اس کا خط نہایت عمدہ اور طلائی کام تھا۔ نظام بن محمد شیرازی کاتب اور سنہ رقم ۹۹۶ھ تھا۔ ۵۱۱۳۳ اشعار تھے۔

ایک نسخہ مڈلیٹن صاحب نے بھیجا تھا۔ اس کا کاتب ابن حسن نورالدین اصفہانی تھا۔ کتابت و صحت میں متوسط۔ اس میں ۵۲۹۱۱ اشعار تھے۔ اور ۱۰۰۱ھ میں لکھا گیا تھا۔

ایک نسخہ راہس صاحب نے بھیجا تھا۔ اس کا کاتب عبدالکریم بن عبدالنبی جونپوری تھا۔ کتابت و صحت دونوں عمدہ تھیں سال رقم ۱۰۲۰ھ تھا۔

ایک نسخہ لیمر صاحب کے پاس سے آیا تھا مگر اس میں ایک لاکھ اشعار شروع کے گشتاسپ نامہ اسدی کے اور دوسری داستانیں فردوسی کی تھیں۔ خط بہت اچھا اور طلاکاری خوب تھی۔ سال رقم ۹۹۶ھ ہجری تھا۔

ایک نسخہ ایرانی خط میں لکھا ہوا نہایت معتبر و خوشخط جس میں ۵۰۰۰۰ اشعار تھے اور سال رقم ۹۴۹ھ تھا۔

ایک نسخہ محمد خان قزوینی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت ہی خوشخط اور مطلا کار۔ یہ ایسا نفیس و پاکیزہ تھا کہ اُسکو تمام جمع شدہ شاہناموں کی عروس کہا جاسکتا ہے اس میں ۴۰۰۲۰ اشعار تھے۔

ایک نسخہ ایرانی خط میں نہایت خوشنما لکھا ہوا جسمیں ۸۷۹۱۱ اشعار تھے۔ گویا بہت زیادہ تھے۔ سات ہزار بیتیں بغداد شریف کی تعریف میں بھی تھیں۔ سال رقم ۱۰۸۰ھ ۔

ایک نسخہ میں ابتدائے حکمرانی کیکاؤس سے لیکر لہراسپ تک کا حال لکھا ہوا تھا۔ مگر صحت قابل اعتماد تھی ۱۰۱۱ ہجری سال رقم تھا۔

ایک نسخہ میرزا علی اصفہانی نے بھیجا تھا جس میں ابتدا سے ہجیر کا گودرز کے پاس کیخسرو کا خط لیکر آنے تک صحیح واقعات مندرج تھے۔

ایک نسخہ آنریبل مسٹر ملول نے بھیجا تھا۔ اس میں سوسن رامشگر کے قصہ سے لیکر آخر تک واقعات ہیں۔ جب ان تمام نسخوں کو دیکھا گیا تو بڑا فرق نظر آیا۔ لیکن نہایت محنت و وقت سے سب شاہناموں کو سامنے رکھکر اُس زمانے کے علما نے ایک اصح نسخہ مرتب کیا۔ اور اسطرح سے سیکڑوں برس کا اختلاف دور ہو گیا۔

ایران پر سب سے بڑا حق ترتیب شاہنامہ کا تھا کیونکہ وہیں اسکی نشو و نما ہوئی لیکن قدرت نے یہ فخر ہندوستان کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ اسی صحیح نسخہ سے غالباً منشی نول کشور نے شاہنامہ طبع کیا، اور اسی کی نقل آقا سمیع شیرازی ایران لے گئے جن کے محررہ نسخہ سے ۱۹۰۶ء میں ایک عالم ایرانی آموزندہ شیر مرد فارسی ایرانی نے بمبئی میں بذریعہ فوٹو لیتھو شاہنامہ چھاپا۔ اسکی تقطیع ۱۷×۲۱/۱ اور قیمت عسہ تھی۔

بعہد سلطان عالم واجد علی شاہ مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور لکھنوی نے سرور سلطانی کے نام سے شاہنامہ کو اردو نثر کا مقفٰی و مسجع لباس پہنایا۔ انگریزی، ہسپانوی، اور فرنچ زبانوں کے ترجمے کا مجھے بھی علم ہے۔ ممکن ہے کہ اور یورپین زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے ہوں۔

جھولنا محل - گورداسپور پنجاب

انڈین پریس الہ آباد

اہلِ علم جانتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش نظم فارسی سے آج تک شاہنامہ کے برابر کوئی کتاب زبردست نہیں لکھی گئی۔ اہل یورپ کی سرمایۂ ناز کتاب ہومر کی آلیڈ۔ اور اہل ہند کی مہابھارت ہے۔ اسیطرح اہل ایران شاہنامہ فردوسی کو افتخار کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ فارسی زبان کے مستند اُستادوں نے فردوسی کو کامل الفن تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ حکیم انوری کیسے مہذّب و مودّب الفاظ میں لکھتا ہے۔ ؎

آفریں بر روان فردوسی آن ہمایوں نہاد فرخندہ
اوکہ اُستاد بود ما شاگرد اوخداوند بود ما بندہ

انوری وہ شخص ہے کہ جمہور نے اُسکو پیغمبر سخن مان لیا ہے۔ اس کے علاوہ اُستاد الاساتذہ حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد کہ رحمت بران تربتِ پاک باد

خدائے سخن مولانا نظامی رح ارشاد فرماتے ہیں ؎

سخن گوے پیشینہ دانائے طوس کہ آراست روئے سخن چوں عروس

یہ سب بزرگ فن شاعری کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے اس لئے انکی رائے بہت زیادہ وزن دار ہے۔ آج کل انگریزی تعلیم کے پیچھے ہندوستانی ایسے پریشان ہورہے ہیں کہ علوم نفیسہ فارسی، عربی و سنسکرت کی جانب کوئی توجہ نہیں۔ افسوس کہ اہل مغرب ان علوم کو شوق کے ساتھ پڑھیں اور ہم لوگوں کی یہ حالت ہو۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ز خاک مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی ست

محمد شفیع الدین خاں

عالمِ خیال کے چوتھے رُخ کا ایک نظارہ

"عالمِ خیال" کے نام سے مسلسل چار نظمیں منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی کی تصنیف کی ہوئی، مختلف رسالوں میں اشاعت پذیر ہوچکی ہیں، جن کو ایک ہی زنجیر کی چار کڑیاں کہنا زیبا ہے۔ یہ لاجواب نظمیں اگر کسی ایک ہی رسالے کے حصّے میں پڑی ہوتیں، تو طالبان سخن کو جستجو کی دشواری نہ پیش آتی جن کی نگاہیں ایک نظم کو دیکھکر بیتابانہ سب نظموں کی جویا ہوتی ہیں۔

مجھے بے انتہا فرحت اس امر سے ہوئی کہ "چوتھا رُخ" ان نظموں کا الہ آباد کے رسالہ "ادیب" میں نکلا ہے۔ وہ میری رائے میں اُن تمام خوبیوں کے اعتبار سے جو ایک رسالے میں مجتمع ہونی چاہئیں، ہندوستان کے اُردو رسالوں میں بلند ترین پایہ رکھتا ہے درحقیقت چاروں نظموں کا اتفاق رسالۂ "ادیب" ہی کو تھا جسکی تصویر نے جو "عالمِ خیال" کے نام سے شائع ہوئی تھی، سحر بیاں سخن سنج کے خیال کو ان نظموں پر آمادہ کیا تھا۔ معلوم نہیں کہ کیا اتفاقات ایسے پیش آتے گئے جن کے سبب سے موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی، اور موتی بکھر گئے۔

حصّہ اوّل پر مسٹر شبیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا نے، حصّہ دوم پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا نے، اور حصّہ سوم پر سیّد مقصود علی صاحب (دسیولی) وکیل نے ریویو تحریر فرمایا ہے۔ ہر ریویو اپنے حصّہ نظم کی شاعرانہ خوبیوں اور اس کے لطیف جذبات کا معقول شارح ہے، اور اشعار کے ربطِ باہمی کو آشکارا کر کے ہر طرز بیان کی ضرورت کو عالم خیال سے عالم ظہور میں لا رہا ہے۔

دو قابل بیرسٹروں کے نظارے معمولی نہیں ہیں۔ اُن کی وسیع نگاہیں انگریزی کے مذاقِ فطری اور جذبات انسانی کو اپنے دماغوں اور دلوں میں مجتمع کئے ہوئے ہیں، اور اُن کے فلسفیانہ خیالات کی جولانیاں فلسفۂ اخلاق و معاشرت کے مراحل کو طے کر چکی ہیں، جنکا میدان بہ نسبت اُردو و فارسی کے انگریزی علم ادب کی قلمرو میں وسیع تر ہے۔ لہذا نظموں کی اِن خوبیوں پر جو فیصلے اُن دونوں کے ہیں، وہ ناطق ہیں۔

ہر دو قابل بیرسٹر تحریر فرماتے ہیں کہ ایسے جذبات کی مسلسل نظمیں انگریزی میں بھی نہیں ہیں۔

ہر سہ ریویو نگار تسلیم فرماتے ہیں کہ اُردو میں اس قسم کی دلفریب نظموں کے موجد حضرت شوق قدوائی ہی ہوئے ہیں، جنھوں نے فصیح زبان، لطیف بیان، فطری جذبات، اخلاقی خیالات، اور ایشیائی طرز معاشرت کی دلکش اداؤں کے ساتھ عفت مآب عورتوں کے جذبات دلی کو اسطرح دکھا دیا ہے کہ گویا زندہ صورتیں پیش نگاہ ہیں۔ آج یہ کمالِ سخن سرائی حضرت شوق قدوائی ہی کی ذات پر منحصر ہے، اور بس۔

اب مجھے اِن ہر دو امور پر بجز اس کے اور کچھ رقم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں قابل ریویو نگاروں سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔

جذبات انسانی اور فطری ہیجان طبعی پر فلسفیانہ اور سخن سنجانہ بحث فاضل بیرسٹروں نے ایسی قابلیت اور ماہیت کے ساتھ کی ہے نیز مذاق سخن اور اُس کے نکات کو اُنھوں نے اور پھر حضرت وکیل نے اس قدر خوبی اور پُر تجربہ دلائل کے ساتھ دکھایا ہے کہ اس صنف پر بھی گنجایش تحریر زیادہ نہیں باقی رہی، البتہ صرف ایک امر زمانۂ حال کی سخن سرائی پر غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ قدیم طرزِ سخن اور جدید طرزِ سخن دونوں کی صورتیں، اِس وقت بگڑی ہوئی کیوں ہیں؟

میری راے میں مطابع کی زیادتی۔ اور رسالوں کی کثرت سے ذرائع اشاعت میں آسانی ہوئی تو ناواقفانِ فن سخن سرا بن گئے۔ رسالوں کے ایڈیٹروں میں یا تو سخن سنج اور سخن فہم کم ہیں، یا صفحے بھرنے کو اگر ہے تو یہی سامان ہے۔ کریں کیا؟ لیکن پُر از اغلاط اور اصول علم و فن سے متجاوز نظموں کے شائع کرنے سے بجاے بہبودِ اُردو کے خرابی کے اسباب مہیّا کئے جاتے ہیں۔

اگر کبھی حشر شدنی ہے اور ہر شے یاراے سخن پائے گی تو زبانِ اُردو اور فنِ شعر کے خونِ ناحق کا محاسبہ انہیں حضرات سے ہوگا جو اغلاط اور بے اصولی سے ان کے گلوں پر جہل کی چھریاں بے رحمانہ پھیر رہے ہیں۔

خیر۔ وہ ہزار مخرّب ہوں، فن اُنکے زائل کرنے سے زائل نہیں ہو سکتا۔ سرزمین فن و سخن پر جنابِ شوق قدوائی کے سے یکتاے فن و سخن موجود ہیں۔ (خدا عمر میں بہت برکت دے) جن کی سحر بیانی نے "حسن" اور "عالمِ خیال" نیز اور بہت سی فطری مذاق کی بے مثل اور لاجواب نظموں سے سخن پرست دماغوں اور نگاہوں کو منوّر کر دیا ہے۔

اب میں اِن مباحث سے اپنے رخ کو اصل نظم یعنی "عالمِ خیال کے چوتھے رُخ" کی جانب پھیرتا ہوں جسکی لطافتوں اور خوبی بیان کی نزاکتوں نے میرے دماغ اور دلکو گرویدہ کر لیا ہے۔

{ شوہر نے خط میں لکھا تھا کہ میں آج کے بیسویں دن آؤنگا آج بیسواں دن ہے، }
{ عورت انتظار میں اپنے خیالات کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔ }

خط کو ہی بیسواں دن آج۔ آئینگے وہ "ضرور ہی" کیا میں کھنچی ہوئی رہوں "اُن" کی نظر سے دور ہی

لفظ "ضرور" پر "ہی" کا زور دیکے عورت نے اپنے یقین کو شوہر کے آج آنے پر مستحکم کر لیا۔ اب مصرعۂ ثانی کی بنیاد "عالمِ خیال" کے دوسرے رُخ پر ہے۔ وہ عورت کا حسرت ناک خط ہے جس میں وہ بہت سے شکوے اور طنز آمیز گلے شوہر کو تحریر کر چکی ہے۔ اسوقت سوچتی ہے

کہ کیا میں اُن شکووں کی بنا پر شوہر سے کچھ اظہار کشش کروں اور رد و رہوں۔

اس خیال کے ساتھ ہی جوشِ محبت نے جو باعصمت عورت کا خاصّہ ہے۔ اس کے دلکو تمنّا کی جانب پھیر دیا اور وہ اپنے خیال سے یوں اظہار مجبوری کرنے لگی۔

"اون" کی صدا سُنے۔ تو پھر۔ ہو نہ سکے جگر سے صبر پلکے "اُنھیں" کبھی نہ ہو ترسی ہوئی نظر سے صبر

باعفت عورت جو مصائبِ ہجراں میں سالہا سال مبتلا رہی ہے۔ یہ شعر اُس کے جوشِ تمنّا کی سچّی حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے "ترسی ہوئی" کے الفاظ نے اور بھی تمنّا کو قوت دی ہے۔ یہ جناب شوقؔ قدوائی ہی کے کمال سخن اور اُنھیں کی لطیف زبان کی سحرالبیانی کا حق ہے۔

عورت نے پھر اپنے دل سے ایک ایسا سوال کیا ہے، اور پھر خود ہی ایسا جواب دیا ہے کہ دونوں کا لطف میرے دل کو جنبش میں لا رہا ہے یعنی دل وجد کر رہا ہے۔ پہلا شعر سوال ہے اور دوسرا شعر جواب

کیا میں جگر کو تھام لوں۔ کیا میں نظر کو پھیر لوں؟ کیا "وہ" اُدھر سے آئیں۔ تو رُخ میں اِدھر کو پھیر لوں
اُن کی کشش میں آکے رُخ پھر نہ سکے تو کیا کروں دل سے کروں تو زور میں۔ دل جو جھکے تو کیا کروں

واہ! جناب شوق!! سبحان اللہ!!! شعر کیا فرمائے ہیں، منہ سے موتی اُگلے ہیں۔ میری عمر کا زمانہ بھی اشعار کو دیکھتے ہی گذرا ہے۔ لیکن ایسے فصیح اور دلکش اور باادا اشعار جن میں فطری اداؤں کے ساتھ جذبات کوٹ کوٹ کے بھر دئیے گئے ہوں، سوا ان نظموں کے نہ آج تک دیکھے نہ سُنے۔

شعر اول اپنے مصرعۂ اولےٰ سے کن فصیح اور سلیس الفاظ میں ارادۂ ضبط اور اس کی صورت کا اظہار کر رہا ہے۔ اور مصرع ثانی اُدھر اور اِدھر کے الفاظ سے آنے اور رُخ پھیرنے کی کیا دلاویز ادائیں دکھا رہا ہے

دوسرے شعر کی رفعت نے عرش معلےٰ سے ٹکر کی ٹھہرا دی۔ مصرع اولیں جس کشش سے رُخ کے نہ پھر سکنے کا اظہار کر رہا ہے، اس کا لطف اصحاب معنی فہم کے قلوب اثر پذیر سے پوچھا جائے۔ مصرع ثانی نے اور بھی قیامت کر دی۔ فرقت زدہ کا دل جو ناتواں ہو رہا ہے اُس کا زور کرکے تھک جانا۔ یہ ایسا حسنِ بیان ہے کہ اس سے بہتر اس موقع کے لئے اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اِس تھکنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رُخ کھنچکے سامنے ہو ہی جائیگا۔

کیا سوا جناب شوقؔ قدوائی کے اور کسی نے بھی اُردو کی شاعری میں ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ ایسا کمال سخن آفرینی ہے جس نے فصاحت سے زبان اُردو کو اور لطافت سے اندازِ بیان کو آج ہندوستان میں خلعت یکتائی پنھا دیا ہے۔

اب بہ مقتضائے فطرت عورت کو وہم نے گھیرا کہ مبادا آج شوہر نہ آئے تو کیا کہتی ہے۔

اور اگر نہ آئے "وہ" ہائے یہ شک ستم کا ہے آمرے دل میں او اُمید وقت ترے کرم کا ہے
شک سے پڑی ہیں سوچ میں ڈرتی ہوں یاس آنہ جائے اُس سے چڑھی ہوئی ہیں نہیں۔ وہ مجھے پاس آنہ جائے
آتے ہی یاس کا خیال۔ کانپ اُٹھی ہوں ڈرکے میں در نہیں دل میں۔ ورنہ آج بیٹھتی بند کرکے میں
یاس سے ہوں جلی ہوئی۔ اُسکو میں جھونکوں بھاڑ میں ہٹ مرے دل سے او شک آج۔ یاس ہے تیری آڑ میں

شعر اوّل کے مصرع اولیٰ میں "ہائے" نے حسرت انگیز خیال میں جان ڈال دی ہے۔ مصرع ثانی میں "اُمید" پکاری گئی ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس سے ایسی حالت میں قلب حزیں تسکین پا سکتا ہے۔ امید کو کرم کا وقت بتایا گیا ہے۔ "وقت" کا لفظ جو یہاں "ضرورت" کے معنی دے رہا ہے۔ اُس نے عجیب لطف پیدا کیا ہے۔ شعر دوم میں یاس سے خوف کا اظہار ہے جس کے خیال نے شعر سوم میں وہ لطافت پیدا کی ہے جو باعتبار حالت اور باعتبار سخن سنجی جس قدر مصرع اولی سے صورت حال ہے۔ اُسیقدر مصرع ثانی سے بلند پایہ ہے۔ یہ بیان کہ دلمیں دروازہ نہیں ہے ورنہ آج میں بند کرکے بیٹھتی تاکہ یاس نہ آسکے۔ کتنا رفیع مضمون اور کیسا دلفریب ہے۔ شعر چہارم میں جو لطف "جلی ہوئی" اور "جھونکوں بھاڑ میں" ان دونوں محاوروں سے پیدا ہوا ہے، جن

عورت کی بے تکلفانہ بول چال پیشِ نگاہ ہے، اس لطف کی داد دلوں سے لی جائے۔ اسی شعر کے مصرعِ ثانی میں شک یہ کہکر ہٹایا جاتا ہے کہ یاس تیری آڑ میں ہے۔ مضمون اور قافیہ دونوں کمالِ مضمون آفرینی کے قطعی دلائل ہیں۔ معمولی شاعر کا خیال نہ اتنی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ نہ اس کی زبان بندشِ مضمون کے واسطے ایسے فصیح اور سلیس الفاظ پاسکتی ہے۔ یہ قدرتِ کلام، قوتِ بیان اور لطفِ زبان جناب شوق، قدوائی، ہی کے مفتوحہ اور مقبوضہ ممالک ہیں جن میں اُنھیں کا سکۂ سخن چل رہا ہے، اور بس۔

اس کے بعد عورت نے اپنے دل سے سوال کیا ہے۔ اُس کا دل بول اُٹھا کہ آرہے ہیں۔ اور بہت سا چین میرے واسطے تحفہ میں لارہے ہیں۔ یہ معنی آفرینی کے لحاظ سے کیسا نیا۔ اور واقعے کے اعتبار سے کس قدر دلچسپ تحفہ ہے۔ غالباً جناب شوق قدوائی ہی نے صلاح دی ہوگی کہ ایسا تحفہ لے جاؤ جس کو دل قبول کرئے۔ اس لئے کہ سوا اِن کے ایسا نکتہ یاب دماغ فی زمانا اور کسی سخن گو کا نہیں ہے۔ جو ایسے تحفۂ لاجواب تک اپنے خیال کو پہنچا سکے۔

عورت کا دل بولکے آنے کی خبر دے چکا تو وہ اپنے یقین کا استحکام کیسے کیسے مسرت خیز خیالات سے کرتی ہے، اور کیا کیا فرحت انگیز شگون لیتی ہے!۔

دیکھ رہی ہوں آرسی۔ چہرے پہ رنگ آگیا　　دل نے کیا ہی سرخ رُو۔ ورنہ کہاں سے پاگیا
دلکو ملا کہاں سے رنگ۔ اِس کو ملا امید سے　　پائیگا یہ کچھ اور بھی۔ آج ہی اُنکی دید سے
کل مرے سر میں تھا جنوں۔ آج ہی کچھ غرور سا　　کل مرے دل میں تھا ملال۔ آج ہی کچھ سرور سا
اپنے لبوں پہ بار بار پاتی ہوں میں تبسم آج　　خوش ہوئے مرے لبو۔ کہتے ہو اور کچھ تم آج
گھر کی زمین جاگ اُٹھی صحن پہ نور چھا گیا　　آئینگے "وہ" ضرور ہی۔ مجھکو یقین آگیا

آرسی میں چہرے کے رنگ کو دیکھ کے کہتی ہے کہ یہ اُمید سے مِلا ہے۔ رنگِ امید کو شعرا نے الفاظ میں تو دیکھا ہوگا، مگر جناب شوق، قدوائی، نے اُسے چہرے پر نمایاں کردیا۔ گویا یہ رنگ حضرت ہی کے سخن لاجواب کے واسطے وضع کیا گیا تھا۔

شعرِ سوم میں لفظ غرور جو لطیف اور بلند معنی دے رہا ہے اُسکی داد یارائے قلم سے زیادہ ہے۔ اور اُسی کے برابر کا قافیہ سرور ہے جسکا سرور دلِ سخن فہم سے پوچھا جائے۔ عورت کی فطرت کا یہ خاصہ کہ شوہر پر اُسکو گھمنڈ ہوتا ہے، اس فصیح اور لطیف شعر نے ظاہر کردیا۔

شعرِ چہارم میں لبوں پر بار بار تبسم کا آنا بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی مسرت دلی کی فطری روش ہے۔ اسی شعر کے مصرعِ ثانی میں لبوں کی جانب مخاطب ہوکے یہ کہنا کہ "کہتے ہو اور کچھ تم آج" کس قیامت کا ٹکڑا ہے۔ اس کو جواہر کا ٹکڑا نہیں بلکہ دل کا ٹکڑا کہنا چاہئے۔ اور اسکا مزا بھی وہی دل پاسکتا ہے جس کو چاشنی مہر و وفا کے ساتھ چاشنی سخن بھی نصیب ہوئی ہو۔ صرف انھیں چھ الفاظ کی شرح لکھنے کا قصد کیا جائے، تو دماغ شش و پنج میں پڑجائے کہ کہاں تک اظہارِ مطالب کروں۔ یہ جناب شوق قدوائی ہی کا سخن گسترانہ دماغ ہے جسکو ناپیدا کنار بحر موّاج کہنا چاہئے۔

عورت نے شوہر کے آنے کا یقین دلکی شہادت اور شگونوں سے بہر نوع کر ہی لیا۔ اب وہ اُن نازوں کی جانب اپنے خیالات کو منتقل کرتی ہے جن کو وہ کام میں لانا چاہتی ہے۔ فی الحقیقت قدرت نے عورت کے دل و دماغ کی ترکیب ہی میں نازوں کو داخل کردیا ہے اور یہی ادائیں ہیں جو حرکات کرشمہ پرداز سے حسن کو قوتِ جاذبہ دیکے مردوں کے دلوں پر مقناطیسی کشش کا اثر ڈالتی ہیں۔ کیسی ہی حسین عورت کیوں نہ ہو، اگر اُسکی ادائیں دلفریب نہیں ہیں تو قوت جاذبہ نگاہوں سے گذر کر دلوں پر کم اثر انداز ہوسکتی ہے حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎ بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد حسن کا مسئلۂ فلسفیانہ ایسا وسیع ہے جس کی تحریر کا یہ موقع نہیں

دیوار چین

انڈین پریس الہ آباد

جسکو شوق ہو، وہ جناب شوق قدوائی کی مثنوی "حسن" کو دیکھے۔ جس میں حُسن کا وسیع فلسفہ ایسی رنگینی سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا گلہائے رنگا رنگ چمن زار اوراق پر کھلے ہوئے ہیں۔ اور اُس مثنوی کے فلسفہ کی تشریح حضرت برق بی۔ اے (آں جہانی) نے دیباچہ میں نہایت معقول کی ہے جس سے بلیغ مسائل کا فصیح بیانات سے انکشاف ہو گیا۔ ورنہ بہت لوگ مثنوی کو دیکھ کے فہمِ نکات سے محروم رہتے۔

بہرحال عورت نے قصد کر لیا کہ وہ دلفریب اداؤں کا جال شوہر پر ڈالے گی۔ اب وہ کہتی ہے:۔

دل تو خفا نہیں۔ مگر۔ میری نظر جھکی رہے   بعد کو بات چیت ہو۔ پہلے زباں رُکی رہے

اُس کی محبت، وفا، اور سرشت نیک نے اُس سے یہ کہلا دیا کہ وہ دل سے خفا نہیں ہے۔ اگر وہ اس امر کو ظاہر نہ کر دیتی تو ضرور اس کا برتاؤ قابلِ حرف قرار پاتا۔ اس لئے کہ شوہر اپنے خط میں (جو سلسلۂ عالمِ خیال کا تیسرا رُخ ہے) عورت پر یہ ظاہر کر چکا ہے کہ وہ بہ مجبوری ایک مدّت دراز تک پردیس میں رہا۔ نہ کہ بہ اندازِ بے وفائی۔ اور اُسی خط میں وہ چند در چند شکلوں سے عورت کے ساتھ محبّت اور اُسکی دل خوش کن یاد کا اظہار کر کے اُسکو تشفیاں دے چکا۔ اور یہ وعدہ تحریر کر چکا ہے کہ آج کے بیسویں دن وہاں پہنچیگا۔

اداہائے دل فریب کا اظہار بہت سے اشعار میں کیا گیا ہے۔ نیز نظم خود بھی بڑی ہے۔ اور ہر شعر اس کا ایک کرشمۂ ہوش رُبا ہے۔ لہذا اب میں جابجا سے اس کے چند چند اشعار تحریر کروں گا تاکہ ریویو بہت طویل نہ ہو جائے جس کو جناب سحر البیاں کی پوری سحر بیانی کا نظارہ مدِّنظر ہو، وہ اس چوتھے رُخ کو الہ آباد کے بلند نام رسالۂ "ادیب" میں دیکھے۔ اور ہر چہار نظموں کی یکجائی کتاب کے واسطے حضرت شاکر میرٹھی ایڈیٹر "ادیب" سے درخواست کرے۔

اب عورت اداہائے ناز آفریں پر خیالات کو یوں دوڑا رہی ہے۔

بننے کو میں بنوں مگر۔ بن بھی سکونگی یا نہیں   تننے کو میں تنوں۔ مگر۔ تن بھی سکونگی یا نہیں

یہ الفاظ نکلے ہیں یا جناب شوق قدوائی کے قلم سے آبِ حیات کے قطرے ٹپکے ہیں۔ جو ہمیشہ اُردو کے ادب کو زندہ رکھیں گے۔

عورت اپنے جوشِ محبّت اور ولولۂ تمنّا کا اندازہ کر کے خود کہتی ہے کہ اظہارِ کشش کا تصنّع اُس سے بن بھی پڑے گا یا نہیں۔ یہ پس و پیش اُس فطری خیال پر مبنی ہے جو اوہام کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔

اب وہ مسرّتِ قلب سے کششِ مصنوعی کے مغلوب ہو جانے کا وسوسہ یوں ظاہر کرتی ہے۔

بن کے شگفتگی خوشی رُخ سے جو کھل پڑے تو پھر   لطف کے ساتھ کر کے میل اُن سے نظر لڑے تو پھر

ہونٹھ تو میرے بس کے ہیں انکو سکھاؤں جنگ میں   لیکن اڑاؤں کسطرح رخ سے خوشی کا رنگ میں

دل یہ کہیگا میل کر۔ لب یہ کہینگے۔ بول دے   حُسن کہیگا ہاتھ سے۔ تو مرے رُخ کو کھول دے

شعرِ اولیں میں شگفتگی کا چہرے سے کھل پڑنا کیا لطف پیدا کر رہا ہے یہ بالیقین فطری مسرّت ہے۔

شعرِ ثانی میں ہونٹھوں کو تعلیمِ جنگ۔ مگر رُخ سے رنگِ خوشی کے نہ اڑا سکنے پر مجبوری۔ یہ ایسی شاعرانہ لطافتیں اور نازک خیالانہ مضمون آفرینیاں ہیں جو جناب شوق قدوائی ہی کے دماغِ سحر آفریں اور زبانِ سحر البیاں کے واسطے اس زمانہ میں مخصوص ہیں۔

اب یہ شعر ملاحظہ ہو جو فصاحت، نزاکت، اور ادائے فطرت کا ایک گنجینہ ہے۔

بن کے بلائیں اُنکے سر آج پڑوں ضرور ہی   دل میں ہنسا کروں مگر مُنہ سے لڑوں ضرور ہی

"بنکے بلا" یہ ٹکڑا قلبِ اداشناس کو جو مزہ دے سکتا ہے اُسکی حد نہیں بیان کی جا سکتی، زبان کیا ہے معدنِ جواہر ہے۔ مصرعۂ ثانی ہو بہو تصویرِ فطرت ہے۔ اس کے بعد وہ کہتی ہے ؎

کچھ جو وہ کہیں۔ تو۔ یوں نہ لوں۔ لوں تو نہیں نہیں کے بعد   لاکھ رُکاوٹوں کے بعد۔ لاکھ چناں چنیں کے بعد

میں کہہ چکا ہوں کہ زبان معدنِ جواہر ہے، "یہ چناں چنیں"

کا قافیہ اُسی معدنِ جواہر کا ایک لعلِ بے بہا ہے۔ فصاحت، اور وسعت زبان کا خزانہ جتنا قدرت کے پاس تھا، گویا وہ سب اس عہد میں جناب شوق قدوائی ہی کی زبانِ سحر البیان کو عطا فرما دیا گیا ہے۔

بہت سے پر لطف اور اداہائے دلفریب کے اشعار اس موقع پر ہیں۔ لیکن خیالِ طوالت مانعِ تحریر ہے۔

اب عورت اس خیال پر مائل ہوئی کہ یہ تو جو کچھ ہوگا، ہوگا؛ آج مجھے کچھ سنگار تو ضرور کرنا چاہئے۔ کیسا طبعی خیال ہے، جو عورات کی سرشت میں گویا ودیعت ہے۔ سنگار کے واسطے طرزِ شوہر پسند اور اشیائے مناسب کے فراہم کرنے کا انتظام وہ اپنے تصوّرات سے کرنے لگی۔ اسی درمیان میں اُس کو ایک خیال نے گھیر لیا، جس کا اظہار وہ یوں کرتی ہے۔

ہو ہی رہے گا یہ تو سب، مجھکو خیال ایک ہے	ساس "چپ" و زبان چپ" نند ضرور نیک ہے

اس کے ناقص برتاؤ پر بے ساختہ اُسکی زبان کچھ کہنے کو تھی۔ مگر بہ پاسِ ادب اُس نے "چپ او زبان چپ" کہکر روک دیا۔ فطری بے ساختگی کو لحاظِ ادب سے کیا لطیف شکل اور کن عمدہ الفاظ سے روکا ہے کہ سبحان اللہ نند سے وہ بہت جلی ہوئی ہے۔ اُس سے اظہار کدورت "ضرور نیک ہے" ان طنزیہ الفاظ سے کیا گیا ہے۔

یہاں نند کی نسبت جو خیالات اُسنے ظاہر کئے ہیں، اُس کے دو لاجواب شعر میں ذیل میں رقم کرتا ہوں ؎

اسکی سی لبس کی گانٹھ اور کوئی نہ ہوگی شہر میں	رکھی ہے مُنہ میں اک چھری اُسنے بجھا زہر میں
جب وہ جلن سے لال ہو گال ہوں گرم دو توے	خود تو ہے لسن اور دانت جیسے چھلے ہوئے جوے

شعر اولین کا محاورۂ زبان اور اُس کے مصرع ثانی کی نفاستِ بیان اور لطافت معنوی ملاحظہ ہو۔

شعر دوم میں دونوں گالوں کی نسبت یہ ذہن انگیز مثال کہ جلکے گرم ہوں تو دو توے ہو جائیں۔ قابلِ داد ہے۔ اور اسی شعر کا مصرعِ ثانی اپنی دونوں تشبیہات سے لاثانی اور لاجواب ہے۔ یعنی وہ (نند) خود لہسن ہے اور اُس کے دانت چھلے ہوئے جوے ہیں۔ کیا ہجو ہے کہ اس سے بہتر ہجو اور نہیں ہو سکتی۔ تشبیہات بھی کتنی جدید ہیں۔ چھلے ہوئے کے الفاظ نے جوؤں کی ہیئت کذائی دکھادی۔ دانتوں کے واسطے یہ تشبیہ جدید کس قدر موزوں ہے۔ قدرتِ بیاں، قدرت زباں، قدرتِ معنی آفرینی یہ جملہ اصنافِ سخن سنجی جناب شوق قدوائی ہی کی اختیاری چیزیں ہیں۔ تشبیہات کیا عموماً مضامین تو آج اُنھیں کے دماغ بلند اور خیالاتِ ارجمند کے حصّہ میں ہیں۔

ذیل میں عورت نند کے حسد کا ماحصل ظاہر کرتی ہے۔ کہتی ہے

دیکھ کے یہ چمک دمک وہ مرے روپ سے جلے	ریت میں کوئی جس طرح جیٹھ کی دھوپ سے جلے

کیا لطافت اور کیا فصاحت ہے۔ کہ ان دونوں خوبیوں کے لئے یہ نظم سرمایۂ نازش ہے۔ چمک دمک کو دیکھ کے جلنا۔ اے سبحان اللہ مصرع ثانی تمثیلِ جدید اور لطفِ بیان کی رفعت پر پہنچ کے عرشِ معلےٰ سے باتیں کرنے لگا۔ ریت میں جس کی حدّت مشہور ہے اس میں جیٹھ (ماہ ہندی) کی دھوپ سے جلنا۔ اللہ رے کلام فصاحت نظام۔ یہ قدرتِ کلام اور قوّتِ زبان ہے جو بیان کو اوجِ سما پر لئے جا رہی ہے، معمولی شاعر کا خیال بھی ریت اور جیٹھ کے الفاظِ لاجواب تک رسا نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد سب سے آخری شعر ہے جو قلبِ اثر پذیر کے لئے ایک عجیب اور لطیف حیرت انگیز حالت پیش کرتا ہے۔ عورت اپنے منصوبوں ہی میں تھی کہ شوہر آگیا تو وہ کس حسرت، مگر کس نفیس پیرائے میں کہتی ہے ؎

اے لو حضور آگئے بندی سنورتی ہی رہی	تن نہ پڑا سنگار کچھ۔ حوصلہ کرتی ہی رہی

بندی کا لفظ کیا محاورے کا لطف دے رہا ہے۔ شعر استعجاب، تحیّر اور حسرت کی ایسی دلکش تصویر ہے کہ دل بے ساختہ اُسکی تاثیر کو قبول کرتا ہے۔

میں نے جس قدر داد دی ہے۔ یہ ایسی بلند پایہ اور لطیف نظم کو دیکھتے بہت کم ہے۔ جس قدر اُسکی لطافتیں اور کششیں جو فطری جذبات سے

بھری ہوئی ہیں، دل کو مسخر کرتی ہیں، اُسقدر داد دل ہی دے سکتا ہے زبانِ خامہ مجبور ہے۔ حضرت حکیم برہم نے بہت صحیح بات تحریر فرمائی کہ جناب شوق قدوائی کے سخن کی داد روح القدس سے ملتی ہے یعنی انسان کے قلم اور زبان سے اس یکہ تازِ میدانِ سخن اور سخن گستر سحر البیان کے اصنافِ سخن کی داد پوری نہیں ہو سکتی۔

میں ریویو کو ختم کر چکا۔ آخر میں خدا سے یہ دعا ضرور مانگوں گا کہ وہ جناب شوق قدوائی کو عمر دراز دے اور جسقدر لُطف ہم مشتاقانِ سخن کو اُن کی لاجواب نظموں سے حاصل ہو رہا ہے اُسیقدر لطفِ حیات اُن کو حاصل رہے۔ آج ملکِ ہند میں ایک یہی تو ہیں جنکی سخن سنجیوں کے گلہائے رنگا رنگ سے سرزمین سخن گلزارِ شاداب بنی ہوئی ہے۔ اور جن کی باآب و تاب اور لاجواب لفظوں کے سلسلے سے عقدِ مروارید کی دولتِ بے بہا خزینۂ اردو کو حاصل ہو رہی ہے۔

سیّد شبیر حسن

انقلابِ زمانہ

زمانہ کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کے اجزا کا مجموعہ پایا جائے یا اُس کے گزشتہ اجزا کا کوئی وجود قرار دیا جا سکے۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جس کے اجزا نہ موجود ہیں نہ معدوم، یعنی زمانہ کا وجود کوئی مستقل اور مخصوص شے نہیں ہے۔ زمانہ کا وہ حصّہ جسے ہم اُسکی رفتار کے لحاظ سے موجود قرار دیتے ہیں، وہ دراصل ایک غیر مستقل اور بہت جلد معدوم ہو جانے والا ہے۔ ہم اسی زمانہ کو زمانۂ موجودہ کہتے ہیں، جو ہماری آنکھوں کے سامنے اپنا دورہ پورا کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا معدوم ہو جاتا ہے کہ پھر اُس کے اجزا سے کوئی نشان نہیں ملتا۔ اگر ہم رفتارِ زمانہ پر غور کریں، تو ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ زمانہ بالذات کوئی مستقل شے نہیں ہے، یا زمانۂ حال اُسی غیر مستقل رفتار کا نام رکھا گیا ہے جو اپنے عدم استقلال کیوجہ سے بہت جلد معدوم ہو جاتا ہے جسطرح گلّی کا پہیّہ گھومتا اور چکّر کھاتا ہے، اور ایک چکّر ختم ہونے پر وہ معدوم ہو جاتا ہے، اور پھر دوسرا چکّر شروع ہوتا ہے اور وہ بھی پہلے چکّر کے نقشِ قدم پر چلکر معدوم ہو جاتا ہے، اُسی طرح زمانہ کی حالت کو خیال کرو۔

زمانۂ موجودہ اُس رفتار کا نام ہے جو نہایت سریع الزوال ہے اس حرکت اور تعلق کا نام خواہ خیالی حرکت اور تعلق رکھو، خواہ طبعی۔ جب زمانہ کا رنگ بدلتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی انسان کے حالات اور خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ یہ انقلاب صرف اسی جہت سے ہے کہ زمانہ اور انسانی خیالات اور حالات میں ایک تعلق اور نسبت ہے گویا انسانی خیالات اس نسبت اور تعلّق کے باعث زمانہ کے محکوم اور تابع ہوتے ہیں۔ جب زمانہ میں انقلاب آتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی انسانی خیالات میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، لیکن یہ خیالی انقلاب بوجہِ اتم زمانہ کے ساتھ منقلب نہیں ہوتا، کیونکہ زمانہ بعد انقلاب کوئی وجود اور شکل قائم نہیں کرتا ہے۔ نہ وہ مخصوص موجود رہتا ہے، اور نہ اس امر کا امتیاز کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اجزا کسقدر تھے، مگر انسانی خیالات اور حالات قائم رہتے ہیں، اور اُن کا وزن و مقدار خواہ وہ کسی دور دراز زمانہ میں ظہور پذیر ہوئے ہوں، بسہولت

وعمدگی معلوم ہوسکتا ہے۔ہم جو کسی گذشتہ اور معدوم زمانہ کے حالات وخیالات کو وزن کرتے ہیں، تو صرف اسی وجہ سے کہ وہ بذاتہٖ قائم تھے، اور اُن کی صورتیں ابھی تک معدوم نہ ہوئی تھیں۔ اگر خیالات وحالات بھی زمانہ کی طرح معدوم اور لاشے ہو جاتے، تو دنیا سے علم تاریخ ایسا شریف فن جاتا رہتا، اور کچھ بھی معلوم نہ ہوتا کہ ازمنۂ گزشتہ کے لوگوں کے کیا حالات وخیالات تھے، اور اُن کی طرزِ معاشرت کیا تھی، یا اُن کی سیاست وتمدّن کے کیا کیا طریقے اور ڈھنگ تھے۔ یہ صرف حالات کی قائمی ہی کا طفیل ہے کہ آج ہم پرانے سے پُرانے زمانہ کے لوگوں کی ذرا ذرا سی حقیقت وحالت سے واقف ہیں۔ انسانی خیالات وحالات صرف ایک ہی طریق سے کامل طور پر قائم اور برقرار رہ سکتے ہیں، اور وہ طریق "تحریر" ہے

جب زمانہ چکر کھاتا ہے تو اس چکر اور انقلاب سے لوگوں میں متعدد اور مختلف تاثیرات پیدا ہوتی ہیں؛ اور اُن تاثیرات کے اثر سے زمانہ گزشتہ کی بہ نسبت، وہ زمانہ جو اب چل رہا ہے، ہر بات میں جزوی طور پر مخصوص ہو جاتا ہے۔ زمانہ کی تاثیرات مراتب انسانی کے لحاظ سے اثر کرتی ہیں۔ اور یہ مراتب بالعموم تین اقسام پر منقسم ہیں، یعنی

ا۔ اعلیٰ۔

ب۔ ادنیٰ۔

ج۔ اوسط

اعلیٰ سے وہ اشخاص مراد ہیں جن کے دل مَیل وکدورت سے معرّا ومبرّا ہیں؛ اوسط وہ جن کے دل میں نہ زیادہ صفائی اور نہ زیادہ میل؛ اور ادنیٰ وہ لوگ ہیں جن کے دل بالکل میلے اور مکدّر ہوں۔

جب زمانہ پلٹا کھاتا ہے، تو یہ انقلاب اعلیٰ آدمیوں کے مصفّا دلوں میں عکس قبول کر لیتا ہے۔ اعلیٰ لوگوں کے قلوب کی مثال آئینہ سے دیجا سکتی ہے۔ مصفّا آئینہ کے سامنے جب کوئی شے آتی ہے تو فوراً اُسکا عکس پڑجاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ اعلیٰ آدمیوں کے دل ایک صاف وشفاف چشمہ کی مانند ہیں۔ جب پانی کے اوپر سے کوئی تیز پرواز جانور اڑتا ہوا چلا جاتا ہے، تو پانی میں اُسکا عکس ضرور ہی اُتر آتا ہے۔ اسی طرح تیز رفتار زمانہ کی تاثیرات کا عکس دلوں پر جم جاتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ آئینہ اور پانی پر ایک میعادی اور محسوس عکس بنتا ہے، اور صاف دلوں میں دوامی اور معقول۔

اور جن لوگوں کے دل کچھ کچھ مکدّر ہیں، ان میں اتنی جلدی اور صفائی سے زمانہ کے انقلابات کا عکس نہیں پڑتا، اور نہ وہ لوگ اسکی تاثیرات سے کسی خاص حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ اُن کے دل ایک گدلے تالاب کی مانند ہیں۔ اُس کے اوپر سے خواہ کتنے ہی جانور اڑتے چلے جائیں، وہ انکا عکس قبول نہ کرے گا۔ اس عدم انعکاس کا باعث صرف تکدّرِ قلوب ہے۔ اور جن کے دل بالکل مکدّر اور میلے ہوتے ہیں، اُن پر زمانہ کی تاثیرات و انقلابات کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ جسطرح کیچڑ کے اُوپر کسی جانور کو پکڑ کر بٹھایا جائے تو ایک کثیف شے ہونے کے باعث اس پر مطلق عکس نہ پڑے گا۔

ہندوستان کے حصے کا زمانہ کب کا الٹ پلٹ ہوگیا۔ اگلی تحقیقاتیں، پُرانی ریاضتیں اور مجاہدات، پُرانے طرز وطریق بالکل بدل گئے۔ ان کی جگہ پر زمانہ نے اور بھرتی کی۔ نئے نئے علوم وفنون، نئی نئی تحقیقاتیں، نئی نئی تدابیر وتجاویز ظاہر ہوگئیں۔ اس انقلاب سے وہ لوگ جن کے دل بالکل مُصفّا اور لطیف تھے، بیحد متاثر ہوئے وہ رفتارِ زمانہ کو پہچان کر اُس کے نقشِ قدم پر چلنے لگے۔ مگر وہ لوگ جن کے دل بہت صاف نہیں تھے، اس انقلاب اور الٹ پھیر کو دیکھ دیکھ کر تذبذب میں پڑ گئے؛ اور وہ اشخاص جن کے دل بالکل مکدّر تھے اس انقلاب کو دیکھکر ایسے مُتحیّر ہوئے کہ خود بھی پلٹا کھا گئے۔

بیگم کا روضہ (مٹھی گنج - الہ آباد)

"نہ ادھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے"

مندرجۂ بالا تحریر سے یہ تو واضح ہوگیا کہ انقلابِ زمانہ سے ہندوستانیوں کے دل بھی پلٹا کھا گئے، خواہ ان منقلبین کی تعداد کم ہی ہو۔ اب یہ سوال عاید ہوتا ہے کہ یہ انقلابات اور پلٹے اہلِ ہند کے حق میں مفید ہیں کہ مُضر؟ جہاں تک اس معاملہ پر غور کیا جائے، اور منقلبین کے حالات وخیالات کو دیکھا جائے، اور نیز انقلاب کے نتائج وتاثیرات کو وزن کیا جائے، ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا ہی ہماری ترقی وبہبودی کا موجب ہے۔ زمانہ نے جن باتوں اور جن رسموں کو اپنی تیز رفتاری کے باعث پیچھے چھوڑ دیا ہے، ہمکو بھی مناسب ہے کہ ہم انھیں چھوڑ کر زمانہ کے نقشِ قدم پر آگے کی طرف بڑھیں۔ اہلِ یورپ کی ترقی اور روز افزوں رونق کا باعث یہی ہے کہ وہ اپنی چال ڈھال کو زمانہ کی رفتار کے مطابق رکھتے ہیں۔ جدھر زمانہ کا قدم پڑتا دیکھتے ہیں، اُدھر ہی ڈھل جاتے ہیں جس طرف زمانہ جاتا ہے، خود بھی اُس کے پیچھے ہو لیتے ہیں جس طرح زمانہ چکر کھاتا اور اپنا دورہ کرتا ہے، وہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔

اگر اہلِ یورپ ہماری طرح اپنی آبائی رسوم پر اڑے رہتے، اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ موافقت ومرافقت نہ کرتے تو آج ایسی ترقی کا مُنہ نہ دیکھتے۔ وہی پتھروں کے کھنڈر، چمڑے کا لباس، اور بالونکی ٹوپیاں موجود ہوتیں۔ کچھ شک نہیں کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے کچھ تو اپنی ناداری کی وجہ سے اور زیادہ تر ناجائز آبائی تقلید سے اپنی بہتری وبہبودی کو اپنے ہی ہاتھوں معدوم اور زائل کر دیا، اور روز بروز کرتے جاتے ہیں۔ ہم صریحاً دیکھتے ہیں کہ فلاں رسم، جو محض ایک ڈھکوسلا ہے، ہماری ترقی اور بہبودی میں مانع ہے۔ مگر اتنا حوصلہ اور مجال نہیں کہ ہم اُسکو ترک کر جائیں۔ اُسی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں، اور فخریہ کہتے ہیں کہ "جب ہمارے بزرگ اور باپ دادے اس کو کرتے چلے آئے ہیں، تو ہم کیوں نہ کریں؟"

بعض لوگوں کا یہ مقولہ ہے کہ "آبائی رسوم کو ترک کرنے سے ہماری بدنامی ہوتی اور برادری میں ناک کٹتی ہے"۔ یہ عقل کے دشمن اور گانٹھ کے پورے یہ خیال نہیں کرتے کہ ہمارے بزرگوں اور اسلاف کے خیالات اپنی اور اُس زمانہ کی تحقیقات کے بموجب تھے۔ اُنکا زمانہ گزر گیا اور وہ خود بھی مٹی میں ملکر خاک ہو گئے۔ اس زمانہ کے داناؤں اور محققین نے اُن کے بعض خیالات کو ردّی اور پوچ ثابت کر دیا ہے، اور ان رسوم وخیالات کی غلطیاں دکھا دی ہیں تو کیا مناسب ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے خیالات کو، باوجودیکہ اُن کے بعض جزو اور حصّے غلط ثابت ہو گئے ہیں، اور اُن کی بعض مذموم رسمیں قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل کا درجہ رکھتی ہیں، محض اس خیال سے کہ وہ ہمارے بزرگوں کے افعال وخیالات ہیں، اُن کو جاری رکھیں، اور ان کو ترک کرنا موجبِ ذلّت اور ناک کٹائی سمجھیں؟ جب اُن کے اغلاط واسقام ظاہر ہو گئے ہیں تو کیا ضرور ہے کہ اب اُن کو مانا جائے۔ ہمارے بزرگوں اور باپ دادوں کا فعل اور حکم کوئی خدائی اور نبوی حکم نہیں ہے کہ ہم اس پر عملدرآمد کرنے پر مجبور کئے گئے ہوں۔ ہمارے بزرگوں کے تمام خیالات وعادات اپنے زمانہ کے مطابق تھے۔ اُن پر چلنے کے لئے انہیں کا زمانہ مخصوص تھا۔ اگر ہم اپنے بزرگوں کے خیالات اور اُن کے بزرگوں کے خیالات کا باہم مقابلہ وموازنہ کریں، تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بڑوں نے اپنے زمانہ کی رفتار کو دیکھکر اپنے بزرگوں کے بہت سے خیالات کو ترک کر دیا اور اُن کی جگہ پر نئے خیالات اور رسوم پیدا کئے۔ پس اسیطرح ہمکو مناسب ہے کہ ہم بھی انقلابِ زمانہ کو دیکھکر اپنے بزرگوں کی بعض رسوم کو جو اب غلط، ردّی، اور موجبِ نقصان ثابت ہوئی ہیں ماترک کر دیں،

اور اُن کی جگہ اس زمانہ کے مطابق پیدا کریں، تاکہ ہم بھی زمانہ کی تیز رو گاڑی کا ساتھ دے سکیں۔ جو شخص علمِ تاریخ سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ہر ایک زمانہ کے لوگ دوسرے زمانہ کے لوگوں سے طرز و طریق میں ہمیشہ علیحدہ اور جُدا رہے ہیں۔ پہلے زمانہ کے خیالات اور رسمیں دوسرے زمانہ میں برابر قابلِ ترک خیال کی جاتی رہی ہیں۔

برادران! اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں زمانہ پلٹا کھا چکا۔ ہمارے حالات بدل گئے۔ ہمارے بزرگ مٹی میں رل گئے۔ مگر کس قدر افسوس کی جاہے کہ ہمارے خیالات نے پلٹا نہ کھایا۔ یہ ہماری غلطی ہے اُس زمانہ کے ساتھ اسکی ساری باتیں بھی جاتی رہی ہیں۔ جب کسی نئی حکومت کا دور ہوتا ہے تو پُرانے آئین و قوانین یک لخت بدل جاتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کے عہد میں اگر کوئی شخص آئین اکبری کی تلاش کرے، تو محض حماقت ہے، پُرانا زمانہ بدل گیا۔ اب نیا دور جاری ہے۔ اُس زمانہ کے آئین و قوانین اس زمانہ میں کام نہیں دے سکتے۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس زمانہ کے مطابق چلیں۔

لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے ملکی بھائی سب رسموں کو ترک کر دیں، یا اپنے بزرگوں کے تمام خیالات و تحقیقات کو ردّی اور غلط سمجھیں۔ البتہ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُن رسوم و خیالات کو جن کی غلطی ثابت ہو چکی ہے اور جو قومی ترقی اور ملکی فلاح کی مانع ہیں، ترک کر دینا چاہئے جس طرح ہمارے بزرگوں اور بڑوں نے اپنے بزرگوں کی بہت سی رسوم کو رفتارِ زمانہ کے متضاد اور قومی ترقی و ذاتی بہبودی کے مخالف سمجھ کر ترک کر دیا اور بجائے اُن کے اُن رسوم و خیالات کو جگہ دی، جو زمانہ کی حالت کے بموجب اور ملک و قوم کے حق میں مفید تھے، ہم کو بھی ضرور ہے کہ ہم بھی اس زمانہ کی رفتار کو دیکھکر عمل کریں جس سے ملک و قوم کا بھلا ہو!

تعلیمِ نسواں

اِن دنوں تمام شائستہ ممالک میں تعلیمِ نسواں کا بہت زیادہ چرچا ہے۔ عام طور پر تعلیمِ نسواں کو مفید مانا جاتا ہے، مگر ہمارے ہندوستان میں اس مفید تحریک کی بھی مخالفت کی جاتی ہے۔ اور اس مخالفت کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب مستورات لکھ پڑھ جاتی ہیں تو وہ

۱۔ مغرور ہو جاتی ہیں

۲۔ اپنی مرضی پر چلنے لگتی ہیں

۳۔ شوہر سے بیباک ہو جاتی ہیں

۴۔ خانگی امور کی طرف بے توجہی کرتی ہیں۔

لیکن یہ اتّہامات بالکل بے بنیاد ہیں۔

جس اعلیٰ صفت کو غرور و تکبّر کہا جاتا ہے حقیقت میں وہ "بلند خیالی" ہے۔ علم سے ہرگز غرور پیدا نہیں ہوتا، بلکہ جو ہوتا ہی وہ بھی جاتا رہتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان ایک گہرے دریا کے مثال مطمئن اور بھاری بھر کم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی تعلیم یافتہ شخص مغرور

ہو تو اس کا موجب تعلیم نہیں ہوسکتی - البتہ تھوڑا علم اس کو مغرور بنا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ تھوڑے علم کو ہمیشہ مضر بتایا جاتا ہے - اگر لڑکیاں مغرور ہوجاتی ہیں، تو لڑکے اُن سے کہیں زیادہ مغرور ہوجاتے ہیں - روح دونوں میں یکساں ہے - طوطے کی طرح رٹ لینے کا نام علم نہیں ہے، اور اگر اسی پر کوئی مغرور ہوجائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس نے تعلیم کا بہترین حصّہ ابھی دیکھا ہی نہیں - پس یہ الزام دینا کہ تعلیم سے مستورات میں غرور پیدا ہوجاتا ہے، سراسر بہتان اور یک طرفہ ڈگری ہے - پھر یہ الزام اُس صورت میں کچھ وقیع بھی ہوسکتا اگر مردوں میں یہی بات نہ پائی جاتی اگر مستورات علم حاصل کرکے مغرور ہوجاتی ہیں، تو مردوں کے غرور کا کیا سبب ہے؟

دوسرا نقص یہ بتایا جاتا ہے کہ مستورات لکھ پڑھ کر اپنی مرضی پر چلنے لگتی ہیں - مگر اصل میں یہ نقص نہیں ہے - علم کا لابدی نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں اپنی نیکی و بدی، عزت و رسوائی وغیرہ میں امتیاز و شناخت کرنیکا مادّہ پیدا ہو کوئی وجہ نہیں کہ مستورات جہالت کی وجہ سے اپنے شوہروں اور دیگر لواحقین کی صلاح و مشورہ کی محتاج رہتی تھیں اب روشن ضمیر (تعلیم یافتہ) ہوکر بھی اُنہیں کی دست نگر رہیں - اگر وہ اپنے فیصلہ اور جانچ کے مطابق کسی کام کو کرتی ہیں، تو اسپر مردوں کو بگڑنا اور غصّہ ہونا نہ چاہیئے، کہ ہماری صلاح نہیں لی، ہمیں کچھ سمجھتی نہیں - اس غصّہ کے احساس کا الزام بیچاری عورتوں کے سر تھوپنا سراسر ظلم ہے - ہاں یہ اچھی بات ہے کہ اپنے بڑوں سے صلاح لی جائے، مگر اپنے آپ کو بالکل اُن پر چھوڑ دینا، کہ کوئی کام بھی اپنی مرضی سے نہ کرسکیں، نادرست ہے - اگر کوئی ایسا وقت آپڑے کہ شوہر نہو، اور گھر کا کوئی دوسرا آدمی بھی نہو اور کام بہت ضروری ہے، تو کس سے صلاح لیجائے - کیا عورت اپنے ہی فیصلہ پر عمل نہ کریگی؟ اگر ایسا نہو تو عورت کو "کٹھ پتلی" سمجھنا چاہیئے کہ جس رخ پر تار کو حرکت دی اُدھر ہی وہ ہوگئی -

"شوہر کو حقیر جاننا اور بے باک ہوجانا" یہ تیسرا الزام ہے - مگر میں سمجھتی ہوں کہ کسی تعلیم یافتہ اور شریف عورت کی یہ تعریف ہرگز نہیں ہوسکتی - جاہل اور ناخواندہ عورتیں ایسا کرتی ہیں، تو اس کا سبب اُن کے شوہروں کی بدسلوکی ہوتی ہے - اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جاہل عورتوں کی بہ نسبت تعلیم یافتہ عورتیں اپنے شوہروں سے زیادہ محبّت رکھتی ہیں - اب رہا بے باک ہونا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خوف و ہراس اُس کام میں ہوتا ہے جس کی بابت یہ علم ہو کہ وہ ٹھیک نہیں ہے، جب تعلیم حاصل کرنے کے بعد عورت نے اپنے بُرے بھلے کی تمیز سیکھ لی، تو وہ ہر ایک درست کام کو نڈر ہوکر کرتی ہے - حتیٰ کہ اگر اُس خاندان کا کوئی ممبر غلط راہ پر جاتا ہو تو وہ اس کو بھی خبردار کردیتی ہے - اگر اسی کو مرد کہتے ہوں کہ بڑی بیباک اور نڈر ہے ہمارے تابع میں نہیں رہتی، ہمیں نصیحتیں کرتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتی کہ یہ کس حد تک درست ہے -

سب سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ عورت لکھنے پڑھنے یا لٹریری کام کرنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی - بلکہ اُس کا یہ فرض ہے کہ اپنے شوہر کی خدمت کرے اور بال بچّوں کو سنبھالے[۵] - جو لوگ ذرا گھر سے خوش ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں پڑھ لکھ کر کچھ دفتر کا کام نہیں کریں گی، اور نہ ہمیں اُنکی کمائی کھانی منظور ہے، پھر ہم انھیں کیوں پڑھائیں - غریب کہتے ہیں کہ ہاں علم اچھی چیز ہے، لیکن اگر ہم اپنی لڑکیوں کو پڑھائیں، تو گھر کا کام کس طرح چلے گا - اور اگر گھر کی بڈھی عورتوں سے کہا جائے کہ اپنی ناتی پوتی کو تعلیم دلاؤ، تو اُنکی منطق نرالی ہوتی ہے - وہ فوراً یہی جواب دیتی ہیں کہ تعلیم پاکر

۵؎ "فرائض مستورات" کے باب میں کسی آئندہ نمبر میں اپنے خیالات ظاہر کروں گی - یہاں گنجائش نہیں -

لڑکیاں بے شرم ہو جاتی ہیں، آنکھوں پر ٹھیکرا رکھ لیتی ہیں، چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتیں، وغیرہ۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر کسی لڑکی میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، تو اس کا الزام علم پر نہیں لگ سکتا۔ علم سے تو بھلے بُرے کی پہچان ہو جاتی ہے، لیکن اگر کوئی علم کی صلاح پر نہ چلے تو اس میں علم کا کیا قصور؟

خورد و نوش کے باب میں بھی تعلیم کی بہت ضرورت ہے۔ تعلیم یافتہ عورت ہمیشہ وہی چیزیں پکائے گی اور اپنے بچّوں کو کھلائے گی جو موسم کے لحاظ سے مضرِ صحت نہوں۔ وہ کپڑے میں بھی اسی قسم کا لحاظ رکھے گی۔ بیماری کے دنوں میں ایسی واقفیت بے حد مفید ہوتی ہے۔ اگر تمام لڑکیاں اور عورتیں اس قسم کی واقفیت بہم پہنچا لیں، تو میں یقین کرتی ہوں، کہ بہت سی دُکھ بیماریاں دنیا سے جاتی رہیں گی۔ ایسا ہونا کچھ ناممکن نہیں ہے۔ علم میں بڑی بھاری طاقت ہے۔ اگر تمہاری لڑکیاں زیورِ علم سے آراستہ ہیں، تو تم خود دیکھ لوگے کہ اُن کا گھر بہشت کا نمونہ ہوتا ہے کہ نہیں۔

اس بات کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں، کہ بچّے زیادہ تر اپنی ماؤں کی نقل کرتے ہیں۔ جو قوم اعلیٰ درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے، مناسب ہے کہ اُس قوم کی عورتیں تعلیم یافتہ ہوں۔ جو باتیں بڑی محنتوں اور دقتوں کے بعد بھی اسکولوں میں حاصل نہیں ہو سکتیں، اُنھیں کو بچے کھیل کھیل میں اپنی ماؤں سے سیکھ لیتے ہیں۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہے تو اپنے بچّوں کو بھی بہت سی علمی باتیں باتوں ہی باتوں میں سکھا سکتی ہے۔ مثلاً کہانی کے پیرایہ میں بہت سی تاریخی اور مذہبی باتیں بچّوں کو سکھائی جا سکتی ہیں، جو ہمیشہ کے لئے اُن کے دلوں پر نقش ہو جائیں گی۔ مگر جاہل مائیں ہمیشہ اپنے بچّوں کو فضول اور بیہودہ کہانیاں[1] سناتی ہیں، جن سے کوئی خاص مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ البتّہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بُرائی کا بیج اُن کے دلوں میں بو دیا جاتا ہے۔ افسوس!

یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ مستورات یونیورسٹی کی ڈگریاں حاصل کریں۔ یہ حیثیت پر منحصر ہے۔ مگر ہاں، اتنی تعلیم ضرور ہونی

---

[1] ایک امریکن ڈاکٹر چارلز لنے (جو مدراس میں ویدانت اور یوگ کی تعلیم پا رہے ہیں) ایک ہندوستانی کے ساتھ گفتگو کی جسکا آخری حصّہ "انڈین ریویو" میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا تھا کہ "ہندوستانیوں کی بابت میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، کہ مجھے ہر ایک ہندوستانی کے منہ پر بزدلی اور ڈرپوکی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اپنی بیویوں کے سامنے تو وہ شیر کی طرح گرجتے ہیں، لیکن جب دفتر میں جاتے ہیں تو بے زبان بھیڑ بن جاتے ہیں۔ وہ اسقدر ڈرتے ہیں جسکی کوئی حد نہیں۔ انہیں خوف رہتا ہے کہ کہیں ہماری نوکری نہ جاتی رہے۔ برعکس اسکے امریکہ میں یہ حالت نہیں ہے۔ کوئی امریکن جب اپنے مالک یا پریزیڈنٹ روزولٹ اور لفٹنٹ کے ساتھ ملاقات کرتا ہے تو مرد بن کر اُن کے ساتھ دست پنجہ کرتا ہے۔ اسکی گفتگو میں کسی قسم کی بزدلی نہیں پائی جاتی۔ لیکن ہندوستان میں لوگ اپنے آقا کے سامنے ڈر اور خوف کے مارے تھر تھر کانپتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بزدلی اُن کی بے علم اور جاہل مائیں بچپن کے زمانہ میں اُنکے دلوں میں بھر دیتی ہیں۔ بد روحوں، جنّات، اور بھوتوں کی ڈرانے والی کہانیاں اُن کو سناتی ہیں۔ اس کا جلد دفعیّہ کرنا چاہئے۔ ہندوستانی مستورات کو عمدہ تعلیم کی بہت سخت ضرورت ہے تاکہ اُنکی زندگی کے کسی پہلو میں جہالت کا نام و نشان نہ رہے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے بچّوں کو ڈرانے اور خوف دلانے والی کہانیاں سنائیں اُن کے دلوں میں دلیری اور بہادری کا بیج بوئیں اور اپنے ملک کے بہادر لوگوں، اور بڑے بڑے نامی گرامی بادشاہوں، اور شہیدوں اور سنت لوگوں کی کہانیاں سُنائیں۔ اس مقصد کے حاصل ہونے کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے وہ خود اُن سے واقف ہوں۔ پس اہلِ ہند کو مناسب ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں میں عملی حصّہ لیں اور اپنی مستورات کو زیورِ علم سے آراستہ کریں۔ اور کوشش کریں کہ خوف اور ڈرنے کی بزدلانہ عادت اُنکے بچّوں میں پیدا نہ ہونے پائے۔"

مہنت نارائن ناتھ جی

انڈین پریس الہ آباد

چاہئے کہ وہ اپنے بھلے بُرے کو سمجھ سکیں، اپنے بچّوں کو عمدہ تعلیم و تربیت دے سکیں، اپنی مذہبی کتاب کو عمدگی کے ساتھ سمجھ کر پڑھ سکیں، اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو خط وغیرہ لکھ سکیں اور گھر کا حساب کتاب رکھ سکیں۔ اگر اس سے زیادہ تعلیم ممکن ہو تو اسکو حاصل کرنا چاہئے، ورنہ عام جہالت کے مقابلہ میں اتنا بھی غنیمت ہے۔

پُرانے زمانہ میں مستورات بھی مردوں کے ساتھ کام کرتی تھیں، یعنی علم پر اُنکو کافی عبور تھا۔ بعض عورتیں تو ایسی ہو گزری ہیں کہ اب اُن کے حالات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً سیتا جی نے جو جوابات رام چندر جی کو دیئے تھے، اُن میں صاف صاف منطق کی جھلک پائی جاتی ہے۔ نورجہاں اور زیب النسا، گزشتہ زمانہ کی مشہور بیگمات ہیں، جو علمی معاملات میں کسی طرح مردوں سے کم نہ تھیں۔ احمد نگر کی مشہور شاہزادی چاند بی بی کو بھی کافی شہرت حاصل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر زمانہ میں تعلیم یافتہ مستورات موجود تھیں۔ جب سے پٹھانوں نے حملے شروع کئے اُس وقت سے تعلیم نسواں کے باب میں غفلت ہونے لگی ہے۔ ورنہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں شروع سے ایسی جہالت رہی ہو۔

آج کل اس بات کی سخت ضرورت ہے اور یہ مناسب بھی ہے کہ مستورات کو تعلیم دی جائے تاکہ وہ

۱۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں کسی کی محتاج نہوں۔

۲۔ خانگی امور و معاملات کو درستی کے ساتھ انجام دے سکیں۔

۳۔ ہر ایک کام کو قاعدہ کے ساتھ کرنے سے اپنی اور اپنے بچّوں کی صحّت کو بحال رکھ سکیں۔

۴۔ وقت بے وقت اپنے بچّوں کا علاج معالجہ کر سکیں، اور ذرا ذرا سی بات میں ڈاکٹر کی محتاج نہوں۔

۵۔ اپنی قوّت ارادی کو قابو میں رکھ سکیں۔

غصّہ کرنا، ذرا ذرا سی بات میں بگڑنا اور لڑنا، بدمزاج ہونا، یہ سب بُرائیاں جہالت کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ جاہل عورتوں کی لڑائیاں آپ نے بھی دیکھی ہوں گی کہ کس طرح وہ عام شاہراہ پر کھڑی ہو کر گالیاں بکتی ہیں۔ تعلیم یافتہ عورتوں کے درمیان میں بھی جھگڑا ہوتا ہے۔ مگر آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی تعلیم یافتہ عورت راستے میں کھڑی ہو کر گالی بکتا تو درکنار، کوئی نا ملائم لفظ اپنی زبان سے نکالتی ہو۔ علم سے اُس نے جان لیا ہے کہ ایسا کرنا بُرا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ایک اعلیٰ اور مُہذّب قوم بنے تو سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دو۔ کیونکہ قوم اُسی وقت اچھّی ہو سکتی ہے جب کہ قوم کی مائیں تعلیم یافتہ ہوں گی۔ فقط

آر۔ ظہور الدین

جھولنا محل گورداسپور ۔ گرونانک کے زمانہ میں پنجاب میں کئی نامی بزرگ ہو گزرے ہیں۔ اُنہیں کے خاندان کے نام پر گورداسپور کا نام پڑا ہے۔ مشہور ہے کہ یہاں کی گدّی پر بیٹھنے والوں نے اپنے اپنے زمانہ میں طرح طرح کی کرامات دکھائی ہیں۔ اورنگ زیب بادشاہ کے عہدِ حکومت میں مہنت نارائن ناتھ یہاں کی گدّی پر براجمان تھے ذات کے یہ سارسوت برہمن تھے۔ اِن کے والد مہنت دیپ چند نے ایک عالیشان محل بنوانا شروع کیا تھا۔ اسوقت انکی عمر کوئی نو دس برس کی ہوگی۔ روایت ہے کہ کھیلتے کھیلتے یہ محل کے پاس چلے گئے۔ انھیں دیکھکر معماروں نے کہا "بابا جی! ہم ایسا مضبوط محل بنارہے ہیں کہ اگر ہاتھی بھی اسکی دیوار پر ٹکر مارے تو یہ ہرگز نہ ہلے" اتنا سُنکر مہنت نارائن ناتھ نے اپنا پیر دیوار پر جھکر ہلایا تو دیوار بھی ہلنے لگی۔ دیوار کو ہلتے ہوے دیکھکر آپنے سادگی اور بھولے پن سے کہا کہ "دیکھو دیوار تو ہل رہی ہے" یہ دیکھکر سب لوگ متعجب ہوے۔ معماروں کو حکم ہوا کہ اب دیواروں پر چھت نہ ڈالی جائے۔ اُسوقت سے ابتک یہ دیوار برابر ہلانے سے ہلتی ہے۔ دور دور سے لوگ اسکو دیکھنے آتے ہیں۔ اسی دیوار کا نام "جھولنا محل" ہے۔ تصویر میں جس دیوار پر چند آدمی اوپر نیچے بیٹھے ہوے ہیں، یہی جھولنا محل کی دیوار ہے۔ اس دیوار میں ۹ دروازے ہیں، اور وہ ستونوں پر یہ کھڑی ہے۔

ایشیائی شعرا کا کمال (۲)

اگر ہمارے زمانہ کے شاعران غرا گزشتہ کاملانِ فن و خدایانِ سخن کے کلام پر انصافاً نظر کریں گے اور غوامض و دقائق نزاکت و بلاغت سمجھیں گے (حالانکہ اب کوئی سمجھنے والا بھی نہیں) تو اپنی شاعری کی بساط اور دعویٰ ہمہ دانی پر افسوس کریں گے، اور حد درجہ نادم ہوں گے ؎۔

طرزِ کلامِ غیر کجا واں روش کجا نسناس را کسے نہ شمارد ز نوعِ ناس

رجالانِ سخن و مردانِ فن کا جیسا قحط موجودہ زمانہ میں ہے کبھی نہ ہوا ہوگا۔ پھر طرّہ یہ ہے کہ ایک ایک شاعر کوس لمن الملک الیوم بجا رہا ہے۔ اگر آج نہ صرف شعرائے عرب و فارس بلکہ بعض شعرائے اردو غالب و مومن کا کوئی نازک شعر مشتہر کیا جائے تو ہندوستان میں ایک بھی اس کا سمجھنے اور سمجھانے والا نہ نکلے گا۔ حال کو حجت نہیں لیجئے۔ بیدل ؎

بکدام فرحت ازیں چمن ہوس از فضولی اثر کشد
شبِ خوں بعمرِ خضر زنم کہ نفس شرابِ سحر کشد
نہ گرفت کردنہ آسماں سرِ راہ ہرزہ خرامیم
مگرم تاملِ نقشِ پا مژۂ بہ بینشِ نظر کشد
نہ شد آں کہ از دمِ گرمِ کس بہ تسلیٔ کشدم ہوس
بہ تپم در آئینہ چوں نفس کہ ز جوہرم تہ پر کشد

حضرت بیدل دوسری غزل میں ذہن کے شق کرنے والے اشعار فرماتے ہیں ؎

بنمودِ ہستی بے اثر چہ نقاب شق کنم از حیا
تو مگر بمن نظرے کنی کہ دمے عرق کنم از حیا
چہ کنم ز شوخیٔ طبع دوں قدحے نہ زد غرقم بخوں
کہ بہ بوسم آں لبِ لعل گوں سحرے شفق کنم از حیا

سبحان اللہ کیسی مشکل زمین اور کیسے بلند و نازک مضامین ہمارے شعرا بلکہ علمار و فضلار اگر ان کے سمجھنے کا ارادہ کریں گے تو ہیبت سے شبکۂ دماغ میں تشنج پیدا ہو جائے گا۔ ہم تو نکات بیدل حل کر چکے بلکہ اسی رنگ میں اپنی طبیعت کا نیرنگ بھی دکھا چکے، قصائد خاقانی کے مقابلہ میں قصائد لکھ چکے۔ غالب کے طرز پر ریختہ لکھ چکے۔ کبھی ناظرین ادیب کی نظر سے گزریں گے۔ حضرت غالب مرحوم کے کلام میں بھی کہیں کہیں بیدل کی ہوا ہے۔ پس کلام غالب وہ شخص حل کر سکتا ہے جو کلام بیدل حل کر سکے۔ مگر مجدد کے سوائے کوئی مرد میداں نہیں۔ ہاں پرائے مال پر "یا حسین" کہنے والے شعرا پیدا ہو رہے ہیں۔ اور لیجئے ؎

بحصولِ مقصدِ عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب
تو ز اشک آں ہمہ پس فہ قدمے ز آبلہ پا طلب
کفِ پائے حجلہ نشینِ ما بخیال کرد کمینِ ما
پئے آرزوئے جبینِ ما بچراغ رنگ حنا طلب
طلب تو بس بود آں قدر کہ ز معنئ بری اثر
مخودت اگر نہ رسد نظر بخیال ہیچ و صدا طلب
مپسند اے فلک آں قدر خللِ طبیعت و حشیم
کہ چو موجم آبلہ پائے غم نمِ انفعالِ گہر کشد
بسجودِ درگہش اے عرق تو زبے نمی منما تری
کہ مباد سعیِ جبینِ من بفشارِ دامنِ تر کشد

ناظم شروانی سیمرغ قافِ معانی یعنی خاقانی شاہ اختسان کے مدحیہ قصیدۂ تہنیتِ عید میں کہتا ہے ؎

روزہ پا اندر رکاب ایشان با ستقبال عید دستہا را از رکابِ مہِ عناں انگیختہ
برجہاں ایں نقرہ گیراں عید کردہ پیش ازانکہ صبح عیدی نقرہ خنگی زیرراں انگیختہ
عاریت بردہ زکامِ روزہ داراں بوئے مشک درلبِ خم کردہ از خم ضیمراں انگیختہ
در وداعِ روزہ گلگوں مے کشیدہ تا زخاک جرعہ چوں اشک وداعِ دلستاں انگیختہ
شاہدانِ آب دنداں آمدہ بر روئے آب فتنہ را از خوابِ خوش دنداں کناں انگیختہ
آہوے شیر افگنِ ما گاہ سیمیں زیر دست وزلبِ کاوش لعابِ لعل ساں انگیختہ
خوردہ می چنداں بکاسِ زر کہ بر قرطاس سیم خور طلسم زرباک زعفراں انگیختہ*
لعبتانِ چشمہا حیراں کہ ما بر تختِ نرد چشمہا از لعبتانِ استخواں انگیختہ
رقعہ ہمچوں قطب از شش جا بدو دو بر کعبتین از سہ شو پروین ز نقشِ فرقداں انگیختہ
دف ہلالِ بدر شکل و در خشکارستانِ او از حمل و زجدی و ثورش کارواں انگیختہ
راندہ چوں دامانِ شب چوں شب مومنہ بر جنب چرخ جادو آسا یک فوارہ از کتاں انگیختہ
بر سرِ دریائے نیلیں تیغ کانِ رونیاس تا جزیرہ رونیاسِ دلبراں انگیختہ

یہ قصیدہ کورس ایم - اے و منشی فاضل پنجاب یونیورسٹی میں داخل ہے - تمام قصائد خاقانی جو بی - اے کورس و منشی عالم میں داخل ہیں اور تمام قصائد جو بی - اے کورس الہ آباد میں داخل ہیں ہم نے حل کر دئیے۔ ایک ماسٹر اور ایک پروفیسر صاحب اٹھے اور ہمارے حل کردہ قصائد جو کورس بی اے الہ آباد میں ہیں اپنے نام سے داخل کر دئیے - لیکن انوریؔ اور عرفیؔ کے قصائد کو کیا کریں گے - جن کی غلط در غلط شرح کی ہے اور سررشتہ تعلیم کو گمراہ کیا ہے - طالب علموں اور معلموں کے گلے پر چھری چلائی ہی - ایک اور پروفیسر نے ہمارے حل کردہ قصائد خاقانی کورس منشی عالم کو ہتھیا لیا - افسوس ہے کہ ان بے مایہ "شرح کرنیوالوں" کو یہ خبر نہیں کہ کیا ایسا امر اہم چھپ سکتا ہے ؟ اگر عدالت دیوانی و فوجداری میں دعوے دائر ہوا اور اُن سے کہا جائے کہ اگر یہ قصائد تمہارے حل کئے ہوئے ہیں تو خاقانی کے کسی دوسرے قصیدے کا ایک ہی شعر حل کر کے دکھاؤ، تو معلوم نہیں کیا جواب دینگے - اچھا اگر مندرجہ بالا اشعار خاقانی کوئی صاحب حل کر کے ہمارے حبیب ادیبؔ میں چھپوا دیں تو ہم اپنے دعوے سے دست بردار ہوں گے - اب ہم اردو اشعار پیش کرتے ہیں مگر اُن کے سمجھنے کا بھی وہی رنگ ہو گا، جو خاقانیؔ اور بیدلؔ کے اشعار سمجھنے کا - کیونکہ چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک مُشت - نازک کلام کے سمجھنے کا کسی سر میں دماغ ہی نہیں - ورنہ مجددؒ کے بھیجنے کی خدائے تعالےٰ کو کیا ضرورت تھی -

حضرت غالبؔ مرحوم کا کلام دقیق اور سنگلاخ بتایا جاتا ہے - مگر حضرت حکیم مومن خاں صاحب مومنؔ مرحوم کا کلام تمام شعرائے اردو کے کلام سے نازک تر ہے - مومنؔ کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ اُن کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا - خوبی یہ ہے کہ کوئی اجنبی لفظ نہیں - نہ ترکیب پیچیدہ - نہ تتابع اضافات - تاہم عسیر الفہم اور دقیق - حمد میں فرماتے ہیں ؎

بچا دل آبلہ پائی کو کیونکر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دھمکا

نعت کی تشبیب میں بطور تعلّی فرماتے ہیں ؎

ورم ہو چارہ گرِ قبض تا بدستِ لئیم کیا ہو میں نے جو تجویز وزنِ مغز فلوس
گو وہ عصمتِ مریم ہو کثرتِ اولاد عقیمہ مجھسے سنے گر بیانِ شکلِ عروس
تبے وشت بزمِ طرب کثرت نتائج سے نہ کیوں ہو شکل حماری کو نادِ شکلِ عروس
حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر کرے معارضہ سر دفترِ عقول و نفوس
جو ہوں معالجِ مسلوں تو قابض ارواح کرے دعاے رواجِ طریقِ جالینوس

غزلوں کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اس کو | دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا
نسبتِ عشق سے ہوں نزع میں گریاں یعنی | ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا
چارہ گر اور بھی اچھا وہ کرے گا ٹکڑے | پر وہ شوخ جو پیوندِ گریباں ہوگا

اُنسے پرپوش کو نہ دیکھے کوئی | مجھکو مری شرم نے رسوا کیا
ہاں میں یہ رنگ کہاں آپنچے | آپ مرے خون کا دعویٰ کیا
جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے | رازِ مرا صبر نے افشا کیا
دعوئ تکلیف سے جلاد نے | روزِ جزا قتل پھر اپنا کیا

یہ اشعار ہمارے نزدیک تو بالکل صاف و شگفتہ ہیں مگر کوئی انہیں کو حل کرکے دکھائے۔ خاقانی اور بیدل کا کلام تو کجا جو حضرت حل قصائدِ خاقانی اور حل کلیاتِ غالب کے مُدعی ہیں وہ تو ضرور ہی حل کریں کیونکہ جب انھوں نے خود قصائد خاقانی حل کئے ہیں تو مندرجۂ بالا اشعار بھی خاقانی ہی کے ہیں کیوں حل نہ کریں۔ اور جب کلیاتِ غالب خود حل کیا ہے جو مومن کے کلام سے سخت ترین ہے تو مومن کا کلام کیوں حل نہ کریں۔

ہم آئندہ غالب کے بعض اشعار بھی جو اب تک حل نہیں ہوے اور ہم نے اسی دن کے لئے ان کو حل نہ کیا تھا پیش کرینگے ساری حقیقت کھُل جائے گی۔

انسان کو وہ کام کرنا چاہئے جو اُس کے قابو اور بساط کے موافق ہو۔ ورنہ رسوائی اور تکلیف سامنے دھری ہے ہمارے وطنی ماسٹر اور پروفیسر صاحب بخوبی آگاہ ہوجائیں۔ تصنیف و تالیف ایک جائداد ہے اس پر قابض ہوجانا یا غصب کرنا آسان نہیں آجکل برٹش عملداری ہے۔

احمد حسن شوکت

مولوی نظام الدین حسن، بی۔ اے، بی ایل

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گُل ہونے کے بعد اسلامی تمدن اور قابل مسلمان افراد میں جو ضعف اور کمی ہوگئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ غدر کے پر آشوب زمانہ کے بعد مسلمانوں کے سوکھے مگر پر قوت تنے اور چیدہ خاندانوں میں جا بجا جو چند افراد عالیہ کا ظہور رہا ہے وہ مغتنمات سے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی قوم مغلوب ہوکر غیروں کے قبضے میں آجاتی ہے تو بہت جلد اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ مغلوب و مفتوح قوموں کی طبیعت پر کسل غالب آجاتا ہے ان کا جوش و ولولہ سرد پڑجاتا ہے۔ فاتحانہ حیثیت سے گر کر مفتوحانہ حیثیت میں اضمحلال روبہ ترقی ہوتا ہے اور آخر کار وہ قوم گھٹنے اور مٹنے لگتی ہو پس ایک ایسے زمانہ میں اگر کسی مضمحل قوم میں کچھ قابل افراد پیدا ہوں تو وہ نہایت ہی عزت کے لائق ہوتے ہیں۔ مولوی نظام الدین حسن زمانۂ حال کے مسلمانانِ ہند میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اودھ کی مردم خیز خاک سے آپ کا بھی تعلق ہے۔ خاندانی وجاہت اور ذاتی لیاقت دونوں باتوں کے لحاظ سے آپ واجب العزت ہیں۔ آپ کے والد ماجد مولوی محمد حسن صاحب عرصہ تک سرکار انگلشیہ میں جج کے عہدہ پر ممتاز رہے اور وظیفہ لینے کے بعد حیدرآباد دکن کی عدالت العالیہ کی ججی پر سرفراز ہوئے۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپکی ابتدائی تعلیم تو پُرانی مکتبی طریقہ پر ہوئی لیکن چونکہ آپ کے والد ماجد

ایم نظام الدین حسن اسکوئر بی' اے - بی' ایل

انڈین پریس الہ آباد

اُس زمانہ کے عالمگیر تعصبات سے پاک تھے اس لئے انہوں نے مولوی صاحب ممدوح کو مکتبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم دلانا شروع کی اور مولوی صاحب قریباً تمام امتحانات میں اوّل یا کم از کم دوم درجہ حاصل کرتے اور انعامات جیتتے رہے۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد سے آپ نے ایف۔ اے کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اور کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری [illegible]ء میں حاصل کی۔ شروع ہی سے آپ کو کچھ وراثت سے اور کچھ ذاتی شوق سے قانون اور ریاضی کی طرف میلان تھا۔ چنانچہ آپ نے الہ آباد ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان ۱۸۸۰ء میں پاس کیا۔ اور ۱۸۸۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ ایل کا درجہ حاصل کیا اور لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا نے اسی اثناء میں آپکو صوبہ برار میں اسسٹنٹ کمشنری کا ممتاز عہدہ عطا فرمایا۔ اور ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۲ء تک آپ صوبہ برار میں اسسٹنٹ کمشنری وججی وغیرہ کے مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ سخت محنت وجفاکشی بچپن ہی سے آپکی طبیعت ثانی بن چکی تھی اسپر اعلیٰ درجہ کی دیانتداری اور فرائض میں انہماک ایسی خصوصیتیں تھیں جن سے اعلیٰ حکام انگریز اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں کی نظر میں آپکی نہایت عزت ووقعت قائم ہوگئی۔ چنانچہ محکمہ خارجہ گورنمنٹ آف انڈیا نے حیدرآباد دکن کی عدالت العالیہ کی ججی پر جس کے لئے اسوقت ایک سخت دیانتدار جج کی ضرورت تھی آپ کی سفارش کی اور مولوی صاحب ممدوح ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک یعنی تقریباً ۱۰ سال حیدرآباد کی ججی پر قائم رہے۔ اپنی دیانتداری اور انصاف کا سکہ آپ نے حیدرآباد میں ایسا بٹھایا کہ دوست دشمن سب آپ کی انصاف پژوہی وریاضیانہ تحقیق وتدقیق کے قائل ہوگئے۔ اور قانونی تبحر کے باعث آپ محکمہ وضع قانون ممالک محروسہ حیدرآباد دکن کے ممبر منتخب کئے گئے۔ چونکہ عوام الناس سنٹیمنٹ پسند ہوتے ہیں اور محض خشک حکیمانہ وفلسفیانہ تحقیق وتدقیق بمقابلہ نمائش وظاہرداری دنیاسازی ورعایت کے اُن کو چنداں مرغوب نہیں ہوتی بالخصوص دیسی ریاستوں میں جہاں درباردایوں اور سازشوں کے جال ہمیشہ پھیلے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً انقلابات کے بھونچال آتے رہتے ہیں اور جو شخص اِن درباردایوں اور سازشوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ کبھی ہردلعزیز نہیں بنتے۔ اس لئے ۱۹۰۲ء میں مولوی صاحب ممدوح حیدرآباد سے اپنے سابق عہدہ ڈپٹی کمشنری پر برار واپس چلے آئے اور ضلع یوت مل کی ڈپٹی کمشنری پر متعین کئے گئے ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے بسبب آپ کی اعلیٰ دیانتداری، جفاکشی اور سخت پابندی قانون وضابطہ کے آپ کو ریاست بھوپال کی وزارت مال پر بسفارش روانہ کیا جہاں آپ دو سال تک رہے اور ریاست کے تمام محکموں میں سخت دیانتداری اور فرائض کی انجام دہی پر آپ کا سارا زور رہا۔

بالآخر آپ نے قریباً ۲۵ سال کی مسلسل خدمات ومشقت ومشغولیت کے بعد ۱۹۰۶ء میں وظیفہ لے لیا۔ اور اپنے وطن کے قریب لکھنؤ میں اقامت اختیار کی۔ مولوی صاحب ممدوح کی زندگی وذاتی خصائص سے زمانۂ حال کے مسلمان نوجوان چند نہایت ہی اہم اور مفید سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

(۱) اوّل خصوصیت آپ کی چستی وجفاکشی ہے۔ ایام طالبعلمی وایام ملازمت میں آپ سخت محنت وجفاکشی کے پابند رہے اور ان آخری ایّام میں بھی جبکہ آپ اپنی زندگی کی دوڑ کے اختتام پر قریب آرہے ہیں اپنے فرائض ذاتی وقومی وملکی

ومشاغل علمی میں منہمک رہتے ہیں جسمانی طور پر گو آپ بہت قوی نہیں ہیں لیکن سستی وکاہلی سے آپ ہمیشہ مقابلہ وضد کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت اہل یورپ کا تو عام خاصہ ہے مگر اہل ہند اور بالخصوص مسلمانوں میں اس کی کمی پائی جاتی ہے ذرا سی بھی فارغ البالی وخوشحالی ہم کو محنت شاقہ وریاضت وفرائض کی انجام دہی سے روکتی ہے مفتوح ومغلوب قوموں کا سب سے بڑا مرض کسل واضمحلال ہوتا ہے۔ اسی لئے نبیؐ عرب اکثر یہ دعا مانگتے تھے کہ اعوذ باللہ من الکسل والہم شخصی وقومی ترقی کا راز چستی اور مسلسل کام کرنے میں ہے دنیا میں جتنے مشاہیر یا نامور شخص ہوتے ہیں اُن کی زندگی نہایت ہی محنت ومشقت ومصروفیت کی رہی ہے۔ زمانۂ حال ہی کے بزرگوں کو لو۔ مثلاً نواب وقار الملک جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ محنت ومشقت کی گویا کل ہیں۔ شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم۔ مولوی چراغ علی مرحوم۔ جنرل عظیم الدین خاں مرحوم وغیرہ۔ یہ لوگ اس قدر محنتی تھے کہ معمولی آدمی کو حیرت واستعجاب ہوتا تھا۔ اور انکی کامیابی وترقی کا راز اسی میں تھا۔

(۲) مولوی نظام الدین حسن صاحب کی دوسری بڑی خصوصیت سخت دیانت داری وبے لوثی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اس زمانہ کے افراد عالیہ میں بھی خال خال پائی جاتی ہے صاحبِ اختیار وسخت آزمائش کے عہدوں وکاموں پر رہتے ہوئے سخت دیانت دار رہنا اس زمانہ میں تو قریب قریب فوق العادت بات ہے۔ ایام سلف کے مسلمان البتہ اس میں بڑے ممتاز رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو سخت دیانت دار ہوگا وہ مسرف ہو ہی نہیں سکتا۔ ذرہ ذرہ اور قطرہ قطرہ کے لئے وہ اپنے کو خدا کا امانت دار وذمہ دار سمجھتا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح اس معاملہ میں غالباً ہندوستان بھر میں ایک عجیب الخلقت فرد ہیں۔ آپ نے اپنی تمام زندگی کے حرکات وواقعات، آمدنی ومصارف کی ایسی یادداشتیں رکھی ہیں جن سے جزئیات تک کا پتہ چل جاتا ہے۔ باقاعدہ طور پر کئی درجن حساب وکتاب کے رجسٹر سالہا سال سے آپ کے یہاں رکھے جاتے ہیں جس میں ہر لحظہ وگھنٹہ نہایت صحیح اندراج ہوتے ہیں اور جن کی صحت علم ریاضی کی سی صحت تک پہونچتی ہے۔ چونکہ یہ ایک نادر بات ہے اس لئے مولوی صاحب ممدوح کے اس طریقہ کو اکثر لوگ بنظر استعجاب دیکھتے ہیں۔ مولوی صاحب ممدوح کا دماغ حد درجہ ریاضی واقع ہوا ہے اور اس کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آپ ہر بات کو انتہا، ریاضی ومنطقی صحت کے ساتھ جانچنا ودیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ انتہا، ریاضی ومنطقی صحت پسند دماغ نہایت ہی اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسے یکطرفہ رُخ سے انھیں نتائج پر پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے جو اُس بڑے ریاضی داں کا ہوا جو ایک برات کے ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک ندی ملی۔ ریاضی داں نے جا بجا سے اُس ندی کے عمق ووسعت کو ناپ کے ایک اوسط نکالدیا اور حکم دیا کہ سب لوگ ندی کو عبور کرسکتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب ممدوح یکرخے شخص نہیں ہیں۔ شدت کے ساتھ ریاضی ومنطقی ہونے کے علاوہ آپ کا من سنس میں بھی اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ علی گڈھ کالج کے آپ ٹرسٹی بھی ہیں اور کالج کے حساب وکتاب کے آڈیٹر بھی ہیں۔ آپ کی رائیں نہایت بے مروت وبے لوث ہوتی ہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت ممدوح کی اسلامی سادگی واتقا ہے۔ آپ ضلع کے ڈپٹی کمشنر رہے جج رہے لیکن جمعہ کی نمازیں ہمیشہ مثل ایک معمولی مسلمان کے شریک ہوئے۔ امیر غریب سب سے

آپ کا یکساں برتاؤ ہے۔ ساری عمر نماز و اوقات کی پابندی آپ نے نہایت شدّت سے رکھی ہے۔

(۴) اولاد۔ ممدوح صاحب اولاد ہیں۔ اپنے بڑے صاحبزادہ ناظرالدین حسن صاحب کی تعلیم و تربیت کا فرض آپ نے جس خوبی سے انجام دیا وہ نہایت تعریف کے لائق ہے ۲۹ سال کی عمر میں صاحبزادہ موصوف نے نہ صرف علی گڈھ یونیورسٹی کا بی اے پاس کیا بلکہ کیمبرج یونیورسٹی کے ماسٹر آف آرٹ اور ایل ایل ڈی کی ممتاز ڈگریوں کو نہایت عزت کے ساتھ حاصل کیا اور بیرسٹر ایٹ لا بھی ہو گئے اور اب لکھنؤ میں پراکٹس کرتے ہیں۔ اور نہایت ہوشیار و خلیق ہیں۔ مسلمان جو کسی زمانہ میں علم کے ساتھ سپاہیانہ خصائل میں بھی ممتاز تھے۔ یہ خصوصیت بھی ناظرالدین حسن صاحب نے قائم رکھی۔ آپ علی گڈھ کالج کے رائڈنگ رسالے کے کپتان تھے۔

(۵) مولوی نظام الدین حسن نے باوجود ملازمت کے مشاغل و خاندانی فرائض کے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا چنانچہ آپ نے حسب ذیل مختلف چھوٹے چھوٹے جامع رسالے تصنیف کئے ہیں جو نہایت مفید ہیں صحت و اختصار ان رسالوں کی بڑی خصوصیت ہے۔ یہ رسالے طوالت زوائد مبالغہ و تکرار سے مبّرا ہیں۔

۱۔ رسالہ اوقاف العبارت
۲۔ صفات باری تعالیٰ
۳۔ طلوع و غروب معلوم کرنے کا طریقہ (انگریزی)
۴۔ الرموز
۵۔ بحث الف لام
۶۔ کعبہ کی سمت معلوم کرنے کا طریقہ (انگریزی)
۷۔ فہرست قران مجید
۸۔ صحیفۂ حرمت ربوٰ (وغیرہ)

ان رسالوں میں رسالہ اوقاف العبارت ایک نئی تحقیق ہے جس میں مصنّف ممدوح نے ثابت کیا ہے کہ موجودہ یوروپی زبانوں میں جو اوقافی نشانات ہیں ان کی ابتدا عربی میں ہوئی تھی اور اہل یورپ نے اُن کو عرب سے لیا ہے۔ اسیطرح قرآن کی فہرست بھی بہت مفید ہے۔

خدا تعالیٰ ممدوح کو بہت دنوں تک صحت کے ساتھ زندہ رکھے اور مسلمانانِ ہند ان کے نمونہ سے سبق حاصل کریں۔

جان ملکم

دیوارِ چین۔ یہ وہی دیوار ہے جسکی چار دانگ عالم میں شہرت ہے۔ دو ہزار برس ہوئے کہ خاندان چین کے پانچویں حکمراں نے تاتاریوں کے حملہ کو روکنے کے لئے اسے تعمیر کرایا تھا اُسوقت سے اب تک یہ جُوں کی تُوں موجود ہے۔ اس دیوار کی لمبائی ۱۴۰۰ میل ہے اور چوڑائی قریباً ۲۰ فٹ اور اونچائی ۱۸ سے ۳۲ فٹ تک ہے۔ اس کی چوڑائی پر تین گاڑیاں برابر برابر چل سکتی ہیں "ہفت عجائبات عالم" میں اس دیوار کا بھی شمار ہے۔

شاہ عبدالجلیل کا روضہ اور بیگم کا روضہ۔ بادشاہی زمانہ کی الہ آباد میں دو مشہور عمارتیں ہیں ان کے علاوہ اور بھی چند عمارتیں ہیں جو اپنی تاریخی اہمیت کے باعث بہت مشہور ہیں۔ کسی آیندہ اشاعت میں ہم الہ آباد کی قدیم عمارات کے متعلق ایک آرٹیکل درجِ ادیب کریں گے۔

شعرم را بمدرسہ کہ برد

کسی مدرسہ کے مُلّا یا طالب علم نے مولنا نظامی گنجوی مرحوم کے شعر پر کج فہمی یا بے شعوری سے اعتراض کیا تو مولنا نے بطور خندہ زنی فرمایا کہ ہائے مدرسہ میں میرا شعر کون لے گیا۔ یعنی کسنے نافہمی سے شعر کی مٹی خراب کی۔ ایسا ہی کسی صاحب نے مجدد السنہ مشرقیہ سیّدنا مولنا شوکت مدظلہ کی تنقید پر جو حضرت ابو الفیض فیضی رح کے کلام پر بطور سرسری کی تھی کدورت کا غبار رسالہ الناظر میں نکالا گویا برقی مشعل تجدید کو پھونکوں سے بجھانا چاہا۔ واضح ہو کہ تنقید صرف قہرمانِ اقلیم سخن کا کام ہے جو جامع علوم و فنون ہو، نکہ اُن لوگوں کا جنکی دلیل اور رہبر سبیل صرف دقیانوسی تقلید ہے۔ اور اسی تقلید نے ہمارے ملک کے حوصلے پست کر دئے ہیں مولانا روم فرماتے ہیں ؎

آن محقق ہرچہ میگوید حق است　　آن مقلد ہرچہ میگوید دق است

مشک آلود است اما مشک نے　　مشک چہ بود او سوائے پشک نے

یعنی محقق جو کچھ کہتا ہے وہ ٹھیک ہے اور مقلد جو کچھ کہتا ہے وہ محض بیہودہ سمع خراشی ہے۔ تقلید بظاہر مشک آلود ہے۔ مگر درحقیقت چوہے کی مینگنی ہے۔

حضرت مجدد نے طاہر وحید کی رباعی کو نہ صرف فیضی کی رباعی بلکہ کل شعرا کی جوابی رباعیوں پر بجا طور سے ترجیح دی تھی کیونکہ اول تو سب نے طاہر وحید ہی کی ادھوری تقلید کی ہے اور ظاہر ہے کہ قافیہ پیمائی اور مضمون پر مضمون لکھنا نہایت خفیف اور آسان بلکہ نو آموزوں کا کام ہے۔ ایجاد مشکل ہے مگر مقلد یہ رمز نہیں سمجھ سکتا اس کا سرمایہ تو بکر و خالد کے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ اب میں طاہر وحید کی رباعی کی بلاغت کا سمجھانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ناظرین دھوکے میں نہ پڑیں۔ طاہر وحید ؎

زنگی بفراوانیٔ لشکر نازد　　رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد

اکبر بہ خزاین پُر از زر نازد　　عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

مصرعہ اولیٰ کو یوں بتایا جاتا ہے ؎ زنگی بسپاہ و خیل و لشکر نازد۔ اِس مصرعہ نے تو غریب طاہر وحید کی رباعی کی بلاغت کا خون کر دیا آپ لکھتے ہیں کہ "ایک مصرعہ میں تو سپاہ و خیل و لشکر ہے اور دوسرے مصرعہ میں مقابلہ پر سنان و تیغ و خنجر ہے"۔ مگر یہ خبر نہیں کہ سپاہ و خیل و لشکر تو زنگی کا ہے اور سنان و تیغ و خنجر رومی کا۔ تقابل کہاں رہا۔ پھر مصرعہ اولیٰ میں سپاہ، خیل، لشکر گویا تین جُدا جُدا چیزیں ہیں لشکر اور شے ہے اور سپاہ دوسری چڑیا ہے۔ اور خیل کو تو سپاہ و لشکر سے گویا کچھ واسطہ ہی نہیں اور سپاہ و لشکر میں گھوڑے تو ہوتے ہی نہیں اور دوسرے مصرع میں جو سنان و تیغ و خنجر ہے تو لشکر سپاہ ان ہتھیاروں سے بالکل الگ تھلگ اور نابلد ہوتی ہے واہ کیا خوب تقابل ہے۔ کیا حیوان ناطق انسان کی ضد ہے اور کیا حیوان و انسان میں تقابل تضاد ہے جیسا شیعہ سنّی میں اور مقلّد و غیر مقلّد میں۔ بلکہ مومن و کافر میں۔ سبحان تیری قدرت فراوانی لشکر اور سنان و تیغ و خنجر میں بدیہی تقابل ہے یعنی ممکن ہے کہ زنگیوں کا لشکر (مانگی بھیڑ بھاڑ) ہو مگر جری نہ ہو نہ اُسکی سنان و تیغ و خنجر کارگر ہو۔ پس زنگیوں کو گھٹایا ہے اور پہلا شعر صاف طور پر اکبر کے گھٹانے کی تمہید ہے مگر اِس بلاغت کے سمجھنے کو بازار سے کوئی جنسِ فہم نہیں خرید سکتا۔ دوسرا شعر کتنا بلیغ ہے اور کیسی چُبھی

مہاراجہ راجندر نارائن بھوپ بہادر والئے ریاست کوچ بہار

انڈین پریس الہ آباد

ہوئی تعریض ہے اور عباس کے ساتھ ذوالفقار حیدر کتنا موزوں اور متناسب ہے۔ طاہر وحید کا مطلب یہ ہی کہ خزانے اور کوٹھی کٹھلے تو کروڑپتی اور ارب پتی سیٹھ ساہوکاروں اور سوداگروں کے پاس بھی ہوتے ہیں مگر تیغ نہ ہو تو وہ کس کام کے ہیں کوئی قاروں کا چچا سیٹھ ساہوکار کشور کشا اور فاتح نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ حشو کو کلام کا نقص نہیں سمجھا جاتا بلکہ اُس پر فخر کیا جاتا ہے۔ حشو تو بدتریں عیوب میں سے ہے۔ کلام وہ ہے جو ٹھکا ہوا ہو۔ در زنام کو نہ ہو۔ تصرف دخل نہ پا سکے۔ اور شعرائے کاملین فارس و عرب کا کلام ایسا ہی ہے بلکہ بھاشا کے کویشروں (شاعروں) کا بھی یہی اسلوب ہی۔ درحہ

قافیہ بندی سے بہتر ہے کہ چھپّر باندھے

اب طاہر وحید کی رُباعی کے مقابلہ میں فیضی کی رباعی ملاحظہ ہو

دریا بگہر فلک بہ اختر نازد فردوس بسلسبیل و کوثر نازد

عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد کونین بذات پاکِ اکبر نازد

تیسرا مصرعہ تو طاہر وحید ہی کا دوہرا دیا جو فیضی جیسے علاّمہ کی شان سے بہت بعید ہے۔ کیا لفظ عباؔس دوسری طرز سے نہ بندھ سکتا تھا۔ صاف علامت عجز نمایاں ہے۔ پھر طاہر وحید کی رباعی تو بالکل مسلسل اور مربوط ہے اور فیضی کی رباعی کی بندش منقطع اور متلون ہے گویا کئی رنگ کا ایک نیرنگ ہی۔ دریا اور گوہر کو فلک و اختر سے لگاؤ نہیں اور ان دونوں کو سلسبیل کوثر سے ربط نہیں۔ چوتھا مصرعہ نہایت سبک ہے۔ جس میں لفظ پاک خوگیر کی بھرتی ہے۔ کونین تثنیہ کو فیضی رباعی لکھتے وقت مفرد سمجھا پس نازد مفرد کے ساتھ ملا دیا۔ آپ کہتے ہیں یہ جائز ہے تو بہ تو بہ شعرائے فارس کے کلام سے قیامت تک بھی ایسی لغو سند نہیں مل سکتی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زید و عمرو مے آید یا عمرین مے آید۔ کیا اُردو زبان میں کوئی بول سکتا ہے کہ ہم دونوں آتا ہے۔ ہاں صاحب لوگ ایسا بولنے سکتا ہے کہ "ول! ہم تمکو کل بولا تھا کہ اس ماپھک (اسکے موافق یا اس طرح) بیرا اور کھانساماں (خانساماں) اپنا اپنا ڈیوٹی پورا کرے" ایک اَن پڑھ کے سامنے بھی جمع یا تثنیہ کو مفرد بولئے گا تو وہ حیرت سے مُنہ تکنے لگے گا۔

حضرت مجدد تحریر فرما چکے ہیں کہ فیضی نے اکبری دربار میں یہ جوابی رُباعی فی البدیہ لکھی ہے۔ اگر کوئی بات رہ جائے تو اس سے فیضی کے جوہر کمال پر حرف نہیں آسکتا۔ وہ انسان تھے فرشتہ یا معصوم نہ تھے۔ تمکن ہمیشہ ممکن ہے۔ جو کام ایک انسان کرتا ہے دوسرا بھی کر سکتا ہے حضرت مجدد نے فیضی کے مصرعہ کو یوں بدلا تھا

ہر ذرہ بذات مہر اکبر نازد

مہر اور اکبر دونوں ذو معنی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "مہر اکبر نہیں بولتے" اوّل تو اکبر مضاف الیہ ہے نہ کہ صفت اور صفت بھی ہو تو ایک مقلد البتہ اس کو ناجائز بتا سکتا ہے۔ نیر اعظم نیر اکبر۔ مہر اکبر میں کیا فرق ہے۔ واضع نے الفاظ وضع کئے ہیں نہ کہ تراکیب۔ یہ انسان کا کام ہے۔ اگر نئی ترکیبیں نئے محاورات وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہیں تو ہر زبان کی ترقی کے پاؤں کاٹھ میں ٹھک جائیں اُردو ہی کو دیکھئے کہ انگریزی زبان کی بدولت اُس میں کس قدر نئی ترکیبیں نئے محاورات پیدا ہو رہے ہیں جن سے اُردو زبان کو ترقی ہو رہی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ماہ انور یا مہر خاور مشہور ہے نہ کہ مہر اکبر اور کیا کوئی مہر اصغر بھی ہے" میں کہتا ہوں کیا کوئی ماہِ اظلم یا ماہ تاریک یا مہر باختر یا مہر مغرب بھی ہے یا مہر شمال اور

مہر جنوب بھی کسی نے دیکھا ہے۔

اب نلدمن کے اصلاحی شعر کو لیجئے ؎ عنقائے نظر بلند پرواز۔ آپ نظر کے معنی نگاہ یا آنکھ کے سمجھے ہیں۔ یعنی آنکھ عنقا ہے اور بلند پروازی کر رہی ہے۔ یعنی معدوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا اندھی ہے اور ازل سے تقلید کی پوبی گھُن لگی لاٹھی لیکر ٹٹولتی آئی ہے۔ بھلا اندھا کیا تک ٹوہ کرے گا اور اُڑنے کے لئے کہاں سے سرخاب کا نہیں چمگادڑ کا پر لائے گا اور وہ بھی دن دہاڑے۔ جب نظر کے معنی آنکھ یا نگاہ کے ہیں تو یوں چاہیئے ؎

اے از پئے دیدِ تو ز آغاز عنقائے نظر بلند پرواز

اب سمجھئے یہاں نظر کے معنی علم نظر (عقلیات و فلسفے) کے ہیں یعنی خدائے تعالےٰ کی ماہیت کا ادراک عقل کا کام نہیں اور اس کی سعی بے کار ہے چنانچہ اگلے شعر میں اس کی توضیح ہے کہ

فکرِ تو بدل خیال بگداخت اوجِ تو ز مرغ بال بگداخت

اگر آپ واقعی فیضی کا کلام سمجھ سکتے ہیں تو مندرجہ ذیل شعر کا مطلب بتائیے جو حمد ہی میں ہے ؎

وانگاہ مجرّد از وسائط ترکیب فرود بر بسائط

پھر آگے معراج میں شعر ذیل کا مطلب بھی بتائیے ؎

کان ذوجسدین چون قلم چند وندر دو سرے چنین علم چند

جو شخص بساط سے بڑھ کر قدم رکھتا ہے ندامت و پشیمانی اٹھاتا ہے جسطرح شعراء فارس و عرب کے کلام کا سمجھنا آسان نہیں اُسیطرح تنقید کا سمجھنا بھی آسان نہیں۔ یہ کام علماء اور فضلاء اور پروفیسروں کا ہے۔ اُن میں سے بھی شاذ و نادر کا۔ اگر آپ فیضی کا کلام سمجھ سکتے ہیں تو اُس کے ایک قصیدے کا شعر ذیل سمجھئے حالانکہ یہ شعر کچھ مشکل نہیں ؎

بدبو جاہ طبیعت کہ خاک بر سر آں کند کنگرۂ طارمِ بریں مکشائے

نحوی ترکیب بتائیے اور یہ بھی کہ مصرعہ اولی میں خاک بر سر آں چسپاں ہے یا نہیں کیا کوئی اور لفظ چاہیئے اور کیا موزوں ہوگا۔ اب حضرت مجدد حماسہ اور متنبی وغیرہ شعراء عرب کے کلام یا بھاشا کے شعرا کی نظم پر تنقید کریں گے تو کیا آپ اُس کو بھی سمجھیں گے۔

اعجاز میرٹھی

مہاراجہ کوچ بہار۔ مہاراجہ سر نرپیندر نارائن بھوپ بہادر جی سی۔ آئی۔ ای، سی۔ بی، حضور ملک معظم کے جشنِ تاجپوشی کی تقریب پر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ ناسازئی طبع کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، مگر جشنِ تاجپوشی کے بعد مرض نے ایسا زور جمایا کہ جاں بر نہو سکے۔ اپنے والد ماجد کی وفات کے وقت آپکی عمر صرف ۲ سال کی تھی ابتدائی تعلیم آپنے بنارس میں پائی اور بعد ازاں پٹنہ کالج اور پھر کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں داخل ہوئے۔ آپکے لڑکپن کے زمانہ میں آپکی ریاست نے سرکار انگلشیہ کو جنگ بھوٹان میں بہت مدد دی تھی، جس کے صلہ میں ریاست کو دو توپیں انعام دی گئیں ۱۸۷۸ء میں جبکہ آپکی عمر ۱۵ برس کی تھی آپ تکمیل تعلیم کے لئے دو انگریز افسروں کی نگرانی میں ولایت تشریف لیگئے وہاں سے واپس ہونے پر آپکو اختیارات عطا کئے گئے۔ اس کے بعد آپنے بابو کیشپ چندر سین کی دختر نیک اختر کے ساتھ شادی کی ۱۸۷۸ء کے دہلی دربار کے موقعہ پر آپ کو ایک تمغہ اور ایک تلوار انعام ملی نیز سرکار نے آپ کو جی سی۔ آئی۔ ای کا اعلیٰ خطاب بھی عطا فرمایا۔ تیراہ کی مہم میں آپ نے سرکار کی طرف سے آفریدیوں کا خوب خوب مقابلہ کیا اور دادِ شجاعت دی۔ رعایا کا آپ کو بہت خیال رہتا تھا۔ سوشل ریفارم (تمدنی اصلاح) میں بھی آپ حصہ لیتے تھے۔ علم دوست بھی تھے۔ اپنے دار الریاست میں آپ نے ایک کالج قائم کیا جس سے رعایا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ شکار کا آپ کو بہت شوق تھا، یہاں تک کہ اس موضوع پر آپ نے ایک عمدہ کتاب تصنیف کی ہے کئی مرتبہ آپ (مع مہارانی صاحبہ) انگلستان تشریف لے گئے۔ برٹش فوج کے آپ آنریری میجر تھے۔ آپ کی وفات پر حضور ملک معظم جارج پنجم نے بھی بذریعہ تار اظہار افسوس کیا۔ آپ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑے صاحبزادے جانشین ہوئے ہیں جنکی تصویر ہدیۂ ناظرین ہے۔

فراق

کوکلا تجھسے طبیعت جو بہل جاتی ہے — تو جو آئی تو مرے دلمیں یہ لہرآتی ہے
اپنا دُکھ تجھکو سناؤں نہیں بہن تو جو سُنے — صبح سے آج طبیعت مری گھبراتی ہے
پیا پردیس گئے جب سے کچھ ایسے چُپ ہیں — نہ تو خط آتا ہے کوئی نہ خبر آتی ہے
نہیں معلوم کہ کیا اُن پہ گذرتی ہوگی — اُنکا دھیان آتا ہے تب جان پہ بنجاتی ہے
ساس سے کچھ نہیں کہسکتی نہ کچھ دیور سے — مجھے تو نند سے بھی پوچھتے شرم آتی ہے
پوچھوں کس سے میں بہن اُسکا تو یہ حال ہے اب — سیدھی سی بات جو کرتی ہوں بگڑ جاتی ہے
مجھکو دیوانہ بنا رکھا ہے سب نے گھر میں — میں جو روتی ہوں تو لوگوں کو ہنسی آتی ہے
تیری ماں بھی یہ مری ساس سے کل کہتی تھی — کونسا غم ہے بہو کو جو گھُلی جاتی ہے
منھ لپیٹے ہوئے ہر وقت پڑی رہتی ہے — سُست رہتی ہے نہ پیتی ہے نہ کچھ کھاتی ہے
ساس بولیں کہ بناوٹ کی ہیں ساری باتیں — میکے جانے کے لئے سوانگ یہ پھیلاتی ہے
یہی سُن سُنکے کُڑھا کرتی ہوں دن رات بہن — کیا کروں موت بھی تو مجھکو نہیں آتی ہے
اپنا دُکھڑا میں کہوں تجھسے کہاں تک پیاری — تو جو آتی ہے طبیعت یہ بہل جاتی ہے
تو یہ کہتی ہے کہ اب آتے ہیں پیا — جیتی رہ میری بہن کیا مجھے بہلاتی ہے
تو ذرا کہہ تو کہ اک تار جوابی بھیجیں — مجھکو تو ساس سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے
پھر مری بات پہ کیا جانے وہ کیا کہہ بیٹھیں — طعنہ بازی سے طبیعت مری گھبراتی ہے
ساس نندوں کی محبّت کو تو میں دیکھ چکی — آگے کیا دیکھئے قسمت مری دکھلاتی ہے
دھک سے رہجاتی ہوں سنتی ہوں جو پردیس کا نام — اک اُداسی سی مرے چہرہ پہ چھا جاتی ہے
دل بھر آتا ہے مرا غیر کا دُکھ سُننے سے — رنج کی بات نہیں مجھسے سہی جاتی ہے
آنکھ لگتے ہی بُرے خواب نظر آتے ہیں — بند کانوں میں بھی رونے کی صدا آتی ہے
ایسی کمزور طبیعت ہوگئی ہے اِن روزوں — ہر طرف رنج ہی کی شکل نظر آتی ہے
کوکلا میرے حواسوں کا تو یہ عالم ہے — کل کی بات آج جو پوچھو نہیں یاد آتی ہے
اپنے سایہ سے بھی ڈرتی ہوں اکیلے میں بہن — گھر کی بھی شکل بھیانک سی نظر آتی ہے
بیکسی پہ جو مری اُس کو ترس آتا ہے — کبھی دو چار گھڑی ساس بھی سمجھاتی ہے
میرا دیور بھی تسلّی کبھی کرتا ہے مری — نند بھی میری دلاسا مجھے دے جاتی ہے
کیا کہوں میری طبیعت بھی ہے ایسی کمبخت — کچھ جتن کیجئے پر یہ نہیں کل پاتی ہے
دن تو رو رو کے کسی طرح سے کٹ جاتا ہے — چھاتی پھٹتی ہے مری رات جہاں آتی ہے
شام سے صبح تلک تارے گنا کرتی ہوں — بیٹھے چین آتا نہ لیٹے مجھے نیند آتی ہے
تھرتھرا جاتی ہوں گھبرا کے میں چونک اُٹھتی ہوں — منہ سے چادر بھی جو سوتے میں سرک جاتی ہے
دھیان رہتا ہے پیا کا مجھے دن رات بہن — تیری پیاری تو اِسی غم میں گھُلی جاتی ہے
نہیں معلوم کہاں ہونگے وہ کیسے ہونگے — سوچ اُنھیں کا ہے اُنھیں کی مجھے یاد آتی ہے
یاد پردیس میں مجھکو بھی وہ کرتے ہونگے — کچھ سبب ہے جو طبیعت مری گھبراتی ہے
اُنکے آنے تلک اب آس کسے جینے کی — تھوڑی سی عمر ہے سو غم میں کٹی جاتی ہے
میرے گھر والے تو ناداں سمجھتے ہیں مجھے — میری تسکین کو تو بھی مجھے پھُسلاتی ہے
تُو تو کہتی ہے چلو باغ میں جھولا جھولیں — رُت ہے ساون کی وہ گھنگھور گھٹا آتی ہے
صدقے جاؤں میں ترے پیار محبت کے بہن — تُو تو سب طرح سے دلکو مرے بہلاتی ہے
پر مرا حال جو کچھ ہے وہ کہوں کیا تجھسے — مجھے دنیا کی کوئی بات نہیں بھاتی ہے
ضعفِ غم سے یہ ہوا حال کہ اب نبض مری — چھوٹ جاتی ہے تو گھڑیوں نہیں پھر آتی ہے
دل تڑپ جاتا ہے پھٹ جاتی ہے چھاتی میری — روتی ہوں شعر کسی کا جو یہ تو گاتی ہے

"وہ شکلِ امید تو کب ہم کو نظر آتی ہے"
"وہ صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے"

بشن نراین در

تاریخ وفاتِ تسلیم مرحوم لکھنوی

صد حیف گیا جہاں سے وہ قافیہ سنج — تھا ذہن رسا سے جو معانی کا گنج
محوی یہ کہو سالِ وفاتِ مرحوم — مرگ تسلیم کا جگر دوز ہے رنج

۱۳ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

محوی لکھنوی

رُباعیات

ہوتی ہے نزاکت ہی سے تمکیں پیدا   معشوق کی سادگی سے تزئیں پیدا
ہے عشقِ بتاں میں صورتِ حق زاہد   فرہاد نے کی سنگ سے شیریں پیدا۔

امید بقاے عیش نادانی ہے   اے خضر تمہاری عمر بھی فانی ہے
شہرت سے کبھی نہ خوش ہوں مردانِ غنا   خود نقش نگیں کا چین پیشانی ہے

پٹکا کمر عزم سے ہر سیر کا باندھ   لیکن نہ تصوّر تو کبھی غیر کا باندھ
ہر شے میں ہے موجود فقط ایک وجود   احرام تو کعبہ کا کبھی دیر کا باندھ

کیا چاہئے مجھ بے سر و ساماں کے لئے   پہلو میں تڑپتا ہے دل ارماں کے لئے
وحشی کو ہو کیوں نہ ننگ عُریانی سے   ہاتھ اس کا ترستا ہے گریباں کے لئے

غواص کو یاں ہے جستجو کی مشکل   گوہر کو بھی واں ہے آبرو کی مشکل
ممکن نہیں ہر رہ گو سے پاسِ انفاس   ہے گل کو حفاظت اپنی بو کی مشکل

کیا دفترِ شوق دوست تک پہنچاؤں   اے بخت رسا تجھے کہاں سے لاؤں
لاغر ہوں میں کیا غرض کبوتر سے مجھے   خود بیٹھ کے خط کے دوش پر اڑ جاؤں

چکھا وہ مزہ حسن کی شیرینی سے   بیزار ہوئے وہ نخوت آئینی سے
کیا منہ ہے کہ دیں جواب آئینہ کو   خود ناک میں دم ہے انکا خود بینی سے

پھل تلخ ملے ہمیشہ بد بینی کے   کھٹے ہوئے اس سے دانت شیرینی کے
پیماں شکنی بتوں کی ہے دل کی شکست   ہیں بال گواہ مو بمو چینی کے

جینے کی خوشی کے بدلے غم اور نہو   پیری کا شباب میں الم اور نہو
ہو جا کے عدم میں پشت ہلکی پھلکی   اب بار سے زندگی کے خم اور نہو

شوکت میرٹھی

سرکشی و احتضار

اک نجس قطرہ سے کی حق نے ہماری خلقت   سرکشی اُسپہ کریں ہم یہ خدا کی قدرت
نام لیتے ہوئے جس چیز کا شرم آتی ہو   دیکھئے بدلی ہے کس طرح سے اُسنے رنگت
کیوں نہ ہو صنعتِ صانع پہ تحیر سب کو   ایک کی دوسرے سے کچھ نہیں ملتی صورت
ایک مٹی سے بنے سب ہیں مگر دیکھئے فرق   مختلف رنگ جدا پائے ہیں سب نے قامت
کوئی ایسا ہے حسینوں میں نہیں جسکا مثل   گندمی رنگ کسی کا کوئی کالی صورت
حسن پر ناز زمانے میں اگر اُسکو ہے   اسکو دعوی کہ ملاحت کی ملی ہی دولت
کیوں نہ ڈالیں ہمیں حیرت میں کرشمہ اُسکے   طالبِ حسن کوئی اور کسی کو نفرت
کوئی کہتا ہے کہ ہے عشق حسینوں کا جنوں   کوئی کہتا ہے گئی عقل ہی اُسکی حضرت
کوئی ممتاز زمانے میں ہی مردود کوئی   خاکساری ہے کسی میں تو کسی میں نخوت
کوئی ایسا ہی کہ گھر راہ خدا میں دیدے   کوئی کہتا ہی نہو صرف ہماری دولت
کوئی ایسا ہی کہ دس بیس ہیں اُسکے مہماں   کوئی ایسا ہی عزیزوں سے ہی اسکو نفرت
ایک گھر میں ہیں اگر دس تو مزاجوں میں ہے فرق   ہے کوئی نرم کسی میں ہی نہایت شدت
کوئی ایسا ہی کہ روتے ہوے بچوں کو ہنسائے   کوئی ایسا ہی کہ جاتی نہیں اُسکی نخوت
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہی کہ یہ کیوں ہے غرور   حال کھلتا نہیں پائی ہی کہاں کی عزت
کیوں ہوئے جاتے ہیں یہ جامہ سے باہر اتنا   مالِ دنیا جو ملا اُس سے بڑھی کیا شوکت
طالبِ نام اگر ہیں تو کریں کسبِ ہنر   کوئی عالم میں نہیں علم سے بہتر دولت
دیکھو اکثر یہ کتابوں میں لکھا ہی دیکھو   لو سبق اُس سے جہاں میں ہی اگر کچھ عزت
ایک زردار کا اب ہوتا ہے دُنیا سے سفر   قابلِ رحم ہی ہر طرح سے اُس کی حالت
کبھی اولاد سے کہتا ہے کہ دو میری کمک   کبھی احباب سے کہتا ہے نبھاؤ الفت
اشک بھر آتے ہیں دل تھام کے روتا ہی کبھی   کبھی کہتا ہے کہ کام آئی نہ اپنی دولت

ولادت شکنتلا

"منھہ پھیر کر حجاب کر گیا وہ　　بس، خوف خدا سے ڈر گیا"

انڈین پریس الہ آباد

کیوں فراہم کیا اور وں کے لٹانے کے لئے   عملِ خیر سے کیوں دلکو تھی میرے نفرت
لب پہ یہ ذکر تھا اکبار جو آنکھیں جھپکیں   دیکھتا کیا ہے نرالی ہی یہاں کی صحبت
کوئی کہتا ہے ذرا دیکھ تو تو میری طرف   کسقدر قابلِ افسوس ہی تیری محنت
رات کو رات نہ تو دن کو کبھی دن سمجھا   تیرے دلمیں تھی عجب طرح کی میری اُلفت
تیری اولاد کرے گی مجھے دنرات تلف   کام کچھ تو نے نہ مجھسے لیا دیکھی ذلت
کچھ بتا چھوڑ چلا ہے مجھے غافل کسپر   کون پہنچاے گا اب تجھکو لحد میں راحت
سُنکے یہ آنکھوں میں بیکس کے بھر آئے آنسو   کفِ افسوس ملے دیکھ کے سب کی صورت
ناگہاں سامنے اک شکلِ مجسّم آئی   اور گویا ہوئی ہنسکر کہ قریں ہی رحلت
اب بھی کچھ قدر مری دلمیں ترے ہی کہ نہیں   لوگ وہ کیا ہوے جن سے تھی ہمیشہ الفت
ساتھ ہر وقت رہا کرتے تھے سایہ کی طرح   ہوگئی آج انہیں لوگوں کو تجھ سے نفرت
قبر تک بھی تو نہیں ساتھ یہ دینے والے   اور کیا کام بھلا آئے گی ان کی ہمّت
ہم ترے ساتھ ہیں تا پرسشِ محشر غافل   کام بن جائیں گے سب نیک اگر ہی نیت
لب پہ دم آگیا کیا دیر ہے توبہ کر لے   تیرے عصیاں سے سوا ہی کہیں حق کی رحمت

طول ہوتا ہے یہ ہے نظم کا ماہر کی مآل
عملِ خیر کروگے تو ملے گی جنّت

ماہر کنتوری

فسانۂ دشینت و شکنتلا

باب اوّل۔ ولادت شکنتلا

یا ہادیِ گمراہ و تبہ کار مدد   یا رحم نمائے بندۂ زار مدد
یا چارۂ دردِ دلِ ناچار مدد   یا حامیٔ مطلق و مددگار مدد

اے عشق یا تری خودی نے کیا کیا نہ کیا   اب کیا رہا خود خدا سے بیگانہ کیا
حاصل یہ کہ سحر تو نے حسبِ اطوار   اچھا کیا یا برا۔ اچھا نہ کیا

کہتا ہے جو داستانِ دلکش   یوں خامہ سے ہی بیانِ دلکش
قصّہ ہے کہ جوئے گومتی پر   تھا ایک فقیر نیک محضر
بسوامتر اُس کا نامِ نامی   تھا حسنِ عمل میں وہ گرامی
از بسکہ اسیرِ معرفت تھا   گویا تصویرِ معرفت تھا
وحدت کی چمک عیاں تھی اُسپر   قدرت کی جھلک عیاں تھی اُسپر
صحرا میں عجب سماں بندھا تھا   جو گل تھا خوشی سے ہنس رہا تھا
لاتی تھی صبا ہوائے جنّت   تھی پیشِ نظر فضائے جنّت
اک صفحۂ راز برگِ تر تھا   اک موقعِ مست ہر شجر تھا
موجوں کی وہ آب میں روانی   کہتی تھی فسانۂ جہانی
پانی میں حباب کی وہ مستی   کرتی تھی عیاں فریبِ ہستی
اٹھا تھا جو پردۂ حقیقت   ہر شے میں تھا جلوۂ حقیقت
اک سمت وہ عابدِ خردمند   تھا محوِ عبادتِ خداوند
بوئے گلِ خاص پیرہن میں   راحت تھی ہری کی اُسکے تن میں
تھا یادِ خدا میں وہ جو مخمور   تھا رشک سے دل ملک کا معمور
اک اک نے حسد سے اُسکو تاڑا   یوں کھیل بنا ہوا بگاڑا
بلوا وہیں حورِ مینکا کو   ظاہر کیا لب نے مدّعا کو
درویش کی بندگی بگڑ جائے   عرفاں کے چمن پر اوس پڑ جائے
بولی وہ کہ سہل بات پائی   یہ کہکے چلی زمیں پر آئی
جب پہنچی وہ مہرشی کے بن میں   پھول اک نیا کھلا چمن میں
بن ٹھن کے وہ سج سجا کے پہنچی   اور نزدِ فقیر جا کے پہنچی
بے پردہ تھا نورِ حسنِ دلکش   ظاہر تھا غرورِ حسنِ دلکش
مستیٔ خرام کا یہ تھا حال   فتنہ تھا قدم قدم پہ پامال
آئی وہ لگاتی سوز کی آگ   گاتی ہوئی حسن و عشق کا راگ
خاموش طیورِ خوش نوا تھے   مدہوشِ صدائے نغمہ زا تھے
کرتی تھی الاپ سے وہ بسمل   لوٹا جاتا تھا رقص پر دل

صحرا میں غرض جو گونج اٹھی تان   چھوٹا عابد کا گیان سے دھیان
دیکھا تو تھی اک نگارِ خوش رُو   بس دل میں سمائی عشق کی بو
آنکھوں نے دیئے وہ جامِ سرشار   زاہد کے ہوئے حواس بیکار
جوبن میں بھرا ہوا تھا جادُو   چتون میں بھرا ہوا تھا جادُو
دیوانہ بنایا ہر ادا نے   زائل کئے ہوش مینکا نے
انداز پہ دل ہوا تھا قرباں   آواز پہ دل ہوا تھا قرباں
تھا پہلے تو بندۂ خدا وہ   اب بندہ صنم کا بن گیا وہ
جس دل میں فروغِ لامکاں تھا   اک جلوۂ باطل اب وہاں تھا
دل گھر تھا خدا کا اب ہوا دیر   پیدا ہوا روشنی میں اندھیر
ہر چند تھا فکرِ رادِرم میں   ششدر رہا مگر قدم قدم میں
پھر آگئیں حسرتیں نکل کر   ارمان پھرے مچل مچل کر
ہمت ہوئی دل میں التجا کی   جرأت ہوئی عرضِ مدعا کی
ظاہر ہوئی حالتِ نہانی   اُس رنگِ پریدہ کی زبانی
تھا دام پری کا مدعا پوش   درویش سے ہو گئی ہم آغوش
وہ پاک خیال سر سے نکلے   ارمان اِدھر اُدھر سے نکلے
دونوں ہوئے حظِّ وصل میں چور   مہ نے لیا آفتاب سے نور
میعادِ حمل، غرض، گزر کر   نکلا وہ جسد، وہ نورِ انور
یعنی اک دختِ دلبری سے   جادو سی عیاں ہوئی پری سے
آنچل پہ اُٹھایا مینکا نے   دامن پہ رکھی کلی صبا نے
شرمائی ہوئی ادا سے آئی   نزدیکِ رشی حیا سے آئی
بولی کہ اے نکتہ دانِ اُلفت   لے نذر یہ ارمغانِ اُلفت
اس نور کی جا نظر میں رکھنا   اس نقشِ وفا کو بر میں رکھنا
اب مجھکو وطن کی ہو اجازت   جانے کی عطا ہو جلد رخصت
دیکھی جو وہ دختِ ماہ پارہ   عابد کو ہوا غمِ نظارہ
اُس غنچہ کو دیکھ وہ ہوا زرد   یاد آیا سبب تو ہو گیا زرد

غفلت سے جو چشم ہو گئی وا   حیلہ کا گرا نظر سے پردا
آنکھوں سے اڑا خمارِ غفلت   جانا کہ بگڑ گئی عبادت
منُھ پھیر حجاب کر گیا وہ   بس خوفِ خدا سے ڈر گیا وہ
ہو کر وہ غریقِ بحرِ افسوس   بولا، صد حیف، بختِ معکوس!
اے نفس! کیا یہ تو نے کیا ہائے   کیسی ہوئی تجھ سے یہ خطا ہائے
تقویٰ کا مٹا نشاں، ہا صد افسوس!   محنت ہوئی رائیگاں ہا صد افسوس!
یہ کہکے وہ زار زار رویا   اُف! سوز سے شمع وار رویا
دیکھی جو پری نے کج ادائی   کچھ فتح پہ اپنے مُسکرائی؛
چھوڑا وہیں اُس بتِ حسیں کو   ویرانے کو گھر دیا زمیں کو؛
آہستہ وہاں سے خود اُٹھ آئی   جنّت کو چلی، ہوئی ہوائی
بسوامتر اُس جگہ تھا مدہوش   تھیں مادر و دخت، سب فراموش
دنیا کی نہ اُس کو تھی خبر کچھ   غم تھا اپنا ہی، تھا اگر کچھ
چھوڑا اُس دشت کی زمیں کو   دیوانہ سا چل دیا کہیں کو
درویش کنو تھا اک نکوکار   ناگاہ وہاں ہوا نمودار
دیکھا ہی۔ خاک میں سے تنویر   آئینہ میں حسن کی تھی تصویر
اک ہنس تھا سر پہ سایہ افگن   شعلہ سا نہاں تھا، زیرِ دامن
خوبی کی تھی اک نرالی صورت   پیاری تھی، وہ بھولی بھالی صورت
تھا بسکہ رحیم پیرِ دانا   واجب اُسے چھوڑنا نہ جانا
معصوم پہ اُس کو رحم آیا   آنکھوں میں لیا، گلے لگایا
گھر لایا، غرض، اُسے وہ خوش کام   رکھّا اس کا شکنتلا نام

رہتی تھی سہیلیوں میں، بن میں
بڑھنے لگی، شاخِ گلُ چمن میں

اقبال ورما سحر

بیکار رہنے والو!

تم کیوں ہوئے ہو پیدا بیکار رہنے والو؟ کیا فرض ہے تمہارا بیکار رہنے والو؟

دیکھو ذرا اٹھا کے تقدیر کا نوشتہ کرنا ہے تمکو کیا کیا بیکار رہنے والو

ہے دلفریب کتنی آرائشِ مناظر دیکھو ذرا تماشا بیکار رہنے والو

کرنا ہے تمکو جو کچھ انجام اُس کو دیدو ہے چند روزہ دنیا بیکار رہنے والو

کب تک یہ زورِ نکبت کب تک یہ خوابِ غفلت دنیا ہے عبرت افزا بیکار رہنے والو

مہلک مرض تمہارا ہے کاہلی و سُستی کر لو علاج اپنا - بیکار رہنے والو

یورپ کے رہنے والے کیا کر چکے ہیں ابتک تمنے بھی کچھ دکھایا بیکار رہنے والو

کیا کر رہی ہے دنیا کیا ہو رہے ہیں ساماں کچھ بھی نہ تمنے دیکھا بیکار رہنے والو

بالیں پرست رہنا اچھا نہیں تمہارا کرنا تھا کچھ مداوا بیکار رہنے والو

منسوخ کر رہے ہو قانونِ نظمِ قدرت تمکو دئے ہیں اعضا بیکار رہنے والو

اعضا تمہارے اکدن ہو جائینگے معطّل سوچو نتیجہ اپنا بیکار رہنے والو

اس گردشِ فلک نے کیا کیا نہ روپ بدلے دیکھا نہ تم نے اصلا بیکار رہنے والو

تمکو دئے گئے ہیں بیکار و بے سبب کیا؟ یہ دیدہ ہائے بینا بیکار رہنے والو

دیکھو مصنّفاتِ نام آورانِ گیتی کیا کر رہی ہے دنیا بیکار رہنے والو

اپنے دماغ و دل کی گر روشنی دکھاتے ہوتے نہ تم بھی یکتا بیکار رہنے والو

کس کس لباس میں ہے صورت نما ترقی دیکھو جہاں کا نقشا بیکار رہنے والو

کیوں کر رہے ہو شکوہ تقدیر کا تم اپنی الزام ہے یہ بیجا بیکار رہنے والو

جا کر کرو ریاضت کالج میں مدرسہ میں ہو بے نظیر و یکتا بیکار رہنے والو

علمی مناظروں میں عقلی نمایشوں میں کیا کیا نہ تمکو ڈھونڈھا بیکار رہنے والو

ہمّت کے نیشترِ سے غیرت کی رگ کو چھیڑو ہے جوشِ خلطِ سودا بیکار رہنے والو

اسلاف نے تمہارے کی کیسی جانفشانی ہے کچھ خیال اس کا بیکار رہنے والو

جو نقش ہے بٹھانا اسوقت وہ بٹھا دو اب ہو گے پھر نہ پیدا بیکار رہنے والو

صحبت سے دوستونکی فرصت ملے جو دم بھر نظمِ عزیز پڑھنا بیکار رہنے والو

عزیز لکھنوی

چاندنی

غنچۂ دل کو کھلا جاتی ہے آکر چاندنی ہے برنگِ موسمِ گل روح پرور چاندنی

ہیں زمین و آسماں روشن وفورِ نور سے شکلِ روئے یار ہے کیا نور گستر چاندنی

آسماں پر ہے ستاروں سے فروغِ نورِ ماہ چار سو سطحِ زمیں پر جلوہ گستر چاندنی

گلشنِ دنیا میں یہ رنگیں بہاریں تجھسے ہیں نور کی مورت ہے تو اے ماہ پیکر چاندنی

واہ وا کیا عجز ہے کیا خاکساری تجھ میں ہے بچھگئی سطحِ زمیں پر فرش بنکر چاندنی

مرشوں پر رکھتی ہے لطف و عنایت کی نظر ڈالتی ہے قبر پر رحمت کی چادر چاندنی

سچ تو یہ ہے کیا لکھے کوئی تری مدح و ثنا آئی ہے تو نور کے سانچے میں ڈھلکر چاندنی

آشکارا ہے جہاں میں صنعتِ پروردگار

روزِ روشن ہے نمایاں قدرتِ پروردگار

صورتِ رخسارِ روشن پُر ضیا ہے چاندنی باغِ عالم میں بہارِ جانفزا ہے چاندنی

کھینچ لیتی ہے دلوں کو حسینوں کی طرح واہ کیا دلکش ہے کیسی دلربا ہے چاندنی

اے قمر تیری ضیائے حسن ہے کیا دلفریب پیاری پیاری روح افزا دلکشا ہے چاندنی

ہر روش پر کیوں نہ اتراتی پھرے بادِ صبا شام ہی سے باغمیں رونق فزا ہے چاندنی

ہے نمونہ قدرتِ صانع کا ہر سو آشکار مظہرِ انوارِ حق شانِ خدا ہے چاندنی

غنچۂ خاطر کھلے جاتے ہیں کلیوں کی طرح کسقدر ہے دلکشا کیا پُر فزا ہے چاندنی

باغ میں جوشِ طرب سے بلبلیں ہیں نغمہ زن ہو مبارک اوجؔ کیا عشرت فزا ہے چاندنی

آشکارا ہے جہاں میں صنعتِ پروردگار

روزِ روشن ہے نمایاں قدرتِ پروردگار

اوج گیاوی

تصحیح - گذشتہ نمبر میں جو فارسی غزل جناب ڈاکٹر لی ریمل صاحب لطیفؔ کی شائع ہوئی تھی، اُس کے مطلع کے اوّل مصرعہ میں قافیہ غلط ہو گیا جسکا ہمیں افسوس ہے۔ صحیح مطلع یوں ہے:-

نگاہِ چشمِ شوقم لمعۂ نورِ جلالِ تو

سویدائے دلم آئینۂ عکسِ جمالِ تو

جلوۂ قدرت

ہر شے میں نور تیرا جلوہ دکھا رہا ہے
قدرت کا تیری طوطی نغمہ سنا رہا ہے

کوئی شریک تیرا یا رب نہیں جہاں میں
نیرنگیاں ہیں تیری دنیا کے گلستاں میں

پیکِ نظر کا جس جا ممکن گزر نہیں ہے
صنعتگری کا تیری رازِ نہاں وہیں ہے

یہ پھول یہ شگوفے، یہ شاہدانِ رعنا
کتمِ عدم سے تو نے ان کو کیا ہے پیدا

تیرے کرم سے قائم ہے یہ حیاتِ عالم
زیرِ نگیں ہے تیرے سب کائناتِ عالم

گلشن میں ہر شجر پہ قمری کی ہے یہ کوکو
عظمت کا تیری جلوہ آتا نظر ہے ہر سو

سو سو تجلیاں ہیں اک اک ادا میں تیری
اہلِ خرد ہیں حیراں مدح و ثنا میں تیری

گلشن میں ہے نظارت گل میں تری ادا ہے
ہر مرغ خوشنوا کے لب پر تری ثنا ہے

ہر رفعت و بلندی ہے تیرے آگے پستی
کیا حمد تیری لکھے، کیا ضبط کی ہے ہستی

جگل کشور ضبط

قطعہ تاریخ وفات حضرت ظہیر دہلوی

اے اہلِ جہاں چساں بباید
وارستگی از غمِ جہاں یافت

ہر چند کنیم امیدِ عشرت
لیکن ز فلک نمے تواں یافت

ہر کس ز قضائے جور پیشہ
شد فوت و حیاتِ جاوداں یافت

چوں مرگِ ظہیر مشتہر شد
محوی کہ ملالتے بجاں یافت

خوش مادۂ سالِ فوتش
بگزشت ظہیر از جہاں، یافت

محوی لکھنوی

تازہ غزلیں

ابو الاعجاز حضرت عرشی

ہر ذرّے ذرّے میں پر تو تری خدائی کا
ہر اک پہ سایہ ہے دامانِ کبریائی کا

ہمیں غرور سے دو حکم جبہ سائی کا
خدا کی شان تم اور ادّعا خدائی کا

جنوں نے شوق دلایا برہنہ پائی کا
ترے فراق میں کاسہ لیا گدائی کا

دلِ شکستہ میں طاقت نہیں ہے ملنے کی
اٹھائے کون یہ صدمہ تری جدائی کا

میں مر گیا تو لحد پر وہ شمع رو بولا
چراغ ہو گیا گل آج آشنائی کا

فقیرِ عشق ہیں ہم بادشاہ ہیں دل کے
کہ رشکِ ساغرِ جم کاسہ ہے گدائی کا

کہاں کا باغِ خلیل اور کہاں کا جلوۂ طور
یہ ایک شوشا تھا حضرت کی کبریائی کا

چلیں گے کوچۂ جاناں میں سر کے بل عشّاق
کہ مدتوں سے تہیہ ہے جبہ سائی کا

نہ راہِ عشق میں دو گام چل سکے ہمراہ
اسی پہ خضر کو دعویٰ تھا رہنمائی کا

بنایا خاک کا میری کلال نے ساغر
پسِ فنا بھی نہ دھبّا مٹا گدائی کا

بنائی خلدِ بریں خاک تو نے اے شداد
ملا نہ حکم جو در تک تجھے رسائی کا

چراغِ کعبۂ دل ہے خیالِ حسنِ نبی
کہ نور پردہ میں ہے ذاتِ کبریائی کا

وہی وہی ہے جدھر دیکھئے اٹھا کے نگاہ
بہشت آئینہ خانہ ہے خود نمائی کا

نئی روش سے بہار آئی باغِ عالم میں
جنوں کے ہاتھ میں دامن ہے پارسائی کا

پہنچنے پائے نہ ہم کوئے یار تک عرشی
گلہ ہے اپنے مقدّر کی نارسائی کا

از خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی

اُنکی نگاہِ ناز سے کیوں طور جل گیا
موسیٰ کا ارتباط رقابت سے کھل گیا

وہ آپ ہوں فراق میں یا اُنکی یاد ہو
کوئی نہ کوئی دل کو مرے آ کے مل گیا

سچ تو یہ ہے رقیب نے ڈالا یہ تفرقہ
اقرارِ وصل کر کے وہ مجھ سے بدل گیا

دل میرا مجکو پھیر نہ دینا تھا توڑ کے
یہ چال وہ حسین شرارت سے چل گیا

موسیٰ سے کیوں حجاب کیا کوہِ طور نے
کیا اور کوئی دیکھنے والا نکل گیا

الفت جتا کے یار کو مغرور کر دیا
اب تو مزاج اور بھی اُنکا بدل گیا

عشرت کٹھن ہے منزلِ الفت کا راستہ
دو ہی قدم میں پاؤں ہمارا پھسل گیا

روضۂ شاہ عبدالجلیل - الہ آباد

انڈین پریس الہ آباد

مہاراجہ یدھشٹر (سورگاروہن)

انڈین پریس الہ آباد

دسمبر ۱۹۱۱ء

جلد ۴ نمبر ۶

اقوامِ ہند کی اصل اور اُن کی تقسیم (۲)

(۳) ہند کی اقوام کیونکر بنی ہیں اور انکی اصلی تقسیم کیا ہیں؟

ہند کی اقوام اور اُن کی تمدنی حالت کا اختلاف

تھوڑا ہی زمانہ گزرا ہے کہ ہند ایک ایسا ملک خیال کیا جاتا تھا جس میں ایک ہی قسم کی قوم رہتی ہے اور ان کا مذہب اور تمدن اور صنعت و حرفت ایک ہی سا ہے اور مُدت ہائے دراز سے بلا کسی تغیر کے چلا آتا ہے۔ لیکن یہ غلط راے اسوقت قائم نہیں رہ سکتی۔۔۔ ......اس ملک میں انسان ہیں بہ لحاظ اپنی مختلف اقسام مختلف خیالات مختلف رسوم و عادات اور مختلف مدارج تمدن کے اُسی قدر فرق ہے جس قدر اس مرز بوم میں جہاں وہ رہتا ہے۔ اگر ہم نے یہ کہا ہے کہ ہند بوجہ اپنی متضاد اور مختلف آب و ہوا کے تمام عالم کا ملخص ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کے باشندوں میں بھی یہ تضاد اور تفریق کچھ کم نہیں اور بہ حیثیت مجموعی یہاں تاریخی بنی نوع انسانی کا ہر ایک طبقہ موجود ہے۔ نوع انسانی کی قسمیں یہاں اشد درجہ مختلف ہیں۔ ایک طرف تو سیاہ فام وحشیوں کی اقوام ہیں اور دوسری طرف ایسی اقوام ہیں جن کی جلد مثل یوروپیوں کے صاف اور سفید ہے۔ یہاں دنیا کے مدارج ترقی کے کل درجے موجود ہیں۔ یعنی ممالک متوسطہ کے پہاڑی حصوں کی وحشیانہ زندگی سے لیکر گنگا کنارے کے شہروں کی پُرلطف معاشرت اور پھر یوروپی زندگانی کے اُن اعلیٰ وسائل تک جن کو اس ملک کے اخیر فاتحین یہاں لائے ہیں۔

اقوام ہند چار اقوام سے مرکب ہیں۔ لفظ ہندو

وہ پچیس کروڑ مخلوق جس کو ہم یورپ میں بطور عام ہندو کہتے ہیں کئی بڑی بڑی اقوام سے مرکب ہے حبشی زرد رنگ قوم تورانی اور آریہ لیکن ان چار اصلی اجزا کے مختلف تناسب میں ملنے کی وجہ سے اور نیز اُن اثروں کی وجہ سے جو اختلاف مرز بوم سے پیدا ہوئے ہیں ہند میں ایک بہت بڑا گروہ ذیلی اقوام کا پیدا ہو گیا ہے جو تعداد میں یورپ

کی اقوام سے زیادہ ہیں۔ لفظ ہندو قومیت کے لحاظ سے کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ہند میں اس سے مراد صرف وہ شخص ہے جو نہ مسلمان ہو نہ عیسائی نہ یہودی اور نہ پارسی اور جو ان چار ذاتوں میں سے جن کو فی الواقع بُدھ مذہب نے بھی جائز رکھا کسی ایک ذات میں شامل ہو۔ یہ ذاتیں ابتدا میں چار ہی تھیں یعنی برہمن چھتری ویش اور شودر لیکن اب ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ ذاتیں اقوام کی تقسیم سے مطابقت تو نہیں رکھتیں لیکن جیسا ہم آگے چلکر دکھائیں گے ہمیں ذات قائم ہونے کے اصول کی خبر دیتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوگا کہ برہمن عموماً آریہ ہے اور چھتری راجپوت اور ویش تورانی اور شودر تورانیوں اور اصلی باشندگانِ ملک کے میل سے بنا ہے۔

ہند کے قدیم باشندے

ہند کے قدیم باشندے سیاہ فام تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم الایام سے ان کی دو قسمیں تھیں ایک حبشی وش جن کے بال اونی اور چہرے چپٹے تھے یہ مشرق اور وسط میں رہتے تھے اور دوسرے اسٹریلیا کے حبشیوں کے قسم میں سے تھے۔ قدآور اور زیادہ ہوشمند اور ان کے بال لمبے تھے یہ جنوب اور مشرق میں بود و باش رکھتے تھے۔ ان میں سے پہلی قوم اس وقت تک گونڈوانہ کے پہاڑوں میں موجود ہے اور دوسری نیلگری کی وادیوں میں۔ یہ قدیم اور وحشی اقوام جو کبھی ابتدائی تعلیم کے درجے تک بھی نہیں پہنچیں۔ تاریخی زمانہ کے پہلے سے ہند کے ساحلی جنگلوں میں رہا کرتی تھیں اور جیوں جیوں ملک میں تمدن ترقی کرتا گیا یہ بتدریج مفقود ہوتی گئیں۔

ملک ہند میں داخل ہونے کے مشکلات

جیسا ہم اوپر دکھا چکے ہیں ہند وہ ملک ہے جس میں داخل ہونا نہایت مشکل ہے۔ ایک طرف تو ہمالیہ کے پہاڑ اور دوسری طرف سمندر نے اسے تمام دنیا سے علیحدہ کر لیا ہے۔ خلیج بنگالہ کی طرف اس کے سواحل کو موجوں کے تھپیڑوں نے غیر ممکن العبور بنا رکھا تھا اور بحر عمان اور بحر عرب کی جانب مانسون کی شدت افریقہ سے آنے والی کشتیوں کو مار کر ہٹا دیا کرتی تھی۔ اگر وہ کنارے تک پہنچ بھی گئیں تو مغربی گھاٹ اُن کے لئے ایک سدِ حائل تھے اور اُن کی آڑ میں یہاں کے باشندے بخوبی ان اجنبی اشخاص کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ ان وجوہات سے اُس قدیم زمانہ میں کسی اجنبی قوم کو اس ملک میں سمندر کی راہ سے آنے کا خیال تک نہیں گزرا اور اقوام فاتحین جو اس ملک میں آئیں وہ ہمالیہ کے راستے سے آئیں۔ یہ بڑی قہقہہ دیوار ملک کو دور تک محفوظ کئے ہوئے ہے لیکن اس کے دونوں کناروں پر دو منفذ ہیں۔ مشرق کی طرف برہمپتر کی گھاٹی اور مغرب کی طرف دریائے کابل کی گھاٹی ان دونوں نے اس دیوار میں راستہ پیدا کیا ہے اور انھیں راستوں سے ایشیائی فاتحین کی فوجیں یکے بعد دیگرے اس زرخیز ملک میں داخل ہوئی ہیں۔ ان اقوام میں سے زیادہ قوی اور کثیر التعداد قوم مغربی راستے سے داخل ہوئی کیونکہ دونوں راستوں میں سے یہی راستہ زیادہ آسان تھا مشرقی راستہ یعنی برہمپتر کی گھاٹی ایک ایسا خطہ تھا جہاں جنگل کی گنجانی اور پانی کی توفیر انسان کو ہر قدم پر روکتی تھی۔ انگریزوں نے ان دونوں راستوں کو دو نام دئے ہیں جو بالکل صحیح تو نہیں لیکن یہ ہندوستان کے جغرافیہ سے کسی قدر مطابقت رکھتے ہیں مغربی راہ کا نام باب آریہ رکھا گیا ہے اور مشرقی راہ کا باب تورانی۔

باب تورانی

باب تورانی یعنی برہمپتر کی گھاٹی وہ راہ ہے جس سے فی الواقع اقوام تورانی اس ملک میں نہیں آئی ہیں لیکن اگر اس لفظ کو خاص معنی میں نہ استعمال کیا جاوے تو کہہ سکیں گے کہ یہ نام غلط نہیں ہے لفظ تورانی سے دراصل وہ اقوام مراد ہیں جو ترکستان

کے باخندہ ہیں۔ لیکن بطور عام اس لفظ کا اطلاق اُن زرد فام اقوام پر بھی ہوتا ہے جو تورانیوں سے مشابہ ہیں۔ باب تُورانی سے ہند میں آنے والی یہی اقوام زرد فام تھیں جن کے چہرے چپٹے اور آنکھیں ترچھی تھیں۔ یہ تاریخی زمانے سے پہلے یہاں آئیں اور یہ ملک کے پہلے اجنبی تھے۔ اصلی تُورانی سیدھے بالوں والے جن کے مُنہ پر ڈاڑھیاں تھیں اور جن کی آنکھیں سیدھی تھیں اس زمانے سے بہت بعد ہند میں آئے اور درحقیقت ان کا بڑا گروہ باب آریہ سے اس ملک میں داخل ہوا۔ اصلی تورانیوں کے ذکر سے پہلے ہم اس امر کی تحقیق کریں گے کہ زرد فام اقوام جو ہند میں آئیں اُن کا کیا حشر ہوا اور وہ کونسی نشانیاں اس ملک میں چھوڑ گئیں۔ یہ اقوام زرد فام برہمہ پُتر کی وادی سے گزرنے کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوئیں۔ یہاں انھیں اس پہاڑی خطّے نے روکا جو اب گونڈوانہ کہلاتا ہے۔ اصلی باشندگان سیاہ فام نے جو بالکل مقابلہ نہ کر سکتے تھے یہاں آکر پناہ لی اور اس خطّے کی دشوار گزار زمین اور یہاں کی قاتل آب وہوا نے اجنبیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ اب یہ دو حصّوں میں تقسیم ہوگئے ایک اِن میں سے گنگا کے کنارے کنارے مغرب کی طرف چلا اور دوسرے نے خلیج بنگالہ کے کنارے کنارے جنوب کی راہ لی۔

پروٹوڈراویڈی اقوام ان ایشیائی فاتحین اور اصلی سیاہ فام باشندگان ہند سے جو اقوام پیدا ہوئیں اُن کا نام پروٹوڈراویڈی (یعنی قدیم قوم ڈراویڈ) رکھا گیا ہے اور چونکہ اِن میں اصلی باشندوں کا میل زیادہ تھا یہ بھومی جنم یعنی اصلی باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ نئے فاتحین کے ریلوں نے ان بھومی جنم اقوام کو روز بروز جنوب کی طرف بھگایا اور نئے فاتحین ومفتوحین کے میل سے وہ قدیم قوم بنی جس کو ڈراویڈ یا ٹامل کہتے ہیں۔ پس گویا قوم ٹامل نتیجہ ہے پروٹوڈراویڈیوں اور زرد فام اقوام کے میل کا۔ اگر اقوام زرد فام کے اثر کو جو ہند کی اقوام پر پڑا بغور دیکھا جائے تو یہ اثر زیادہ تر برہمہ پُتر کی گھاٹی میں نظر آتا ہے جہاں فاتحین کی نئی نسلیں یکے بعد دیگرے زمانہ دراز تک آتی رہیں۔ مثلاً آسام کے باشندے جن کی تعداد تقریباً بیس لاکھ ہے خالص زرد فام نسل کے ہیں۔ لیکن بنگال میں بھی جہاں کے باشندے نہایت مخلوط ہیں زرد فام دھاوے کا اثر اس وقت تک موجود ہے۔ کیونکہ یہاں وہ اقوام دور تک پھیل گئی تھیں۔ جیوں جیوں ہم جنوب کی طرف خلیج بنگالہ کے کنارے کنارے چلیں ان زرد فام اقوام کا اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً سنتالوں میں یہ اثر بمقابل ان اقوام کے جو گونڈوانہ میں رہتی ہیں بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے گونڈوانہ کی اقوام کھونڈ مالیر اور گونڈ اس وقت تک اصلی باشندگان ہند سے زیادہ مشابہ ہیں اور شاید انھیں میں وہ قدیم حبشی وش قوم جس کا اوپر ذکر ہوا اِسوقت موجود ہے۔

ٹامل اور تلنگے غرض اسوقت جنوبی ہند میں گوداوری سے لیکر کیپ کامرن تک مختلف ڈراویڈی اقوام جن میں متعدد تقسیمیں ہیں بود و باش رکھتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور تقسیمیں ٹامل اور تلنگے ہیں۔ یہ کُل زرد فام اقوام اور حبشیوں کے میل سے بنی ہیں لیکن انمیں اور اجزا بھی شامل ہوگئے ہیں۔ جن میں سے ایک جز تورانی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اقوام تورانی کے مغرب کی طرف سے آنے کا ذکر کریں ہمیں یہ کہدینا ضرور ہے کہ ہمالیہ کی بلند سطحوں اور وادیوں کے باشندے باستثنا باشندگان کشمیر کے تبت الاصل ہیں اور مشرقی چین کے باشندوں سے بہت مشابہ ہیں لیکن تبتی اقوام یہاں بطور فاتحین کے نہیں آئیں کیونکہ جغرافی حیثیت سے اور نیز بلحاظ نسل و مذہب ورسوم وعادات کے ان کا زیادہ تر تعلق

تبت سے ہے نہ کہ ہند سے۔ لداخ۔ دروستان۔ بالتستان۔ بھوٹان اور نیپال کے ایک حصہ کے باشندے بھی تبتی ہیں۔ ان کے گال کی ہڈیاں اُبھری ہوئی اور پلکیں کوتاہ ہیں۔

باب آریہ سے آنے والے فاتحین۔ اگرچہ ہمیں وہ زمانہ قطعی طور پر نہیں معلوم ہے جب باہر کی اقوام باب تورانی کی راہ سے ہند میں آئیں لیکن برخلاف اس کے ہمیں اُن فاتحین کا حال بہت کچھ معلوم ہے جو باب آریہ سے اس ملک میں داخل ہوئے۔ البتہ ان میں سے بہت قدیم آنے والے اقوام زرد فام کی طرح زمانے کی تاریکی میں غائب ہو گئے ہیں اور ان کا پتہ صرف ان نتائج سے پایا جاتا ہے جو ان کے میل جول سے مفتوحہ اقوام میں پیدا ہوا۔ تورانی اقوام وہ ہیں جنہوں نے ان اقوام کی جسمانی خصائص میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیا۔ برخلاف اس کے آریوں نے ان کو زیادہ تر تمدنی اثر سے متاثر کیا۔ عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہند کی اقوام نے اپنا تناسب اعضا اور صورت شکل تورانیوں سے پائی ہے۔ اور زبان و مذہب اور رسوم و عادات آریوں سے مثلاً سترہ کروڑ ہندو اس وقت آریہ زبانیں بولتے ہیں لیکن ان میں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں جن کی رگوں میں اُس قدیم سفید رنگ قوم کا خالص خون موجود ہو۔

کول اور کولی زبان۔ تورانی اس ملک میں پہلے آئے اور انہوں نے سارے دریائے سندھ کے مجرا پر اپنا دخل کیا اور گنگا کی گھاٹی کے ایک حصے پر بھی قابض ہو گئے جیوں جیوں نئے گروہ اُن میں آکر ملتے گئے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی یہ بھی قدم بڑھاتے گئے یہاں تک کہ دکن تک پہنچ گئے بجنسہ اسیطرح جس طرح زرد فام اقوام دکن تک پہنچی تھیں ان کے بھی آگے آگے اصلی اقوام بھاگتی گئیں اور چونکہ ان میں مقاومت کی قوت نہ تھی یہ دکن کے اُس حصے میں پناہ گزیں ہوئیں جو بالکل پہاڑی ملک اور گھنے جنگلوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ وسط ہند کے پہاڑی حصوں میں ہمیں اس ملک کے قدیم ترین باشندوں کا پتہ لگتا ہے جو پرو تو ڈراویڈی یا خالص حبشی تھے۔ ان میں سے تعداد میں زیادہ کول ہیں۔ یہ چھوٹے ناگپور میں مہاندی کی اونچی گھاٹی میں بودوباش رکھتے ہیں۔ اور اُن کی کئی تقسیمیں ہیں جن میں کم و بیش میل ہو گیا ہے لیکن اصلی کول جن کی تعداد تقریباً دس لاکھ ہے اس وقت تک خالص ہیں اور انہوں نے اقوام ڈراویڈ کی رسوم و عادات اور مذہب کو اخذ نہیں کیا ہے کول اور کولی زبان کا اطلاق اُن قدیم باشندوں اور ان کی زبان پر ہوتا ہے جو خلیج کھاچ گنگا تک کے پہاڑی حصوں میں رہتے ہیں۔ لیکن ان میں سے خالص اقوام جن میں میل نہیں ہوا ہے وہی ہیں جو اس خطے کے مشرق میں بود و باش رکھتی ہیں۔ برہمنی ندی کے منبع سے قریب جو مہاندی کے شمال میں واقع ہوا ہے دوانگ یعنی جنگل کے باشندے ہیں جو اپنے تئیں سب سے قدیم تبلاتے ہیں اور فی الواقع پورے وحشی ہیں۔

کولی زبان۔ اب ہم کولی زبان سے بحث کریں گے لیکن اس بحث سے پہلے ہمیں اتنا کہدینا ضرور ہے کہ نہ ہند میں اور نہ کسی اور ملک میں صرف زبان تقسیم اقوام کی بنیاد قرار دی جاسکتی۔ وہ قوم جو اسوقت خالص کولی زبان بولتی ہے بہت قدیم نہیں ہے۔ بلکہ یہ سنتال ہیں جن میں اقوام زرد فام کا بہت کچھ میل ہو گیا ہے۔ ڈراویڈی زبانیں جنوب میں بولی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ قوم جو اس زبان کو ہند میں لائی زیادہ تر اس خطے میں نہیں پائی جاتی اسیطرح ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگرچہ آریہ زبانیں ہند میں سب سے زیادہ رائج ہیں لیکن وہ اقوام جن کو اصلی آریہ ہونے کا فخر ہے تعداد میں بہت کم ہیں۔ پس صرف زبان قومیت کا

معیار نہیں قرار دی جاسکتی۔

آریہ اقوام کا ہندستان میں آنا۔ جس وقت سفید رنگ اقوام یعنی آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہیں وحشیوں سے مقابلہ نہیں پڑا بلکہ اُن متمدن اور زبردست حکومتوں سے جنہیں تورانیوں نے قائم کیا تھا آریوں نے پہلے صحرائے سندھ کی حکومتوں کو زیر کیا اور یہاں مدت تک قیام کرنے کے بعد مغرب اور جنوب کی طرف مبادرت کی پندرہ سو سال قبل مسیح تک قوم آریہ وندھیاچل کے پہاڑوں کو پار نہ ہوسکی تھی اس نے شمال کے تورانیوں کو البتہ زیر کرلیا تھا اور اُن کے لئے ایک نئی ذات ویش کی قائم کی گئی تھی جس کا درجہ برہمنوں اور کھتریوں کے بعد تھا۔ برخلاف اس کے اصلی باشندوں کو انہوں نے ایک وسیع ذات میں شامل کرلیا تھا جس کا نام شودر تھا اور جو درجہ میں سب سے نیچی تھی۔ اسی زمانہ میں آریوں نے دکن پر دھاوا کیا تھا جس کے متعلق راماین لکھی گئی ہے۔ راما کی سپہ سالاری میں یہ نہ صرف دکن تک پہنچے بلکہ بڑی بڑی بہادریوں کے بعد یہ جزیرہ نمائے ہند کے جنوبی حصّہ تک پہنچ گئے اور سیلون کے باشندوں پر بھی اپنی حکومت قائم کردی رامائن میں لکھا ہے کہ اُن آریوں کو بڑے بڑے دیوؤں سے سامنا پڑا اور انہوں نے بندروں کی مدد سے قوم ناگ کے ملک کو جو سانپ کی پرستش کرتے تھے زیر و زبر کیا۔ یہ ناگ دراصل تورانی فاتحین تھے جنہوں نے جنوبی ہند میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کی تھیں اور اپنی رعایا یعنی قدیم اقوام ڈراویڈ کے ساتھ انہوں نے سانپ کی پرستش اختیار کی تھی۔ بندروں سے جو رامچندر جی کے شریک اور معاون تھے گویا وہ قدیم اقوام سیاہ فام مراد ہیں جو اس خطے کے اصلی باشندے تھے۔ آریوں کی یہ فوج کشی صرف بمنزلہ ایک فوجی دھاوے کے تھی اور اسکا کوئی اثر اس ملک میں باقی نہیں رہا۔

راجپوتوں کی فوج کشی چوتھی صدی مسیحی میں ہندوستان پر پھر ایک نئی فوج کشی راجپوتوں کی ہوئی۔ یہ قوم جو بادشاہوں کی اولاد تھی اور جن کا ہر فرد بہادر اور آپس میں برابر تھا چھتری کے نام سے مشہور ہوئی اور اس نے اپنے تئیں اُس خطے میں جس کا نام اب راجپوتانہ ہے یعنی دریائے سندھ کے مشرق سے لیکر اراولی کے پہاڑوں تک قائم کیا۔

پنجاب اور وسط ہند کی اقوام ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کہ شمال و مشرق کی جانب سے باب تورانی سے ہوکر زرد فام اقوام اس ملک میں آئی تھیں اور یہ سیاہ فام اقوام کیساتھ کم و بیش میل پیدا کرنے کے بعد صحرائے گنگا اور جنوب دکن میں اقوام تورانی کی تابع ہوگئی تھیں اسی طرح اب ہم اُن دھاووں کے نتائج کو بتائیں گے جو باب آریہ کی طرف سے ہند پر ہوئے اور یہ دکھائیں گے کہ انہوں نے شمال و غرب اور غرب میں اقوام تورانی کو فتح کیا اور آریہ اثر کو جو بمقابل جسمانی اثر کے زیادہ تر روحانی اور اخلاقی تھا اس ملک میں پھیلایا۔ اگر ہم اب شمال سے مغرب کی طرف چلیں جیسا کہ ہم پہلے شمال سے مشرق کی طرف گئے تھے اور پنجاب کی حالت پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جاٹ اور گوجر اور سکھ جو تورانی اقوام ہیں یہاں کے باشندوں میں تین چوتھائی ہیں اور ایک چوتھائی آریہ ہیں جن کا رنگ انھیں صاف بتاتا ہے۔ اس سے نیچے اتر کر ہمیں راجپوت ملتے ہیں جو آریوں میں شریک ہیں لیکن خالص آریہ نہیں ہیں۔ گجرات کے باشندے بہت ہی مخلوط ہیں لیکن ان میں تورانی میل زیادہ ہے اور وہ پہاڑی سطح جو وندھیاچل تک چلی گئی ہے اور جس کے جنوب میں گنگا واقع ہوئی ہے آریہ اقوام کی حد ہے اس سے نیچے اتر کر گویا یہ بالکل مفقود ہوگئی ہیں لیکن یہاں کے باشندوں کی صورتوں میں اگر ان کی نشانی باقی نہیں رہی ہے تو اقلاً ان کا مذہب اور

اِن کے نظامات ہر جگہ غالب ہیں۔ بمبئی سے آگے گھاٹ کے دونوں دامنوں پر ایک جنگجو قوم ہے جس نے تاریخ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ یہ تورانی الاصل مرہٹے ہیں اور ان کی تعداد کئی لاکھ ہے۔ جیوں جیوں ہم وسط ہند کی طرف اور جنوب کی طرف اترتے جاتے ہیں آریائی تمدن اور تورانی نقشے کم ہوتے جاتے ہیں اور مخلوق ڈراویڈی ہوتی جاتی ہے۔ اِن اجزا کے مختلف امتزاج سے کئی قومیں پیدا ہوئی ہیں اوّلاً بھیل جنہیں راجپوتوں نے بھگا کر پہاڑی حصوں میں پہنچا دیا۔ یہ پروٹوڈراویڈی ہیں اور ان میں تورانی اثر بہت کم آیا ہے بلکہ بعض ان میں سے گویا اصل باشندگان ہند کی اولاد ہیں یہ وندھیاچل کے مغربی حصّے میں رہتے ہیں اور ان کی تعداد تقریباً بیس لاکھ ہے دوسری قوم میر ہے جو جاٹوں سے زیادہ ملتے ہوئے ہیں اور اراول کے شمال میں رہتے ہیں ان کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ہے تیسری قوم مینا ہے جو ریاست جے پور میں بود و باش رکھتے ہیں اور ان کی تعداد تقریباً تین لاکھ ہے۔ اخیر میں راموسی اور دھانک ہیں جو مغربی گھاٹ کے دامن میں رہتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ڈراویڈی معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ ان کی تاریک جلدوں چپٹی ناکوں اور ابھرے ہوئے رخساروں سے معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی فتوحات | مسیحی گیارھویں صدی میں مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں یہ فاتحین بھی نہایت مختلف الاصل تھے ان میں عرب ایرانی افغانی اور مغل ملے جلے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے ہند کی اقوام کو جو پہلے ہی سے مخلوط تھیں اور بھی زیادہ مخلوط بنا دیا۔ ان کی حکومت اور ان کے تمدن نے سندھ و گنگا کے مجراؤں میں بہت کچھ اثر پیدا کیا لیکن جنوب میں انکے میل سے کوئی علٰحدہ قوم پوری طرح قائم نہیں ہوئی۔

(ماخوذ از مسودۂ تمدن ہند) **سیّد علی بلگرامی (مرحوم)**

دربار تاجپوشی

این بارگاہ کیست کہ گویند بے ہراس — کاے اوج سطح چرخ حضیضِ ترا مماس

جس طرح موسمِ بہار کی جلوہ آرائی، ہنگامہ پیرائی، اعجوبہ نمائی، صفاگستری، ضیاپروری سے پیشتر ہواؤں کا رُخ بدل جاتا ہے سماں پلٹ جاتا ہے۔ زمانہ کے صحیفہ کا ورق الٹ جاتا ہے۔ رات کا سنسان سنّاٹا گھٹ جاتا ہے۔ دن عاشق کا ارمان ہو کر بڑھجاتا ہے۔ خزاں کے زرد منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ نیچر کے ہونہار پودوںمیں کونپلے پھوٹنے لگتی ہیں۔ جو درخت لُنڈ مُنڈ نظر آتے تھے اُنکے سوکھے ٹھنڈ بیلوں اور پتوں سے لدکر جھنڈ کے جھنڈ ہونے لگتے ہیں۔ نئے نئے سرخ سُرخ پتے، روز روشن میں شمعوں کے قمقموں کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ سبز سبز پتے شاخوں کا عصا ہاتھ میں لئے خضر کی صورت نظر آتے ہیں بلبلیں پھولوں کی پتلی پتلی نازک اور لچکدار ٹہنیوں پر پھول پھول کر بیٹھی ہوئی پیک صبا سے خسروِ گل کی سواری کا مژدہ سنکر خوشی سے پھولی نہیں سماتیں۔ تہنیت کے زمزمے سناتی ہیں۔ خیر مقدم کے نغمے گاتی اور چہچہاتی ہیں۔ درختوں کی فوج در فوج قطاروں کو قوت نامیہ کا جنرل عجیب اوج موج سے بڑھاتا ہے۔ سرو اپنے کو کھینچکر اور تن کر فیروزمندی اور بخت بلندی کا لہلہاتا جھنڈا دکھاتا ہے۔ سبزۂ نودمیدہ شوق پابوسی بہار میں بچھا جاتا ہے۔ نرگس بعینہٖ ہمہ تن چشم انتظار بننے کو اور سوسن ادب سے دانتوں میں زبان دبائے اپنی ارمان بھری داستان

سکنے کو ہوتی ہے۔ بیدل ؎

دل ذرۂ تپ جستجو سر مہر گرمئے آرزو — چہ ہوس کہ تحفہ نے کشد بنگاہ آئینہ مائلش

یعنی ہر ذرہ جستجوے معشوق کی سرگرمی میں تپ بنا ہوا ہے اور آفتاب ہمہ تن گرمئے آرزو سے ہو ہیں اپنا اپنا تحفہ پیش کر رہی ہیں مگر حسن آرا دلبر اپنے بناؤ سنگار کے لئے آئینہ کی جانب مائل ہے کسی کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھتا

اسیطرح اس بھارت ورش کی بھومی ایک سال قبل اپنے شری شکتیمان مہاراج دھراج چکرورتی راج دھان ظل اللہ سنسار اوتار کے نزول اجلال کے انتظار میں سمندر کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوے ہے کہ شہنشاہی جہاز دلنواز قیصری پھریرا اڑاتا اور ابر نیساں کیطرح خوشی کی لہریں دکھاتا بندرگاہ بمبئی کو معدن لعل اجلال و صدف گوہر اقبال بنائے۔ تمام ہندوستان میں ویسی ہی جنبش ہے جیسے نسیم بہار کی سرسراہٹ سے نخل و شجر میں پیدا ہوجاتی ہے اور جیسی باد موافق کے مسرت بھرے جھونکے سے بحر کی تمام سطح پر لہر دوڑ جاتی ہے۔ مختلف مذاہب کی سوسائٹیاں جو ملک و قوم اور برطانیہ کی بہتری اور فلاح و صلاح کی رات دن خواہاں ہیں سوتے جاگتے اپنی اپنی رفارم کی تکمیل کے ہرے بھرے باغ دیکھ رہی ہیں کہ اب خاطر خواہ نتایج اور ثمرے حاصل ہونگے۔ پولٹکل رفارمر خورسند، سوشیل لیڈر آنند ہیں کہ انکی اسکیمیں جو نیک نیتی اور خیر طلبی کے سونے کے اوراق پر پیش ہوں گی کامیابی کا مبارک چہرہ دیکھیں گی اور اس کو سونے میں سہاگا پائینگی۔ خادمان ملک و قوم امیدوار ہیں کہ انکی جانی اور مالی خدمتیں مقبول ہوکر شہنشاہی دربار سے عطیہ (تمغہ اور خطاب وغیرہ) دلوائیں گی۔ ہر قسم کے اہل کمال حسرت بھرا دل پہلو میں لئے بیٹھے ہیں کہ اب ہمارے جوہر کمال کا ستارہ چمکے گا اور ہمارا گرد آلود گوہر شفاف و آبدار ہوکر کامگاری کی سلک میں منسلک ہوگا اور گردن شاہد مقصود کی حمائل بنے گا۔

شہنشاہ کی رونق افروزی کی خبر بشاشت اثر کا چراغ تمام برٹش انڈیا میں گھر گھر روشن ہے ہندوستان کی سرزمین آسمان بنی ہوئی ہے اور خیر مقدم کے جو چراغ روشن ہیں وہ ستارے ہیں جو اپنی تابناکی سے سیہ بخت بد بینوں کی آنکھیں خیرہ کر رہے ہیں۔ گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے۔ جب ابھی سے مسرت و شادمانی کا یہ سماں ہے تو ہز میجسٹی کی جلوہ افروزی پر تو گویا ہندوستان کو چار چاند لگ جائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ترستی آنکھوں نے کم و بیش دو سو برس کے عرصہ میں اپنے نامدار تاجدار دادار سایۂ کردگار کا جمال جہاں آرا نہیں دیکھا۔ وہ تاجدار جس کی پرجلال سلطنت کی افق سے آفتاب و ماہتاب دیکر نکلتے ہیں۔ وہ تاجدار جس کے جہازوں نے سمندر کو مشرق و مغرب میں کھونڈ ڈالا ہے۔ جس کے لشکروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے دنیا کے اونچے اونچے سر بفلک پہاڑوں کو روند ڈالا ہے۔ جس کا سکہ بادوزاں کی طرح ممالک دنیا میں چل رہا ہے جسکی عالمگیر صنعت و تجارت نے یورپ۔ ایشیا۔ افریقہ کو مالامال کردیا ہے۔ جسنے اپنے خداداد نعمتوں کے بار احسان کا جوا انسانی نسلوں کے دوش پر رکھدیا ہے۔ جسکی ریلوں کے سلسلہ نے صعوبتوں اور دشوار گزاریوں کے لمبے لمبے دانتوں والے فیلان مست کا مُہرہ توڑ دیا ہے۔ جس کے انجنوں کی چنگھاڑوں نے افلاس و نکبت کے سیاہ دیوؤں کا منہ کالا کرکے عدم کے مازندران میں جلاوطن کردیا ہے۔ جس کے انجنوں کے دھواندھار بادلوں نے عالمگیر خلا کے سر پر گھٹا ٹوپ رکھدیا ہے جو صنعت و حرفت کی دولت کا دنیا پر مینہ برسا رہا ہے۔ وہ تاجدار جس کی

دمینتی سویمبر

انڈین پریس الہ آباد

سمندر کی سیر کرے تو دو دو میل تک سمندر میں چراغ ہی چراغ نظر آئیں گے۔ سمندر کی لہریں جب پشتے سے ٹکراتی اور پھر سو سو قدم پیچھے ہٹ جاتی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ علےٰ ہذا قدرت کی عجیب و غریب نیرنگیاں اس بھومی کے ہر مقام پر موجود ہیں اور مختلف قومیں بعض نیرنگیوں کی پرستش کرتی ہیں۔ اطاعت اور پرستش چونکہ اس بھومی کا سُبھاؤ ہے لہذا ۳۳ کروڑ دیوتاؤں ہی تک محدود نہیں بلکہ ہمیشہ نئے نئے دیوتا یہ بھومی جنتی رہتی ہے اور اس بھومی میں سب دیوتاؤں سے بڑا دیوتا راجہ اور بادشاہ ہے۔ اس بھومی میں جو لوگ براجمان ہیں وہ فطرت کی یہ فلاسفی تمام سنسار کے مہاتما دداتوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں کہ ایک منُش جو ویسا ہی شریر رکھتا ہے جیسا ہم تم سب مگر کروڑوں آدمیوں کی گردنیں جو اس کے نازک ہاتھ کی انگلیوں اور پنجے میں آگئی ہیں وم کے دم میں مروڑ سکتا ہے پس ضرور اس میں کوئی ان نیچرل شکتی (خلاف فطرت طاقت) موجود ہے اگر وہ چاہے تو نازک انگلیوں کی لکیروں کے شکنجے میں کروڑوں کر دانوں (ستمگروں) کو کھینچ سکتا ہے۔ اور چاہے تو انہیں نازک انگلیوں سے سونے چاندی اور جواہرات کا مینہ برسا سکتا ہے اس کا اشارۂ ابرو تیغ بنکر کروڑوں آدمیوں کا سر یکقلم قلم کر سکتا ہے۔ اس کے ترحم کی نگاہ کا ایک چھینٹا خشم و غضب کے عالمگیر دریائے آتش کو سرد کر سکتا ہے۔ بھلا شخص واحد میں یہ طاقت کہاں سے آگئی۔ یہ فوق العادت طاقت اُسی نے دی ہے جس کے سامنے دریا ایک قطرہ اور جس کے حضور صحرا ایک ذرّہ ہے اور جس کے جلال و جبروت کے آگے کوہ ایک پرِکاہ ہے راجا اور بادشاہ کی تمام قوتیں اسی ازلی ابدی قوت کا پرتو اور عکس ہیں۔ مبارک ہیں وہ شہنشاہ وفرماں روا جو اس نرنکار پرماتما کے دوار کو بار بار سیس نواتے اور اُسی کے مندر میں ہر دم ماتھا ٹیکتے اور اپنے کو ناچیز و ہیچ سمجھتے ہیں اور اُس کے عزّ و جلال و کمال لایزال صنعتِ قدرت کی تہ تک پہنچنے کا حتے الامکان ارادہ رکھتے ہیں۔ بیدل ؎

بکمالِ خالقِ انس و جاں نہ زمیں رسید نہ آسماں
چہ صدف کسے چہ دہد نشاں زحقیقتِ گہر آفریں

چونکہ دو سو سال قبل اس بھومی پر ہزاروں برس جابرانہ حکومت رہی لہذا وہ اطاعت کی عادی بن گئی۔ اب برٹش گورنمنٹ نے وہ آہنی جُوا اس کے کاندھے سے اٹھا لیا اور اس کو آزاد کر دیا۔ پس برٹش خاندان کے چشم و چراغ بلکہ اس کان کے گوہر شب چراغ ملک معظم جارج پنجم بالقابہ سے ہندوستان کو اپنی آزاد مرفہ الحالی کی ترقی کی جو کچھ امیدیں ہوں اور دربار تاجپوشی جو کچھ برکتیں اسپر نازل کرے کم ہے۔

نُدرت میرٹھی

مالک الدولہ صولت

پڑگئے ہیں یوں دلِ مضطر میں داغ جس طرح ہوں لالۂ احمر میں داغ

خوف ہے مجھکو دلِ پرسوز سے پڑنجائیں دامنِ محشر میں داغ

مطلع کی بندش اچھی ہے زواید سے پاک ہے مگر تشبیہ مبتذل ہے اور کسی قسم کی تازگی بھی نہیں ہے۔ دامنِ محشر میں داغ پڑجانے کی تخیل اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ہے خدائی اس بتِ بے دین وایماں کی طرف

کون بندہ حق کہے گا اب مسلماں کی طرف

رفتہ رفتہ دستِ وحشت کی رسائی دیکھئے

آستیں کا چاک جا پہنچا گریباں کی طرف

لوگ کہتے ہیں ضرور اک دن قیامت آئے گی

کاش آنکلو تمہیں گورِ غریباں کی طرف

ہم تو کہتے ہیں کسی سے واسطہ ہم کو نہیں

آپ تو کہئے اٹھاکر ہاتھ قرآں کی طرف

دن ہمارے قتل کا قاتل بتاتا ہی نہیں

ابروؤں کا ہے اشارہ عید قرباں کی طرف

سنتے ہیں صولت گرفتارِ بلائے زلف ہے

کیا وہی جکڑا ہوا جاتا تھا زنداں کی طرف

اس زمین میں بھی حسن تغزل بھلا معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کے قافیہ میں یہ غنیمت ہے کہ محض بدگمانی ظاہر ہوتی ہے ورنہ معشوق کے مبتذل ہوجانے میں کوئی بات باقی نہ رہی تھی ؎

نہیں داغِ دل ہیں مٹانے کے قابل یہ گلشن ہی اُن کے دکھانے کے قابل

جدائی میں ہم منہ لپیٹے پڑے ہیں نہ آنے کے قابل نہ جانے کے قابل

جو رمز و کنایہ لکھا خط میں اُسنے وہ باتیں نہیں ہیں بتانے کے قابل

کہا بے وفا دل لگی میں، تو بولے کوئی ڈھونڈھ لو دل لگانے کے قابل

محبت کا گیسو کی پابند ہوں میں نہیں بیڑیاں یہ بڑھانے کے قابل

بحر متقارب فعولن چار بار۔ اس وزن میں اکثر موزون الطبع ناواقف عروض یہ غلطی کرجاتے ہیں کہ مصرعہ کو فعول یا فعل پر تمام کردیتے ہیں حال آنکہ فارسی و اردو کے شعرا میں کسی نے ایسا نہیں کیا مثلاً محبّت کا گیسو کی پابند ہوں۔ اسی پر مصرعہ تمام کردیا جاتا تو رکن آخر سالم نہیں رہتا اور وزن میں خلل پڑتا ؎

ہوا ز لفوں پر اُسکی مبتلا دل کئے کی اپنے پائیگا سزا دل

وہ بیٹھے ہیں مرے پہلو بہ پہلو جگر کی جا جگر ہے دلکی جا دل

اس مصرعہ میں حالت اطمینان کی صورت کھینچی ہے حال آنکہ اطمینان ایک معنوی و باطنی شے ہے اُس کے لئے صورت کجا بالتزام یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ فراق میں جگر و دل ٹھکانے نہیں رہتے۔ شاعر کا کام مصوّری ہے اور یہ سچ ہے کہ کوئی تصویر غیر مہذب بھی ہوتی ہے مگر وہ بھی تصویر ہی ہوتی ہے بلکہ تصویر سے بڑھکر۔ اس لئے کہ معانی کی تصویر کھینچنا شاعر ہی کا کام ہے مصوّر میں یہ ہنر کہاں ؎

جن کے ستم اُٹھاکر برباد ہوگئے ہم نازاں ہیں اب وہ اسیر جلاد ہوگئے ہم

مطلب نہیں کسی سے ہی کام عاشقی سے افکار دنیوی سے آزاد ہوگئے ہم

شیریں سے منہ نہ موڑا کہسار کو نہ چھوڑا سر پتھروں سے پھوڑا فرہاد ہوگئے ہم

کیا مطلع کہا ہے۔ اور شعروں میں بھی کیا اچھا تغزل ہے لیکن اُردو کی شاعری اور زبان کی اصلاح کرنے والے یہ کہا کرتے ہیں کہ آخر فرہاد و مجنوں کا ذکر کب تک کئے جائیں گے یہ مضمون کیا کبھی پُرانا نہو گا۔ اسی طرح اگر بہزاد و شداد کے قافئے کہئے تو وہ بھی پُرانے ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کو مرے ہوئے نہیں معلوم کے ہزار برس گزر گئے۔ پھر اسی قیاس پر صیاد و جلاد کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے مگر ان کی شکایت کرتے کرتے بھی زمانہ ہو گیا۔ کہاں تک کوئی سن سکتا ہے یہ اعتراض بظاہر بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ مگر جواب اس کا یہ ہے کہ ان قافیوں کے ساتھ "ہو گئے ہم" بھی تو لگا ہوا ہے دوسرے جو قافئے معرکہ انظار شعرا رہ گئے ہیں اس سے تجاوز کرنا غزل میں نامناسب بلکہ غریب و رکیک معلوم ہوتا ہے۔ ناسخ مرحوم گیسو و آہو کے قافیوں میں راسو ضرور کہا کرتے تھے اور اس پر انھیں ناز تھا کہ میں نے نیا قافیہ نکالا۔ مگر غرابت سے خالی نہیں۔ غزل میں یہ عیب بے شک ہی کہ اسکا فرہ ایسا پڑجاتا ہے کہ شاعر دوسرے اصنافِ سخن سے اکثر بیگانہ رہتا ہے فارسی و اردو کی شاعری میں غزل و قصیدہ اکثر ہے اور بعض شعرا مثنوی و مرثیہ بھی کہتے ہیں۔ غیر زبانوں کی شاعری میں زیادہ تر کسی موضوع پر شعر کہتے ہیں یا کسی منظر کا سماں دکھاتے ہیں یا مثنوی کہتے ہیں اور فسانہ گوئی کرتے ہیں۔ غزل ان کے کلام میں نہیں ہے۔ ہمارے قصیدوں کی تشبیب و تمہید اکثر کسی منظر لطیف یا کسی موضوع اخلاقی پر شامل ہوتی ہے مگر مقصود قصیدہ کا کسی امیر کی مدح ہوتی ہے۔ اس سبب سے تشبیب کا مضمون بھی مبتذل ہو جاتا ہے۔ فسانہ گوئی شریعتِ اسلام میں ناجائز قرار پائی ہے۔ اس سبب سے شعرائے اہل اسلام نے اس سے احتیاط کی ہے۔

جانتے زیست کو جو نقش بر آب
بیٹھتے خیمۂ حباب میں ہم

اس کے آنے کی سنتے ہیں جو خبر
غرق پاتے ہیں اضطراب میں ہم

اس زمین میں بھی دونوں شعر خوب ہیں اور خیمۂ حباب والا شعر تو تعریف سے مستغنی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ انسان خیمۂ حباب میں کیونکر سما سکتا ہے تو میں یہی کہونگا کہ وہ شعر کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہستی جس دریا کا نقش بر آب ہے اس کا حباب کچھ اور ہے۔

نظر آتا ہے مجھکو جان کا خطرہ اقامت میں
مثالِ نبض میں سرگرم ہوں قطعِ مسافت میں

جدائی میں تری میں سوکھکر کانٹا ہوا اے گل
عجب کیا ہوں جو دامن گیر صحرائے قیامت میں

گزارِیں عالمِ خوف و رجا میں کیوں نہ تر دامن
یقیں برقِ غضب کا بھی ہو دلکو ابر رحمت میں

مطلع میں وہ مضمون عالی ہے جسے فکرِ شاعر کا کارنامہ کہنا چاہئے۔ ایسے شعر بہت کم دست یاب ہوتے ہیں۔ کانٹے کا دامنگیر ہونا بھی لطف سے خالی نہیں۔

غمِ ہجراں سے آرام نہیں، مجھے اصلا تاب کلام نہیں
اس قصہ کا انجام نہیں، یہ فسانہ وہ ہی کہ تمام نہیں

تری یاد میں جب سے فقیر ہوا، ترے عشق میں جب سے کہ جوگ لیا
رہا دشت میں منہ پہ بھبوت ملا، مجھے دیر و حرم سے کام نہیں

ہیں نزع کے طور نکلتا ہو دم، او لٹی سانسیں لیتے ہیں ہم
ہٹ جاؤ ہمارے سر کی قسم، اسوقت تمہارا کام نہیں

سرِ قبر وہ آئے جو بال کھلے، پڑھا فاتحہ رو کے یہ کہنے لگے
او اٹھو بیٹھے ہیں کب سے ہم آئے ہوئے، سونے کا تو یہ ہنگام نہیں

یہ فسانہ وہ ہی کہ تمام نہیں، اس میں چاروں فعلن متحرک العین اور الٹی سانسیں لیتے ہیں ہم، اس میں چاروں فعلن مسکن ہیں اس سبب سے کہ فعلن میں تین متحرک پیاپے جمع ہو گئے ہیں

اور یہ کلیہ عروض فارسی کا ہے کہ جس بحر میں تین متحرک جس جگہ پے درپے آجائیں وہاں دوسرے کو ساکن کرسکتے ہیں لیکن اُردو کے شعرا اس وزن کے سوا اور کسی بحر میں ایسا تصرف کم کرتے ہیں۔

مردم نہیں ہیں چشمِ بتِ بے حجاب میں　　پریوں کو اس نے بند کیا ہی حباب میں
اک برق آہ سے میں جلادونگا۔ دیکھنا　　کیوں آسماں چھپا ہے گلیمِ سحاب میں
ہوتا ہی پختہ کار مسن اسمیں شک نہیں　　کیفیتیں زیادہ ہیں کہنہ شراب میں
پہنچے وہاں غبار جو اِس خاکسار کا　　دونی جلا ہو آئینۂ آفتاب میں
پیشِ نگاہ رہتے تھے صولت جو رات دن　　وہ صورتیں نظر نہیں آتی ہیں خواب میں

زجاجی سرپوش کو بھی حباب کہتے ہیں جس کے نیچے گلدستے وغیرہ رکھتے ہیں۔ یہاں یہی معنی مقصود ہیں مطلب یہ کہ پریوں کو شیشہ میں اُتارا ہے۔ آسمان کا گلیم سحاب میں چھپنا کیا اچھی تخیل ہے۔ اپنی خاک سے آئینۂ آفتاب کی جلا ہونا بہت ہی تعلّی کا مضمون ہے۔ لیکن شاعر کے منہ سے تعلّی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور خاکسار کا لفظ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مرتبہ خاکساری سے حاصل ہوا ہے۔

نہیں اگرچہ خمارِ شراب آنکھوں میں　　غنودگی ہو مگر بے حساب آنکھوں میں
کبھی وہ دیکھتا ہی لطف سے غضب سے کبھی　　جہاں کی طرح سے ہی انقلاب آنکھوں میں
تمہارے ہجر میں مہمان ہوں کوئی دم کا　　کیا ہے روح نے اب پا تراب آنکھوں میں

مطلع میں یہ بات نہ بتائی کہ یہ کس کی آنکھوں کا ذکر ہے اور اس سے کلام کا حسن زیادہ ہو گیا۔

یہ رنگ پر ہی بہار گلچیں، کہ گل سے نازک ہیں خار گلچیں
غضب ہی گل کا نکھار گلچیں، یہ لطف ہی یادگار گلچیں
کسی کا ہوتا نہ خوف حاشا، چمن بھی اپنا تھا گل بھی اپنا
زمانہ آرام سے گزرتا ہمارا ہوتا جو یار گلچیں
نہ کیوں ہو سیرِ چمن سے نفرت، یہ رنگ دیکھا ہی ہمنے صولت
کھلے جو دو پھول بعد مدت، تو آکے ٹوٹے ہزار گلچیں

لکھنؤ کی شاعری میں گل و بلبل و صیّاد و گلچیں کا ذکر بہت ہی۔ ایسے اشعار کو استعارہ پر محمول کرنا چاہئے۔ فرض کرو کہنے والے نے اس نکتہ کو سمجھکر نہیں کہا ہے۔ اس کے نہ سمجھنے سے شعر کو ضرر نہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم نے تقلیدِ قدما میں اسی قسم کے مضامین باندھے جیسے ان کے کلام میں دیکھے اور اہل مذاق نے جب داد دی تو تنبہ ہوا کہ اس شعر کی یہ خوبیاں ہمارے خیال میں نہ تھیں۔

آج چھلّا وہ نشانی کا عطا کرتے ہیں　　اور دیوانہ کو انگشت نما کرتے ہیں
آپ عاشق ہمیں سمجھیں کہ نہ سمجھیں اپنا　　ہم اسی طرح مگر جان فدا کرتے ہیں
جھوٹی قسمیں اُنھیں کھانیں نہیں کچھ وسواس　　اب تو قرآن پہ قرآن اُٹھا کرتے ہیں
دل لگی اُنکی ہی اغیار سے لڑوا دینا　　آپ الگ ساہتے ہیں اور دونکو بُرا کرتے ہیں
اعتماد آپ کو جن جن کی رقابت پر ہی　　گوشت ناخن سے وہی لوگ جدا کرتے ہیں
پوچھتا کیا ہی مزاج اپنے مریضوں کا مسیح　　شکر ہی شکر ہی جیتے ہیں دُعا کرتے ہیں
تم سے مطلب ہی ہمیں اور کسی سے کیا کام　　جلنے والے تو اسیطرح جلا کرتے ہیں

اس غزل کے مطلع میں تو ایک عاشقانہ معاملہ ہے۔ باقی جتنے شعر ہیں وہ دیکھنے ہی میں عاشقانہ معلوم ہوتے ہیں ورنہ یہ معاملات اہل دنیا میں ہوا ہی کرتے ہیں۔ عاشق و معشوق کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ شاعر کے کلام کو عام کرکے دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ دنیا کے کن کن معاملات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

بت پرستوں کو کہا کرتا ہی واعظ سخت سُست　　ہم طرح دیتے ہیں اس مردِ خدا سے کیا کہیں
آہ کرنے پر ہوئے برہم تو ہم خاموش ہیں　　آپ تو بیکار لڑتے ہیں ہوا سے کیا کہیں
پوچھنا رونیکا باعث ہچکیاں تھمتے تو دو　　دم سماتا ہی نہیں غرباء بکا سے کیا کہیں

مصلحت جو قتل عاشق میں تھی خود ظاہر کریں ۔ مجھسے کیوں پوچھا میں کیا جانوں خضاسے کیا کہیں

بت پرستوں کو برا کہنا اس سبب سے برا معلوم ہوتا ہے کہ خود بھی بت پرست ہیں بت پرستی سے مراد محویت ہے جو عالم اجسام کو دیکھکر طاری ہوئی ہے ۔ شاعر اُسے مظاہر قدرت سمجھتا ہے اور صوفی سد راہِ معرفت خیال کرتا ہے ۔ بُکا کا قافیہ غرابت سے خالی نہیں ۔ میرے خیال میں یہ لفظ زبان شاعر کا نہیں ہے خصوصاً شاعر غزل گو ۔

چال سے آفت بپا کر آئے ہو ۔ فتنۂ محشر جگا کر آئے ہو
شکل تم جس کو دکھا کر آئے ہو ۔ اُس کو دیوانہ بنا کر آئے ہو
جذبِ دل پھر کھینچ لایا ہے اِدھر ۔ کیسے اُلٹے پاؤں جا کر آئے ہو
وہ ہی امیدِ اسیری میں ہلاک ۔ جس کو صدقے میں رہا کر آئے ہو
سُنکے مجھسے دردِ دل کہتے ہیں وہ ۔ ہائے کیا فقرہ بنا کر آئے ہو
میں نے جا کر جب کہا مرتا ہوں میں ۔ بولے سچ مچ زہر کھا کر آئے ہو
آہ نے صولت کی دکھلایا اثر ۔ یار کیسے تلملا کر آئے ہو

صولت نے یہ غزل جس رنگ میں کہی ہے یہ رنگ لکھنؤ میں اُچھلا اور موجد اس کے جرأت ہوئے ۔ پھر ناسخ و آتش کا رنگ اس پر غالب آگیا ۔ آخر میں فصیح الملک مرزا داغ مرحوم نے اس رنگ کو اپنے حِصّہ کا کر لیا ۔ حال آنکہ وہ کہتے تھے کہ میں نے ابتدا میں شیخ ناسخ کا تتبع کیا پھر حکیم مومن خاں صاحب کا طرز اختیار کیا ۔ پھر میں اپنے رنگ پر آگیا ۔ مگر اصل امر یہ ہے کہ یہ رنگ جرأت کا ہے اور خاصہ اس رنگ کا یہ ہے کہ اکثر کلام سست اور بے مزہ رہتا ہے ۔ جرأت کا ضخیم دیوان چھپ چکا ہے اور لوگوں کی نظر سے گزر چکا ہے چند اشعار بیشک بہت شوخ ہیں ان میں بھی معاملات عاشقانہ اکثر تعلق ناجائز کا پہلو لئے ہوئے ہیں سے

در تک اب چھوڑ دیا گھر سے نکلکر آنا ۔ یا وہ راتوں کو سدا بھیس بدلکر آنا
جرأت اُسکی کہوں کیا تجھسے طرحداری میں ۔ جانا جب اُٹھ کے تب اک روپ بدلکر آنا
گالیاں دینے لگے نام مرا لے تم ۔ کہو مری چاہ کے کھل جاتے ہی کھل کھیلے تم
پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری ۔ تو منہ کو پھیر کے کہتا ہے اف پناہ تری
کہا جو میں نے کہ ہے دل جلونگی آہ اک سق ۔ تو بول اُٹھا کہ تجھی پر پڑیگی آہ تری
میرے جو اشارہ سے رکھا گھیر کسی نے ۔ سو باتیں سنائیں مجھے منہ پھیر کسی نے
دیکھوں تو یوں وہ کہنے لگے منہ کو ڈھانپنے ۔ کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

غزل میں کسی حسین کی تصویر دکھانا یا اسکی کسی ادا کا ذکر کرنا اس ہیچ مداں کی رائے میں خلاف تہذیب نہیں ہے اور مہذب قوموں کے شعرا کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اسی وادی کے سالک ہیں البتہ معاملات عاشقانہ جن سے تعلق ناجائز سمجھا جائے شعر میں ہوں تو اخلاق پر بُرا اثر ڈالتے ہیں ۔ اسی وجہ سے محقق طوسی، امراؤ القیس و ابو نواس کا دیوان دیکھنے کو منع کرتے ہیں اور اڈیسن نے سیفو شاعرہ یونان کا کلام تلف ہو جانے کو غنیمت سمجھا ہے ۔

ناسخ و آتش نے کھلے کھلے جذبات کے نظم کرنے سے کراہتیہ کی لیکن پھر بھی استعارہ کے پردہ میں اس طرح کے مضامین اُنکے کلام میں موجود ہیں ۔ کوئی اس بات کو سمجھا نہیں کہ ایسے مضامین مطلقاً ترک کرنا چاہئے ۔ شیخ ناسخ نے اس مصرعہ میں ۔ ع
رکھوں میں ساق ساقیِ گلفام دوش پر ۔ کنایہ و تجنیس کی آڑ پکڑی ہے مگر بات تو وہی ہے جو کہنے کی نہ تھی ۔ داغ نے یہ مضامین اس برجستگی سے نظم کئے کہ لوگ حیران رہ گئے تعجب یہ ہی کہ جلال مغفور و امیر مرحوم کے کلام پر بھی اس کا اثر پڑ گیا ۔ تقریباً پچیس برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ تیسرا دیوان جلال کا چھپا ایک نسخہ اسکا حیدر آباد میں مجھے بھیجا اور یہ لکھا کہ یہ دیوان میں نے اہل دہلی

کے رنگ میں کہا ہے۔ میں نے اس عطیہ کے شکریہ میں یہ کلمہ بھی لکھا کہ ہمیں تو آپ کا پہلا ہی رنگ زیادہ تر پسند ہے۔ مختصر یہ کہ وہ مجھ سے خفا ہو گئے۔ مگر مالک الدولہ اور بادشاہی دربار کے شعرائے سبعہ سیارہ ایسے کورہ دہ میں رہے جہاں سے نہ کسی شاعر کا کلام باہر نکلا نہ کسی کا شہرہ وہاں تک پہنچا۔ داغ مرحوم کا پہلا دیوان بے شک چھپ چکا تھا اور وہ خود بھی مٹیا برج و کلکتہ کے مشاعروں میں شریک ہو چکے تھے۔ لیکن انکی شہرت کا زمانہ مالک الدولہ نے کہاں دیکھا مٹیا برج کا خاتمہ ہو جانے کے بعد حیدرآباد میں جب میں پہنچا ہوں تو مرزا داغ صاحب یہاں آ چکے تھے اور سیف الحق ادیب مرحوم کے مہمان تھے اور امیدواروں میں تھے۔ ایک غزل انہوں نے اپنی سنائی کہ یہ تازہ فکر ہے؎

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے   اجل رہ گئی تو کہاں آتے آتے

ساری غزل مرصع اور نہایت برجستہ تھی مگر اس شہرت عام کو دیکھئے کہ وہاں سے میں اٹھا تو راہ میں وہی غزل گائی جا رہی تھی۔ ہمارے زمانہ میں یہ شاعر بڑا مقبول و اقبال مند گزرا غزلیں ان کی گانے کے مناسب ہوتی تھیں اور اسی سبب سے شہرت بھی ان کی سی کسی غزل گو کو نصیب نہ ہوئی۔ مگر حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان میں تہذیب جدید نے اتنی جلد ترقی کی کہ ان مرحوم کی زندگی ہی میں انکا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ چوماچاٹی کے مضمون کہنا جانتے ہیں۔ اتنے بڑے دربار میں کوئی شاندار قصیدہ نہ پیش کر سکے اسی اثنا میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ اب کے دفعہ وہاں کئی خوش فکر شاعروں کو دیکھکر نہایت مسرت ہوئی یعنی جناب منشی نوبت رائے صاحب نظر اور حضرت محشر اور حضرت فصاحت۔ محرم کے دن تھے برادر معظم نواب سید فدا حسین خانصاحب طباطبائی سے ملنے کو میں حسین آباد گیا وہ مجلس میں جانے کو گھر سے نکل چکے تھے۔ بی حیدر کے یہاں سالانہ مجلس تھی مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے مجلس میں چلے گئے۔ وہاں بھی اکثر ایسے احباب سے ملاقات ہوئی جو شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔ مجلس شروع ہونے میں عرصہ تھا۔ مرزا داغ کا ذکر ہونے لگا ایک صاحب نے کہا داغ اپنے طرز میں متفرد ہیں فصاحت نے کہا اب تو کل کے چھوکرے اسی طرز میں غزل کہہ لیتے ہیں۔ میں نے کہا اس شخص کے کمال کی بڑی دلیل یہ ہے کہ یہاں کے مشاہیر شعرا پر اس کے کلام کا ایسا اثر پڑا کہ رنگ سخن بدل گیا۔ ایک اور بزرگ بیٹھے تھے انہوں نے کہا غرض اس سے یہ تھی کہ دیکھو ہم ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کہا الفضل للمتقدم۔

حیدرآباد میں جب میں آیا تو مرزا داغ مرحوم پوچھنے لگے کہ لکھنؤ میں ہمارا بھی ذکر کسی سے آیا تھا۔ میں نے حیدر کی مجلس میں جو گفتگو ہوئی تھی یہ سمجھکر بیان کی کہ وہ خوش ہوں گے۔ مگر انھیں ملال ہوا۔ کہنے لگے جی ہاں ہمارا طرز سخن چھوکروں ہی کے کہنے کا ہے۔ میں یہ ذکر کر کے پشیمان ہوا۔ گویا وہ اسے میری رائے سمجھے۔ حالانکہ میری رائے انکی نسبت میں وہی تھی جو میں نے بیان کی اور ان کے کلام کا بڑا قدرداں میں تھا۔ اور وہ بھی میری ہرزہ سرائی کو جس غور سے سنتے تھے کسی اور کے کلام پر ایسی گہری نظر نہیں ڈالتے تھے۔ یہ کل کی بات ہے جسے آج میں کہانی کی طرح بیان کر رہا ہوں۔ ایک دفعہ کہنے لگے یہ جو طرح ہوئی ہے رفتار کسی کی اور تکرار کسی کی اس میں کچھ شعر کہے ہوں تو پڑھئے۔ میں تو مشاعرے میں نہیں جاؤنگا۔ مجھے جو شعر یاد آتے گئے میں پڑھنے لگا ایک شعر یہ تھا؎

واعظ ہو کہ زاہد ہو یہ ہے فصل بہاری ہم رند اٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

قافیہ اس کا میری زبان سے پورا نہ نکلا تھا کہ انہوں نے ایسا مزا لے کے ردیف کو پڑھا جیسے کوئی سم پر بے چین ہو جاتا ہے۔ اور مجھ سے کہا سچ کہئے گا یہ داغ کا رنگ ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا آپ کا فیض صحبت کہاں تک نہ پہنچے گا۔ مگر اس شعر کے رنگ کو بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

عبرت مجھے ہوتی ہے پلٹنے پہ صدا کے اک بات اٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

کہنے لگے یہ اور ہی چیز ہے۔ پھر ایک شعر میں نے اور پڑھا ؎

یوں مر کہ نہ یاروں کو ہو بھاری ترا مرنا یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

کہا اس کا کیا پوچھنا۔ مرزا داغ کے چھوٹے بھائی شاغل مرحوم ذوق کے شاگرد اور بڑے خوش فکر شاعر تھے وہ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے اُن سے میں نے کہا کچھ اپنا کلام سنائیے۔ مرزا داغ نے کہا ان کو شوق ہی نہیں آپ کی طرح سے برسوں میں ایک آدھ غزل کہہ لیتے ہیں غرض شاغل نے بہت اچھی ایک غزل پڑھی زمین یہ تھی کہ ہو جائے گا اور رہ جائے گا ان کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ؎

تم شب وصل میں افسانہ کہو میں سمجھا کہ یہ برسوں کا ہے جاگا ہوا سو جائیگا

وہ زمانہ جب کہ حجاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
یہی چہرہ زیرِ نقاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہمیں جاں نثار تمہارے تھے، کہ ہمیشہ جس سے اشارے تھے
کبھی عاشق اپنا خطاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جو اُٹھائے لطف وصال میں، نہیں آتے وہم و خیال میں
وہ گزشتہ عیش بھی خواب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
یہ ملال آج ہے بوسہ پر، بھلا پہلے کی بھی ہے کچھ خبر
نہ حساب تھا نہ کتاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حکیم مومن خاں صاحب کی نکالی ہوئی زمین ہے۔ ع

وہ جو ہم سے تم سے قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ یہ غزل لکھنؤ میں بہت مشہور رہی ہے اور مٹیا برج میں بھی ارباب نشاط کے زباں زد تھی۔ مومن نے "تھا" کو قافیہ قرار دیا اور مالک الدولہ نے تھا کو بھی ردیف کر دیا اور حجاب و نقاب قافیہ قرار دیا اب یہ زمین زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ اس غزل کے آخر شعر میں دیکھئے کہ محاورہ قیاس پر کس قدر غالب ہے۔ ایسی مثال اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے بہت کم ملے گی۔ کتاب مونث ہے مگر محاورہ نے اپنی زبردستی سے اُسے مذکر بنا لیا۔ بھلا کے الف کا گرنا بُرا معلوم ہوتا ہے ؎

وہ حسیں غیرت لیلیٰ نظر آتا ہے مجھے تھا جو مجنوں کو وہ سودا نظر آتا ہے مجھے
اسکے ابرو کے تصور میں رواں ہیں آنسو تیغ کی باڑھ پہ دریا نظر آتا ہے مجھے
ہمسری کی تھی جو کل تجھسے مہ کامل نے آج چہرہ بھی کچھ اترا نظر آتا ہے مجھے
کسطرح شکر کا سجدہ نہ بجا لاؤں میں یار کا نقش کف پا نظر آتا ہے مجھے
تیری باتیں ہیں قیامت کی غضب کے فقرے آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے
ہائے کچھ کم نہ ہوئی قلب و جگر کی دھڑکن رقص بسمل کا تماشا نظر آتا ہے مجھے
تم نے کیا پھیر لیں آنکھیں کہ جہاں مجھسے پھرا کوئی اپنا نہ پرایا نظر آتا ہے مجھے

چاند کا ایک رات میں چہرہ اتر جانا کیا اچھی تخیل ہے۔ شاعر کے سوا کسی کو ایسی باتیں نہیں سوجھتیں۔ میں نے درخشاں کا جو تذکرہ رسالہ ادیب میں شائع کیا تھا اس میں یہ نکتہ طالبان فن کے لئے قابل لحاظ لکھا تھا کہ بوسۂ ابرو میں نہایت تصنع معلوم ہوتا ہے۔ بوسہ لینے کے جو مقامات ہیں ان میں ابرو نہیں داخل تصور ابرو میں بھی ویسا ہی تصنع ہے۔ لیکن تیغ کی باڑھ پر دریا کا ہونا کیونکر بنتا۔ اس قسم کا توسع اساتذۂ فارس کے کلام سے ماخوذ ہے۔ حافظ کہتے ہیں ؎

در نمازم خمِ ابروئے تو در یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

مگر تصنّع کسی کے کلام میں ہو اچھا نہیں۔

اے دل تجھکو خیال کیا ہے کھلا گیا کیوں ملال کیا ہے

دانستہ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں مطلب کیا ہے سوال کیا ہے

ماشاء اللہ ابھی سے ہو شوخ کیا عمر ہے سن و سال کیا ہے

سنتے نہیں ہم سوائے قلقل اے شیخ یہ قیل و قال کیا ہے

لاکھوں ہیں بناؤ سادگی میں آرائشِ خط و خال کیا ہے

دیکھو دیکھو نہ حشر ہو جائے سنبھلو سنبھلو یہ چال کیا ہے

محفل میں کسے وہ ڈھونڈتے ہیں اُٹھ اُٹھ کے یہ دیکھ بھال کیا ہے

مسلا ہے کسی کا غنچۂ دل مٹھی میں یہ لال لال کیا ہے

بوسہ ہونٹوں کا لوں جو بے حکم کیا منہ ہو مرا۔ مجال کیا ہے

یہ وزن رباعی کا مجزّو ہے۔ رکن آخر کے کم کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ سمجھو "اے دل تجھکو خیال کیا ہے تبلا" یہ رباعی کے اوزان میں سے ایک وزن ہے۔ اس میں سے بتلا نکال ڈالا مجزّو رباعی حاصل ہوا۔ اس وزن میں تین متحرک ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ یعنی مفعول مفاعلن مفاعیل میں مفعول کا لام اور مفاعلن کا میم اور ف متحرک ہیں۔ اردو کہنے والے بھی یہاں تسکین متحرک ثانی کا قاعدہ جاری کرتے ہیں اور مفعولن فاعلن مفاعیل کے وزن پر جس مصرع کو چاہتے ہیں کہتے ہیں۔ مگر رباعی کی طرح بعض لوگ اس میں بھی دھوکا کھاتے ہیں۔ دو حرف زیادہ کہہ جایا کرتے ہیں جس سے مفعولن مستفعلن مفاعیل ایک غلط وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وزن میں شعر کہنے والوں کو میں اس عام الورود دھوکے سے متنبہ کر دینا مناسب سمجھا۔ داغ کی ایک رباعی میں میں نے یہی غلطی پائی۔ وہ مصرع مجھے اسوقت یاد نہیں مگر وزن اس کا یہ تھا مفعولن مستفعلن مفاعیل فعل۔

خیر گذری آپ کا آنا غنیمت ہو گیا تھم گئے نالے قیامت ہو کے برپا رہ گئی

پھینک کر تیرِ نظر دو چار وہ راہی ہوا زخم دل میں رہ گئے زخموں میں ایذا رہ گئی

کھا کے غوطہ پھر نہ اُبھرا میں غریقِ بحرِ عشق ہاتھ ساحل سے بڑھا کر موجِ دریا رہ گئی

اپنے بیگانوں سے اے صولت چھٹے ہم بعد مرگ سب ہوئے رخصت لحد میں لاش تنہا رہ گئی

موج کا غریق کے نکالنے کو ہاتھ بڑھانا تازہ خیال ہے لفظ لحد بسکون ح ہے۔ لیکن فارسی والے بتحریک باندھا کرتے ہیں اور اردو کہنے والے اُن کے متبتع ہیں۔ غرض دونوں طرح نظم میں لانا صحیح ہے۔ رہ گئی اور رہ گیا کی ردیف مجھے اکثر مزہ دیتی ہے حافظ کی اس غزل میں حسن ردیف قابل لحاظ ہے۔

ہر کہ شد محرمِ دل در حرمِ یار بماند آنکہ ایں کار ندانست در انکار بماند

داشتم دلقے و صد عیب مرا می پوشید خرقہ رہنِ مے و مطرب شد و زنار بماند

گشت بیمار کہ چوں چشمِ تو گردد نرگس شیوۂ آں نہ شدش حاصل و بیمار بماند

از صدائے سخنِ عشق ندیدم خوش تر یادگارے کہ دریں گنبدِ دوار بماند

صوفیاں واستدند از گروِ مے ہمہ رخت دلقِ ما بود کہ در خانۂ خمار بماند

بر جمالِ تو چناں صورتِ چیں حیراں شد کہ حدیثش ہمہ جا بر در و دیوار بماند

بتماشاگہ زلفش دلِ حافظ روزے شد کہ باز آید و جاوید گرفتار بماند

فراغِ قلبِ مجنوں ہے خیالِ روئے روشن بھی

وگرنہ ہے مقام ہو جو ہو وادیٔ ایمن بھی لو

یہ بے دردی کے معنے ہیں ستمگر ہو تو ہو تم سا

نہ پوچھا زندگی میں بھی نہ آئے بعد مُردن بھی

خدا کو بھول جائیں سب جو شکل اپنی دکھا دو تم

کریں سجدہ مسلماں بھی پڑھیں کلمہ برہمن بھی

تم اپنی تیغ کی خوں ریزیاں عشاق سے پوچھو

عجب طوفاں بپا کرتی ہے موجِ آبِ آہن بھی

دلِ پُر داغ کافی ہے قفس میں دل بہلنے کو

لیلیٰ و مجنوں

انڈین پریس الٰہ آباد

یہیں سیرِ گلستاں ہے یہیں لطفِ نشیمن بھی
کوئی دیکھے بوقتِ گریہ از خود رفتگی میری
عجب کیا ہے بہلنے جائے موجِ چینِ دامن بھی

مطلع کی بندش اداے مطلب سے قاصر ہے۔ یعنی مجنوں کا فراغِ قلب خیال روے روشن سے بھی ہے۔ ورنہ قلب اس کا وادی ایمن بھی ہوتا تو مقام ہُو تھا۔ مردن اور کردن اور گفتن وغیرہ سیکڑوں مصدر ہیں جنمیں نون مصدری ہے اسکو دامن اور آہن کے قافیوں میں لے آنا شائگاں کہلاتا ہے۔ ایطا و شائگاں میں اکثر اہل فن فرق نہیں کرتے ہیں ہیچمداں کی راے یہ ہے کہ اگر یہی قافئے مطلع میں آجائیں تو ایطا ہے اور اشعار میں ہوں تو شائگاں ہیں۔ اُردو میں دریا اور صحرا کے ساتھ دیکھا اور سمجھا اور بولا وغیرہ جس میں الف ماضی لگا ہوا ہے نظم کیا جائے تو قافیہ شائگاں اُن لفظوں کو کہیں گے اور اگر مطلع میں دیکھا اور بولا مثلاً کہا جائے گا تو ایطا ہوگا۔ کلمہ بسکون لام مستعمل ہوگیا ہے اور اردو میں تو بتحریک لام بُرا معلوم ہوتا ہے

طبیعت میں نہ شوخی تھی نہ گرمی تھی ذرا پہلے
تمہارے ہاتھ پر چڑھتا نہ تھا رنگِ حنا پہلے
کروں کیا دل کی بے تابی کو تا لے کس طرح روکوں
برستے ہو عبث مجھپر سنو تو ماجرا پہلے
ابھی کچھ دن اُدھر اِلّھڑ پنے سے چال چلتے تھے
اُتر پڑتا تھا شانہ سے دوپٹہ بارہا پہلے
ابھی کیونکر جگر کے داغ کی حالت دکھاؤں میں
تمہارے سامنے سے ہو تو آئینہ جدا پہلے

مجھے یاد ہے مشاعرہ میں اس مطلع نے بڑا رنگ دیا تھا۔ دوپٹہ اور آنچل مسّی اور کاجل گھونگٹ اور افشاں چوٹی اور جوڑا لکھنؤ کے خصوصیات میں سے ہے اس واسطے کہ امرد پرستی کے عیب سے غزل کو پاک کریں۔

(باقی آیندہ)

علی حیدر طباطبائی

دربار دہلی

نو سو برس دہلی دار السلطنت رہا یہ تو یقینی ہے اور اس کے علاوہ ظنی ہے کیونکہ ہندوستان کے واقعات قدیمہ کے زینوں پر چڑھنے میں فن تاریخ پس پا ہے۔ تواریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ۹ مرتبہ دہلی تاخت و تاراج ہوا اور اتنی ہی مرتبہ پھر آباد ہوا مگر یہ آبادی کبھی کبھی اِدھر اُدھر ہٹ گئی چنانچہ جس مقام پر اب ناف شہر ہے وہ قدیم دہلی کی آبادی سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے دہلی کو تمام ہندوستان میں دار السلطنت ہونے کا فخر اسی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی شاہان ہند کو غنیم کا خوف ہوا ہے شمال و مغرب ہی کے گوشہ سے اور اس کا راستہ پنجاب سے ہے اور پنجاب کا پھاٹک دہلی ہے۔ لہذا بادشاہ کا دہلی میں قیام رکھنا اسیطرح مناسب ہوا جس طرح جنگی موقع پر قلب لشکر میں بادشاہ محفوظ اور محافظ رہتا ہے اور اگر بالکل پنجاب میں یعنی سرحد کے قریب پائے تخت ہوتا تو یہ بھی نامناسب ہوتا کیونکہ تمام ہندوستان سے باعتبار قرب و بعد دار السلطنت کو قریب قریب مساوات ہونی چاہیئے اور پنجاب میں اگر پاے تخت ہوتا تو پورب سے

بہت فاصلہ ہوجاتا یا اگر پورب کی طرف ہوتا تو پنجاب سے
بہت فاصلہ ہوجاتا اور یہ پولٹیکل اصول سے بُرا تھا ان وجوہ
سے اکثر بادشاہوں نے اس کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔
مگر چونکہ گورنمنٹ انگریزی کو بھی ضرورتیں کلکتہ میں واقع ہوئیں جو
کہ یورپ کے بحری راستوں کا دہانہ ہے اور اسی وجہ سے
اگر کوئی خوف بحری ہوسکتا ہے تو وہ زیادہ تر کلکتہ کے بندرگاہ
پر اس لئے گویا پایۂ تخت کلکتہ قرار دیا گیا حالانکہ بادی النظر میں
برّی مہموں کا خوف اُسی جانب ہے جسطرف سے ہمیشہ رہا
یعنی افغانستان۔ مگر کابل کی مہم سر ہوجانے کے بعد گورنمنٹ
کو ایسا اطمینان کامل ہوگیا کہ سوائے معمولی باغی قبائل کے
اور کسی شاہی فوج نے اُدھر رُخ نہ کیا۔ یہ گورنمنٹ کی پولٹیکل
قابلیت کا نتیجہ تھا کہ اُس کا انتظام جس پیشین گوئی کی بنا پر ہوا
تھا وہ آج تک صحیح رہا۔ پولیٹکل معلومات میں اس سے یہ فائدہ
اُس شخص کو پہنچ سکتا ہے جو یہ نتیجہ نکال لے کہ ہر ایک یورپین
سلطنت کو بہ نسبت برّی طاقت کے بحری قوت کی زیادہ ضرورت
ہے اور یہ پولٹیکل مسئلہ دو چار برس سے نہیں طے ہوا ہے بلکہ
حضرت عیسٰی سے تقریباً ساڑھے چار سو برس پیشتر تھیمسٹوکلس اعظم
یونانی پہلا شخص تھا جس نے یہ تجویز کی تھی کہ لہراسپ شاہ فارس
کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ اسی حالت میں ہوسکتا ہے جبکہ جنگی
جہاز تیار کئے جائیں اُس کی رائے سے عام اختلاف ہوا اور
آخر تک رہا مگر آخرکار بڑی مشکل سے وہ کامیاب ہوا اور اسکی
رائے کے موافق تقریباً ڈیڑھ سو جہاز کا بیڑہ تیار ہوا۔ افلاطون
کا مقولہ ہے کہ تھیمسٹوکلس پر یہ الزام یونانیوں نے لگایا کہ اس نے
فوجی سپاہی اور بہادروں کی تیغ و سپر چھین کے ان کے ہاتھوں
میں تھاپیاں پکڑا دیں اور بڑے بڑے سورماؤں کو ملّاح
بنا دیا۔ اس بحری جنگ میں پہلا سپہ سالار یورے بانڈس ایک
والی ریاست تھا۔ فتح ہونے کے بعد تمام یونان کو معلوم ہوگیا تھیمسٹوکلس
کی رائے بہت صائب تھی گو اس سے پہلے جہازوں کا وجود
تھا مگر یورپ میں جنگی جہاز کوئی نہ تھا اور نہ اس ساز و سامان
سے۔ غرضکہ یہ ایک قدیمی طے شدہ مسئلہ ہے کہ جو ممالک سمندر کے
کے قریب بھی واقع ہیں خواہ وہ جزیرے نہ ہوں اُنہیں بحری
قوت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے اثر نے دہلی کو ایک
نامعلوم وقت تک کے لئے اس عزت سے محروم کردیا تھا
کہ وہ دارالسلطنت ہو اور نہ اب امید تھی* مگر ۸۰ برس کے
بعد اُس کو اعلیحضرت جارج پنجم قیصر ہندوستان و انگلستان کے مراحم خسروانہ
سے وہ پھر ایک مرتبہ اپنی گذشتہ رونق کی تجلّی دکھا دیگا۔ یوں تو
ہر واقعہ مجموعی حیثیت سے نیا ہوتا ہے مگر اس اہمیت کیساتھ
ہندوستان میں کبھی ایسا عالیشان دربار نہوا ہوگا جسمیں
مدبران انگلستان کی تشریف آوری سے دربار آراستہ ہوا ہو
اب ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ یہ قدیمی تقریب تخت نشینی لندن میں
جن اصول پر ہوئی ہے آیا دہلی میں بھی اُنہی اصول پر ہوگی یا
نہیں اور یہ کہ ہونی چاہیئے یا نہ۔

انگلستان کا قدیمی رواج اس موقع پر جو کچھ ہے سیاست
و مدن پر اُس کی بنا ہے اور اعلیٰحضرت کی تخت نشینی میں بھی
وہی سب رسوم ہوئے جو ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں صرف
یہ ایک فرق تھا کہ وزیر اعظم اس سے پہلے کبھی ان خاص
موقعوں پر شریک ہوئے تھے ابکی مرتبہ یہ اضافہ کیا گیا باقی
تمام رسوم حسب دستور ادا ہوئے ان سب کی اصلیت یا یوں
کہا جائے کہ اس تقریب کا خاص رکن یہ تھا کہ بادشاہ و
رعایا نے آپس میں ایک دوسرے سے اقرار و عہد کیا کہ باہم

* خوشی کی بات ہے کہ اہل ہند کی یہ پرانی آرزو پوری ہوگئی۔

خیر خواہی وہمدردی کی نسبت برقرار رکھیں گے۔اس موقع پر اعلیحضرت نے حلف کے رو سے جو اقرار کیا کہ میں انگلینڈ و آئرلینڈ دریا ستہائے متحدہ اور جملہ ممالک متعلقہ کا یکساں خیال رکھونگا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہندوستان بھی ضمناً آگیا تو یہ فرض شاہنشاہ کے اوپر سے اُسیوقت اتر گیا۔اب رہا رعایا کا معاہدہ تو وہ یوروپین رعایا کی طرف سے ہوچکا۔ہندوستانی رعایا سے کہلوانا باقی ہے جو کہ بغیر کہلوائے کہنے کو تیار رہے ہے۔مگر صرف اقرار سے کچھ نہیں ہوتا ہے جب تک عملی طور پر ہر ایک اقرار پورا نہیں کیا جاتا اسوقت تک کوئی عہد مضبوط نہیں سمجھا جاتا اور اس کے عملی ثبوت کی ابتدا دربار ہی کے وقت سے شروع ہوجاتی ہے۔چنانچہ لندن کی تخت نشینی کے موقع پر جس خلوص اور جوش کے ساتھ سات ہزار اہل دربار نے خوشی منائی اس کو اعلیحضرت نے بخوبی محسوس کیا۔چنانچہ ایک تحریر کے ذریعہ سے سکرٹری کی معرفت اہلِ دربار کا شکریہ ادا کیا گیا۔اسی طرح دہلی دربار میں ہندوستانی رؤسا کے خیالات کا بھی اندازہ حضور پرنور کو عین وقت پر ضرور بالضرور ہوگا اور اگر کم سے کم اُتنی ہی مسرت ان لوگوں سے بھی ظاہر ہوئی تو اہل ہند غیر قوم ہونے کی وجہ سے زیادہ شکریہ کے مستحق ہوں گے۔جذبات دلی بغیر ظاہر ہوئے نہیں رہتے خصوصاً بادشاہوں اور مدبّروں کے روبرو جھوٹی خوشی اور مصنوعی ہنسی سچے رونے سے بدتر ہے غالباً دربار میں تو کوئی ایسا شخص نہوگا جو اس موقع پر دل سے خوش نہو خواہ وہ زبان سے کہے یا نہ کہے تو رعایا کی طرف سے بھی اہل الرّائے مطمئن ہیں بس یہی ضروری رکن اس تقریب کے ہیں کہ بادشاہ رعایا پر مہربان ہو اور رعایا بادشاہ کی مطیع وہمدرد ہو۔ورنہ جو لوگ اس دربار کو صرف تماشا یا نمایش سمجھتے ہیں وہ حشرات الارض ہیں اُنکی خوشی ناخوشی کوئی چیز نہیں عام طور پر یہ بھی ایک رسم ہے کہ ہر ایک مسرّت خیز دربار میں رعایا بادشاہ کو نذر دیتی ہے اور بادشاہ رعایا کو خلعت و انعام۔ہم کو امّید ہے کہ اب تک ہندوستان پر برٹش گورنمنٹ کی جس قدر مہربانیاں ہوتی رہی ہیں اس مرتبہ اس خاص تقریب میں جس سے زیادہ کوئی طرب انگیز تقریب نہیں ان پر اضافہ ہوگا اور رعایا اس المضاعف انعام کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور اعلیحضرت و ملکہ معظمہ کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے گی

ناطق لکھنوی

رسوم دہلی متعلقہ مسلمانان۔یہ کتاب منشی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کی تصنیف ہو۔اس میں آپ نے تقریباً ۲۰ رسوم کا بیان کیا ہے، جو دہلی کے علاوہ تمام مسلمانانِ ہند میں کم وبیش مروّج ہیں، بلکہ جزو معاشرت بن گئی ہیں۔"رسوم دہلی" کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندو مذہب اور رسم ورواج بتدریج مسلمانوں میں کسقدر سرایت کرگئے ہیں۔اس کتاب کو پڑھکر یہ کہنا بیجا نہوگا کہ گو عقائد کے لحاظ سے مسلمانانِ ہند مسلمان ہوں، مگر رسم ورواج اور معاشرت کے لحاظ سے وہ بہت کچھ ہندوؤں سے مشابہت ومشارکت رکھتے ہیں اور اس مشابہت ومشارکت پر بھی ہندو اور مسلمانوں کا ایکدوسرے سے اجنبی رہنا عجیب وغریب فنامنا (مظاہرہ) ہے بہرکیف یہ کتاب دلچسپی سے خالی نہیں۔قیمت ۱۲ر

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی

اس میں شک نہیں کہ اردو علم ادب لکھنؤ میں دہلی سے آیا اور اس بدیہی امر سے انکار کرنا سخت احسان فراموشی ہے یا یہ کہئے کہ دہلی کا ٹکسال لکھنؤ میں اُٹھ آیا اس لئے کہ دہلی جن لوگوں سے عبارت تھی وہ سب شہزادے اور شاعر اپنی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی کے زمانے میں دہلی کو سلام کرکے لکھنؤ چلے آئے اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ لکھنؤ کے دربار میں ان کی توقیر اور عزت حد سے سوا ہوئی۔ ملک الشعرا میر تقی میر لکھنؤ میں معہ اہل وعیال کے چلے آئے اور زندگی بھر مفتی گنج میں رہے اور اب بھی وہیں سو رہے ہیں۔ ملک الشعرا مرزا رفیع السودا لکھنؤ مینا بازار میں آکر بسے اور میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں دفن ہوئے انشاء اللہ خاں انشا لکھنؤ میں آئے اور فراشخانے میں رہے اور حسین گنج میں آئینہ بی بی کے باغ میں دفن ہوئے۔ میر حسن، میر خلیق، میر جعفر زٹلی، صاحبقران، میر تقی، ہوس، میر سوز، طالب علیخاں عیشی، یہ سب کہاں رہے، کہاں دفن ہوے، وطن کو چھوڑ کر غربت میں وہ آرام پایا کہ مر کے بھی لکھنؤ سے نہ نکلے۔ اس قدردانی کا یہ صلہ ملا کہ لکھنؤ نقش ثانی بن گیا اور اب تک اس کا وقار زبان اُردو کی تحقیق میں اتنا ہی ہے جتنا شاہی میں تھا۔

جب دہلی کے لوگ مر چکے تو خدا نے لکھنؤ کی سرزمین میں بھی ایسے لوگ پیدا کئے جن کی شہرت اور زباں دانی کے نقارے تمام ہندوستان میں بج گئے۔ ناسخ اور آتش کا زمانہ لکھنؤ میں اُردو علم ادب کی تاریخ کا زمانہ ہے اس لحاظ سے آتش کے واقعات اور اُن کی اُردو کی مستقل خدمت کا احسان تمام ہندوستان پر ہے۔ اُردو علم ادب کے ایسے محسن کا ذکر ہر طرح ملک کے لئے مفید ہے۔

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص تھا۔ آبا و اجداد قدیم باشندے دہلی کے تھے۔ شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں انکے والد خواجہ علی بخش درویش سالک (جو خواجہ زادوں کے خاندان سے تھے) دہلی سے فیض آباد میں آئے اور محلہ مغل پورہ میں قیام کیا۔ پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا اسی پر اوقات بسر ہونے لگی۔ اس زمانہ میں دہلی اجڑ رہی تھی عالمگیر ثانی کا بھی انتقال ہو چکا تھا اب سوائے اودھ کے اور کوئی مقام نہ تھا جہاں آسایش سے بسر ہو سکے۔ تھوڑے زمانے کے بعد بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ بہادر کو شکست ہوئی جسکا رنج بہت کچھ ہوا اس لحاظ سے کوئی شکستِ بکسر کا نام بھی نہ لیتا تھا اس اثنا میں فوج مغلیہ سے بادشاہ بدظن ہو چکے تھے آتے ہی تمام فوج کو برطرف کر دیا۔ مغل لوگ فیض آباد سے شاہجہاں پور چلے گئے اس سبب سے مغل پورہ بہت ویران ہوگیا۔ ہر چند مغلوں نے خواجہ علی بخش سے چلنے پر اصرار کیا لیکن خواجہ صاحب کی یہاں اچھی طرح بسر ہو رہی تھی اس سے کہیں نہ جا سکے۔

اس اثنا میں جناب عالی (نواب شجاع الدولہ بہادر) نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خانخاناں کی پوتی سے کی جسمیں چوبیس لاکھ روپیہ صرف کیا یہ واقعہ ۱۷۶۶ء کا ہے ابھی یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے۔ باپ کی طرح گورے چٹے اور خوبصورت۔ ابھی لڑکا اچھی طرح جوان نہ ہونے پایا تھا اور تعلیم بھی نامکمّل تھی کہ باپ نے انتقال کیا مزاج میں آوارہ گردی تھی

عطائے دیوانی

(شاہ عالم کے دربار سے لارڈ کلایو کو فرمان دیوانی عطا ہوتا ہے)

Block kindly lent by THE BHARATI, Calcutta.

انڈین پریس الہ‌آباد

اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شورہ پشت ہوگئے اِس زمانے میں بانکپن اور بہادری کی بہت قدر تھی آتش کو بہادری دکھانے کے بہت سے مواقع ملے مغل بچّوں کی صحبت میں تیغ زنی بہت اچھّی آگئی تھی آدمی تھے جیوٹ کے بات بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے کسنی سے تلوریئے مشہور ہوگئے سیکڑوں تلواریں کھائیں ہزاروں ٹانکے لگے اِس جوہر کے قدرداں فیض آباد میں ایک نواب میر محمد تقی تھے جو آتش کو نوکر رکھکر اپنے ساتھ لکھنؤ میں لے آئے انھیں کے ساتھ ناسخ بھی فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔

اسوقت میں ناسخ اور آتش کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہم کبھی لکھنؤ میں شاعری کے زمرے میں آئیں گے اور ایک مشہور اُستاد کے نام سے مشہور ہوں گے سردی کے زمانے میں شب کو نواب صاحب کے پُرانے پردے اوڑھ لیتے تھے اور دن کو تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے اکڑتے پھرتے تھے۔

آتش گورے شکیل وجیہ چھریرا بدن اور رندانہ وضع کے آدمی تھے آدھا سر منڈا ہوا اور آدھے سر پر پٹے (اسوقت اچھے بانکوں کی یہی وضع تھی اور ان کو اک پٹے جوان کہتے تھے) کھانڈا باندھتے تھے بھنگیرن کی دُکان پر چرس کا دم لگارہے ہیں کسی نے ان کو دیکھکر کھنکارا یا سامنے سے مونچھ اونچی کرتا ہوا نکلا بس غضب آگیا تلوار کھینچ لی اور کہا آؤ ہمارے تمہارے دو دو ہاتھ ہوجائیں لکھنؤ میں آکر رفتہ رفتہ آتش کی صحبت بدل گئی انکو کتب بینی کا شوق ہوا اور دن رات علمی چرچے رہنے لگے اسی زمانے میں اُن کو مذاق سخن پیدا ہوا اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد ہوئے ناسخ بھی انکے شاگرد ہوئے تھوڑے ہی زمانے کی مشق میں روزمرہ محاورے اور صفائی کلام میں اُستاد سے سبقت لے گئے اُس مدت میں نواب میر تقی کا انتقال ہوگیا آتش کے شاگردوں کی جمعیت بڑھنے لگی اور کلام کی شہرت ہونے لگی۔

نواز گنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے ماہولال کی چڑھائی مشہور ہے وہاں سے اُتار کو ایک چھوٹا سا باغچہ اور ایک کچّا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا اور اسی میں رہنے لگے مکان لینے کے بعد آتش نے اپنا نکاح کسی شریف خاندان میں کرلیا تھوڑے زمانے کے بعد ایک صاحبزادے پیدا ہوئے جنکا نام آپنے محمد علی رکھا ان کی بیوی بہت نیک عورت تھی انکی وارستہ مزاجی اور اسکی گرہستی نے ملکر گھر سنبھال لیا عقد سے پہلے تو آتش کو ہزار روپیہ ماہوار ملتا جب بھی مہینے میں دو ایک فاقے ضرور ہوجاتے تھے لیکن نکاح کے بعد بی بی کے پس انداز کرنے سے میاں فاقہ کشی سے بچ جاتے تھے۔

مولوی صادق علی کہتے تھے آتش کو میں نے دیکھا ہے گیروا تہ بند باندھتے تھے ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا جس میں ایک چھلّہ سونے کا رہتا تھا دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھلّہ رہن رکھکر فاقہ شکنی کرتے تھے۔

بیچے کام کا سلیم شاہی جوتہ ایک اشرفی کی قیمت کا پہنتے تھے۔ بے طمع اور بے غرض تھے کبھی شاگرد سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کرتے تھے اور اکثر اپنی دولت دعوت اور ضیافت میں لُٹا دیا کرتے تھے کچھ تنخواہ اودھ کے بادشاہ کی طرف سے ملا کرتی تھی وہ چار دن میں خرچ کرڈالتے تھے۔

منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم شاگرد نسیم دہلوی کہتے تھے ہم نے جسوقت آتش کو دیکھا کوئی ستر برس کے قریب ہونگے ایک بالشت سے زیادہ ڈاڑھی تھی مہندی کا خضاب کرتے تھے معالی خاں کی سرا میں رہتے تھے ایک لنگوٹ باندھے ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر جو

زمیں دوز تھا تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے بیچ بیچ حقہ سامنے رکھا رہتا تھا جو کوئی امیر غریب آتا سب کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش ہوتا۔

وارث علی خاں ان کے رفیق بھنگ گھوٹ کر پلایا کرتے تھے مزاج میں توکل تھا جو کچھ آتا اس کو اسی روز خرچ کر ڈالتے تھے۔ دوسرے روز کے لئے کچھ نہ رکھتے تھے جس روز فاقہ ہوتا دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہتے۔ ایک روز رسالہ دار فقیر محمد خاں گویا کو معلوم ہوا کہ آتش آجکل بہت تکلیف میں ہیں کچھ روپیہ لیکر گھر پر آئے دروازہ بند تھا آواز دی اندر سے آواز آئی کون ہے یہ بولے فقیر۔

آتش نے کہا فقیر کا میرے یہاں کام نہیں آج خدا مہمان ہے (فاقہ ہے) دوسرے روز پھر آئے مشکل سے دروازہ کھلا انکا لڑکا بہت کمسن تھا کوٹھے پر کنکوا اوڑا رہا تھا سامنے بلایا اور اُسکا کنکوا اچرخی ڈور دیکھکر کہا یہ کنکوا تو اچھا نہیں ہے گتّی لیتا ہوگا ڈور بھی اچھی نہیں سُتی ہے۔ دو ہزار کی دو تھیلیاں سامنے رکھوا دیں کہ تو بھی اس کا ڈور کنکوا منگوانا۔

آتش اس بات کی تہ کو پہنچ گئے کہ خاں صاحب مجھکو زیر بارِ احسان کرنا چاہتے ہیں کہنے لگے خانصاحب آپ کو چاہئے تھا اس کو تادیب دیتے کہ ایسے اشغال سے باز رہتا نہ کہ آپ خود ڈور کنکوے سے مدد دیں یہ کہکر پانچ روپئے نکالکر لڑکے کو دئے اور کہا خانصاحب کو جھک کر سلام کرو اس کی چیز کھانا باقی روپئے خانصاحب کے واپس کر دئے۔ گھی میں تلی ہوئی مرچیں بہت کھایا کرتے تھے۔

مولوی فصیح اللہ صاحب دفا کا بیان ہے کہ اس زمانے میں جو مشاعرے ہوتے تھے انہیں ایک قافیہ لازمی قرار دیدیا جاتا تھا۔ طرح مقرر ہوئی "اپنے بیمار سے بھاگو نہ مسیحا ہو کر" اس میں میلا کا قافیہ لازمی قرار دیا گیا۔ جو قافیہ لازمی ہوتا تھا اس پر سب شاعر زور دیکر کہتے تھے۔ نواب سید محمد خاں رند نے اس میں غزل کہی۔ اصلاح کے واسطے لائے اور کہنے لگے اُستاد مشروطہ قافیہ تو میں نے اپنے حصّے کا لکھا ہے۔ پھر بہت ناز سے پڑھا ؎

اگر ئی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

تمام غزل پر اصلاح دی اور کہا ذرا ٹھہرو سیدّ آتا ہوگا (صبا سے مراد ہے) اس کا قافیہ بھی سنتے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد میر وزیر علی صبا آئے۔ آتش نے پوچھا غزل مشاعرے کی لائے ہو۔ عرض کیا جی ہاں۔ کہا پڑھو۔ صبا نے کہا نواب صاحب بیٹھے ہیں ان کے سامنے میں بھلا غزل پڑھ سکتا ہوں۔ کہنے لگے کیوں کیا نواب صاحب چور ہیں۔ اچھا ایک قافیہ "میلا ہو کر" پڑھ دو۔ صبا نے کہا ؎

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہو کر

کہنے لگے دیکھئے نواب صاحب شعر اس طرح کہتے ہیں۔

شیخ فضل احمد کیف کہتے ہیں ایک مرتبہ طرح ہوئی زوال نہیں انتقال نہیں۔ اسمیں بول چال کی قید تھی ہمیں بھی طرح کا مصرعہ آیا غزل کہی۔ خواجہ صاحب کو قید کا قافیہ جب سنایا تو کہنے لگے اب کی بار غزل تمھیں پڑھنا تم نے قافیہ خوب کہا ہے میں تو نہ پڑھوں گا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

کسی نے باغ میں ایسا شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں

نواب معتمد الدولہ بہادر ناسخ کے شاگرد تھے ان کے مشاعرے بہت دھوم دھامی ہوا کرتے تھے اکثر آتش کو بھی بلواتے تھے۔ یہ اسی بانکپن سے اکڑتے ہوئے جاتے تھے۔ تلوار میان سے

دو انگل باہر رہتی تھی۔ لوگ کہتے تھے خدا خیر کرے۔ ایسا نہو مشاعرے میں خون کی ندیاں بہ جائیں۔

دونوں مشہور شاعر اور دونوں کے شاگرد بے شمار۔ ایک مرتبہ جو مشاعرہ کیا تمام شہر میں مصرعِ طرح تقسیم کردیا لیکن آتش کو ایک روز پیشتر مصرع طرح بھیجا۔ آپ نے فرمایا شاید معتمد الدولہ بہادر کو ہمارا امتحان منظور ہے جو طرح عین وقت پر بھیجی خیر یوں تو ہم آتے یا نہ آتے مگر اب جانا ضروری ہے۔ غزل کہی تلوار کمر سے لگائی بانکے دار ٹوپی دی شاگردوں کے جم غفیر سے مشاعرے میں داخل ہوئے دیکھا تو معتمد الدولہ نے نیا مکان جو تعمیر کرایا ہے اسمیں مشاعرہ کیا ہے۔ آپنے مکان کو دیکھکر فی البدیہہ یہ مطلع کہا جب انکے سامنے آیا تو پڑھا

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

مطلع تھا موقع کا دشمن کے منہ سے بھی واہ نکل گئی معتمد الدولہ نے اسیوقت خلعت دیا اور بہت عزت کی۔

آتش کے شاگردوں مین ایک نواب اصغر علی خاں صاحب اصغر بہت خوشگو شاعر تھے مگر وارستہ مزاج غزل پڑھنے کے بعد پھینک دیتے تھے اکثر لوگوں میں ان کے شعر آتش کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں انکا ایک یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

جب میر تقی میر نے انتقال کیا تو سعادت علی خاں کا زمانہ تھا آتش کا سن اسوقت اکتالیس برس کا تھا بہت رنج کیا اسلئے کہ میر صاحب انکی بہت قدر دانی کرتے تھے آتش اور ناسخ کی شاعری میں جتنا فرق تھا اتنا ہی مزاج میں بھی تفاوت تھا۔ آتش رند اور متوکل آدمی تھے اس وجہ سے وہ ہر ایک امیر غریب کو برابر سمجھتے تھے اور دنیاوی سازوسامان کی چنداں طمع نہ تھی۔ ناسخ مرفہ حال تھے اور لوگوں کی انکے مرتبے کے موافق عزت اور آبرو کرتے تھے امرا کی آو بھگت سوا تھی اسلئے اکثر رئیس انکے شاگرد ہوتے تھے ناسخ کے شاگرد جو غریب ہوتے تھے ان کو سفارش کرکے کہیں نوکر رکھوا دیتے تھے اور حد سے زیادہ دنیاسازی کرتے تھے۔ لوگوں کا رجوع انکی طرف زیادہ ہونے لگا اور رفتہ رفتہ نواب معتمد الدولہ بہادر انکے شاگرد ہوئے تو ملک میں انکا اعزاز اور وقار زیادہ ہو گیا۔ آتش نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی فقیری کی آڑ لے لی ایک لنگوٹ بھنگ کا سونٹا اور چاروں ابرو کا صفایا گھر سے نکلنا کم کر دیا گیروا کپڑے پہننے لگے مگر وہ فقیری بھی بادشاہت سے بہتر تھی آرام سے اپنے گھر میں فکرِ سخن میں موتی پرو رہے ہیں کسی نے آوازدی دل چاہا تو دروازہ کھولدیا نہیں تو صاف جواب دیا اسوقت آرام میں ہیں

خواجہ محمد علی جب تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے تو عین شباب میں شعر کہنے لگے جوش تخلص رکھا گیا مچھلی کے بچے کو کون پیرنا سکھاتا ہے چند روز میں اچھے مشاق ہو گئے آخر وقت میں آتش کی بینائی جاتی رہی تھی میر دوست علی خلیل ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ غالب جنگ کے بیٹے جے دیال جو آتش کے شاگرد تھے مصر ہوئے کہ آپ جوش کی شادی کر دیجئے آتش نے عذر کیا کہ فقیر کی کیفیت تمکو معلوم ہے شادی حوصلے کے موافق ہونا چاہیئے لائق شاگرد نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا آپ اپنے کف میں نسبت ٹھہرالیں شادی کا سامان تمام مہیا ہو جائے گا آتش کی غیرت نے اس کو بھی قبول نہ کیا آخر بار بار کے تقاضوں سے تنگ آکر جوش کی نسبت ٹھہرانا پڑی شادی کے دھوم دھامی جلسے کے لئے دلارام کی بارہ دری لے لی گئی۔ تمام دوست احباب شاگرد عزیز مدعو ہوئے بہت معقول انتظام تھا سارا خرچ جے دیال نے نہایت حوصلے سے کیا جب محمد علی نوشہ

بنکر آتش کے سامنے آئے تو آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے شاگردوں نے عرض کیا اُستاد یہ وقت خوشی کا ہے خدا نے آپ کو بیٹے کا سہرا دکھایا خدا کا شکر بھیجئے بدشگونی نہ کیجئے ان کی اولاد سے خدا آپکی نسل قائم رکھے۔ کہنے لگے میں اس بات پر روتا ہوں کہ محمد علی کی والدہ جو خوش ہونے والی تھی وہ زندہ نہیں ہے جو اپنے بیٹے کو دولھا بنے ہوئے دیکھے میں آنکھوں سے اندھا ہوں صورت دیکھ نہیں سکتا یہ کون سا خوشی کا مقام ہے خیر تم لوگوں کو خدا مبارک کرے۔

شیخ ناسخ کے مرنے کی خبر سنی تو چیخ مارکر رونے لگے لوگوں نے کہا وہ تو آپ کے حریف تھے ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی آپکو خوش ہونا چاہئے کہ ایک دشمن کم ہوگیا۔ کہنے لگے میاں کیا کہتے ہو ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے مدت تک ہم پیالہ ہم نوالہ رہے ہمیشہ دوستی کا برتاؤ رہا شاعرانہ نوک جھوک کی اور بات ہے اور آشنا پرانا تو دشمن نہیں ملتا۔

نواب محمد علی خاں عرف نواب چندا میاں نے خواجہ آتش کو دیکھا ہے اُس زمانے میں خواجہ صاحب نابینا ہو چکے تھے مکان میں ایک چھپر پڑا تھا ایک کھاٹا بچھا تھا اس پر بیٹھے رہتے تھے نرکل کی چٹائیاں سامنے بچھی رہتی تھیں۔

غازی الدین حیدر بادشاہ نے ایک مرتبہ اپنے وزیر معتمد الدولہ سے پوچھا ہمارے شہر میں کوئی نامی شاعر بھی ہے عرض کیا شاعر تو بہت سے ہیں لیکن ان میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش بہت مشہور ہیں ارشاد ہوا اچھا ہماری کوٹھی میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے معتمد الدولہ نے اس مشاعرے کی خبر ناسخ کو کردی اور انہیں کی تجویز سے تاریخ اور مصرعہ طرح مقرر ہوگیا اور آتش کو ایک روز پیشتر چوبدار کے ہاتھ رقعہ طلب آیا۔

بہت پیچ و تاب کھاکر کہا معتمد الدولہ نے اچھا سلوک کیا اب یہ شہر ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا یہ کہکر گھر میں کہلا بھیجا کچھ شگون کی روٹی پکا دو ہم کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ چھوڑ دیں گے دوسرے روز علی الصباح گھر سے پیادہ پا نکل کھڑے ہوے۔ سنہری برج میں مرزا محمد تقی مرزا حیدر صاحب بیٹھے ہوے سیر دیکھ رہے تھے آتش کو دیکھکر کہا اُستاد آج گھر سے کیوں نکلے آدمی بھیجکر بلوایا۔ آتش نے کہا ہمارا اسلام کہدینا اور کہا ہم سفر کو جارہے ہیں مرزا محمد تقی یہ سُنکر خود بوچے پر سوار ہوکر آتش کے پاس پہنچے۔ راہ میں روک کر سب حال دریافت کیا اور کہا اُستاد آپکو اسکی کیا پرواہ ہے آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس پانچسو بانکا پچاس پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم ہے یہ کس کام آئیگا آپ دیکھ لیجیگا اگر معتمد الدولہ نے ہٹ دھرمی کی تو بارہ دری میں لہو کی ندیاں بہ جائیں گی مرزا صاحب تیس ہزار روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے ان کے سمجھانے سے آتش وہیں بیٹھ رہے اور شام تک غزل کہا کئے۔

اتنی دیر میں مرزا صاحب نے آتش کی طرف سے ایک درخواست لکھی حضور میں ایک فقیر گوشہ نشین ہوں اگر حضور نے یاد فرمایا ہے تو اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ سب سے پیشتر غزل پڑھوں اور دوسری گزارش یہ ہے کہ گڑگڑی خاص مرحمت ہو یہ عرضداشت محل کے اندر پیش ہوئی اور اس عنوان سے پیش ہوئی کہ بادشاہ نے دستخط فرما دئے حالاں کہ شاہی دربار میں سوائے بادشاہ کے ولیعہد تک کو اجازت نہ تھی۔ شام تک اس مشاعرے کی شہرت تمام شہر میں ہوگئی آتش کے تمام شاگرد نواب غضنفر الدولہ نواب مہدی علیخاں نواب نصرت یار خاں نواب سید محمد خاں رند خلیل وغیرہ مرزا صاحب کے دولت کدہ پر جمع ہوگئے شاہی مشاعرہ کی طرح ”فسانہ کیا نشانہ کیا“

تھی شام کو جب یہ خبر آ چکی کہ ناسخ مع اپنے شاگردوں کے
مشاعرے میں پہنچ چکے تو آتش نے بھی ٹوٹی تلوار (کھانڈا)
کمر سے لگائی ایک تہمد آدھی باندھی آدھی اوڑھی ننگے سر ننگے
پاؤں گھر سے نکلے پیچھے پیچھے آدمی چھتر لگائے ہوئے اس کے
بعد تمام رؤسا امرا شاگرد وغیرہ اس کے بعد پانچسو بانکا تلوار
کمر سے لگائے کتنے مرنے پر تلے ہوئے۔ اس بات کے تمام لوگ
قائل ہیں کہ مشاعرے میں آتش کے سامنے کبھی ناسخ کا رنگ
نہیں جما۔ انکا پڑھنے کا انداز شعر کا رکھ رکھاؤ ادا کرنے کے تیور کسی
کو نصیب نہ تھے۔

آتش شاہی دولت کدہ میں داخل ہوئے تو دیکھا صدر
بارہ دری کے اندر شہ نشین پر کرسی بچھائے ہوئے غازی الدین
حیدر فروکش ہیں ادھر ادھر ارکین سلطنت مختصر باادب کھڑے
ہیں آگے چلمن پڑی ہوئی ہے بارہ دری کی بغل میں داہنی طرف
ناسخ مع اپنے شاگردوں کے بیٹھے ہیں بائیں طرف آتش کے
واسطے جگہ ہے بیچ کے در میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔
مرزا محمد تقی صاحب آتش کو لئے ہوئے بیچ کے درجے میں چلے
گئے چوبدار نے عرض کیا حضور یہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے
آپنے ہش کر دیا وہ خاموش ہو رہا آتش نے پہلے بادشاہ کو فرشی
سلام کیا اور سامنے بیٹھ گئے اور پھر دست بستہ عرض کیا حضور
ایفائے وعدہ ہو۔

بادشاہ نے اشارہ کیا ایک خواص خاص گڑگڑی لیکر حاضر
ہوا۔ پھر عرض کیا اجازت ہے غزل شروع کروں فرمایا "ہوں"
آتش گڑگڑی لے کر مشاعرے کے پیترے سے بیٹھے اور اسی
ٹھاٹھ سے اپنی غزل پڑھنے لگے جس سے تمام سامعین وجد میں آ گئے
اور بادشاہ کے دل پہ ایک خاص اثر ہوا۔ سننے والے کہتے ہیں
آج تک ایسی زوردار غزل خواجہ صاحب نے نہیں پڑھی۔
بعض شعروں میں ناسخ پر کھلی کھلی چھونک تھی جنکو بادشاہ سنکر
مسکرائے ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجکو خلق خدا غائبانہ کیا
طبل و علم ہے پاس اپنے نہ ملک و جاہ — ہمسے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا
ہوتا ہے سنگ زرد جو نامرد مدعی — رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تونے کہی عاشقانہ کیا

آتش کے سب شاگرد بائیں طرف بیٹھے تھے استاد کی تعریف
کر رہے تھے ناسخ کے شاگردوں پر اس ادائے خاص کا بہت اثر
ہوا اور دل کھولکر لوگوں نے تعریف کی شاہی حکم سے دوہرا
خلعت مرحمت ہوا مگر اس شاعر درویش سیرت نے عرض کیا یہی
عزت وہی کافی ہے جو حضور نے خاص گڑگڑی مرحمت فرما کر دی
ہے۔ یہ خلعت ناسخ کو مرحمت ہو میں اپنا صلہ پا چکا اور اسی تیور
سے سلام کر کے خوشی خوشی گھر واپس آئے۔

تحسین گنج میں میاں تحسین علی خاں خواجہ سرا کے یہاں مشاعرہ
ہوا چلمن بگڑا کفن بگڑا اس میں بھی بالا آتش کے ہاتھ رہا اور ناسخ
کی غزل کمزور رہی۔

ولیعہدی کے زمانے میں حضرت محمد واجد علی شاہ آخری شاہ
اودھ آتش کے شاگرد ہوئے سو روپیہ ماہوار دیتے رہے غزل
اصلاح کو بھیجا کرتے تھے آتش نابینا تھے غزل سنکر شاگرد سے
اصلاح لکھوا دیا کرتے تھے ایک شعر پر بادشاہ کو کچھ شک ہوا رفقا
سے بیان کیا سب نے کہا خداوند آپ کا شعر بے مثل ہے آتش
نابینا ہیں شاگرد جو چاہتا ہے شعر کاٹ دیتے ہیں۔
یہ خبر آتش کو معلوم ہوئی دوبارہ غزل آئی اسپر لکھدیا ماشاللہ

خوب غزل کہی ہے۔ اُس سہ ماہی میں جتنی غزلیں آئیں سب پر یہی لکھدیا۔

جب سہ ماہی تنخواہ آئی تو واپس کردی اور کہا میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا جب غزل بناتا تھا تنخواہ لے لیتا تھا اب اصلاح نہیں ہوتی تنخواہ کس بات کی لوں۔ بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر کو بھیجا آتش نے یہی جواب دیا علی نقی خاں نے شاگردوں سے ناراضی کا سبب دریافت کرکے بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ خود معذرت کے لئے آتش کے مکان پر آئے۔

منشی قمر صاحب کہتے ہیں جب ہمنے دیکھا ہے تو آتش کی بینائی جاتی رہی تھی گورے دبلے پتلے تھے سر پر بال لمبے لمبے تھے جوڑا باندھتے موچھیں بڑی بڑی ڈاڑھی منڈی ہوئی ایک تہد آدھی باندھے ہوئے آدھی اوڑھے ہوئے مکان میں بیٹھے رہتے تھے۔ چہرے سے بانکپن ٹپکتا تھا ایسا متوکل آدمی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ خواجہ محمد بشیر کہتے ہیں ہم بہت کمسن تھے صفر کا مہینا تھا ۱۲۶۳ء تھا۔ آتش کی بیماری کی خبر مشہور ہوئی خواجہ رکن الدین کے ساتھ ہم بھی آتش کی عیادت کو گئے اس زمانے میں واجد علی شاہ کا عہدِ سلطنت تھا اور اسی سال سریرآرائے سلطنت ہوئے تھے۔

آتش کا مکان ماہولال کی چڑھائی پر تھا جہاں اب چونے والی بھٹی ہے کچّا مکان تھا اس میں ایک چھپر پڑا ہوا۔ تقریباً اسّی بیاسی برس کا ایک آدمی چاروں ابرو کا صفایا رنگ کھلتا ہوا چارپائی پر لیٹا تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا یہی آتش ہیں۔ کچھ منہ سے کہنا چاہتے تھے آواز نہ نکل سکی شاگرد لوگ نرکل کی چٹائیوں پر بیٹھے ہوے تھے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک کھڑے رہے پھر چلے آئے اسکے آٹھ روز کے بعد سُنا آتش کا انتقال ہوگیا اور اپنے مکان میں دفن کئے گئے۔

معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ ۱۲۵۴ھ میں ناسخ کا انتقال ہوا اور ناسخ کے نو برس کے بعد ۱۲۶۳ھ میں آتش نے اس جہان فانی سے کوچ کیا کسی شاعر نے "چراغِ جہاں" تاریخ وفات نکالی تھی۔ (باقی پھر)

عشرت لکھنوی

محاکمۂ مرکزِ اُردو۔ اس مختصر رسالے کے مصنف منشی سیّد احمد صاحب دہلوی مولّف فرہنگ آصفیہ ہیں۔ آپ کا نام ہی اس کی دلچسپی، خوبی، اور سند کے لئے کافی ضمانت ہے۔ اس رسالہ میں مصنّف موصوف نے دہلی کو اردو زبان کا وطن اور ٹکسال ثابت کرکے حب الوطنی کا خوب حق نباہا ہے، اور مختلف فصحا و شعرا کے کلام سے یہ ثابت کیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کی جان سادگی، عام پسندی، اور دل آویزی میں ہے، اور یہ خصوصیتیں دہلی کی زبان میں ہمیشہ سے رہی ہیں۔ لکھنؤ کی زبان میں تصنّع و تکلّفات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور لاہور کی زوردار زمین میں گو اردو کے پودے نے نہایت زور کا نشو و نما پایا ہے، مگر اس میں ہنوز کسی قدر قلم تراشی کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیچر کی سادگی و خاموشی میں جو دلربائی و فصاحت ہے، انسانی تصنّع اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ برج بھاشا کے مقبول عام ہونے کا راز اسی نیچرل سادگی میں ہے۔ ہم بھی زبانِ دہلی کے شیدائی ہیں، اور وہیں کے اسٹینڈرڈ (معیار) کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جسطرح یوسفِ کنعانی کا عروج کنعان سے نکلکر مصر میں ہوا، اُسیطرح اُردو کی قدر و قیمت و ترقی لکھنؤ، حیدرآباد اور لاہور میں پہنچ کر ہوئی۔ اہل زبان اس رسالہ کے مطالعہ سے خود فیصلہ کرسکتے ہیں۔ قیمت ۲؍

सिस्टर निवेदिता । SISTER NIVEDITA سسٹر نویدتا

Indian Press, Allahabad.

سسٹر نیویدتا

کسی پیدائشی ہندوستانی کی ایثار نفسی، وطن پرستی، خدمتِ ملک اس قدر قابلِ تحسین و آفریں نہیں، جتنی ایک غیر ہندوستانی شخص کی، جو مادرِ ہند کی خدمت کے لئے اپنے اصلی وطن، عزیز و اقارب، دوست و احباب، راحت و آسائش کو ترک کر کے غیر ملک کو اپنا وطن بنائے۔ ایسے بے نفس اور خدا ترس شخص کی تعریف جس قدر کی جائے کم ہے۔

سسٹر نیویدتا انہیں چند برگزیدہ نفوس میں ہیں، جنھوں نے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہکر ہندوستان میں بود و باش اختیار کی اور جس کی خدمت میں دل و جان سے مصروف ہیں۔

ناظرینِ ادیب کو معلوم ہوگا کہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو سسٹر نیویدتا بمقام دارجیلنگ جاں بحق ہوئیں۔ ان کی وفاتِ حسرت آیات سے ہندوستان کی سوشل، تعلیمی، اور مذہبی ترقی کو صدمۂ عظیم پہنچا۔ سسٹر کی زندگی کے کارنامے اور خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک مختصر سے مضمون میں وہ سب قلمبند نہیں کئے جا سکتے۔ ہم چند واقعات اور حالات کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں۔

شکاگو کی عالمگیر مذہبی کانفرنس اور سفرِ امریکہ سے فارغ ہو کر جب سوامی ویویکانند صاحب لندن تشریف لے گئے تو اہلِ مشرق، خصوصاً ہندوستان، کے حالِ زار کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی پبلک سے خدمتِ ہند کی اپیل کی۔ مس مارگریٹ۔ ای نوبل (سسٹر نیویدتا) نے بڑی خوشی سے اپنی بیش قیمت خدمات سوامی جی کے نذر کیں، اور اُن کے ہمراہ ہندوستان آئیں۔

سوامی ویویکانند جی ہندو فلسفہ کے ماہر اور عارفِ کامل تھے آپ کی خداداد سحر بیانی اور پرمعنی تقریر کا ایسا معجز نما اثر ہوا کہ مس نوبل صاحبہ نے آپ کے حلقہ بگوش ہو کر شرفِ شاگردی حاصل کیا۔ اس زمانہ سے ہندو مذہب اور ہندو قوم کی محبت اُن کے دل میں اس درجہ بڑھی کہ اپنا طرزِ معاشرت، بلکہ نام بھی، تبدیل کر دیا۔ سسٹر کی مرتاضانہ زندگی کو دیکھکر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سچّی ہندو نہیں۔ وہ ہندوؤں کی سوشیل، پولٹیکل، اور مذہبی اصلاح کی حمایت بذریعہ تحریر و تقریر آخر وقت تک کرتی رہیں۔ آج سے تیرّہ برس قبل آپ مسز جے سی۔ بوس صاحبہ سے ملیں اور ہندی بہنوں کی تعلیمی ضرورت کو محسوس کر کے اُن کی خدمت کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ مسز بوس کا بیان ہے کہ "میں نے حقیقی کامیابی سے ناامیدی ظاہر کی، اور ہندوؤں کی راسخ الاعتقادی، جاہلانہ ذاتی تفریق، اور تنگ خیالی کی بنا پر یہ عرض کیا کہ آپ کو غیر مُلکی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ برداشت دقتوّں، ہر ایک قدم پر ناامیدی اور جہالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اپنے اس ارادہ سے باز رہیں۔ مگر اس ثابت قدم انسان نے میری ایک نہ سُنی اور اپنے عزم بالجزم پر قائم رہیں۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں جو بوسی پارہ لین میں واقع ہے مدعو کیا۔ میں ان کی کارگزاریوں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئی"۔

جس محلّہ میں سسٹر نے مکان کرایہ پر لیا تھا، اس میں کثر ہندو آباد تھے۔ ابتدا میں ان کو کوئی خدمتگار بھی نہیں ملا۔ وہ اکثر محض نوالہ کھات پر گزارا کرتی تھیں، یا کبھی کبھی خود کچھ پکا لیا کرتی تھیں۔ اس مکان میں انہوں نے ایک کنڈر گارٹن اسکول جاری کیا تھا،

جس میں نہ صرف نوعمر بچوں بلکہ سن رسیدہ ماؤں کو بھی شفقت اور اور مادرانہ محبت سے تعلیم وتربیت دیا کرتی تھیں۔ ان کی دینداری، انکساری، اور بے نفسی کو دیکھکر وہ ہندو مستورات جو پہلے ملنے جلنے سے ہچکچاتی تھیں یا اپنے بچوں کو مدرسہ میں بھیجنے سے پرہیز کرتی تھیں، اب بلا تامل آنے جانے لگیں۔ اس مدرسے سے ہندو بچوں اور مستورات کو جس قدر فائدہ پہنچا وہ محتاج بیان نہیں۔ ہر ایک تعلیم یافتہ بنگالی سسٹر کی بے نظیر خدمات کا معترف ہے۔

فیض رسانی کا دائرہ صرف اس درسگاہ تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ صفائی اور حفظانِ صحت کی تعلیم وترغیب محلہ والوں کو برابر دیا کرتی تھیں اکثر ایسا دیکھا گیا کہ انہوں نے ناپاک زمین اور گندی نالیوں کو خود اپنے ہاتھ سے صاف کیا اور محلے والوں کو صفائی کا عملی نمونہ دکھایا۔ پہلے پہل جب کلکتہ میں طاعون پھیلا تو سارا شہر بدحواس اور خائف ہو کر گردونواح میں بھاگنے لگا۔ نفسی نفسی کی صدا ہر طرف بلند تھی۔ ایسی حالت میں مفلسوں اور محتاجوں کی خبر گیری کون کرتا۔ مگر آفریں ہے سسٹر کی ذات قدسی صفات پر کہ صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ نہایت سرگرمی اور مادرانہ توجہ سے غربا کی تیمارداری کی اور اپنی جانِ عزیز کو جوکھم میں ڈالا۔ ایک غریب لڑکا طاعون میں مبتلا ہوا۔ اس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ سسٹر نے اس کے علاج میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ آخر میں اُس بچے نے ان کی گود میں جان دی۔

خداترسی اور رحمدلی کا یہ حال تھا کہ خود تکلیف اٹھاتیں مگر دوسروں کی مدد ضرور کرتیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ انکا ملازم بڑا اسردی کھا رہا تھا۔ آپ نے اپنا گرم لبادہ اُس کو اڑھا دیا اور خود رات بھر سردی کھایا کیں۔

جس زمانہ میں مشرقی بنگال قحط وطغیانی کا شکار ہوا، سسٹر نویدیتا اس خبرِ بد کو سنتے ہی باریسال جا پہنچیں، اور قحط زدہ کسانوں کی حتی الوسع امداد کی۔ ان اَن تھک خدمات کا یہ اثر ہوا کہ ان کی تندرستی خراب ہوگئی۔ آپ کے احباب اور نیز ڈاکٹروں نے بہ اصرار تمام صلاح دی کہ اس تنگ و غیر محفوظ مکان کو ترک کردیں اور کسی دوسرے مکان میں فروکش ہوں، مگر بچوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا آپ نے گوارا نہ کیا۔

علمی قابلیت، سچی دینداری، اور عالمانہ تقریر وتحریر کا یہ حال تھا کہ یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے سربرآوردہ اہل الرّائے سسٹر نویدیتا کی خداداد لیاقت کے مدّاح ہیں۔ علاوہ متعدّد رسالوں اور مضامین کے آپ نے متعدّد کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں سے "وب آف انڈین لائف" نہایت مقبول اور مشہور ہے۔ آخری زمانۂ حیات میں آپ نے دو اور کتابیں لکھنی شروع کی تھیں، اور انہیں میں مشغول تھیں کہ پیغامِ اجل آ پہنچا اور یہ دونوں کتابیں ناتمام رہ گئیں۔

یُوں تو ہندوستان کی ہر شئے اور ہر فن انکو ازبس عزیز تھا، مگر فن تعمیر اور دستکاری سے خاص دلچسپی تھی۔ سسٹر کا خیال تھا کہ ہندوستان کو یورپ کی کورانہ تقلید نہ کرنا چاہیئے بلکہ وطنی صنعت وحرفت کو ترقی دینے اور ہندوستان کی حیرت انگیز دستکاریوں کو قائم رکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

سسٹر نویدیتا کی محبت صرف اہلِ ہنود تک محدود نہ تھی بلکہ وہ سچی وطن پرست تھیں اس لئے بلاخیال فرقہ وملت ہر گروہ کے ساتھ انکو ہمدردی تھی۔ مسلمانوں کے قدیم کارناموں سے از حد دلچسپی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ خدا بخش اورینٹل لائبریری بانکی پور دیکھنے گئیں۔ کسی کتاب یا کتبہ پر شاہجہاں کا اصلی دستخط تھا۔ محافظ کتب خانہ کی اجازت لے کر آپ نے نہایت ادب اور تعظیم سے

اس دستخط کو بوسہ دیا اور دیر تک دم بخود کھڑی رہیں۔ راقم الحروف کو بخوبی یاد ہے کہ جس زمانہ میں آپ لکھنؤ میں لکچر دے رہی تھیں تو شہر کی شاہی عمارتوں اور اسلامی بادشاہوں کے کارناموں کی تعریف میں ازبس رطب اللسان تھیں۔ انکا خیال تھا کہ ہندو مسلمانوں میں موجودہ اختلاف محض انگریزی داں اصحاب کے باعث ہے۔ غیر انگریزی داں ہندو مسلمان اب تک دوستانہ و برادرانہ مراسم رکھتے ہیں۔

آپ سودیشی تحریک کی پُرجوش حامی تھیں۔ اُن کی رائے میں اس تحریک کی ترقی میں ہندوستان کی مالی بہبودی کا اصلی راز وابستہ ہے۔ حب الوطنی اور یک جہتی کی تعلیم وہ برابر دیتی رہیں۔ مغربی ممالک میں، ہندوستان کے پیچیدہ معاشرتی و سیاسی مسائل کے متعلق مسٹر نویدتا کی رائے نہایت مستند مانی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ ایسا ہونا بھی چاہئے۔ وجہ یہ کہ مسٹر نویدتا اپنے خلوص اور ہمدردی کی وجہ سے تقریباً سارے ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، خصوصاً بنگال میں جہاں وہ زیادہ تر قیام پذیر رہیں۔ معزز اور متوسط الحال اہل ہنود کے گھروں میں اُنکی رسائی تھی۔ ہندوؤں کی ظاہری اور خانگی دونوں زندگیوں سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ قریباً تمام ہندوستان کا سفر کر چکی تھیں۔ ہر ایک تاریخی مقام کے حالات سے واقف و آگاہ تھیں۔ ہندوستان کو اپنا وطن اور ہندوستانیوں کو اہل وطن سمجھتی تھیں۔ ایسی حالت میں اُن سے زیادہ کس مغربی شخص کو حق حاصل تھا کہ ہندوستان کے معاملات اور ہندوستان کے معاشرتی، مذہبی، اور سیاسی امور پر رائے زنی کر سکے۔

ہندوستانیوں کو ایک متحدہ قوم بنانے کا خیال اُن کے دل میں عرصہ سے جاگزیں تھا، اور اس موضوع پر بارہا تقریریں کی تھیں۔ مسٹر کی رائے میں ایک نہ ایک دن ہندوستان کے منتشر اجزا و مختلف ادیان و ملل بلا خیال ذات و مذہب "ایک قوم" مثل جاپان یا انگلستان ضرور بنیں گے۔

دنیا میں ایسے پاکباز، بے نفس، اور خالص وطن پرست بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ہم لوگ مسٹر نویدتا کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وہ ہماری سچی محسن اور خیر اندیش تھیں۔ خدا مغفرت کرے۔ آمین۔

"آنند"

رسید کتب۔ (۱) امثال مصنفہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب وزیر مال ریاست بہاولپور ۸؍ (۲) بھیشم پتامہ کا مکمل جیون چرتر مصنفہ ٹھاکر سکھ رام داس چوہان راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور ۸؍ (۳) آئینہ شوق (دیوان) از منشی جگن ناتھ پرشاد صاحب شوق۔ محلہ پیپل مہادیو، چھتہ صوفی جی۔ دہلی عہ (۴) دیوان غالب مشرح از سید فضل الحسن صاحب حسرت بی اے دفتر اردوے معلی علیگڈھ۔ عہ (۵) تحقیق سخن مولفہ مولوی سید حسن مرتضےٰ صاحب شفق عماد پوری، رفیع گنج ضلع گیا۔ ۸؍ (۶) قواعد سول سرس ٹنڈن برادرس، تاجران کتب علی گڈھ۔ ۹؍ (۷) دھرم تتو، سوندریہ پربھا، آتم سدھار، پاروتی پرینیہ ناٹک، تینی دھرم سنگرہ، کویرتن مالا، از دفتر اخبار بھارت متر نمبر ۹۷ بابو مکتارام اسٹریٹ کلکتہ (یہ سب کتابیں ہندی زبان میں ہیں، جو خریداران بھارت متر کو برائے نام قیمت پر دی جاتی ہیں) (۱۳) بڑی جنتری ۱۹۱۲ء مرتبہ منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد نامی پریس کانپور۔ قیمت عہ (۱۴) اقوال بدھ (ترجمہ "دھم پد") مترجمہ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب، انڈین پریس الہ آباد ۔ ۱۲؍ (۱۵) ہندو قوم مر رہی ہے! مصنفہ ڈاکٹر یو۔ این۔ مکرجی صاحب) مطبوعہ لیتک بھنڈار، سوہا بازار لاہور ۔ ۲؍ (۱۶) علمی جنتری ۱۹۱۲ء مرتبہ سید محمد عبد اللہ علم سوداگر، رام نرائن بازار کانپور ۲؍

جاپان میں تعلیم نسواں

("جاپان میگزین" سے ادیب کے لئے ترجمہ کیا گیا)

جاپانی بچہ تین سال کی عمر میں کنڈرگارٹن اسکول میں داخل ہو سکتا ہے لیکن اس طرز کے اسکول چونکہ اس ملک میں بہت کم ہیں اس لئے اکثر بچے چھ سال کی عمر میں پرائمری اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں جس کے بعد عرصہ چھ سال تک انھیں اسکول کی حاضری پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس قاعدہ سے صرف لولے لنگڑے اور کمزور بچے مستثنیٰ ہیں۔ اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ گو اکثر سہولیت کی غرض سے ان کی جماعتوں کو الگ الگ بھی کر دیا جاتا ہے۔ جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہتی ہوں وہ بارہ سال کی عمر میں تعلیم کے اُس کورس کو شروع کرتی ہیں جو جاپان میں عورتوں کے لئے مخصوص ہے، اور کسی اعلیٰ درجہ کے پرائمری اسکول، سپلیمنٹری (ایزادی) اسکول یا لڑکیوں کے ہائی اسکول میں داخل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان میں اکثر جو نہایت غریب اور ادنےٰ طبقہ کی ہیں وہ مزید تعلیم کے فوائد سے محروم رہ کر کارخانوں، چھاپہ خانوں وغیرہ میں محنت مزدوری کرنے لگ جاتی ہیں۔ یا گھر میں رہ کر مختلف طریقوں پر اپنے والدین کو مدد دیتی ہیں۔ مثلاً چھوٹے بچوں کی نگہداشت وغیرہ جنہیں وہ ایک کپڑے سے اپنی پیٹھ کے ساتھ باندھکر ہر وقت پھرتی نظر آتی ہیں۔

بڑے درجے کے پرائمری اسکولوں میں تعلیمی کورس عرصہ دو سال میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ ان اسکولوں میں مضامین وہی ہیں لیکن کسیقدر زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہوتے ہیں مثلاً اخلاقی تعلیم، نوشت و خواند، مقامی جغرافیہ تاریخ، نقاشی، موسیقی، جمناسٹک، سلائی دستکاری وغیرہ۔ بہت سی لڑکیاں اتنی تعلیم حاصل کرکے کام میں لگ جاتی ہیں۔ لیکن بعض لڑکیوں کے ہائی اسکول، زنانہ کاریگروں کے مدرسہ، یا زنانہ نارمل اسکول میں پڑھنے کے لئے داخل ہو جاتی ہیں۔

ایزادی اسکول تین قسم کے ہوتے ہیں۔ زرعی، حرفتی اور تجارتی۔ ان میں سے ہر ایک میں عرصہ تعلیم یکساں یعنی بقدر دو سال ہے۔ ان اسکولوں سے نکلتے ہی لڑکیاں اُن خاص کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں جن کی انھیں تربیت دی گئی ہو۔

خاص ملک جاپان میں لڑکیوں کے ہائی اسکولوں کی تعداد ۱۰۰ ہے۔ ان کا تعلیمی کورس عرصہ چار یا پانچ سال کا مقرر ہے اور مضامین ذیل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اخلاق، انتظام خانہ داری، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، سلائی، تیمارداری اور بچوں کی نگہداشت، غیر ملکی زبانیں (جن کے انتخاب کا اختیار طالب علم کو ہوتا ہے) جبر و مقابلہ، اقلیدس، علم نباتات، علم حیوانات، علم موجودات، نیچرل فلاسفی، علم کیمیا، نقاشی، موسیقی، خاص خاص مراسم کے موقعہ پر چائے دینا اور پھول سجانا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے اسکول چونکہ زیادہ تر بڑے شہروں اور قصبوں میں واقع ہیں اس لئے دیہات سے آئی ہوئی لڑکیوں کی رہائش کے لئے علحدہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ایسے اسکولوں کی طالب علم لڑکیاں زیادہ تر

اوسط سے بڑا درجہ رکھنے والے لوگوں کی ہوا کرتی ہیں اور اچھے مالدار گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ رواجاً ان کی شادی کا انتظام ان کے گریجویٹ ہونے پر فوراً ہی کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح پر وہ جتنی بھی تربیت حاصل کرتی ہیں وہ ساری عملی طور پر انتظام خانہ داری کے کام آتی ہے۔ لیکن بعض لڑکیاں زنانہ نارمل اسکولوں یا زنانہ یونیورسٹیوں میں داخل ہو جاتی ہیں جہاں انہیں استانیوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ان کا تعلیمی کورس ۴ ۱/۲ سال کا ہوتا ہے۔ ٹوکیو میں جو بڑے درجہ کا نارمل اسکول ہے اس میں لٹریچر، سائنس، اور آرٹ، ان تینوں میں سے کسی ایک کی تعلیم حاصل ہو سکتی ہے۔ لٹریری یا علمی کورس کے مضامین حسب ذیل ہیں:۔ علم اخلاق، علم درس، جاپانی زبان، السنہ چینی، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، موسیقی، اور جمناسٹک۔ سائنٹیفک کورس مضامین ذیل پر مشتمل ہوتا ہے:۔ علم اخلاق، علم درس، انگریزی، ریاضی، علم طبیعات، علم کیمیا، نیچرل ہسٹری، موسیقی، اور جمناسٹک۔ آرٹ کے کورس کی ذیل میں یہ مضامین آتے ہیں:۔ علم اخلاق، علم درس، انگریزی، علم طبیعات، علم کیمیا، انتظام خانہ داری، خانگی تعلیم، کپڑوں کی سلائی، دستکاری، نقاشی، نمونہ سازی، موسیقی، اور جمناسٹک۔

زنانہ یونیورسٹی کے آٹھ مختلف شعبے ہیں اور ہائی یا نارمل اسکولوں کے مضامین کے علاوہ یہاں مندرجہ ذیل مضامین کی بھی تعلیم ہوتی ہے:۔ علم موجودات، نیچرل فلاسفی کی تاریخ، فنون لطیفہ کی تاریخ، علم اللسان، آئین ملکی، اور ضابطہ دیوانی۔

امرا کے اسکول کی طرز پر ایک اسکول امیرزادیوں کے لئے قائم ہے۔ لیکن اس میں عزت دار و صاحب اقتدار عوام کی بیٹیاں بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کے عملی طور پر چار مختلف صیغے ہیں کیونکہ Common (معمولی) اور Academic (اعلیٰ تعلیمی) کورس دونو جداگانہ طور پر دو دو چھوٹی اور بڑی جماعتوں پر مشتمل ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے عرصہ چھ سال کا مقرر ہے۔ تعلیمی مضامین اس جگہ بھی قریب قریب وہی ہیں جو زنانہ ہائی اسکولوں میں بطور نصاب مقرر ہیں۔

یہ سب انسٹی ٹیوشن، باستثنائے یونیورسٹی، گورنمنٹ کے زیر اقتدار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مشن اسکول قائم ہیں جن میں اکثر کو گورنمنٹ جائز تسلیم کرتی ہے اور جو معمولی طریقوں پر چل رہے ہیں۔ چند ایک پرائیویٹ انسٹی ٹیوشن انکے سوا اور ہیں جن میں سے ایک کسی جاپانی عورت مس ٹسوڈا کا قائم کردہ اب تک چل رہا ہے۔ مخفی نہ رہے کہ یہ عورت ان سات لڑکیوں میں سے ایک ہے جنھیں گورنمنٹ نے ممالک متحدہ (امریکہ) میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا تھا۔

جاپان میں عورتوں کی تعلیم کا بنیادی اصول انہیں نیک بیبیاں اور مائیں بنانا ہے اور یہی انکا فرض آسمانی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ کنبہ کے خیال کو قومی اور سب سے اعلیٰ تصور کرتے اور شخصیت کو اہمیت سے بالکل بعید رکھتے ہیں بچپن ہی سے لڑکیوں کو اطاعت گزاری کا عادی کیا جاتا ہے اور یہ بات اُن کے ذہن نشین کر دی جاتی ہے کہ اپنے بھائیوں اور کنبہ کے دوسرے مردوں کے مقابلہ میں وہ دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ تمدنی حالات لڑکی کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ اس کے دوستانہ تعلقات صرف اُسی کی جنس تک محدود ہوں اور وہ بہت جلد سیکھ لیتی ہے کہ اپنے والدین کے انتظام کے بموجب اسے بلا شکایت اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی

مرضی کے مطابق بسر کرنا چاہیئے شوہر کو لڑکیاں مشرقی دستور کے مطابق شادی کے دن سے پہلے بہت کم دیکھتی ہیں۔ سوائے مدبرانہ حلقہ کے لوگوں کے شاذ و نادر ہی عورت اپنے شوہر کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتی یا مہمانوں کی دعوت میں شریک ہوتی ہے۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو محض اس لئے کہ ان کی ضروریات کا خیال کرے۔ اس کا کام بالکل کنبہ کے حلقہ تک محدود ہوتا ہے اور اس کا فرض محض اُن کی جسمانی ضروریات رفع کرنا خیال کیا جاتا ہے عام طور پر اسے صرف امور ذیل میں مہارت ہوتی ہے :- کوٹو کھیلنا (جو عملی طور پر سکھایا جاتا ہے اور اس میں موسیقی سیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ موسیقی کا طریق تحریر حال ہی میں مروّج ہوا ہے) پھولوں کو آراستہ کرنا، اور نقاشی یا تصویرکشی۔ گو باوجود اس کے زنانہ طلبہ کو آرٹ اسکولوں میں داخل نہیں کیا جاتا۔

زبیدہ خاتون

چپ کی داد

"Silence is the safest course for any man to adopt"

—(La Rochefoucauld.)

(۱)

۲۵ر دسمبر ۱۹۰۲ء کی رات کو میں نارتھ وسٹرن ریلوے کی ڈاک میں سوار ہو کر ۱۹۰۲ء کے دربار تاجپوشی میں شریک ہونے کی غرض سے دہلی روانہ ہوا میں جس درجۂ اوّل کے ڈبّہ میں بیٹھا تھا اس میں ایک یورپین جنٹلمین اور اس کی بیوی بھی سوار تھے۔ یہ دونوں میانہ قد کے تھے اسباب ان کے ساتھ بے شمار تھا اوپر نیچے کی اکثر نشستیں ان کے ٹرنکوں۔ دستی بیگوں۔ ٹفن کی ٹوکریوں۔ بستروں اور کیش بکسوں سے رُکی ہوئی تھیں۔ لیکن اتنے اسباب کی موجودگی چنداں حیرت میں ڈالنے والی نہ تھی کیونکہ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا وہ اپنی سکونت منتقل کر رہے ہیں اور غالباً کالکا کی طرف کسی جگہ اقامت گزیں ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اتنے بڑے اسباب کے ڈھیر کو دیکھکر میری طبیعت سخت پریشان تھی کیونکہ رات کا سفر تھا اور کمرے میں لیٹنے کے لئے کہیں گنجائش نظر نہ آتی تھی۔ ان دونوں کے پاس ایک چیز ایسی بھی موجود تھی جسے دیکھ کر میں سخت حیران تھا باوجود پنجاب کے کڑکڑاتے جاڑے کے ان کے ساتھ پانی سے بھری ہوئی ایک مٹی کی صراحی تھی جسکا منہ ایک بڑے سے کاگ کے ذریعہ بند کر رکھا تھا۔ یہ صراحی ایک شخص کی موت کا باعث ثابت ہوتی لیکن قدرت نے مجھے اُسے بچانے کا ذریعہ بنایا۔ اسی واقعہ کی یاد گزشتہ دربار دہلی نے میرے دل میں تازہ کردی ہے اور میرا ارادہ اس جگہ ان واقعات کو جو اُس گاڑی کے اندر اس رات وقوع میں آئے بیان کرنے کا ہے۔

(۲)

اس روز میں جب لاہور اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا تو کمرہ

نقشۂ مکۂ معظمہ

خانۂ کعبہ

انڈین پریس الہ آباد

خالی تھا لیکن مجھے وہاں بیٹھے ابھی پانچ منٹ نہ گذرے تھے کہ دونوں میاں بیوی داخل ہوئے۔ اُن کے ہمراہ قلیوں کی ایک پوری پلٹن تھی جنھوں نے اسباب اُٹھایا تھا۔ صاحب اپنی شکل وشباہت سے چنداں ملنسار یا حلیم الطبع معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کی بھنویں اور موچھیں گھنی اور بھاری تھیں اور تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے رکتے رکتے کہا "یہ اسباب گارڈ کے کمرہ میں رکھوا دیا جاتا تو بہتر تھا۔ اس سے گاڑی رک جائے گی تو مسافروں کے بیٹھنے کی جگہ باقی نہ رہے گی"۔ اس نے میری بات کا بالکل جواب نہ دیا بلکہ اور بھی تیزی سے قلیوں کو اسباب جلد جلد رکھنے کا حکم دینے لگا۔ میں نے اس سے مزید تکرار کرنا فضول سمجھا اور اپنا گلیڈ سٹون بیگ لیکر چپ چاپ ایک بالائی نشست پر جا بیٹھا۔

گھنٹی بج چکی۔ گارڈ نے سیٹی دے دی اور اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ نے سبز بتی دکھا دی ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اس وقت تک قلی اسباب لادنے اور رکھنے کے کام میں مصروف تھے۔ ان میں سے چند ایک کو تو آخر چلتی گاڑی سے اُترنا پڑا۔ جب گاڑی سٹیشن پلیٹ فارم سے نکل گئی لیڈی نے تنگ سفید رضائی ایک نشست پر بچھا دی اور صاحب اس پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد وہ اسباب کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگ گئی لیکن مجھے اس بات سے سخت حیرت تھی کہ اس کے شوہر نے اس کام میں اسے بالکل مدد نہ دی۔ ایک ٹرنک اس قدر بھاری تھا کہ باوجود اسکی کوشش کے اپنی جگہ سے نہ ہل سکا لیکن چونکہ وہ راستہ میں پڑا تھا اسے سرکانا بھی ضروری تھا۔ ایک بار اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا لیکن اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے صرف اتنا کہا "آہ! میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں" اس پر میں نے اندازہ کیا کہ یقیناً وہ بیمار ہے اور یہ شاید تبدیل آب و ہوا کی غرض سے کہیں جا رہے ہیں۔

لیڈی کے گلابی لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ دوبارہ پوری کوشش سے بکس کو ہلانے لگی۔ اب مجھے نہ رہا گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی لاہور چھاونی مشرقی کے اسٹیشن سے نکل چکی ہے اور اب امرتسر سے پہلے کہیں نہ ٹھہرے گی۔ جہاں اُسے قریباً ایک گھنٹے میں پہنچنا تھا۔ آخر کار میں اپنی نشست سے نیچے اُترا اور معذرت کرتے ہوئے بھاری ٹرنک کو کھینچ کر ایک طرف کر دیا۔

لیڈی نے کہا "او تھینکس" اور میری طرف ایک ایسی نگاہ سے دیکھا جو سراسر ممنونیت سے پُر تھی۔ صاحب کی تیوری پر پہلے تو بل پڑ گئے لیکن پھر معاً اس نے بھی میرا شکریہ ادا کیا۔ اس اثنا میں میرے اندر اس لیڈی کی مدد کرنے کا شوق اور بھی تیز ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے چند منٹ آرام کرنے کی درخواست کی اور خود چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر دائیں بائیں رکھنے لگا۔ بلکہ اس کے لئے بیچ والی نشست پر ایک رضائی بھی بچھا دی اس کے بعد اس خیال سے کہ اگر تیسری بنچ خالی رہ گئی تو کوئی مسافر اس پر آ بیٹھے گا میں نے چند ایک ٹرنک اس پر چن دئے۔

اس اثنا میں میرے دونوں ہمراہی میری حرکات کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے جب میں اس کام کو ختم کر چکا تو صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ لیڈی نے زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا البتہ اسکی مسکراہٹ سے ممنونیت کا اظہار ہوتا تھا۔

(۳)

اس اثنا میں گاڑی امرتسر کے اسٹیشن پر جا پہنچی اور چند منٹ ٹھہر کر پھر آگے کو روانہ ہوئی۔ اس وقت لیڈی نے جس کا

نام میں صاحب کی گفتگو سے معلوم کر چکا تھا کہ ایمیلیا ہے، مجھے مخاطب کر کے پوچھا "بابو تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا "میڈم میں دہلی جا رہا ہوں" صاحب بیچ میں بول اٹھے "دہلی کو؟ تب تو انبالہ تک ہمارا تمہارا ساتھ ہو گا!"

ایمیلیا کہنے لگی "اس میں کم از کم ہمیں یہ فائدہ ہے کہ اس طویل سفر میں جی بہلا رہے گا۔ بابو تم کو شاید معلوم نہیں کہ مسٹر ایکٹن بیمار ہیں۔ مرض ذیابیطس نے اس بیچارے کو اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ کو مرض ذیابیطس ہے؟ بھلا آپ کب سے بیمار ہیں؟"

مسٹر ایکٹن نے جواب دیا "بابو تین سال سے میں اس موذی مرض میں مبتلا ہوں اب اس نے مجھے لب قبر تک پہنچا دیا ہے۔ میری جسمانی حالت نہایت شکستہ ہے اور نقاہت اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ میں بمشکل دس قدم چل سکتا ہوں۔"

جب وہ گفتگو ختم کر چکا تو میں نے اسے ایک کویراج کا پتہ دیا جسکی نسبت مجھے معلوم تھا کہ بہت سے ایسے مریض اس کے زیر علاج شفا پا چکے ہیں۔ ہر چند کہ ایک دیسی کی دوا تھی تاہم اس نے وعدہ کیا کہ میں اس کی آزمائش ضرور کروں گا۔ کیونکہ واقعہ میں بیماری رنگ اور رتبہ کی تمام باہمی تمیز اٹھا دیتی ہے۔

اس کے تھوڑے وقفہ بعد مسٹر ایکٹن کی آنکھ لگ گئی۔ مسز ایکٹن نے معذرت کرتے ہوئے شٹر بند کر دیئے۔ تاکہ اسکا شوہر سرد ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رہے اس اثنا میں میں اپنی بالائی نشست سے اسکی حرکات کو تعریف اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتا رہا۔ فی الحقیقت اس کی شکل و صورت اور چال ڈھال بہت کچھ قابل تعریف تھا۔ اس کی تمام حرکات ایک خاص انداز لئے ہوتی تھیں۔ اس کے اعضا کی موزونیت بے عیب تھی قد میں نہ بہت لمبی اور نہ پستہ قامت تھی۔ جسم نہ زیادہ موٹا اور نہ بالکل پتلا تھا۔ آواز شیریں چہرے پر اداسی کی جھلک اور آنکھیں کسی قدر سیاہ تھیں۔ اگر آپ ان تمام تفصیلات کو اپنی ذہنی آنکھ کے روبرو رکھیں تو یقیناً ایمیلیا ایکٹن کی تصویر کو اپنے سامنے دیکھ سکیں گے۔

شٹر بند کرکے اور لیمپ پر سبز غلاف چڑھا کر وہ نشست پر بیٹھ گئی اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے آخر کار میں نے معلوم کیا کہ وہ اب باتیں کرتی کرتی تھک گئی ہے اور سونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس وقت گاڑی جالندھر چھاونی کے اسٹیشن سے آگے نکل چکی تھی میں نے اسکی یہ حالت دیکھکر معذرت کرتے ہوے اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ خواہ میں خود نہ سوؤں لیکن اسے سونے کی ترغیب پیدا ہو جائے۔ ڈاک گاڑی اس وقت آباد لیکن سنسان گاؤں اور سرسبز گیہوں کے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ ہلکے ہلکے ہچکولے لگنے سے رفتہ رفتہ میری بھی آنکھ لگ گئی۔

(۴)

یاد نہیں میں اس حالت میں کب تک سویا کیا۔ بہر نوع جب میں بیدار ہوا اور آنکھیں کھولکر گاڑی میں نگاہ دوڑائی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مسز ایکٹن جاگ رہی اور ادھر ادھر پھرتی تھی، اس نے سوائے اپنے سخت کالر کے اور کوئی کپڑا نہ اتارا تھا۔ اور اب ہاتھ میں کوئی چیز لئے بیٹھی تھی۔ ڈھکے ہوئے لیمپ کی مدھم سی روشنی میں میں پہلے تو معلوم نہ کرسکا کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔

لیکن اس بات سے چونکہ مجھے حیرت تھی کہ وہ اس وقت تک کیوں جاگتی ہے اور اس کے علاوہ اس کی خاموشی کو دیکھکر میرے دل میں اس بات کا اندیشہ خود بخود پیدا ہو چکا تھا کہ کوئی بُرا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس لئے میں نے بالکل کسی قسم کی حرکت نہ کی اور چپ چاپ نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میری حالت اسوقت ایسی تھی کہ اسے بالکل میری بیداری کا علم نہ ہوسکتا تھا۔

یکایک کسی کاگ کے اڑنے کی آواز سے مجھے خیال گذرا کہ وہ چیز جو اس کے ہاتھ میں تھی بلا شبہ کسی چیز کی شیشی ہوگی آپ میری حیرت کا اندازہ کرسکتے ہیں جب اس نے بھوت کی طرح چپ چاپ اٹھکر وہ شیشی اس مٹی کی صراحی میں الٹ دی اس کی اسوقت میری طرف پشت تھی۔ اس لئے میں نے اچھی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ جو کچھ مجھے نظر آرہا ہے وہ خواب تو نہیں؟ لیکن نہیں یہ سب واقعہ میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ اتنا معلوم کرکے میں نے پھر وہی حالت اختیار کرلی۔ مسز ایکٹن نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو خرّاٹے مار مار کر سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت کاغذ کی طرح سپید تھا جسے دیکھکر میرے دل میں اشتباہ پیدا ہوگیا۔ معاً وہ غسل خانہ میں داخل ہوگئی۔ میں حیران تھا کہ اس شیشی میں کیا ہوگا۔ میرے ضمیر نے آواز دی "یہ دوا نہیں زہر ہے"

کیا یہ ممکن تھا کہ میں ایک قاتلہ کی معیت میں سفر کر رہا ہوں؟ کیا ان خوشنما خط وخال کے نیچے خوفناک شیطانی سیرت پوشیدہ تھی؟ یہ خیالات یکے بعد دیگرے بڑی تیزی کے ساتھ میرے دماغ میں سے گذرے اور اس سے کم عرصہ میں جتنا ان واقعات کی تحریر میں صرف ہوتا ہے میں نے اس بارہ میں اپنے دل کے اندر ایک خاص ارادہ کرلیا۔ میں چپ چاپ بغیر آہٹ کئے بالائی نشست پر سے اترا اور بڑی آہستگی سے ایک شٹر کھولکر صراحی کو باہر پھینک دیا۔ گاڑی اس وقت بڑی تیزی کے ساتھ فراٹے بھرتی جارہی تھی۔ صراحی کے نیچے گرنے سے بالکل کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ اور چونکہ اکثر مسافر کھڑکیاں بند کئے بیٹھے تھے اس لئے میری دانست میں کسی نے اس صراحی کو گرتے دیکھا بھی نہیں۔ میں ابھی شٹر کو دوبارہ اوپر اٹھانے ہی کو تھا کہ غسل خانہ کا دستہ گھومنے کی آواز آئی۔ میں شٹر کو اسی حالت میں چھوڑ ایک بندر کی پھرتی کے ساتھ اپنی نشست پر جالیٹا اور وہی پہلے کی طرح خواب کی صورت اختیار کرلی۔ اتنے میں آہٹ سے معلوم ہوا کہ مسز ایکٹن بھی غسل خانہ سے نکلکر گاڑی میں آگئی ہے۔ اس وقت میرا دل بڑے زور کے ساتھ دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن میں نے بڑے ضبط سے کام لیا اور ذرا سی جنبش بھی ظاہر نہ ہونے دی۔

(۵)

کھلی کھڑکی میں سے ہوا بڑی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی مسز ایکٹن کو جب سرد ہوا کا جھونکا لگا تو قدرتی طور پر وہ حیران سی ہوکر رہ گئی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ معاً اسکی نظر اس جگہ پر پڑی جہاں صراحی رکھی ہوئی تھی اور جب اس نے اس جگہ کو خالی پایا تو حیرت استعجاب اور اضطراب یکے بعد دیگرے اس کے برف کے ایسے سفید چہرے پر نمودار ہوتے لگے۔ میں یہ تمام حالت اپنی کسی قدر کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ صراحی کو غائب پاکر اس نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور بستر پر گر پڑی میرا خیال ہے کہ اسوقت یقیناً اسے غش آگیا ہوگا۔ پہلے تو میرا ارادہ ہوا کہ اٹھ کر دیکھوں لیکن پھر اس خیال سے جرات

نہ ہوئی کہ میرے اُٹھنے سے معاملہ اور بھی بگڑ جائیگا اور ممکن ہو وہ اپنے جرم پر پردہ پوشی کرنے کے لئے چلتی گاڑی سے کود جائے میں نے بڑی کوشش سے اپنے جسم اور زبان کو قابو میں رکھا اسوقت مجھے انگریزی کی وہ مثل یاد آئی کہ "گفتگو چاندی مگر خاموشی سونا ہے"

میں نے بیدار رہنے کی کوشش کی لیکن تفکرات کے چکر نے گاڑی کے ہچکولوں کی مدد سے آخر مجھے سُلا ہی دیا جب میں بیدار ہوا تو گاڑی راجپورہ سے آگے نکل چکی تھی اور انبالہ اب قریب ہی تھا۔ رات کی تاریکی بھی صبح کاذب کی روشنی میں مبدل ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مسٹر اور مسز ایکٹن بیٹھے بڑے مزے سے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار تک نظر نہ آتے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ رات کا واقعہ یقیناً کوئی بھیانک خواب تھا۔ لیکن اتنے میں مجھے بیدار پاکر مسٹر ایکٹن نے اپنی صراحی کے گم ہوجانے کا ذکر کیا گو وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی گھڑی زنجیر اور کیش بکس جسمیں بہت سے نوٹ تھے محفوظ رہے۔ مسز ایکٹن نے بھی اس بارہ میں اپنی حیرت کا اظہار کیا تاہم اس کا انداز بیان کسی قدر افسوس ناک تھا۔ جو خوش قسمتی سے اس کے شوہر نے معلوم نہ کیا۔ بہرنوع وہ نہ تو میری طرف دیکھتی اور نہ میری آنکھ سے آنکھ ملانے کی جرأت کرسکتی تھی۔ اس اثنا میں انبالہ چھاؤنی کا اسٹیشن آگیا اور دونوں میاں بیوی مجھسے بڑی گرمجوشی کے ساتھ جدا ہوئے۔

(۶)

اس کے قریباً دو سال بعد ایک روز اتفاق سے مسز ایکٹن مجھے لاہور میں اپر مال پر لارڈ لارنس کی تصویر کے پاس سیر کو جاتی ہوئی مل گئی۔ اس نے بہنوں کی طرح مجھ سے آزادانہ طور پر گفتگو کی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے ایک ایسے جرم سے بچایا تھا جس کا خیال تک کرنا بمنزلۂ گناہ تھا۔ اس نے مجھ پر ان تمام تکالیف اور مصائب کا اظہار کیا جو اس کے شوہر کی دائمی بیماری کی وجہ سے اسے پیش آتے رہے تھے اور جن سے مجبور ہوکر اس نے خود اپنا اور اپنے شوہر کا خاتمہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس نے کہا کہ "میں اب خوش ہوں اور میری خوشی کا واحد موجب صرف آپ ہیں کیونکہ جس کیرلج کا پتہ آپ نے بتایا تھا اس کے زیر علاج مسٹر ایکٹن کی حالت اب روبا صلاح ہوتی جارہی ہے"

اس کے بعد میرا اکثر ان کی کوٹھی واقع ایبٹ روڈ میں آنا جانا رہا۔ لیکن اب عرصہ ایک سال سے مسٹر ایکٹن ریٹائر ہوکر ولایت چلے گئے ہیں۔ اُس دربار کے بعد ایک اور دربار حال میں دہلی میں ہوچکا ہے۔ اس لئے میں نے ان واقعات کا انکشاف نامناسب یا غیر موزوں نہ جانکر انہیں قلمبند کردیا ہے۔

تیرتھ رام

سری رام چندر جی (چترکوٹ میں)

سری رام چندر جی

ہندوستان جنّت نشان کی خوبیوں میں سری رامچندر جی مہاراج کا وجود مبارک بھی اس قابل گزر چکا ہے جن کے علمی ایثار کا مختصر سا ذکر ہمارے نوجوان ہندی بھائیوں کے لئے مفید اور نفع رساں ہو سکتا ہے اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ذیل میں کچھ عرض کر کے ہندی بھائیوں کو اُس پر توجہ کرنے کے لئے تحریک کی جائے۔

گو یہ سچ ہے کہ جن لوگوں کی زندگی اُن کے علمی نمونوں کے باعث قابلِ قدر ہوتی ہے اُس پر مفصّل اور شرح و بسط سے لکھنے ہی میں مزا آتا ہے کیونکہ ان کی زندگی کے مختلف واقعات بجائے خود نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں چند صفحوں پر مضمون کا سمانا امرِ محال ہے، اور ضرورت اس کی ہے کہ صرف ان امور کا ایک گلدستہ بنا کر پیش کیا جائے جس سے جہاں ہر قوم و مذہب کے اصحاب کے دماغ معطر ہو سکیں، وہاں ہندوستان کی خوبی کا حال بھی اظہر من الشمس ہو سکے۔

آج رام چندر جی کو گزرے ایک مدت مدید اور عرصہ بعید ہو چکا ہے لیکن جس علمی نمونے نے ان کا نام اس وقت تک زندوں کی فہرست میں جلی حروف میں دکھلایا ہے وہ انکی سچّی وفاداری، حقیقی فرمانبرداری، ایثار، اور خودداری کے جوہر ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی اُنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد اور غرض سمجھنے میں نہایت ہوشیاری، دلیری، اور مستعدی سے کام لیا تھا اور یوں اپنے آپ کو ممتاز انسانوں کے زمرہ میں شامل کرنے کے لئے بدرجہ اولیٰ کوشش کر کے کامیابی اور بامرادی کا سارٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا۔

اگر ہمکو ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے کی خواہش ہے، اگر ہم میں سے بہت سے دنیا میں ممتاز انسان بننے کے خواہشمند ہیں اور یقیناً ہیں تو مثل رام چندر جی کے علم کو روشن دماغی کا ذریعہ عملی طور پر یقین کر کے فرمانبرداری، ایثار، خودداری، اور استقلال کا مجسّم نمونہ بننا چاہیئے۔

سری رامچندر جی کو جب بن باس کا حکم ہوا تھا حقیقتاً وہ اس قدر سخت تھا جس کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جانا نہایت مشکل تھا کیونکہ شادی خانہ آبادی کے بعد اس مصیبت کا آنا اور خصوصاً راج تلک کے موقعہ پر قدرتاً ایسا تھا جس سے مستقل مزاج اور کڑے دل والے کا گھبرا جانا بھی ممکن تھا۔ خوشی کے وقت اگر رنج وغم کی سیاہ اور گھنگھور گھٹائیں یک لخت آجائیں تو انسان یقیناً حواس باختہ ہو سکتا ہے مگر رامچندر جی نے خوشی کے وقت میں غم اور غم کی کالی گھٹاؤں سے ذرا بھی لغزش نہیں کھائی۔ بلکہ اس مصیبت کے پہاڑ کو نہایت استقلال اور خوشی سے اپنے دوشوں پر اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جس سے اس امر کا ثبوت ہم پہنچتا ہے کہ دراصل رامچندر جی بڑے صاحب حوصلہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک فقیر اور سادھو کے نزدیک جنگل میں منگل منانا آسان اور سہل ہے مگر ایک ناز و نعم میں پرورش پانے والے کے لئے اور وہ بھی ایک دو بلکہ کامل چودہ برس کے لئے بہت ہی دشوار اور مشکل ہے۔ لیکن مہاراج رام چندر جی کی زرّیں لائف یہ سمجھاتی ہے کہ وہ اس قسم کے بلند ہمّت تھے کہ اُنکے

نزدیک چودہ سال کی مدت بالکل معمولی مدت تھی۔

اگر رام چندر کی لائف کو دنیوی وجاہت کے لحاظ سے دوسرے شہزادوں کے ساتھ ملاکر دیکھیں تو صرف رام چندر جی کا وجود ان سب میں ممتاز ثابت ہوتا ہے کیونکہ اول الذکر میں سوائے اپنے نفسانی اغراض اور اپنی بھلائی کے وسائل زیر نظر رکھنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر برخلاف اس کے موخرالذکر نے انسانیت کا راز یہ سمجھا تھا کہ دوسرے کی بھلائی کی خاطر اپنی جان پر مصیبت آجائے ہاں عیش وعشرت پر لات مارنی پڑے تو کچھ فکر کی بات نہیں۔

کہنے کو تو رانی کیکئی سری رام چندر جی کی سوتیلی والدہ تھیں۔ اس لئے یہ ممکن تھا کہ رام چندر جی کے دل میں انکے ارشاد کی وقعت نہ ہوتی یا وہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں عیش وعشرت پر لات مارنے پر طیار نہ ہوتے خصوصاً اس حالت میں جبکہ تمام رعیت آپ کی طرفدار تھی۔ مگر سری رام چندر جی کے عملی ایثار نے ثابت کر دیا کہ کیکئی کی عزت اور عظمت اُن کے دلمیں مہارانی کوشلیا سے کم نہ تھی اور وہ اپنے سوتیلے بھائی بھرت کو بھی اُسیطرح ہی دل سے عزیز رکھتے تھے جیسے اپنی جان شیریں کو چنانچہ جب ماتا کیکئی کا یہ ارشاد سنا کہ وہ چودہ برس بنوں میں رہیں اور میرا لڑکا بھرت راج پاٹ سنبھالے، تو آپ نے نہایت خوشی سے اس ارشاد کو منظور کر کے اجودھیا نواسیوں کو آگاہی دیتے ہوئے صاف الفاظ میں اپنے دلی خیالات یا یقین کا یوں اعلان کر دیا کہ "میں اور بھرت دو نہیں ہیں۔ اپنی سعادت مندی اس امر میں یقین کرتا ہوں کہ ماتا کا حکم بجالاؤں اور بھرت راج کریں۔ اے لوگو! خوش ہو کہ تمکو ایک نیک، عادل، رعایا نواز، اور روشن خیال راجہ ملتا ہے۔"

اجودھیا نواسیوں کے دلوں میں چونکہ آپکی محبت نے گھر کیا تھا اس لئے اُن کو آپ کی جدائی شاق گزری اور انہوں نے ہر ایک طرح سے آپ کو سمجھانا اور روکنا چاہا لیکن آپ نے والدین کے ارشاد کی تعمیل کو اسقدر ضروری یقین کیا ہوا تھا کہ صاف الفاظ میں ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یوں سمجھایا کہ "والدین کے قدموں میں جنت ہے۔ وہ فرزند کیسا خوش نصیب ہے جس کو والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت کا موقعہ نصیب ہو اور وہ اس میں کامیاب ہو۔ وہ پسر نہایت ہی بدنصیب ہے جو اس نعمت سے محروم ہے۔ چودہ برس کا زمانہ کٹ جانا مشکل نہیں، خواب کی طرح سے گزر جائے گا۔ مگر عدول حکمی کا داغ ایسا خطرناک ہے جس کا دُھلنا امر محال ہے۔"

آخر رام چندر نے بڑی بہادری اور دلیری سے عیش و عشرت سے مفارقت کے پیالہ کو پیا اور جنگل کی راہ لی۔ پھر وہاں سے چودہ برس کامل نہ صرف اجودھیا میں بلکہ کسی دوسری بستی میں بھی داخل ہونے سے احتراز کر کے استقلال اور اعلیٰ درجہ کی فرمانبرداری کا وہ قابل قدر نمونہ دکھایا کہ آج دنیا میں ہر طرف سے "سری رام چندر جی کی جے" کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ فرمانبرداری اور اطاعت کا جُوا گردن پر رکھنے سے انسان کو ایک طاقت اور قوت عطا ہوتی ہے جس سے بڑھکر اس کا کوئی یار و غمگسار نہیں ہوتا۔

کہنے کو تو رام چندر جی کی مفارقت میں آپکی رعایا میں کوئی فرد و بشر نہ تھا جو آٹھ آٹھ آنسو نہ رویا ہو لیکن کیا سوائے لچھمن جی اور مہارانی سیتا کے حقیقی طور پر کسی نے آپ کا ساتھ دیا۔؟ ہرگز نہیں۔ اور کیونکر کوئی ساتھ دیتا جبکہ سری لچھمن اور جنابہ سیتا جیسے

دل وگردے والے مفقود تھے۔

پیارے ناظرین! ہمنے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اُس سے ہماری غرض یہ نہیں کہ آپ کے آگے ایک پُرانا قصہ پیش کرکے آپکے عزیز اور قیمتی وقت کا خون کریں بلکہ محض اس لئے کہ آپ کو اور خود ہمکو ذیل کے نتائج اخذ کرکے خاص سبق حاصل کرنے کا موقعہ نصیب ہو۔

(۱) ہماری زندگی کا مقصد اعلیٰ جہاں یہ ہے کہ ہم اپنے دل ودماغ کو علم کی روشنی سے منور کریں وہاں یہ بھی ہمارے فرائض میں سے ہے کہ علم کو خاص کام لینے کا ذریعہ بنادیں۔

(۲) جسطرح ہمارے دل میں اپنی بھلائی اور بہبودی کے لئے ان تھک کوشش کرنے کا جوش ہو اسیطرح دوسرے کی فلاح کے لئے بھی تن من دھن سے کوشش کرنا اپنے فرایض میں سے یقین کیا جائے۔

(۳) دوسرے کی فلاح وبہبودی کے لئے اگر اپنی عیش وعشرت کی سیجوں سے جدا ہونا پڑے تو ہم وحزن سینہ کاوی کا ذریعہ نہ بن سکیں بلکہ دوسرے کی بھلائی کے لئے ہر ایک قسم کی مصیبت کو عین راحت سرور اور سچا ذوق یقین کیا جائے۔

(۴) سوتیلے بھائی بہن ایسے ہی عزیز یقین کئے جائیں جیسے اپنے حقیقی یقین کئے جاتے ہیں اور سوتیلی والدہ کی عزت، عظمت اور وقر کا سکہ ایسا ہی دل میں بٹھانا ضروری ہے جسطرح اپنی حقیقی والدہ کا کیونکہ والد سے تعلق کی وجہ سے وہ بھی دراصل اس لائق ہے کہ اسکی اطاعت اور فرمانبرداری سے انکار نہ کیا جائے۔ فرمانبرداری واطاعت کا تلک نافرمانی کے زریں تاج سے بدرجہا بہتر ہے۔

یہ وہ چار سبق ہیں جو سری رام چندرجی کی زریں لائف سے ملتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ جو ان سے فوائد اخذ کرنے کے لئے تیار ہو

محمد حسین

جاڑا

من تصنیف جناب سیّد محمد مرتضیٰ صاحب بیاؔن ویزدانی مرحوم (میرٹھی)

دھوم مچاتی سردی آئی ۔ دانت بجاتی سردی آتی
دُھنیونکے بھاگوں جاڑا آیا ۔ تانت بجی اور راگ بھی پایا
ڈھک گیا مُنہ اور چھپ گئے ہاتھ ۔ جاءالبرد مع الجبّات
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا ۔ روئی کے پیچ نے سبکو پچھاڑا
کھیت کیار کے پڑ گئے لالے ۔ پالے کے سب پڑ گئے پالے
گھر گھر بانٹی دولت اس نے ۔ سب کو دیا ہے خلعت اس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری ۔ کسی کی کملی تول میں بھاری
جیت گیا گر پالا پالے ۔ کھیت رہے تمباکو والے
غل بل کرتے پھرتے ہیں کُل ۔ کابلیوں کا ٹوٹا ہے بلُ

میوہ تولنے والے آئے ۔ پشتو بولنے والے آئے
نکلے چیتے جھاڑی سے ۔ اُترے ریچھ پہاڑی سے
جوؤں میں کپڑے تو بھرے ہیں ۔ رُوڑ میں کیا انگور بھرے ہیں
سُکھ سے بیٹھی ہے اک اک جوں ۔ کابل جائے گی جوں کی توں
پیسہ دہ اینک میوہ بدوشم ۔ کابلیم انگور فروشم
ہو گیا سب کا کلیجا ٹھنڈا ۔ کھوپڑی ٹھنڈی بھیجا ٹھنڈا

× × × × × × ×   × × × × × × ×

دھنیوں کے بھی ہوش ہیں گدلے ۔ دھننے لگے سر روئی کے بدلے
کان یہ دھرتا تھا اب یہی دُھن ہے ۔ کان کے بدلے ہاتھ میں سُن ہے

روئی کے بادل آگئے سر پر ۔ باندھ کے دَل سب چھا گئے سر پر
رعد بنے لڑ لڑ کے دانت ۔ دل بادل میں کڑکے دانت
آگ سے سچ مچ لاگ ہے سبکو ۔ آس اولاد کی آگ ہے سب کو
گود میں لی چھاتی سے لگالی ۔ آجکل آگ ہے ننھی بالی
شب کو انگیٹھی سب کے قریں ہے ۔ کوئلوں پر اب مُہر نہیں ہے
اک اک عضو ہوا ہے ٹھنڈا ۔ چار مہینے نبد ہے دھندا

ٹھٹرے ہوئے ہیں لوگ جہاں کے
گرم فقط مضموں ہیں بیاں کے

خیر مقدم

داورِ گیہاں توئی خسروِ ذیشاں توئی ہم جہانِ مردمی ہم جانِ ہر انساں توئی
در جہاں از فیضِ عدلِ تو کسے محروم نیست دوستاں را جاں توئی بر دشمناں سوہاں توئی
فرد در انصاف و در کشور کشائی بے مثال ہم سلیمانی بعہدِ خویش ہم سلماں توئی
جارج پنجم نام تو فرمانروائی کام تو قیصرِ انگلینڈ و ہر انڈیا سلطاں توئی
ایکہ ہستی درۃ التاجِ سرِ برطانیہ زیں سبب چشم و چراغِ سطوتِ شاہاں توئی
ہند شد از مقدمت روشن. کنوں خواہم گفت ایں زمینِ ماست چرخ و نیرِ تاباں توئی
شد دوبالا رنگِ خوبانِ چمن از حسنِ تو غازۂ رخسارِ بہارِ گلشنِ امکاں توئی
جائے تو در دل چرا نبود کہ بہر دوستاں مدعا و آرزو و حسرت و ارماں توئی
سحر جودِ تو مسخر کرد ہفت اقلیم را اے شہِ ذی جاہِ ما اسکندرِ دوراں توئی
کردہ شمشیرت یلانِ جنگجو را سرنگوں پیشِ تو باید سلامی رستمِ میداں توئی
بر مریضاں چشمِ لطفت کارِ عیسیٰ میکند دردِ قلبِ خستگاں را دارو و درماں توئی
گر کسے را از بلائے آسماں نبود مفر از برائے راحتِ او سایۂ یزداں توئی

خستہ دل گردد چرا از انقلابِ روزگار
چوں مددگارِ حمیدِ بے سر و ساماں توئی

حمید میرٹھی

دِلّی دربار

فاتح اعظم سکندر رومی کے بعد سے یہ پہلا موقع ہے کہ ممالک یورپ کے جلیل القدر تاجدار نے سات سمندر پار سے آکر زمین ہند پر قدم رکھا ہے یعنی حضور پرنور ملک معظم حضرت جارج پنجم شاہنشاہ ہندوستان اور شاہنشاہ بیگم ملکہ میری ادام اللہ ملکہم و اجلالہم کے قدوم میمنت لزوم سے خاک ہندوستان کو شرف افتخار حاصل ہوا۔ اس مسرت خیز موقع پر وفاشعار رعایائے ہند کو جسقدر خوشی و مسرت ہو کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندوستان کا زمین و آسمان اسکی کثیر التعداد اقوام کی مدح سرائیوں اور مختلف زبانوں کی نغمہ سرائیوں سے گونج رہا ہے۔ چنانچہ مشہور بنگالی شاعر مسٹر جے۔ این مکرجی نے انگریزی نظم میں دہلی کو مخاطب کرکے جس عنوان سے اظہارِ مسرت کیا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہوگا۔ یہ نظم بطور خلاصہ ۳۱ اکتوبر کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے جسکا ترجمہ نذر ناظرین ہے:-

اے پرانی دلّی۔ اے آثار دیرینہ شکوہ اے جوانوں بادشاہوں غازیوں کی یادگار
تو کبھی گہوارہ تھا مذہب کا اور تہذیب کا اب شباب اور شان و شوکت کا ہے تو لوحِ مزار

پانڈوؤں نے تجھکو جب دیکھا نگاہِ شوق سے پڑگئی آنکھوں میں اُن کی بس چکاچوند اکبار
خوب گایا ہے مہا بھارت نے ہر یالہ ترا باندھکر صنعت کا سہرا تیرے اور قدرت کے ہار

تیرے چپہ چپہ پر انبار ہیں او رنگ و تاج حوصلوں کے ولولوں کے جوش کے جذبات کے
لوگ لیتے اور تجھے کھوتے رہے ہیں بارہا چال سے تدبیر سے تلوار سے اور توپ سے

تو عماراتِ نفیسہ کا ہے دار السلطنت سات تعمیرات میں دنیا کی ہے تیرا شمار
آج بھی وہ خوبیاں ہیں تجھ میں جنکو دیکھکر وجد کر اُٹھتے ہیں تیرے دوست دشمن اکبار

لے مبارک بعد مدت کھُل گئی ہے قسمت تری آرہا ہے یعنی شاہنشاہ ہندوستان کا
کالے کوسوں دور سے ساتوں سمندر پار سے چھوڑکر پیچھے جزیرہ اپنا انگلستان کا

ہاں مبارک عظمتِ دیرینہ کے سنگِ نشاں ڈالدے گا اپنے ہاتھوں سے ترا اب شہریار
ایک چادر تیری بوسیدہ شکستہ قبر پر یادگاروں میں تری اور ایک تازہ یادگار

ہو رہی ہے دیکھ وہ صبح تجلّی کی نمود اُٹھ رہا ہے پردہ بزمِ عظمت و اقبال کا
فرش سے تا عرش آرائش ہے آتا ہے نظر پھر زمانہ راجہ آشوک کے اجلال کا

ناوک جگر دوز

(مہاراجہ دسرتھہ کے ہاتھہ سے اتفاقاً سرون کا مارا جانا)

انڈین پریس الہ آباد

آج تک مطلع ترا ہر چند تھا تاریک و تار لیکن اب موجودہ شاہی کر رہی ہے ضو نثار
اور یہ امید ہے فیضِ قدومِ شاہ سے اور بھی ہو جائے گا وہ صاف تر شفاف تر

مجھ سے سن تو در حقیقت فخرِ ہندوستان ہے منتخب ہونے پہ تیرے ہے زمانہ بھر گواہ
اور رہیں گے تیرے مینار و مساجد مدتوں تیری عظمت اور تیری شان و شوکت پر گواہ

ملک تیرا آسماں کی طرح ناپیدا کنار خطۂ کشمیر سے وسعت میں بحرِ ہند تک
اور تیرا عرض بھی ہے طول سے کچھ کم نہیں برہما کے ملک سے گجرات اور سرہند تک

اس سے پہلے ہند کو تھی اس قدر وسعت کہاں یعنی اب جتنا ہمالہ کے ادھر ہے ہند ہے
قلۂ ایورسٹ کے مانند کوئی سلطنت گردشِ ایام سے محفوظ اگر ہے ہند ہے

امن و آسایش مسرت کا سبب ہے گو - مگر ہونا توپوں اور تفنگوں کی گرج میں فتح مند
واقعی ہے تیری قوت اور شوکت کی دلیل آتش افشاں کوہ کے دامن میں ہونا بگزند

سرزمینِ پانی پت کی آج خاکِ خون پر ہیں جلیل القدر مہماں کے نصب شاہی خیام
ہوں مبارک تجھکو دلّی تاجپوشی کے رسوم تیرے شاہنشاہوں کی فہرست میں اور ایک نام

یعنی جو ہرست میں رعایا کی نظر آئینگے اب شاہ و شاہنشاہ بیگم بالباسِ زرنگار
جلوۂ دربار و فرمانِ شہنشاہی سے ہوں آنکھیں روشن کان مشتاق اور دل شاد ایک بار

ہم بھی اس موقع پہ اک پر جوش طوفاں کی طرح لیں فلک سر پر اٹھا شورِ مبارکباد سے
اور لیکر ساتھ سچی مشرقی تمکین کو ہمنوا ہو جائیں ہم برطانیہ آزاد سے

نادر کاکوروی

قصیدہ

بتقریب تاجپوشی اعلیٰ حضرت ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم قیصر ہند دام ملکہٗ

اُبھار پر ہے عروسِ بہار کا جوبن ہے جاں فزا اپنے لغار گی فزائے چمن
ہوائے نافہ اڑاتا ہے لالۂ احمر بھری ہے موجِ صبا میں شمیمِ مشکِ ختن
ہر ایک شے میں عجب نازِ دلربائی ہے نگار خانۂ چیں ہے زمین کا دامن
وہ بو ہے جامۂ گل میں کہ جس سے اڑ جائے شمیم پیرہنِ گلرخانِ غنچہ دہن
زبانِ حال سے کرتی ہے عیش کا اظہار بذوقِ شکرِ خدا ہو کے تر زباں سوسن
خمار میں ہے بیاں کیا کرے سرور کا کیف نگاہِ شوخ وہ نرگس کی، وہ غضب چتون
وفورِ وجد سے کیا کیا ہیں جھومتے اشجار ہیں کس ادا سے نواسنج طائرانِ چمن
یہ سرخی ہونٹوں کی، یہ ابتسامِ غنچۂ گل نئی نویلی شبِ وصل جیسی ہو دُلھن
کئے ہیں نذرِ عروسِ بہار شبنم نے گہر وہ سامنے آب آب جن کے دُرِّ عدن
یقیں ہے ہو نہ گدا کو غمِ سیہ بختی سلاخ لوہے کی بنتی ہے فیضِ خور سے کرن
رچی ہے تازگی ایسی مذاقِ عالم میں صفائے صبح سے دورِ فلک ہے جوش لبن
خیال آئے گا ان کو نہ بزمِ جاناں کا جو دیکھ پائیں گے عشاق جلوۂ گلشن
فدا روش کی روش پر ہوں کیوں نہ اہلِ نظر عروسِ دہر نے بدلی ہے آج طرزِ چلن
جہاں ہے نشۂ غفلت میں، فکر ہے کافور شفق ہے یا کوئی دریائے خمر توبہ شکن
ہر اک بشر ہے متاعِ خوشی سے مالا مال زمانہ بن گیا عیش و نشاط کا مخزن
حضور بادشہِ جارج اور ملکۂ ہند ہوئے ہیں ہند میں بہرِ جلوس جلوہ فگن
خوش آمدید کا نغمہ لبِ نشاط پہ ہے بنے ہیں راحت و آرام تھے جو رنج و محن
خود آکے کی ہے شہنشہ نے عزت افزائی ہوئی ہے غیرتِ اکسیر آج خاکِ وطن
مبارک آج حصولِ مراد ہو سب کو ہوا نامِ ہند میں قیصر کا یا خدا احسن
نویدِ طالعِ بیدار - مژدہ اے دہلی! کہ آج تازہ ہوئی تیری عزّ و شانِ کہن
پھر آج تجھ میں ہوا، بعد سالہائے دراز قدومِ قیصرِ ہندو ورودِ شاہ و زمن
پھر آج تجھ میں ہے دربار تاجپوشی کا کہ قیصر آپ ہے محوِ مراسمِ احسن

جلوس سے ہے وہ نورِ طرب کی افزایش
لبوں پہ ہے دلِ ما شاد و چشمِ ما روشن

خوشی سے ہے آج، شہا! تیری تاجپوشی کی
کہ فرطِ عیش سے عشرتکدہ ہے بیتِ حزن

نیا ترانۂ جاں بخش، نالۂ جاں کاہ
ہوا فسانۂ دلچسپ قصۂ شیون

بڑھا یہ ذوقِ تماشا کہ آج دیدۂ کور
ہوئی تصوّرِ منظر سے یک بیک روشن

ترے ستارے کو اے ہند چار چاند لگے
اٹھائی شاہ نے تکلیفِ دوریٔ لندن

یقیں ہے سبز ہو اب نخلِ آرزو تیرا
کہ آج تجھ میں ہے دریائے فیضِ موج افگن

مٹا یہ نامِ جفا تیرے عہد میں شاہا!
کہ دشتِ شیر غزالوں کا بن گیا مامن

جلال و قہر کا گھومے گا فرق پر کوڑا
جلائے برق جو بھولے سے خوشۂ خرمن

ترا سحابِ کرم گر ہو مائلِ بارش
عجب نہیں ہے کہ ہو سبز پھر نہالِ کہن

تری عدالتِ عالی سے اے شہِ آفاق!
ملے زمانہ میں راشی کو یہ سزائے بدن

کہ تازیانہ لگائے نگاہِ خشم کا تار
جو کھولیں حرص کا منہ لُعبتانِ سیمیں تن

غنیم آئے تو سر پر چڑھے تری شمشیر
بڑھے یہ رفعتِ قبضہ سے عزّتِ آہن

فنا ہوئے ہیں جو ہیبت سے تیری شرّ و فساد
زبان پر نہیں آتا کسی کی ذکرِ فتن

ہوں سنگسار خیالِ جلال سے تیرے
کہیں صنم کو جو اب فتنہ خیز اہلِ سخن

ملے اگر ترا لطفِ حلاوتِ گفتار
تو محو ہو دلِ عاشق سے ذوقِ سیبِ ذقن

ملا یہ رتبہ ترے وصفِ اوجِ حشمت سے
کہ آج عرش پہ فکرِ رسا کا ہے مسکن

نہ ہوگا پھر روشِ روزگار کا شکوہ
اثر پذیر رہا یوں ترا جو نیک چلن

مبارک آج تجھے خسروا! یہ جشنِ نشاط
مبارک آج تجھے تاجپوشیٔ احسن

دعا ہے، اور درخشاں ہو نیّرِ اقبال
زیادہ وسعتِ عالم پہ ہو شعاع فگن

حیاتِ خضر ملے تجھکو با مسرّت و عیش
جبینِ عیش پہ غم سے کبھی پڑے نہ شکن

مدام تجھ پہ رہے ظلِّ رحمتِ عیسیٰ
یہ آج سحرؔ کی سن لے دعا خدائے زمن

اقبال ورما سحر

جلوسِ دربار

جلد لا بادۂ گلرنگ کدھر ہے ساقی
ہند کے پھر گئے دن تجھکو خبر ہے ساقی

کاگ ہیرے کا زمرّد کی ہو بوتل ساقی
جوش پر امڈے چلے آتے ہیں بادل ساقی

کشتیٔ زر میں تو لا شیشوں کو چُن کر ساقی
ساغرِ جم میں پلا بادۂ احمر ساقی

مئے گلرنگ سے یوں بھر دے مرا جامِ نشاط
سحرِ عید سے بڑھ جائے مری شامِ نشاط

ایک تو ہے کرم و جود کا دریا ساقی
ایک میں ہوں کہ ہے دادِ دستِ تمنّا ساقی

کیا نہیں تجھکو خبر دھوم سے آئی ہے بہار
ہند میں آتی ہے یورپ کی ہوائے گلزار

بوئے گل کو لئے پھرتی ہے نسیمِ سحری
اسطرح جیسے اُڑے تخت کوئی لیکے پری

زرق برق آج نظر آتے ہیں گلہائے چمن
نونہالانِ چمن پر ہے غضب کا جوبن

خانۂ عیش و مسرّت کے جو وا ہو گئے باب
پڑ گئے خیمے کھنچی تارِ نظر بن کے طناب

مرحبا طالعِ دہلی کا ستارا چمکا
حبّذا طالعِ دہلی کا ستارا چمکا

آج دہلی کا وہ سرسبز ہے شاداب چمن
ہر گلی کوچے نظر آتے ہیں رشکِ گلشن

بعد مدت کے ہے اب لال قلعہ بھی روشن
آج پھر دولتِ شاہی کا بنا ہے معدن

عرش سے فرش تلک نور سے معمور ہے آج
جسکو میں دیکھتا ہوں شاد ہے مسرور ہے آج

سب کو کرنے لگی ہُشیار بگل کی آواز
اور جھکنے لگے ہر سمت سرِ عجز و نیاز

توپیں دغنے کی بھی کانوں میں صدا آنے لگی
اور بندوقوں کی آواز بھی گرمانے لگی

دھوم ہے شاہِ معظّم کی ہے آمد آمد
نیّرِ کشورِ اعظم کی ہے آمد آمد

واہ کس شوکت و اعزاز سے ہے شانِ جلوس
کتنی دلکش ہے بہارِ گلِ بستانِ جلوس

جھومتے آتے ہیں ہاتھی روشِ ابرِ بہار
جس سے ہل جائے زمیں ایسے ہیں پائے رفتار

جھولیں زرّیں بھی دکھاتی ہیں نیا اک انداز
سارے سامان نرالے ہیں نرالے سب ساز

چاندنی چوک بھی ہے رشکِ فضائے گلزار
نظر آتی ہے نئی تازہ دُکانوں کی بہار

آئینہ بندی سے معمور ہے ہر چار طرف
پرتوِ حسن سے پُر نور ہے ہر چار طرف

روشنی وہ ہے کہ خورشید بھی شرمندہ ہے
زرفشاں خاک کا ہر ذرّہ تابندہ ہے

شوقِ دیدار میں ہر سو ہے رعایا کا ہجوم
ہر طرف پاتے ہیں ہم اہلِ تماشا کا ہجوم

اِسطرف شور ہے اظہارِ وفاداری کا   اُس طرف شاہ کو موقع ہے گہر باری کا
ہے سلامی کو کھڑی فوجِ مسلسل کی قطار   سمدواب تُرکِ فلک تا ہے رکھے ہتھیار
صف شکن اور بہادر وہ جری ہیں فوجیں   جیسے طوفان میں دریا کی ہوں اٹھی موجیں
اور دربار کی شوکت کا بیاں کیا ہو کمال   ساز و ساماں ہیں بہم سطوتِ شاہی کیحال
جلوہ افروز ہے دربار میں وہ شاہنشاہ   جسکی عظمت کے ہیں سب شرق سے تا غرب گواہ
ہیں سلاطین میں بھی اسکا وہ پلّہ بھاری   برِّ اعظم میں حکومت کا ہے سکّہ جاری
اے مرے شاہ ترا جاہ و حشم کیا کہنا   ہیں قلمرو میں ترے سیف و قلم کیا کہنا
دل سے بیساختہ نکلیں گی دعائیں تیری   ہم رعایا ہیں نہ کیوں خیر منائیں تیری
عدل کیساتھ خدا تجھکو سلامت رکھے   سلطنت کو تری با حشمت و شوکت رکھے
ملک سرسبز رہے جود و کرم سے تیرے   تخت و تاج و علم و جاہ و حشم سے تیرے
یوں بڑاجے ترا گلزارِ جہاں میں اقبال   شاد و آباد رہیں دوست تو دشمن پامال

ہے دعا اوج کی - رفعت یہ ترا اوج رہے
تو رہے - ملک رہے - امن رہے - فوج رہے

اوج گیاوی

آمدِ تاجور مبارک ہو!

تاجِ زر تاجور مبارک ہو   ہو گیا زیبِ سر مبارک ہو
تاجِ لعل و گہر مبارک ہو   صدقے ہے سیم و زر مبارک ہو
خسروی تاجِ زر مبارک ہو   قیصری کرّ و فر مبارک ہو
شاہِ قیصر کا نیّرِ اقبال   ہو گیا جلوہ گر مبارک ہو
جارج پنجم کو سلطنت کرنا   ہفت اقلیم پر مبارک ہو
ہفت اقلیم کی ملی شاہی   اے شہِ بحر و بر مبارک ہو
آمدِ شہ کی تجھکو خوش خبری   اے دلِ بے خبر مبارک ہو
شہ کے ہمراہ ہونگی ملکہ بھی   یہ خبر معتبر مبارک ہو
تجھکو دیدار شاہ و ملکہ کا   دیدۂ منتظر مبارک ہو
ہمکو نظارۂ جلوسِ رواں   اور ونکو سیم و زر مبارک ہو
شاہ و ملکہ کا دیکھکر اقبال   کہیں شمس و قمر مبارک ہو
ہند کا پھر نصیب چمکا ہے   مہر کی ہے نظر مبارک ہو
شہرِ دہلی میں شہجہاں آئے   یا خدا یہ سفر مبارک ہو
رونق افروز قلعہ میں ہوکر   بیٹھنا تخت پر مبارک ہو
جشنِ دربارِ تاجپوشی ہے   یہ خوشی سربسر مبارک ہو
یہ خوشی یہ سرور و عیشِ مدام   ہر گھڑی ہر پہر مبارک ہو
رات ہے شب برات دن ہے عید   عیشِ شام و سحر مبارک ہو
شہ کے سایہ سے ہُن برستی ہے   ابرِ رحمت اثر مبارک ہو
تاجِ شہ میں جگہ ملی تجھکو   آبرو اے گہر مبارک ہو
چترِ شاہی ہے جلوۂ خورشید   برسرِ تاجور مبارک ہو
تاجِ شہ پر شعاعیں قرباں ہیں   قدرتی یہ چنور مبارک ہو

زمزمہ ہے خلیق کا سب سے
آمدِ تاجور مبارک ہو

خلیق دہلوی

نغمۂ تہنیت

آج دہلی نے نکالا ہے انوکھا جوبن   صورتِ باغ، گلِ عیش سے پُر ہے دامن
روشوں پر ہیں حسینانِ جہاں جلوہ فگن   پرتوِ عارضِ گلگوں سے زمیں رشکِ چمن
شورِ مستانہ عنادل کی صدا سے پیدا   کوک میں قمریوں کی رنگِ صدائے ارگن
جسطرف دیکھئے بوچھار گلِ عشرت کی   دامنِ گلشنِ جنّت ہے صبا کا دامن
ہلکی ہلکی سی رخِ صاف پہ دوڑی سرخی   بن گیا رنگِ طرب غازۂ رخسارِ سمن
بہرِ دل ہوگئی غنچوں کی چٹک وجہ سرور   کاگ اڑنے لگے، ڈھلنے لگی صہبائے کہن

ٹٹیاں مہندی کی ہر سمت بہار افزا ہیں   ڈوبا ہے عطرِ حنا میں گلِ تر کا دامن

جلوۂ حُسنِ پری گیسوِ سنبل کی بہار   دلربا نرگسِ مخمور کی تیکھی چتون

قابلِ دید ہے شاخِ گلُ تر کا عالم   سر جھکائے ہوئے اسطرح کہ جسطرح دُلھن

حسن افزائے عروسانِ چمن بادۂ عیش   خندہ زن جلوۂ خورشید پہ پھولونکی پھبن

جلوۂ لالۂ حمرا بکنارِ گلِ تر   تہِ فانوس چراغِ مہِ تاباں روشن

رنگِ مستانہ روش بادِ صبا سے پیدا   حُسنِ رفتار ہے رفتار میں بیساختہ پن

دی ہی گلشن میں حسینوں کو نویدِ عشرت   زر سے دن رات بھر جاتے ہیں غنچو نکے دہن

جھومتی ہے نگہ مست مثالِ طاؤس   ہر طرف ہے یہ عصافیرِ چمن کا شیون

للّٰہ الحمد کہ اب قسمتِ دہلی چمکی   رونقِ تخت ہوا جلوۂ شاہِ لندن

ہند کے سارے رُوسا ہیں جلو میں حاضر   کرتی ہیں جارجِ پنجم کا نگاہیں درشن

سب ہیں گرویدہ زہے خلقِ شہِ نیک صفات   دامنِ ہند ہے وابستۂ ملکِ لندن

عادل و باذل و فیاض و سخی حاتم دل   حامیٔ خستہ دلاں دافعِ اشرار و فتن

شاہ وہ شاہ کہ دم جسکا ہر اک بھرتا ہی   بارِ احساں سے جھکی جاتی ہی سبکی گردن

تا کجا مدحتِ قیصر یہ زباں روک شباب   اِن بڑی باتوں کے قابل نہیں چھوٹا سا دہن

کر دعا حق سے کہ ممدوح کی ہو عمر دراز

تختِ عظمت پہ ہمیشہ رہیں شاہِ لندن

محمد سیف الدین شباب

قطعۂ تاریخ تہنیت

۴۰۔ مبارک تجھکو اے دہلی یہ وہ روزِ ہمایوں ہے

کہ ہے تختِ شہی پر جلوہ فرما ظلِّ سبحانی ۲۰

۱۰۰۔ قبائے خسروانی زیبِ تن ہے جارج پنجم کے

خدا رکھے عیاں صورت سے ہی شانِ جہانبانی ۶۰۰

۲۰۔ کہاں تک شہرۂ حسنِ شہِ جمجاہ پہونچا ہے

چلی آتی ہیں پریاں قاف سے ہو ہو کے دیوانی ۳۰

۵۔ ہمیں پر منحصر کیا دیکھ لیں اہلِ نظر آ کر

شہِ والا میں آتی ہے نظر کیا شانِ یزدانی ۴۰

۷۰۔ عروسِ سلطنت کا ہے رے نکھرا ہوا جوبن

دمِ نظارہ آنکھیں ہو رہی ہیں محوِ حیرانی ۴

۸۰۔ فدا ہونے کو آئی شوکتِ جم واہ رے شوکت

دُعا دی خضر نے بڑھکر کہ عمرِ شہ ہو طولانی ۴

۱۰۰۔ قدم لینے چلا ہے اللہ اللہ آسماں جھک کر

سرِ اقدس پہ کرتا ہے ہُما آ کر مگس رانی ۴

۲۰۔ کوئی دل تنگ نہیں باقی ہی زلفِ مہ جبیناں میں

رہا کتنے ہوئے ہیں آج حکمِ شہ سے زندانی ۲۰۰

۴۰۔ مبارک باد دینے والیانِ ملک آئے ہیں

جما ہے تخت گاہِ ہند میں دربارِ سلطانی ۳

۶۰۰۔ خوشی یہ ملک میں پھیلی ہے جشنِ تاجپوشی کی

کہ جس شاعر کو دیکھو کر رہا ہے گوہر افشانی ۳

۴۔ دعا کے واسطے تم بھی اُٹھا دو ہاتھ اے صفدر

یہ موقع ہے دکھا دو آج تم حُسنِ سخندانی ۲۰

۲۰۰۔ رہے یہ جارج پنجم حکمراں لاکھوں برس ہم پر

ہمیشہ حامی و ناصر رہے تائیدِ ربانی ۵

۳۰۔ لکھو تاریخ وہ دلکش کہ سب سُنکر پھڑک جائیں

مبارک باد خود دینے کو آئے روحِ قاآنی ۴

۲۰۔ کہاں ہیں حضرتِ یعقوب دیکھیں ہائے یہ جلوہ ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء

سرِ دربار ہے کس شان سے وہ یوسفِ ثانی ۶۰ ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء

صفدر مرزاپوری

عہد قیصری

ظلوم انساں جہول انساں اٹھائے بار امانت کا
تقاضا تیری قدرت کا تھا منشا تیری حکمت کا

مقدر میں لکھا الزام تھا کفرانِ نعمت کا
کریں سجدہ ملک یہ مُنہ نہ تھا اس ننگِ خلقت کا

تجھی کو ڈھونڈھنا الحق کہ جادہ ہی طریقت کا
تجھے پہچاننا بے شبہ زینہ ہے حقیقت کا

جسے تو چاہے عزت دے جسے تو چاہے ذلت دے
کسیکی فہم میں کب آ زیہ آتا ہی قدرت کا

بفحوائے اطیعوا اللہ ہی انسان پر واجب
ادا کرنا ہے جیسا ہو حق جسکی اطاعت کا

سبب امن و اماں کا عہدِ شاہِ عدل گستر ہی
زمانہ جارج پنجم کا ہی آرام اور راحت کا

سبب آرام و راحت کا عدالت ہی کہ سلطاں کو
اسی کی ہی ضرورت ہی یہی شیوہ حکومت کا

رعایا پر رعایت کی نظر ہے شاہ پر واجب
اطاعت شاہ کی کرنا فریضہ ہی رعیت کا

عدالت سے خدا راضی ہی مخلوقِ خدا خوش ہی
عبادت سے بھی بڑھکر ہی کہیں رتبہ عدالت کا

عدالت ہی ہی تالیفِ قلوبِ خلق کا باعث
عدالت ہی سبب ہے حق تعالےٰ کی عنایت کا

عدالت ہی سے زندہ نام ہی کسریٰ کا دنیا میں
عدالت ہی ہی عالم میں سبب کسریٰ کی شہرت کا

عدالت نیکنامی کا ہی جوہر ذات انساں میں
بُرائی کو چھپا نا کام ادنیٰ ہے عدالت کا

خدا کی دین ہی جس کو خدا دیتا ہی یہ نعمت
اُسی کو لطف حاصل ہوتا ہی ملک و حکومت کا

حکومت کے مزے دنیا میں حاصل اسکو ہوتے ہیں
کرم کے ساتھ جس حاکم میں شیوہ ہو عدالت کا

وہ ہی محظوظ اس نعمت سے دل میں رحم ہو جس کے
جو ظالم ہو وہ کیا جانے کہ ہی کیا حظ عدالت کا

نتیجہ ظلم کا ہی باعث بربادیٔ ظالم تو
بڑھے جس سے جلال و جاہ ثمرہ ہی عدالت کا

سمجھنا حق کو حق ناحق کو ناحق سخت مشکل ہی
اہم ہی کام سب کاموں میں انصاف و عدالت کا

تنفر اس سے سب کرتے ہیں جسمیں ظلم کی خو ہو
اُسے سب چاہتے ہیں خُلق ہو جسمیں عدالت کا

کہاں ہوتی ہی جور و ظلم سے ظالم کو دلجمعی تو
ہے اطمینانِ خاطر کا سبب شیوہ عدالت کا

زمانہ جارج پنجم کا کیا اچھا زمانہ ہے
کہ باعث امنِ عالم کا ہی دور اسکی حکومت کا

ہٹا سکتا نہیں کوئی قدم اسکی اطاعت سے
یہ رعب و داب چھایا ہی جہاں پر اسکی سطوت کا

مرقع ہمنے شاہانِ سلف کے غور سے دیکھے
نظر آتا نہیں قیصر کوئی اس شان و شوکت کا

رکھا ہی سر پہ اسنے ہند میں تاجِ جہانداری
مناتے ہیں خوشی سب کبھی یہ باعث مسرت کا

رعایا شاد ملک آباد خوش ہیں ذہیںؔ ہم بھی
خدایا! دیرپا ہو یہ زمانہ عیش و عشرت کا

سیّد غلام مصطفےٰ ذہینؔ

زمزمہ

جارج پنجم ہوگئے ہیں تاجدار ایکبرس
کیوں نہوں نازاں یہ تاجِ زرنگار ایکبرس

جشنِ شاہی کے لئے معمورہ ممتاز ہے
پھر ہوا محسوبہ اجڑا دیار ایکبرس

اوج پر ہے بخت تیرا اے گلزمین خوش فضا
حاسدانِ روسیہ ہیں شرمسار ایکبرس

زہے خوشا اے بختِ فرخ، اے خوشا سالِ نکو
جلوہ فرماں ہیں شہ گردوں مدار ایکبرس

دل سے اس دربارِ شاہی کا ہر اک مشتاق تھا
ہر بشر ہے جاں نثارِ شہریار ایکبرس

بلبلِ خوش نغمہ ہو فرطِ طرب سے باغ باغ
جوش پر ہے رحمتِ پروردگار ایکبرس

اضطرابِ شوق رنگِ کامرانی بن گیا
ہوگیا شاداں دلِ امیدوار ایکبرس

سرو و شمشادِ چمن سروِ چراغاں بن گئے
آتشِ گل تیز تر ہے اے چنار ایکبرس

صحبتِ پیرِ مغاں میں ہوگئے ہیں شوق مست
جھومتے پھرتے ہیں رندِ بادہ خوار ایکبرس

تختہ بندِ حسرتِ دیدارِ گل آسودہ ہیں
ہوگئی سرسبز یہ لوحِ مزار ایکبرس

جشنِ فرخ سے ہوا ہی شہرِ دہلی گلستاں
جھوم کر گلشن میں ابرِ نوبہار ایکبرس

ہے تماشائے تجلّیٔ صورتِ رنگِ جلال
جلوہ شیدا ہوگئے منصور وار ایکبرس

ساغر و مینا کا افسانہ ہوا وردِ زباں
ہوگئے مشتاقِ مے پرہیزگار ایکبرس

ساقیِؔ سرشار سرورِ مسرت کیوں نہوں
شامِ حرماں بن گئی صبحِ بہار ایکبرس

ساقیؔ دہلوی

تختِ طاؤس

شہنشاہی کا ساماں تختِ طاؤس   جہانداروں کا ارماں تختِ طاؤس

وہ ہوتا جارج پنجم کا قدمبوس   ہے اب ایراں میں ویراں تختِ طاؤس

جو دے بلقیسِ قسمت اسکو شہپر   ہو پابوسِ سلیماں تختِ طاؤس

کہاں جمعیتِ خاطر بجز ہند   بہت ہو گا پریشاں تختِ طاؤس

ق

یہ مانا شیوۂ صنعتگری سے   دُر و گوہر کی ہے کاں تختِ طاؤس

نہیں لیکن جو زیرِ پائے قیصر   خذف سے بھی ہے ارزاں تختِ طاؤس

ہوا کیسی چلی جو مثلِ عنقا   ہوا دہلی سے پرّاں تختِ طاؤس

کِھلائے ہجرِ پائے جارج نے گُل   ہوا داغوں سے بستاں تختِ طاؤس

جو تاجِ جارج پنجم کا ہو سایہ   بنے تختِ سلیماں تختِ طاؤس

وہ اب ہندوستاں میں اڑکے آتا   کہ ہو قیصر پہ قرباں تختِ طاؤس

ق

مگر قدرت نے پائی زشت پائی   اسی سے ہے پشیماں تختِ طاؤس

خبر یہ کس کو تھی، ہندوستاں سے   اڑا لے جائیں پریاں تختِ طاؤس

ق

اگر بستم صدی کے معجزے پر   ترا کچھ بھی ہو ایماں تختِ طاؤس

بدستِ حامیِ دینِ مسیحا   تو ہو بے جال سے باجاں تختِ طاؤس

نچھے گر پائے قیصر میں وہ شاکر!

تو قسمت پر ہو نازاں تختِ طاؤس

"سالِ تخت نشینی" سنہ ۱۹۱۱ء

انقلابیست عظیم اینکہ بہنگامِ سخن   خلق را بکم نگاریم و دگر صُم گویم

"دم عجب" گو چو نیا بد دلِ مردہ جانے   از لبِ عیسیٔ دورانِ سخن ہم گویم

دوش در باغِ معانی شدم و شاہدِ نطق   گفت یک مژدہ بہ الحان و ترنم گویم

زیب از تارکِ شہ یافتہ اکلیل و کنوں   قدرتے نے کہ مدیحش بہ تکلم گویم

گرم ہنگامۂ جشن است بہ انگلینڈ و ہند   بر درِ جشن گہے نغمۂ طبتّم گویم

شاہ را مدح کنیم و نہ بہنجارِ کہن   صدرِ بزمِ خور و مہ خسروِ انجم گویم

زیرِ رانش بکشم ابلقِ ایام اکنوں   زیرِ پایش فلکِ ہفتم و ہشتم گویم

مصطبہ گیتی و ساقی چو نمایم دوراں   ماہ و خورشید قدح چرخ بریں خم گویم

وقتِ آں نیست کہ زمنیاں نبویسم مدحے   ہاں پے جود و سخا غیرتِ قلزم گویم

منبعِ حلم و حیا معدنِ صد حکمت و علم   خُلق را مایۂ نازست تبسم گویم

با چنیں جملہ فضائل کہ بقیصر بینم   عین در چشمِ جہاں صورتِ مردم گویم

لاابالی بسنِ تہنیتِ سُور و سرور   "تاجپوشیٔ شہِ جارج پنجم" گویم

۱۳   ۵۵   ۲۹

دیگر

جارج پنجم تخت آراگشتہ است   سالِ جشنِ او ز قلبِ شاد جو

لاابالی دائما با تیغ و تاج   "جارج پنجم تخت آرا باد" گو

۱۱   ۶   ۱۹

فضل ستار لاابالی

قطعاتِ تاریخ

تختِ دہلی کی ہوئی آج نرالی تزئیں   تاج پہنے ہوئے شہ جبہ ہیں با صد تمکیں

گر عطا ہوں مجھے پر میں بھی اُڑوں دہلی کو   تا کہ دیکھوں میں ان آنکھوں سے تماشے رنگیں

جشن اسطرح کا اوروں کو نہ ہرگز ہو نصیب   اس دعا پر مری سب کہتے ہیں آمیں آمیں

عرض کر خدمتِ شاہی میں یہ تاریخ زعیم

ہو مبارک شہِ والا کو یہ تاجِ زرّیں

۲۹   ۱۳   ۵۵

نیک ہو یہ جشن شاہنشاہ کو   یعنی پنجم جارج عالی جاہ کو

لکھ ادب کے ساتھ تاریخ اے زعیم   ہو ہمایوں تختِ دہلی شاہ کو

۷ + ۱۹۰۴ = ۱۹۱۱ء

قاضی محمد کریم الدین زعیم

ایڈیٹوریل

خدا کے فضل و کرم سے ادیب کا دوسرا سال اختتام کو پہنچا۔ اس عرصہ میں ادیب نے زبان اُردو کے متعلق جو کچھ اچھی یا بُری خدمت کی ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ ہونے کو تو سب کچھ ہوا، مگر جو خدمت ہم ادیب کے ذریعہ کیا چاہتے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا عشر عشیر بھی ہم نے سرانجام نہیں دیا۔ تاہم جو کچھ ہم سے ہو سکا، اپنی بساط بھر ہم نے اسمیں کوتاہی نہیں کی۔

جون ۱۹۱۱ء میں جب نیاز مند نے ادیب کی ایڈیٹری کا چارج لیا تو ہر وقت یہی ڈر رہتا تھا کہ شاید مجھ ایسے کج مج زباں سے ایسی اہم خدمات انجام نہ پا سکیں گی۔ مگر اس بھروسے پر کہ "ہمت کا حامی خدا ہے" "حتی المقدور" نہ صرف ادیب کی شان کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی بلکہ بہت سی باتوں میں اسکو ترقی بھی دی، جسکا اندازہ صرف صرّافانِ سخن کی عالی نظری پر منحصر ہے۔ یہ امر نہایت ہی طمانیت بخش ہے کہ ہماری ناچیز خدمات کا اعتراف ہماری امیدوں سے بڑھکر ہوا۔

اس موقع پر ہم اپنے اُن تمام قلمی معاونین کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے چشمۂ فیض سے ادیب کے صفحات کی آبیاری فرمانے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہمارے لئے یہ نہایت فخر کا موقع ہے کہ اہلِ قلم میں بہترین مضامین کی اشاعت کے لئے ادیب ہی کے صفحات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ عام شائقین کی عنایات بھی خاص شکرگزاری کی مستحق ہیں جنکی اعانت و امداد کے بھروسے پر ادیب ایسے کثیر المصارف پرچے کی اشاعت جاری رہی۔ خوش قسمتی سے ہمیں بعض ایسے حضرات بھی ملے ہیں جو ادیب کی توسیع اشاعت میں سرگرم رہتے ہیں۔ اگر سال آئندہ میں بھی انکی امداد کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا تو مطبع مزید نقصان سے محفوظ رہے گا۔

ہمیں امید ہے کہ جو اصحاب ادیب کو ملک کے لئے مفید اور ضروری خیال کرتے ہیں، وہ نہ صرف خود ہی امداد کریں گے بلکہ اپنے احباب کو بھی اسکی خریداری کی ترغیب دیں گے۔ اس طور سے وہ نہ صرف ادیب کی مالی حالت کو بہتر کریں گے بلکہ اس فائدہ کو بھی جو وہ ملک کو پہنچانا چاہتا ہے، وسعت دینے کا ذریعہ ہوں گے۔ یہ میوچوال ہیلپ (امداد باہمی) ہے۔ جب تک دو طاقتیں باہم نہ ہوں، کوئی کام درستی کے ساتھ انجام نہیں پا سکتا۔

آئندہ سال میں ادیب کے مضامین کو زیادہ دلچسپ بنانے کا خاص التزام کیا گیا ہے، جسکی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ہر ایک نمبر گذشتہ نمبر سے بڑھ چڑھکر ہوگا۔ علمی، اخلاقی، تاریخی، اور سائنٹفک مضامین کے علاوہ (جنکا ایک کافی ذخیرہ بہم پہنچا لیا گیا ہے) ہم نے ایک اور سلسلہ مضامین ادیب میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور یقین ہے کہ ناظرین اسکو بیحد پسند فرمائیں گے۔ ہماری مراد اساتذۂ اُردو کے تذکرات سے ہے۔ اس سلسلہ کو مقبول عام بنانے کے لئے نہایت محنت، کوشش، اور صرف کثیر کے بعد اساتذۂ اُردو کی قلمی و عکسی تصویریں بہم پہنچائی گئی ہیں، اور ان کے متعلق قابل حضرات سے مضامین بھی لکھوائے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں مستقل طور پر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی، نظیرؔ اکبرآبادی، میر ببر علی انیسؔ لکھنوی، میر خورشید علی نفیسؔ لکھنوی، میر مہر علی اُنسؔ لکھنوی، سیّد محمد مرتضیٰ بیاںؔ ویزدانی میرٹھی، نواب سید محمد ذکریا خاں ذکیؔ دہلوی، سید انشاء اللہ خاں انشاؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، میر بادشاہ علی بقاؔ، مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ، سیّد محمد ہادی وحیدؔ لکھنوی، میر محمد سلیسؔ لکھنوی، میر نواب مونسؔ لکھنوی، میر تعشقؔ لکھنوی، منشی امیر احمد امیرؔ مینائی، مرزا داغؔ دہلوی وغیرہ حضرات کے با تصویر حالات ادیب میں درج ہوں گے۔ یقیناً اردو رسائل میں یہ ایک نئی چیز ہوگی۔

ہم اپنے بعض دیگر معاصرین کی طرح بھاری بھاری وعدے اور بڑے بڑے انعام دیکر ان کو ادیب کی خریداری کی ترغیب نہیں دیتے مگر ہم انھیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم بجائے اس قسم کے انعاموں کے خود ادیب کو ایک ایسا عمدہ انعام ثابت کریں کہ لوگ ایسے انعامات کی طمع سے نہیں بلکہ خود اسکی خاطر اسکی قدردانی کرنے پر مجبور ہوں۔

آخر وہ مبارک وقت آپہنچا جس کے لئے ایک سال سے اہل ملک چشم براہ تھے۔ حضور ملک معظم کا مع جنابہ ملکہ معظمہ اپنی مملکت ہند میں تشریف لانا اور دہلی میں دربار تاجپوشی خود بہ نفس نفیس منعقد فرمانا برٹش گورنمنٹ کی تاریخ میں پہلا موقع ہے۔ اس اعزاز کے لئے ملک اور اہل ملک ہمیشہ ہز مجیسٹی کے زیربار احسان رہیں گے۔ کیونکہ اس اعزاز سے انگلستان اور ہندوستان کا رابطۂ اتحاد مضبوط ہوگا اور ہندوستان واقعی تاج برطانیہ کا سب سے زیادہ روشن جواہر سمجھا جائے گا۔ خدا کرے کہ یہ شاہی دورہ گورنمنٹ اور ملک دونوں کے لئے موجب خیر و برکت ہو۔ آمین!

ادیب کا آیندہ پرچہ ہز امپیریل میجسٹیز کے دربار شہنشاہی کی یادگار میں خاص اہتمام اور غیر معمولی حجم کے ساتھ شائع ہوگا۔ اس نمبر کے لئے جو مضامین حاصل کئے گئے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی اُردو پرچے نے آج تک ایسا اعلیٰ علمی خوان اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش نہ کیا ہوگا۔ تصاویر بھی خاص کوشش سے بہم پہنچائی گئی ہیں، جنکی تعداد کسی طرح تین سے کم نہو گی۔ دربار کے مفصّل حالات بھی اسی پرچے میں نذر ناظرین ہونگے۔ شائقین شوق سے اس کا انتظار کریں۔

چندہ یادگار غالب کی رفتار بہت سست ہے۔ افسوس ہے کہ معاونین **ادیب** نے ہنوز اسطرف کامل توجہ نہیں فرمائی۔ سخت ضرورت ہے کہ اس اعلیٰ تحریک میں نہ صرف خود عملی حصہ لیا جائے بلکہ اپنے احباب کو بھی اسطرف متوجہ کیا جائے۔ مندرجہ ذیل رقم اس سلسلہ میں اور وصول ہوئی ہے جسکا شکریہ ادا کیا جاتا ہے:

(بتوسط پنڈت سکھدیو پرشاد صاحب بہر ڈپٹی انسپکٹر مدارس)

بابو مہاراج کشن صاحب تحصیلدار ڈیگ ۲؎، شیخ مراد حسین صاحب سوداگر ۱؎، سید واجد علی صاحب و دیگر ساکنان ڈیگ ۲؎۔ بابو رام رتن صاحب و دیگر رئیس ڈیگ ۲؎، طلبا انگریزی اسکول ڈیگ ۵؎، پنڈت سکھدیو پرشاد صاحب بہر ۲؎۔ میزان ۱۴؎ متفرقہ۔ سابق ۵؎ — جملہ میزان ۱۹؎

تصریح تصاویر

اس ماہ کی رنگین تصویریں، جو بابو جامنی پرکاش گنگولی کی صناعی کا نمونہ ہیں، مہاراجہ یدھشٹر کی زندگی کا آخری سین نہایت دلکش پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔ آیندہ نمبر میں مہاراجہ یدھشٹر کے متعلق ایک مفصل مضمون درج **ادیب** ہوگا۔

دمینتی سویمبر۔ دمینتی نل پر فدا تھی اور نل دمینتی پر۔ ادھر اندر، برن، یم، اور اگن دچاروں دیوتا) بھی دمینتی سے بیاہ کرنا چاہتے تھے۔ ان دیوتاؤں کو چونکہ معلوم تھا کہ دمینتی نل کے سوا کسی دوسرے سے بیاہ نکریگی لہذا یہ چاروں نل کی شکل بنا کر نل کے پاس جا بیٹھے سرسوتی، جو دمینتی کی سہیلی تھی، اسکو نل کے پاس لے گئی۔ وہاں ایککے بجائے پانچ نل نظر آئے تو دمینتی سخت پریشان ہوئی کہ اب میں کس کے گلے میں جے مالا ڈالوں۔ اسوقت کی کیفیت اس تصویر میں دکھائی گئی ہے۔

لیلیٰ مجنوں کا فسانہ ملک میں اسقدر مشہور ہے کہ توضیح کی چنداں ضرورت نہیں۔ **ادیب** میں جو تصویر شائع کی جاتی ہے وہ ایک پرانی اور رنگین قلمی تصویر سے نقل کیگئی ہے مصوّر کا نام معلوم نہیں۔ لڑکوں کا قیس پر ایذٹ پتھر برسانا اور اُس بندۂ عشق کا اسطرف سے بالکل بے پروا رہنا نہایت دلکش سین ہے۔ اس تصویر کے لئے ہم مرزا اعجاز حسین صاحب قزلباش کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ناوک جگر دوز کے واقعات کا تعلّق رامائن کے اجودھیا کانڈ سے ہے۔ مہاراجہ دشرتھ نے اپنے مرتے وقت رانی کوشلیا سے بیان کیا تھا کہ کیونکر نادانستگی میں اس کے تیر کی زد سے ایک لڑکا مرا، اور اسکے مرنے سے اُسکے نابینا اور ضعیف الدین بھی مر گئے۔ شرون کا باپ تپسوی تھا۔ اپنے بیٹے کی چتا پر جلتے وقت اُس نے مہاراجہ دشرتھ کو بد دعا دی تھی کہ جسطرح میں آج اپنے بیٹے کے غم سے دکھی ہوں، اسیطرح تو بھی اپنے بیٹے کے غم میں مریگا۔

مری رامچندر جی کی تصویر بھی ایک قدیم تصویر کی نقل ہے۔ اس تصویر کو بھارتیندو بابو ہرش چندر جی مرحوم نے موقع بھٹ پلی ضلع چوبیس پرگنہ کے ایک مندر سے حاصل کر کے مرحوم مہاراجہ صاحب بنارس کے حضور میں نذر کیا تھا اس کے واقعات کا تعلق بالمیکی رامائن کے اجودھیا کانڈ سے ہے۔ پنڈت رام کمار سنگھ صاحب کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انکی عنایت سے ایسی نادر تصویر ادیب میں شائع ہوتی ہے۔

हिन्दी-मेघदूत

कविकुल-कुमुद-कलाधर कालिदास कृत मेघदूत का समवृत्त और समश्लोकी हिन्दी [illegible] श्लोक सहित—मूल्य नाम मात्र के लिए ।=)

हिन्दी-साहित्य में यह ग्रन्थ अपने ढंग का अकेला है। कविता-प्रेमियों—विशेष करके [illegible] की हिन्दी-कविता के रसिकों—को यह हिन्दी-मेघदूत अवश्य देखना चाहिए। बड़ी मनोहारिणी [illegible] पुस्तक के आरम्भ में अनुवादक पण्डित लक्ष्मीधर वाजपेयी का हाफ़टोन चित्र दिया गया है। [illegible] अति-रिक्त विरही यक्ष और विरहिणी यक्षपत्नी के दो सुन्दर रंगीन चित्र भी यथास्थान दिये गये हैं। पुस्तक की शोभा देखते ही बनती है। "अवसि देखिए देखन योगू"

प्रकृति

यह पुस्तक पण्डित रामेन्द्रसुन्दर त्रिवेदी, एम० ए० की बँगला 'प्रकृति' का हिन्दी-अनुवाद है। बँगला में इस पुस्तक की बहुत प्रतिष्ठा है। विषय वैज्ञानिक है। हिन्दी में यह पुस्तक अपने ढंग की एकही है। इस पुस्तक को पढ़ कर हिन्दी जानने वालों को अनेक विज्ञान-सम्बन्धी बातों से परिचय हो जायगा। इसमें सौर जगत् की उत्पत्ति, आकाश-तरंग, पृथिवी की आयु, मृत्यु, आर्यजाति, परमाणु, प्रलय आदि १४ विषयों पर बड़ी उत्तमता से निबन्ध लिखे गये हैं। आशा है, हिन्दी-प्रेमी इस पुस्तक को विशेष चाव के साथ मँगाकर पढ़ेंगे और अनेक लाभ उठावेंगे। मूल्य १)

पार्वती और यशोदा

इस उपन्यास में स्त्रियों के लिए अनेक शिक्षायें दी गई हैं। इसमें दो प्रकार के स्त्री-स्वभावों का ऐसा अच्छा फ़ोटो खींचा गया है कि समझते ही बनता है। स्त्रियों के लिए ऐसे ऐसे उपन्यासों की अत्यन्त आवश्यकता है। 'सरस्वती' के प्रसिद्ध कवि पण्डित कामताप्रसाद गुरु ने ऐसा शिक्षादायक उपन्यास लिखकर हिन्दी पढ़ी लिखी स्त्रियों का बहुत उपकार किया है। हर एक स्त्री को यह उपन्यास अवश्य पढ़ना चाहिए। मूल्य ।=)

बालनिबन्धमाला

यह 'बालसखा-पुस्तकमाला' की अठारहवीं पुस्तक है। इसमें कोई ३५ शिक्षादायक विषयों पर, बड़ी सुन्दर भाषा में, निबन्ध लिखे गये हैं। बालकों के लिए तो यह पुस्तक उत्तम गुरु का काम देगी। ज़रूर मँगाइए। मूल्य ।=)

मिलने का पता—**मैनेजर, इंडियन प्रेस, प्रयाग।**

* * * इंडियन प्रेस, प्रयाग की सर्वोत्तम पुस्तकें * * *

बालविष्णुपुराण ।

१४—विष्णुपुराण में कितनी ही ऐसी विचित्र और शिक्षाप्रद कथायें हैं कि जिनके जानने की हिन्दी वालों को बड़ी ज़रूरत है। इस पुराण में कलियुगी भविष्य राजाओं की वंशावली का बड़े विस्तार से वर्णन किया गया है। जो लोग संस्कृत भाषा में विष्णुपुराण की कथाओं का आनन्द नहीं लूट सकते, उन्हें 'बालविष्णु-पुराण' पढ़ना चाहिए। इस पुस्तक को विष्णुपुराण का सार समझिए। मूल्य ।)

बाल-स्वास्थ्य-रक्षा ।

१५—यह पुस्तक प्रत्येक हिन्दी जाननेवाले को पढ़नी चाहिए। प्रत्येक गृहस्थ को इसकी एक एक कापी अपने घर में रखनी चाहिए। बालकों को तो आरम्भ से ही इस पुस्तक को पढ़कर स्वास्थ्य-सुधार के उपायों का ज्ञान प्राप्त कर लेना चाहिए। इसमें बतलाया गया है कि मनुष्य किस प्रकार रह कर, किस प्रकार का भोजन करके, नीरोग रह सकता है। इसमें प्रति दिन के बर्ताव में आनेवाली खाने की चीज़ों के गुण-दोष भी अच्छी तरह बताये गये हैं। कहाँ तक कहें, पुस्तक मनुष्य-मात्र के काम की है। इतनी उपयोगी पुस्तक का मूल्य नाममात्र के लिए ॥) आठ आना रक्खा है।

बालगीतावलि ।

१६—महाभारत में क्या नहीं है। उसमें सभी कुछ मौजूद है। महाभारत को रत्नों का सागर कहना चाहिए, शिक्षा का भण्डार कहना चाहिए। आप जानते हैं "बालगीतावलि" में क्या है? इसमें महाभारत में से ९ गीताओं का संग्रह किया गया है। उन गीताओं में ऐसी उत्तम उत्तम शिक्षायें हैं कि जिनके अनुसार बर्ताव करने से मनुष्य का परम कल्याण हो सकता है। हमें पूरी आशा है कि समस्त हिन्दी-प्रेमी इस पुस्तक को पढ़ कर उत्तम शिक्षा का लाभ करेंगे। मूल्य ॥) आठ आने।

सीतावनवास ।

जिन मर्यादा-पुरुषोत्तम श्रीरामचन्द्रजी और सती सीताजी का नाम भारतवासी हिन्दू ही नहीं विदेशी विद्वान् भी आदर के साथ लेते हैं; जिनके पवित्र चरित को वर्णन करके संस्कृत के आदिकवि श्री-वाल्मीकि, हिन्दी के प्रसिद्ध कवि श्रीतुलसीदास आदि ने अपनी वाणी को पवित्र और सफल किया है; और जिस पावन-चरित और अपूर्व त्याग की कारुणिक कथा सुप्रसिद्ध पण्डित ईश्वरचन्द्र विद्यासागर ने वंगभाषा में "सीतारवनवास" नामक पुस्तक में लिख कर अपनी लेखनी को कृतार्थ किया है उसी शिक्षा-प्रद और मनोरञ्जक पुस्तक का यह हिन्दी-अनुवाद "सीतावनवास" छप कर तैयार है। इस पुस्तक में श्रीरामचन्द्रजी-कृत गर्भवती सीताजी के परित्याग की विस्तारपूर्वक कथा बड़ी ही रोचक और करुणा-रस-भरी भाषा में लिखी गई है। इसे पढ़ सुन कर आँखों से आँसुओं की धारा बहने लगती है और पाषाण-हृदय भी मोम की तरह द्रवीभूत हो जाता है। मूल्य ॥)

हिन्दीभाषा की उत्पत्ति ।

यह पुस्तक हर एक हिन्दी जाननेवाले को पढ़ना चाहिए। इसके पढ़ने से मालूम होगा कि हिन्दी भाषा की उत्पत्ति कहाँ से है। पुस्तक बड़ी खोज के साथ लिखी गई है। हिन्दी में ऐसी पुस्तक, हमारी राय में, अभी तक कहीं नहीं छपी। एक हिन्दी ही नहीं इसमें और भी कितनी हीं हिन्दुस्तानी भाषाओं का विचार किया गया है। मूल्य ।)

* * * इंडियन प्रेस, प्रयाग की सर्वोत्तम पुस्तकें * * *

बालगीता ।

८—गीता की एक एक शिक्षा, एक एक बात मनुष्यों को भुक्ति और मुक्ति की देनेवाली है। ऐहिक और पारमार्थिक सुख चाहने वालों को गीता के उपदेशों से ज़रूर शिक्षा लेनी चाहिए। गीता में जगह जगह ऐसा अमृतमय उपदेश भरा हुआ है कि जिसके पान से मनुष्य अमर-पदवी तक पा सकता है। श्रीकृष्णचन्द्र महाराज के मुखारविन्द से निकले हुए सदुपदेश को कौन हिन्दू न पढ़ना चाहेगा? अपने आत्मा को पवित्र और बलिष्ठ बनाने के लिए यह "बालगीता" ज़रूर पढ़नी चाहिए। इसमें पूरी गीता का सार बड़ी सरल भाषा में लिखा गया है। मूल्य ॥)

बालोपदेश ।

९—यह पुस्तक बालकों को ही नहीं युवा, वृद्ध, वनिता सभी को उपयोगी तथा चतुर, धर्मात्मा और शीलसम्पन्न बनाने वाली है। राजा भर्तृहरि के विमल अन्तःकरण में जब संसार से वैराग्य उत्पन्न हुआ था तब उन्होंने एक दम भरा पूरा राज-पाट छोड़ कर संन्यास ले लिया था। उस परमानन्दमयी अवस्था में उन्होंने वैराग्य और नीति-सम्बन्धी दो शतक बनाये थे। इस 'बालोपदेश' में उन्हीं भर्तृहरि-कृत नीतिशतक का पूरा और वैराग्यशतक का संक्षिप्त हिन्दी अनुवाद छापा गया है। यह पुस्तक स्कूलों में बालकों के पढ़ने के लिए बड़ी उपयोगी है। मूल्य ।)

बालअारब्योपन्यास (सचित्र) ।

प्रथम भाग

१०—दिलचस्प क़िस्से कहानियों के लिए दुनिया भर के उपन्यासों में अरबियन नाइट्स का नम्बर सबसे पहला है। इसमें से कुछ अयोग्य कहानियों को निकाल कर, यह विशुद्ध संस्करण निकाला गया है, इसलिए, अब, यह किताब क्या स्त्री, क्या पुरुष सभी के पढ़ने लायक़ है। इसके पढ़ने से हि[illegible] का प्रचार होगा, मनोरञ्जन होगा, घर बैठे [illegible] सैर होगी, बुद्धि और विचार-शक्ति बढ़ेगी, [illegible] सीखने में आवेगी, साहस और हिम्मत [illegible] तक कहें, इसके पढ़ने से अनेक लाभ होंगे। [illegible]

बालपंचतंत्र ।

११—इसके पाँचों तंत्रों में बड़ी मनोरंजक कहानियों के द्वारा सरल रीति पर नीति की शिक्षा दी गई है। बालक-बालिकायें इसकी मनोरंजक कहानियों को बड़े चाव से पढ़ कर नीति की शिक्षा ग्रहण कर सकती हैं। यह "बालपंचतंत्र" विष्णुशर्मा कृत असली पंचतंत्र का सरल हिन्दी में सार है। यह पुस्तक प्रत्येक हिन्दीपाठक और विशेष कर बालकों के पढ़ने के योग्य है। मूल्य केवल ॥) आठ आने।

बालहितोपदेश ।

१२—इस पुस्तक के पढ़ने से बालकों की बुद्धि बढ़ती है, नीति की शिक्षा मिलती है, मित्रता के लाभों का ज्ञान होता है और शत्रुओं के पंजे में न फँसने और फँस जाने पर उससे निकलने के उपायों और कर्त्तव्यों का बोध हो जाता है। यह पुस्तक, पुरुष हो या स्त्री, बालक हो या बूढ़ा, सभी के काम की है। इसे अवश्य पढ़ना चाहिए। मूल्य आठ आने।

बालहिन्दीव्याकरण ।

१३—यदि आप हिन्दी-व्याकरण के गूढ़ विषयों को सरल और सुगम रीति से जानना चाहते हैं, यदि आप हिन्दी शुद्ध रूप से लिखना और बोलना जानना चाहते हैं, तो "बालहिन्दीव्याकरण" पुस्तक मँगा कर पढ़िए और अपने बाल-बच्चों को पढ़ाइए। स्कूलों में लड़कों के पढ़ाने के लिए यह पुस्तक बड़ी उपयोगी है। मूल्य ।) चार आने।

❋ ❋ ❋ इंडियन प्रेस, प्रयाग की सर्वोत्तम पुस्तकें ❋ ❋ ❋

बालभारत—पहला भाग।

१—इसमें महाभारत की संक्षेप से कुल कथा ऐसी सरल हिन्दी भाषा में लिखी गई है कि बालक और स्त्रियाँ तक पढ़कर समझ सकती हैं। यह पाण्डवों का चरित बालकों को अवश्य पढ़ाना चाहिए। मूल्य ॥) मूल्य आठ आने।

बालभारत—दूसरा भाग।

२—इसमें महाभारत से छाँट कर बीसियों ऐसी कथायें लिखी गई हैं कि जिनको पढ़कर बालक अच्छी शिक्षा ग्रहण कर सकते हैं। हर कथा के अन्त में कथानुरूप शिक्षा भी दी गई है। भाषा बड़ी सरल है। मूल्य वही ॥)

बालरामायण—सातों काण्ड।

३—इसमें रामायण की कुल कथा बड़ी सीधी भाषा में लिखी गई है। इसकी भाषा की सरलता में इससे अधिक और क्या प्रमाण दें कि गवर्नमेंट ने इस पुस्तक को सिविलियन लोगों के पढ़ने के लिए नियत कर दिया है। भारतवासियों को यह पुस्तक अवश्य पढ़नी चाहिए। मूल्य ॥)

बालमनुस्मृति।

४—आज कल आर्य-सन्तान अपनी प्राचीन धार्मिक, सामाजिक और राजनैतिक रीति-रस्मों को न जान कर कैसे घोर अन्धकार में धँसती चली जा रही है सो किसी भी विचारशील से छिपा नहीं है। इसी दोष के दूर करने के लिए 'मनुस्मृति' में से उत्तम उत्तम श्लोकों को छाँट छाँट कर उनका सरल हिन्दी में अनुवाद लिखा गया है। आशा है, आर्य्य-सन्तान इसे पढ़ कर धार्मिक और दृढ़ आस्तिक बनेगी। मूल्य।)

बालनीतिमाला।

५—नीतिविद्या बड़े काम की विद्या है। हमारे यहाँ चार नीतिज्ञ बड़े प्रसिद्ध हो गये हैं। शुक्र, विदुर, चाणक्य और कणिक। इन्हीं के नाम से चार पुस्तकें विख्यात हैं। शुक्रनीति, विदुरनीति, चाणक्यनीति और कणिकनीति। ये सब पुस्तक संस्कृत में हैं। हिन्दी जाननेवालों के उपकार के लिए हमने इन चारों पुस्तकों का संक्षिप्त हिन्दी-अनुवाद छापा है। इसकी भाषा बालकों और स्त्रियों तक के समझने लायक़ है। यह पुस्तक हर एक हिन्दी-भाषी को ज़रूर लेनी चाहिए। मूल्य ॥)

बालभागवत—पहला भाग।

६—लीजिए, 'श्रीमद्भागवत' की कथा भी अब सरल हिन्दी-भाषा में बन गई। जो लोग संस्कृत नहीं जानते, केवल हिन्दी-भाषा ही जानते हैं, वे भी अब श्रीमद्भागवत की भक्ति-रस-भरी कथाओं का स्वाद चख सकते हैं। इस 'बालभागवत' में 'श्रीमद्भागवत' की कथाओं का सार लिखा गया है। इसकी कथायें बड़ी रोचक, बड़ी शिक्षादायक और भक्ति रस से भरी हुई हैं। हर एक हिन्दी-प्रेमी हिन्दू को इस पुस्तक की एक एक कापी ज़रूर ख़रीदनी चाहिए। मूल्य ॥) आने

बालभागवत—दूसरा भाग।

अर्थात्

श्रीकृष्णलीला।

७—श्रीकृष्ण के प्रेमियों को यह बालभागवत का दूसरा भाग ज़रूर पढ़ना चाहिए। इसमें, श्रीमद्भागवत में वर्णित श्रीकृष्ण भगवान् की अनेक लीलाओं की कथायें लिखी गई हैं। मूल्य केवल ॥)

✻ ✻ ✻ इंडियन प्रेस, प्रयाग की सर्वोत्तम पुस्तकें ✻ ✻ ✻

ऋद्धि ।

कोई मनुष्य ऐसा न मिलेगा जिसे ऋद्धि की चाह न हो। किन्तु इच्छा रखते हुए भी ऋद्धि-साधन का उपाय न जानने के कारण कितने ही लोग सफलमनोरथ न होकर भाग्य को दोष देते हैं और श्रीवृद्धि के प्रयत्न से विमुख होकर कष्ट पाते हैं। जो लोग भाग्य के भरोसे रह कर दरिद्रता का दुःख झेलते हुए भी ऋद्धि-प्राप्ति के लिए कुछ उद्योग नहीं करते उनके लिए यह पुस्तक बड़े काम की है। इस पुस्तक में उदाहरण के लिए उन अनेक उद्योगशील, निष्ठावान् कर्मवीरों की संक्षिप्त जीवनी दी गई है जो लोग स्वावलम्बन-पूर्वक व्यवसाय करके अपनी दरिद्रता दूर कर करोड़पति हो गये हैं। इतनी बढ़िया पुस्तक का मूल्य सजिल्द होने पर भी केवल १।) सवा रुपया रक्खा गया है।

कविता-कुसुम-माला ।

इस पुस्तक में विविध विषयों से सम्बन्ध रखने वाली भिन्न भिन्न कवियों की रची हुई अत्यन्त मनोहारिणी, रसवती और चमत्कारिणी ९१ कविताओं के संग्रह है। हिन्दी कविताओं का ऐसा उपादेय संग्रह आज तक कहीं नहीं छपा। मूल्य ॥=) दश आने।

भारतवर्ष में पश्चिमीय शिक्षा ।

श्रीमान् पण्डित मनोहरलाल ज़ुतशी, एम० ए० के नाम को कौन नहीं जानता। आप उर्दू और अँगरेज़ी के प्रसिद्ध लेखक हैं। आपने "एज्युकेशन इन ब्रिटिश इंडिया" नामक एक पुस्तक अँगरेज़ी में लिखी है और उसे इंडियन प्रेस, प्रयाग ने छापकर प्रकाशित किया है। पुस्तक बड़ी खोज के साथ लिखी गई है। उक्त पुस्तक का सारांश हिन्दी और उर्दू में भी छप गया है। आशा है हिन्दी और उर्दू के पाठक इस उपयोगी पुस्तक को मँगाकर अवश्य लाभ उठावेंगे। मूल्य इस प्रकार है:—

एज्युकेशन इन ब्रिटिश इंडिया (अँगरेज़ी [illegible]
भारतवर्ष में पश्चिमीय शिक्षा (हिन्[illegible]
हिन्द में मग़रबी तालीम (उर्दू में) [illegible]

संक्षिप्त इतिहासमाला ।

लीजिए, हिन्दी में जिस चीज़ की [illegible] उसकी पूर्ति का भी प्रबन्ध हो गया। [illegible] प्रसिद्ध लेखक पण्डित श्यामविहारी मिश्र, एम० ए० और पण्डित शुकदेवविहारी मिश्र, बी० ए० के सम्पादकत्व में पृथ्वी के सभी प्रसिद्ध प्रसिद्ध देशों के हिन्दी में संक्षिप्त इतिहास तैयार होने का प्रबन्ध किया गया है। यह समस्त इतिहासमाला कोई २०, २२ संख्याओं में पूर्ण होगी। इसकी क्रमशः एक एक पुस्तक इंडियन प्रेस, प्रयाग, से प्रकाशित होती रहेगी। अब तक ये ४ पुस्तकें छप चुकी हैं:—

१—जर्मनी का इतिहास ... ।=)
२—फ़्रांस का इतिहास ... ।≡)
३—रूस का इतिहास ... ।=)
४—इँगलेंड का इतिहास ... ॥=)

बालसखा-पुस्तकमाला ।

इंडियन प्रेस, प्रयाग से "बालसखा-पुस्तकमाला" नामक सीरीज़ में जितनी किताबें आज तक निकली हैं वे सब हिन्दी-पाठकों के लिए, विशेष कर बालक-बालिकाओं और स्त्रियों के लिए, परमोपयोगी प्रमाणित हो चुकी हैं। इस 'माला' की सब किताबों की भाषा ऐसी सरल—सबके समझने योग्य—रक्खी है कि जिसे थोड़े पढ़े लिखे बालक भी बड़ी आसानी से पढ़ कर समझ लेते हैं। हिन्दी-समाचारपत्रों के सम्पादकों ने उक्त 'माला' के पुस्तकों की बड़ी प्रशंसा-पूर्ण आलोचना की है। यही नहीं बल्कि इस 'माला' की कई किताबें सरकारी स्कूलों में भी जारी हो गई हैं। इस 'माला' में अब तक जितनी पुस्तकें निकल चुकी हैं उनका संक्षिप्त विवरण यहाँ दिया जाता है:—

* * * इंडियन प्रेस, प्रयाग की सर्वोत्तम पुस्तकें * * *

हिंदीकोविदरत्नमाला।

(बाबू श्यामसुन्दरदास बी० ए० द्वारा सम्पादित)

इस पुस्तक में भारतेन्दु बाबू हरिश्चन्द्र और महर्षि दयानन्द सरस्वती से लेकर वर्तमान काल तक के हिन्दी के नामी नामी चालीस लेखकों और सहायकों के सचित्र संक्षिप्त जीवन-चरित दिये गये हैं। हिन्दी में यह पुस्तक अपने ढँग की अकेली ही है। स्कूलों में ऊँची कक्षाओं में पढ़नेवाले छात्रों को यह पुस्तक पारितोषिक में देने योग्य है। प्रत्येक हिन्दी-भाषा-भाषी को यह 'रत्नमाला' मँगा कर अपना कण्ठ अवश्य सुभूषित करना चाहिए। मूल्य ४० हाफ़टोन चित्रोंवाले पुस्तक का १॥) डेढ़ रुपया।

स्त्रीशिक्षा का एक सचित्र, नया और अनूठा ग्रन्थ

सीता-चरित।

अभी तक ऐसी पुस्तक की बड़ी आवश्यकता थी जिसमें आरम्भ से अन्त तक मुख्यतया सती सीताजी की अनुकरणीय जीवन-घटनाओं का विस्तारपूर्वक वर्णन हो, जिसमें सीताजी के जीवन की प्रत्येक घटना पर स्त्रियों के लिए लाभदायक उपदेश दिया गया हो। इसी अभाव को दूर करने के लिए हमने "सीताचरित" नामक पुस्तक प्रकाशित की है। इसमें सीताजी की जीवनी तो विस्तारपूर्वक लिखी ही गई है, किन्तु साथ ही उनकी जीवनघटनाओं का महत्त्व भी विस्तार के साथ दिखाया गया है। यह पुस्तक अपने ढंग की निराली है। भारतवर्ष की प्रत्येक नारी को यह पुस्तक अवश्य मँगा कर पढ़नी चाहिए। इस पुस्तक से स्त्रियाँ ही नहीं पुरुष भी अनेक शिक्षायें ग्रहण कर सकते हैं। क्योंकि इसमें कोरा सीताचरित ही नहीं है, पूरा रामचरित भी है। आशा है, स्त्रीशिक्षा के प्रेमी महाशय इस पुस्तक का प्रचार करके स्त्रियों को पातिव्रत धर्म की शिक्षा से अलङ्कृत करने में पूरा प्रयत्न करेंगे। पृष्ठ २३५। काग़ज़ मोटा। सुनहली जिल्द। पर, तो भी सर्वसाधारण के सुभीते के लिए मूल्य बहुत ही कम। केवल १।) सवा रुपया।

चरित्रगठन।

जो नवयुवक विद्यार्थी चरित्रगठन के अभिलाषी हैं वे तो इसे अवश्य ही पढ़ें; और विशेष कर उन्हीं के लिए यह पुस्तक बनाई गई है। वे इस पुस्तक को पढ़ कर आप तो लाभ उठावेंगे ही, किन्तु अपने भावी सन्तानों को भी विशेष लाभ पहुँचा सकेंगे। इस पुस्तक के सभी विषय सुपाठ्य हैं। जिस कर्तव्य से मनुष्य अपने समाज में आदर्श बन सकता है उसका उल्लेख इस पुस्तक में विशेष रूप से किया गया है। उन्नति, उदारता, सुशीलता, दया, क्षमा, प्रेम, प्रतियोगिता आदि अनेक विषयों का वर्णन उदाहरण के साथ किया गया है। अतएव क्या बालक, क्या वृद्ध, क्या युवा, क्या स्त्री सभी इस पुस्तक को एक बार अवश्य एकाग्र मन से पढ़ें और इससे पूर्ण लाभ उठावें। २३२ पृष्ठ की ऐसी उपयोगी पुस्तक का मूल्य नाममात्र के लिए केवल ॥।) बारह आना है।

जापान-दर्पण।

(ग्रन्थकर्त्ता के हाफ़टोन चित्र सहित)

जिस हिन्दुधर्मावलम्बी वीर जापान ने महाबली रूस को पछाड़ कर सारे संसार में आर्य्यजाति मात्र का मुख उज्ज्वल किया है, उसी वीरशिरोमणि जापान के भूगोल, आचरण, शिक्षा, उत्सव, धर्म, व्यापार, राजा, प्रजा, सेना और इतिहास आदि बातों का, इस पुस्तक में, पूरा पूरा वर्णन किया गया है। भारत की अधोगति पर आँसू बहानेवाले देश-भक्तों को तो इस पुस्तक से अवश्य कुछ शिक्षा लेनी चाहिए। ३५० पृष्ठ की पुस्तक का मूल्य १) से घटा कर ॥।) बारह आने कर दिया।

पुस्तक मिलने का पता—**मैनेजर, इंडियन प्रेस, प्रयाग।**